مشتاق احمد قریشی

ابن صفی کے چاہنے والوں اور عقیدت مندوں کے جذبات و احساسات کا مرقع

ابن صفی کون؟

مشتاق احمد قریشی

نام کتاب......ابن صفی کون؟

موضوع......ابن صفی کے بارے میں اہل قلم کا خراج عقیدت

تحریر......مشتاق احمد قریشی

کمپوزنگ......طاہر احمد قریشی

اہتمام......محمد علی قریشی

پرنٹنگ......نیر اسد پریس لاہور

سن اشاعت

قیمت......500 روپے

ناشر...... نئے افق گروپ آف پبلی کیشنز۔7 فرید چیمبر عبداللہ ہارون روڈ صدر، کراچی

﴿ملنے کا پتا﴾

مکتبہ القریش اردو بازار لاہور۔۲، فون: **024-37668958**

نئے افق، 7 فرید چیمبر عبداللہ ہارون روڈ صدر، کراچی، فون: **021-3562071/2**

انتساب

ابن صفی کے تمام چاہنے والوں کے نام

پیش لفظ

اس کتاب سے پہلے آپ ابن صفی صاحب کے تعلق سے حوالے سے میری ایک کتاب ''دو بڑے'' کے بعد ''یادش بخیر'' کو پسند کر چکے ہیں۔ آپ کی اس پسندیدگی نے ہی یہ تیسری کتاب ابن صفی کون؟ آپ کی خدمت میں پیش کرنے کا حوصلہ و جرأت دی اگر آج میں یہ کہوں تو شاید غلط نہ ہوگا کہ ابن صفی کسی شخصیت کا نام نہیں بلکہ ایک عہد ایک دور ایک روشنی ایک اسلوب ایک نظریہ کا نام بن چکا ہے۔ ہاں ان کا نام تو اسرار احمد تھا جبکہ ابن صفی اسرار احمد کے زورِ قلم، زورِ تخلیق کا شاہکار ہے۔ ابن صفی گو کہ جاسوسی ادب کے حوالے سے یاد کیے جا رہے ہیں لیکن اگر بغور سوچا جائے، فکر کی جائے تو ابن صفی تو ایک پورے کے پورے عہد کا نام ہے جس نے بابائے اردو مولوی عبدالحق کے کام ان کے مشن کو ان سے کہیں بڑھ چڑھ کر انجام دیا ہے۔ اردو زبان و بیان کو عام آدمی سے لے کر خاص الخاص آدمی تک پہنچایا اور پڑھوایا ہے۔ اگر انصاف اور غیر جانبداری سے دیکھا جائے تو یہ کام بابائے اردو اپنی تمام تر کوششوں محبتوں کے باوجود انجام نہیں دے سکے تھے۔ میرے کہنے کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ انہوں نے اردو کے لیے کوئی خاص کام نہیں کیا۔ نہیں ہرگز نہیں انہوں نے یقیناً اردو زبان کی بقاد حیات کے لیے خصوصاً پاکستان میں اردو کو رائج کرانے میں بڑا اہم کردار ادا کیا ہے لیکن جس سطح کا کام میرے محترم ابن صفی صاحب نے کیا وہ بالکل الگ اور منفرد انداز کا کام ہے جو نہ تو بابائے اردو اور نہ ان کے پائے کے لوگ ادا کر سکے تھے۔ شاید یہی وجہ تھی جب جناب نیاز فتح پوری صاحب نے اپنے موقر جریدے نگار کے ایک شمارے میں ابن صفی صاحب کو اردو کا ناسور تحریر کیا۔ اس سلسلے میں جب میں بذاتِ خود نیاز فتح پوری صاحب سے ملا تو اس وقت ان کے ہاتھ میں اسی دن آنے والی ابن صفی کی کتاب ''شادی کا ہنگامہ'' مجھے نظر آئی۔ مختصر سی ملاقات کے فوراً بعد میں سیدھا اردو کالج بابائے اردو حضرت مولوی عبدالحق سے ملنے پہنچا تو میرے پاس نگار کا وہ شمارہ بھی تھا۔ میں نے مولوی عبدالحق صاحب سے جب نگار کے اس شمارے کو دیکھا کر ابن صفی صاحب کے بارے میں سوال کیا تو بابائے اردو نے وہ تاریخی جملہ ادا کیا جو اَب تاریخ کا حصہ بن چکا ہے اور کئی لوگ اسے اپنی طرف نسبت کرتے ہیں۔ ''ابن صفی کا اردو پر بڑا احسان ہے۔'' اس نے لوگوں میں اردو پڑھنے کا ذوق پیدا کیا ہے اور نگار کے اس شمارے کو ایک طرف رکھتے ہوئے فرمایا۔ اسے کتنے لوگ پڑھتے ہیں یہ کتنے لوگوں کے ہاتھوں میں ملتا ہے۔ ابن صفی کے پڑھنے والوں پر تو عمر کی کوئی قید نہیں۔ ہر عمر، ہر مکتبہ فکر کے لوگ اسے پڑھتے ہیں تمہیں یا کسی کو بھی فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے اور ایک بات سن لو آسمان پر تھوکا خود منہ پر ہی آتا ہے۔ شاید نگار کے اس شمارے سے وہ کبیدہ خاطر ہو گئے تھے۔ اپنے غصے کا اظہار انہوں نے یوں کیا۔ بس اب چلتے پھرتے نظر آؤ مجھے بہت سے کام ہیں۔ آخری جو جملہ میرے کانوں نے سنا وہ تھا کوّوں کے کوسے سے ڈھور نہیں مرا کرتے۔ یہ وہ تمام گفتگو تھی جو میرے کانوں نے بہ سرعت سنی اور محفوظ کی۔ اس کا تذکرہ میں مختصراً کئی بار کئی جگہ تحریر کر چکا ہوں لیکن آج پہلی بار پوری تفصیل سے تحریر کر رہا ہوں۔

آج تقریباً چونتیس سال بعد ایسا محسوس کر رہا ہوں کہ محترم ابن صفی صاحب پھر سے زندہ ہو گئے ہیں اب تو ایسے ایسے جغادری اور ادب عالیہ کے ٹھیکیدار جو پہلے انہیں پڑھتے تو تھے لیکن اقرار نہیں کرتے تھے شرماتے تھے یا اپنی بے عزتی گردانتے تھے لیکن اللہ کا کرنا دیکھیے کہ اب وہی لوگ جن کی پہلے زبان نہیں کھلتی تھی، اقرار کرنے میں ہچکچاتے تھے، شرماتے تھے، ابن صفی کے حسن تحریر پر بڑی بڑی باتیں کرتے، انگلیاں اٹھاتے نہیں تھکتے تھے وہ اب بڑے فخر سے ابن صفی کے بارے میں نا صرف اقرار کر رہے ہیں بلکہ اپنے درست قلبی تعلق کا اظہار بھی برملا کر رہے ہیں۔ یہ سب اللہ کا بڑا کرم اور احسان ہے وہ جس کو جس طرح چاہتا ہے عزت عطا فرماتا ہے۔ بہت کم لوگوں کو یہ عزت ملتی ہے کہ زندگی میں کوئی دوسرا اس کا ہم سر نہ ہو۔ اللہ جب چاہتا ہے، جس کو چاہتا ہے بعد از مرگ بھی مزید عزت و سر بلندی سے نوازتا ہے۔ میرے محترم ابن صفی ان نابغہ روزگار شخصیات میں سے ہیں جنہیں اللہ تبارک و تعالیٰ نے زندگی میں بے پناہ عزت سے نوازا اور وہ عزت ان کی وفات کے بعد ختم نہیں ہوئی بلکہ اس میں اور چار چاند لگ گئے جبکہ اس چاند کی طرف انگلی اٹھانے والے آج کہاں ہیں؟ کون انہیں یوں یاد کرتا ہے بس پرانی الماریوں میں قید ہو کر رہ گئے ہوں گے۔

جیسا کہ میں ہی نہیں مجھ سے پہلے اگر میں غلطی نہیں کر رہا ہوں تو ابن صفی صاحب کے دوست سرپرست جناب عباس حسینی صاحب نے بھی اپنے تعزیتی اداریے میں ان کے بارے میں ایسے ہی خیالات کا اظہار کیا تھا۔ واقعی ابن صفی اب ایک شخصیت کا نام نہیں بلکہ ایک عہد، ایک اسلوب کا ایک زندہ جاوید تحریر کا نام ہے۔ آج بھی ان کی تمام تحریریں اسی طرح تر و تازہ اور ویسی ہی کارگر ہیں جیسی وہ اپنے لکھے جانے کے وقت تر و تازہ اور زندہ تھیں، ہیں اور رہیں گی۔ یہی وجہ ہے کہ میں یہ بلا تکلف کہہ رہا ہوں ابن صفی ایک زندہ جاوید عہد کا نام ہے۔

محترم ابن صفی صاحب کے بارے میں تحریر کی گئیں وہ تمام جذباتی پر اثر تحریریں جو ان کی وفات کے بعد ان کے مخلص چاہنے والوں نے لکھیں تھیں جو نئے افق، نیا رخ اور آنچل کے شماروں میں شائع ہو چکی ہیں اب وہ پرچے یا تو نایاب ہو چکے ہیں یا ان کا ملنا انہیں پڑھنا محال ہو گیا۔ ایسی تمام تحریروں کو یکجا کر کے انہیں کتابی صورت میں شائع کرنے کا ایک تجربہ مجھ سے پہلے راشد اشرف کر چکے ہیں پھر ان کی ہی ایما پر میں نے ایک مجموعہ یادش بخیر ابن صفی شائع کیا جسے پرستارانِ ابن صفی نے نا صرف بہت زیادہ پسند کیا بلکہ یہ ان لوگوں کی ہی فرمائش ہے، جس کی تکمیل کر رہا ہوں۔ یہ کتاب ''ابن صفی کون؟'' یقیناً ایک خوب صورت گلدستے کی حیثیت سے آپ تک پہنچی گی، جس میں بہت سی جذباتی اور نئی تحریریں بھی آپ کو ملے گی امید ہے کہ آپ کی پسند اور معیار پر یہ پوری اترے گی۔

اس کتاب کی تیاری و تدوین میں میاں راشد اشرف پوری طرح شریک رہے ہیں ان کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں اور دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ ان کی ابن صفی دیوانگی اور شیدائی پن کو اور سوا کرے آمین،

فقط والسلام

عاجز

مشتاق احمد قریشی

ابن صفی اور جاسوسی ادب

رفاقت علی شاہد

جاسوسی ادب کا آغاز۔

اردو ادب کی تاریخ اور تنقید کی چند کتابوں میں جاسوسی ناول کے باب میں سوائے ظفر عمر یا تیرتھ رام فیروز پوری کے اور کسی کا نام نہیں ملتا اور وہ بھی صرف اتنا کہا جاتا ہے کہ مصنف کے حالات بتا کر اس بات پر زور دیا جاتا ہے کہ موصوف نے بہت اچھے ناول ترجمہ کیے' انداز سے معلوم ہوتا ہے جیسے یہی مصنف اردو کے جاسوسی ادب کا سہرا اپنے سر باندھے ہوئے ہیں' ان سے پہلے اور بعد میں کسی نے بھی جاسوسی ناول ترجمہ یا طبع زاد نہیں لکھے اور اگر لکھے ہیں تو ان صاحب سے زیادہ اچھے نہیں' جن کا ذکر خیر کر کے یہ نقاد حضرات سمجھتے ہیں کہ انہوں نے جاسوسی ناول کی صنف میں اپنی تحقیق اور تنقید کا حق کما حقہ پورا کر دیا ہے مگر یہ ایک اٹل اور ناقابل تردید حقیقت ہے کہ ظفر عمر اور تیرتھ رام فیروز پوری سے قبل بھی ہمیں بہت سے جاسوسی ترجمہ ناول نظر آتے ہیں۔ انہی حضرات کی طرح دو تین حضرات ایسے بھی ہیں جنہوں نے نسبتاً زیادہ جاسوسی ناول انگریزی سے ترجمہ کیے مثلاً ندیم صہبائی فیروز پوری' محمد حسین اور مرزا فدا علی خنجر وغیرہ......

پنجاب پبلک لائبریری کے کٹیلاگ سے مجھے چند ایک ایسے ناولوں کا پتہ چلا ہے جو ۱۹۱۲ء سے قبل انگریزی سے اردو میں ترجمہ ہوئے وہ مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱)۔ راز نہاں' لال کوٹھی۔ مترجم' میر کرامت اللہ لاہور ۱۸۹۹ء

(۲)۔ حسین قاتلہ۔ متراجم امجد حسین ۱۹۰۴ء

(۳)۔ لنگڑا قاتل۔ سر کانن ڈائل کے ناول کا ترجمہ ۱۹۱۱ء

ان کے علاوہ بہت سے ناول ایسے بھی معلوم ہوئے ہیں جن پر اگرچہ سن اشاعت درج نہیں مگر وہ ۱۹۴۰ء سے قبل کے معلوم ہوتے ہیں۔

مندرجہ بالا تین ترجمہ ناولوں کے نام میں نے مثال کے طور پر پیش کیے ہیں۔ ان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ۱۸۹۹ء میں ایک انگریزی جاسوسی ناول کا ترجمہ ہوا۔ اگرچہ ہم اسے پہلا جاسوسی ناول نہیں کہہ سکتے' ہوسکتا ہے اس سے قبل بھی جاسوسی ناول موجود ہوں۔ جو ہمارے علم میں نہ ہوں۔ میں ترجمہ ناولوں کی اصطلاح اس لیے پیش کر رہا ہوں کہ میں نے جتنے ناول بھی دیکھے ہیں' وہ سب انگریزی سے ترجمہ ہیں۔ اگر اس دوران کوئی طبع زاد جاسوسی ناول لکھا جاتا تو یقیناً یہ انداز پھیلتا بھی اور مشہور بھی ہوتا' جس طرح انگریزی ناول سے کسی نے ترجمہ کیا تو اس کے بعد بہت سے ترجمے ہوئے۔ اسی طرح اگر کوئی طبع زاد ناول لکھا جاتا تو یقیناً اس کی تقلید میں بھی بعد میں طبع زاد ناول احاطہ تحریر میں ضرور آتے۔ لہٰذا یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اظہار اثر تک ہمیں شروع سے جاسوسی ناول کے ضمن میں ترجمہ ناول ہی ملتے رہے۔ طبع زاد ناولوں کی طرح ابن صفی نے ہی ڈالی

تھی لہٰذا ہم یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ اردو میں پہلا جاسوسی ناول کب ترجمہ ہوا۔

جاسوسی ادب کے آغاز کے متعلق ایک اور نظریہ بھی خاصا اہم اور قابل قبول ہے۔ اگر ہم بنظر غائر جائزہ لیں تو ہمیں اردو کی سب سے ضخیم اور مشہور داستان طلسم ہوشربا یعنی داستان امیر حمزہ میں جاسوسی کے آثار بدرجہ اتم موجود نظر آئیں گے۔ عمرو عیار جیسا مرکزی کردار اور اس کے شاگرد داستان امیر حمزہ میں جاسوسی نظریے کی نمائندگی کرتے نظر آتے ہیں۔ کیا عمرو اور اس کے شاگردوں کی عیاریاں دراصل ایک جاسوس کا انداز نہیں ہے؟ بھیس بدل کر دشمن کے پڑاؤ میں جانا اور تمام حالات سے حضرت امیر حمزہ کو مطلع کرنا، طرح طرح کی عیاریوں سے شہنشاہوں، بادشاہوں اور امراء سے دولت بٹورنا، کبھی مرد کبھی عورت کبھی جانور غرضیکہ ہر رنگ میں بھیس بدل لینا کیا ان سب حرکات میں جاسوسی کے آثار نظر نہیں آ رہے۔ لہٰذا یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ داستان امیر حمزہ کی چودہ ضخیم جلدوں میں جاسوسیت کے آثار نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔

اگر اس سے قبل کی داستانوں پر نظر ڈالیں تو ہمیں ان میں بھی جاسوسیت یا سریت کے آثار نظر آتے ہیں۔ میں یہاں صرف اردو کی مشہور ترین داستان قصہ چار درویش کا ذکر کروں گا۔ اس قصہ میں جا بجا ہمیں جاسوسی کے آثار اور بیان نظر آتے ہیں۔ سب سے بڑا ثبوت تو یہی ہے کہ بادشاہ بھیس بدل کر محل سے باہر جاتا ہے اور قبرستان میں چاروں درویشوں سے ان کی کتھائیں سنتا ہے۔ بھیس بدلنے کا بیان صرف اسی ایک داستان میں نہیں بلکہ اردو کی تقریباً تمام داستانوں میں اس کا ذکر ملتا ہے۔ زیادہ تر یہی ہوتا ہے کہ کہیں کا شہزادہ کسی شہزادی پر خواب کے ذریعے یا ویسے عاشق ہو جاتا ہے اور پھر اس شہزادی کی تلاش میں بھیس بدل کر دور دور تک کا سفر کرتا ہے۔ اس طرح اردو کی تمام داستانوں میں جاسوسی عناصر موجود ہیں۔ لہٰذا اس رو سے اردو میں جاسوسی ادب کا آغاز داستان کی صنف کے ساتھ ہی ہو گیا تھا۔

اس بات کو ہم ایک دلیل سے بھی ثابت کر سکتے ہیں اور وہ دلیل ہے سسپنس، سسپنس جاسوسی ناول نگاری کے لیے بہت ضروری ہے اور یہ عنصر اردو داستان میں بھی بدرجہ اتم موجود ہے۔ داستانوں میں جادو کے بیان اور لڑائی کے مناظر میں سسپنس ملتا ہے۔ یہ بات کہ اب کیا ہوگا؟ ہر داستان میں موجود ہے اور یہی بات اس طرف اشارہ کرتی ہے کہ داستان کی صنف میں ایک سے زائد صورتوں میں جاسوسی کے آثار پائے جاتے ہیں۔ لہٰذا یہ نظریہ بھی قابل قبول ہے کہ جاسوسی ادب کا آغاز بھی افسانوی یا داستانوی ادب کے ساتھ ہی عمل میں آیا۔ اگرچہ یہ مکمل شکل میں بہت بعد میں سامنے آیا مگر ثانوی آغاز دراصل داستان کے ساتھ ہی وجود میں آیا۔

جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے کہ ہمیں ابھی تک یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ اردو کا پہلا جاسوسی ناول کون سا ہے؟ کب لکھا گیا؟ اور کس نے لکھا؟ لہٰذا ٹھوس شکل میں جاسوسی ادب کا آغاز ابھی نامعلوم ہے۔ اس سلسلے میں بہت تحقیق کی ضرورت ہے۔ امید ہے کہ اب ادب کے طالبعلم اور استاد حضرات اس طرف توجہ دیں گے اور ناول کی اس ہردلعزیز اور مقبول صنف پر بھی خاطر خواہ تحقیق کریں گے۔

جاسوسی ناول نگاری میں ابنِ صفی کا مقام:۔

یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ ۱۹۵۲ء تک جاسوسی ناول کے ضمن میں ہمیں صرف ترجمہ ناول ملتے ہیں اور وہ بھی اتنے اہم اور کامیاب نہیں کہ ان کے مترجمین کو جاسوسی ادب میں کوئی خاص مقام حاصل ہو سکے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ ان کے تراجم نہ تو زیادہ سبوط اور کامیاب تھے اور نہ ان کے ناولوں میں وہ تمام عناصر پائے جاتے تھے جو ایک جاسوسی ناول کے لئے بہت ضروری ہوتے ہیں۔ زبان کی سادگی بیان کی جولانی' پلاٹ کی مضبوطی' کردار نگاری' ایک مخصوص پیغام' مشرقی انداز' معاشرت' دلکش انداز نگارش غرضیکہ ان تمام عناصر میں سے یہ تو سب مفقود ہیں یا ان میں سے بیشتر عناصر کا کہیں وجود نہیں ملتا۔ بلکہ بعض ناولوں میں تو ان کے خلاف امر واقع ہوئے ہیں میں یہاں ایک مثال پیش کروں گا جس سے اس زمانے کی نثر اور مزاج کا اندازہ ہوتا ہے۔ مثلاً

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانہ میں
تڑپے ہے مرغ قبلہ نما آشیانہ میں

ابنائے زمانہ کی فریب ودغا سے بھری ہوئی بدنیتی اور حرصِ دنیا سے مملوخواہشاتِ نفسانی جن کے خیال کرنے سے بدن پر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں......

دنیا بھر کے رنج ومصیبت اٹھانے پر بھی ظالم قزاق اور بیدرد لٹیر ارات کی ڈراونی تاریکی میں ٹیماری کی خاطر سڑکوں اور وحشت ناک جنگلوں اور بیٹر میدانوں میں شمشیر خونچکا ہاتھ میں لیے تاک لگائے مسافران درنوردان دشت غربت کی گھاٹ میں بیٹھا نظر آئے گا۔

(چور شاطر...... مترجم سید فاروق حسن مہادیو پرشاد۔ پبلشر لکھنؤ بار اول ۱۹۲۱ء۔ صفحہ ۳)

مندرجہ بالا اقتباس سے صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ مترجم نے ناول میں مشکل الفاظ کا استعمال کھل کر کیا ہے جو ایک جاسوسی ناول کے مزاج کے قطعاً خلاف ہے۔ مکالمہ بازی میں کسی خاص کردار کی طبیعت اور لہجے کو مدنظر رکھتے ہوئے تو ان مشکل الفاظ کو قبول کیا جا سکتا ہے۔ یعنی کوئی ایسا کردار جس کا مزاج مشکل الفاظ کا استعمال ہو' لیکن بیان نگاری میں مشکل الفاظ کی کھپت ایک جاسوسی ناول میں مشکل ہی نہیں ناممکن بھی ہے۔ میں یہاں ایک اور مثال اپنے بیان کی تائید میں پیش کروں گا۔

''ویٹنگ روم میں پہنچ کر اس نے کہا۔ ''مم...... مم...... میرے...... اوسان...... بج...... بجا نہیں تھے لل لہٰذا اب آداب بجالاتا ہوں۔'' اس نے نہایت ادب سے جھک کر عمران کو فرشی سلام کیا۔

''جیتے رہو......'' عمران اس کے سر پر ہاتھ پھیرتا ہوا بولا۔ ''کیا تم اس شہر سے واقفیت رکھتے ہو؟''

''جی ہاں یہ...... مم...... مم...... میرے برادرِ نسبتی کا وطن مالوف ہے۔''

(عمران سیریز نمبر ۴...... بھیانک آدمی از ابن صفی بی اے)

مندرجہ بالا عبارت میں ایک کردار کے مکالمات میں بھی مشکل الفاظ استعمال ہوئے ہیں اور یہ ایک کردار

کے مزاج کو ظاہر کرتے ہیں۔ابن صفی نے اس کردار کے مزاج کے بارے میں بھی وضاحت کر دی ہے۔

''......اسے اپنے ماتحت ہدہد کی آمد کا انتظار تھا۔ ہدہد جو ہکلا کر بولتا تھا اور دوران گفتگو بڑے بڑے الفاظ ادا کرنے کا بے حد شائق تھا۔

(عمران سیریز نمبر ۴۔ بھیانک آدمی۔ از ابن صفی بی اے)

لہٰذا ابن صفی کا یہ کردار اس زمرے میں شامل نہیں ہو سکتا جس کا ذکر میں نے اوپر کیا ہے۔ چور شاطر ناول میں بیان نگاری میں مشکل الفاظ کا استعمال ہے جبکہ ابن صفی کی تخلیق میں ایک کردار کے لیے یہ مشکل الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ بیان نگاری میں مشکل الفاظ کے استعمال نے ایک ناول کو پس پردہ ڈال دیا اور جب انہی مشکل الفاظ کا استعمال ایک مخصوص کردار کے لیے ہوا تو نہ صرف وہ کردار بلکہ تحریر بھی زندہ جاوید ہوگئی۔فرق صرف موقع محل کا واقع ہوا ہے مگر اسی فرق کی وجہ سے ایک تحریر خاصیانہ کیا عامیانہ مقام بھی حاصل نہ کرسکی اور دوسری تحریر نے نہ صرف یہ کہ عامیانہ و خاصیانہ رنگ اختیار کیا بلکہ عوام وخواص میں اتنی مقبول ہوئی کہ اس سے قبل اتنی قبولیت کسی اور کتاب کو حاصل نہ ہوسکی ہوگی۔صرف یہی ایک وجہ نہیں تھی اور بھی کئی وجوہات تھیں ان میں سے ایک نہایت اہم اور موثر وجہ بیان نگاری ہے۔مندرجہ ذیل اقتباس ملاحظہ فرمائیے۔

''زنانی آواز۔انسپکٹر صاحب' آپ کے اس وقت مکان پر موجود ملنے سے میں بے حد خدا کا شکر یہ ادا کرتی ہوں۔اے صاحب میں اس وقت سخت رنج وتعب میں مبتلا ہوں۔آہ......میں سمجھتی ہوں کہ اب کوئی جگہ حفاظت اور امن کی کسی غریب الوطن کے لیے اس شہر میں قیام کرنے کے واسطے باقی نہیں۔''

(چور شاطر......مترجم سید فاروق حسن' مہادیو پرشاد پبلشر لکھنو۔بار اول ۱۹۲۱ صفحہ ۵)

مندرجہ بالا عبارت میں تسلسل کا فقدان موجود ہے۔اس کے ساتھ ہی ساتھ یہ عبارت کلاسیکی داستانوں کے انداز کو نمایاں کرتی ہے۔کلاسیکی داستان میں بیان نگاری کے لیے یہی طریقہ اختیار کیا گیا ہے جبکہ جاسوسی ناول ایک جدید صنف ہے اور ناول نگاری کے اوصاف کی حامل ہے جس کی نثر اور عبارت میں کسی قسم کی غیر تسلسلی' نا قابل قبول ہے۔

میں نے اوپر کی بحث میں دو وجوہات بیان کی ہیں جن کی بنا پر ابن صفی کے دور تک جاسوسی ناول مقبول نہ ہوسکے۔ان کے علاوہ بھی بہت سی وجوہات ہیں لیکن ان کے ذکر سے مضمون کی طوالت کا خدشہ ہے لہٰذا انہی دو پر اکتفا کیا جاتا ہے۔اب ہم ان عوامل کا جائزہ لیں گے جن کے باعث ابن صفی کو شہرت دوام حاصل ہوئی اور وہ جاسوسی ادب کے بانی کہلائے۔وہ عوامل درج ذیل ہیں۔

ا۔ان کے ناولوں کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے طبع زاد ناول لکھے۔ابن صفی کے دور تک جتنے مصنفین نے جاسوسی ناول لکھے وہ سب انگریزی سے ترجمہ تھے۔خود ابن صفی اس سلسلے میں فرماتے ہیں۔

اس سے قبل اردو میں صرف منشی تیرتھ رام فیروز پوری کے تراجم پائے جاتے تھے یا دو تین ناول ظفر عمر کے' وہ بھی ان کے اپنے نہیں تھے بلکہ مارس لیبلانک کے چند ناولوں کو مشرف بہ اسلام کر ڈالا تھا۔لیکن انہوں نے

اس کا اعتراف نہیں کیا۔

(ماہنامہ نیا رخ' اگست ۱۹۸۱ء ابن صفی نمبر صفحہ ۸۲)

ابن صفی نے کسی قدر معروف مترجمین کا ذکر کیا ہے جبکہ ان کے علاوہ بھی بہت سے افراد نے جاسوسی ناول انگریزی سے ترجمہ کیے اور ان میں زیادہ تعداد رینالڈس کے ناولوں کی ہے۔ بہر حال ابن صفی نے اردو ادب میں طبع زاد جاسوسی ناول کو متعارف کرایا۔ ان کا پہلا ناول جاسوسی دنیا کا ''دلیر مجرم'' تھا جس کا مرکزی خیال ماخوذ ہے۔ اس سلسلے میں خود ابن صفی کا بیان ہے۔

''بہر حال جاسوسی ناول میرے لیے بالکل نئی چیز تھی لہٰذا پہلی بار مجھے بھی انگریزی ہی کے دامن میں پناہ لینی پڑی۔ میرا پہلا ناول ''دلیر مجرم'' وکٹر گن کے ناول ''آئرن سائیڈز لون ہینڈ'' سے ماخوذ تھا۔ فریدی اور حمید کے کردار میری اپنی اپج تھے۔ اس کے بعد میں نے اپنے طور پر لکھنا شروع کیا لیکن حتیٰ الامکان باہر کی آلودگیوں سے بچنے کے باوجود (ماہنامہ ''نیا رخ'' اگست ۱۹۸۱ء ابن صفی نمبر۔ صفحہ ۸۲) بھی میرے آٹھ ناول کلی طور پر میرے اپنے نہیں تھے۔ یا تو ان کے پلاٹ انگریزی سے لیے گئے ہیں یا ایک آدھ کردار باہر سے آئے ہیں...... جی ہاں ڈیڑھ سو سے زائد ناول میں سے صرف آٹھ ناول ملاوٹ والے ہیں' اور بقیہ سب میرے اپنے۔''

ابن صفی نے بہت فراخدلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے انگریزی سے مدد لینے کا اعتراف کیا ہے اور ان ناولوں کی تفصیل بھی دی ہے' جن کے یا تو کردار یا کہانی انگریزی سے ماخوذ ہے۔ مثلاً دلیر مجرم' پراسرار اجنبی' رقاصہ کا قتل' ہیرے کی کان اور خونی پتھر کی کہانیاں انگریزی سے ماخوذ ہیں لیکن ابن صفی نے ان میں ایسی تبدیلیاں اور اضافے کیے کہ یہ اصل سے بھی زیادہ دلچسپ ثابت ہوئے۔ اس کے علاوہ ''خوفناک ہنگامہ'' کا کردار پروفیسر درانی اور پہاڑوں کی ملکہ کا بن مانس اور سفید ملکہ کے کردار انگریزی سے ماخوذ ہیں۔

ابن صفی نے جن ناولوں میں انگریزی سے مدد لی ہے ان میں سے ہر ناول کی ایک ایک سطر پر ان کا حق ہے۔ انہوں نے کہانی کا مرکزی خیال انگریزی سے لیا' ناولوں کا ترجمہ نہیں کیا۔ اس طرح ابن صفی کے ڈھائی سو ناولوں میں سے صرف سات یا آٹھ ناولوں میں انگریزی کی ملاوٹ ہے باقی سب مکمل طور پر طبع زاد ہیں۔ ان ناولوں میں ملاوٹ کی وجہ ابن صفی نے بیان کی ہے۔ جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ یعنی چونکہ ان کے سامنے کوئی مستند مثال موجود نہ تھی لہٰذا انہیں انگریزی سے مدد لینی پڑی۔ (۱)۔ ابن صفی نے اس تحریر تک ۱۵۰ ناول ہی لکھے تھے۔ (۲)۔ ماہنامہ نیا رخ اگست ۱۹۸۱ء ابن صفی نمبر صفحہ ۸۲۔ (۳) جاسوسی دنیا نمبر ۷۵۔ زمین کے بادل'' دیکھئے پیش رس)

لیکن یہ ناول بھی مکمل ماخوذ یا ترجمہ نہ تھے۔ فریدی' حمید' عمران' قاسم' سلیمان' صفدر' جولیا وغیرہ اور نا قابل فراموش کردار سنگ ہی لیوناڈ' ڈاکٹر ڈریڈ' تھریسیا بمبل آف بی' بوغا اور الفانسے ان کے اپنے تخلیق کردہ ہیں۔ لہٰذا ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ ابن صفی نے بھی اپنے سے پہلے مترجمین کی طرح ناول ترجمہ کیے۔ انہوں نے

انگریزی ادب سے مدد ضرور لی اور یہی ان کی فنکارانہ صلاحیت ہے کہ انہوں نے نہ صرف ناقابل فراموش کردار منتخب کیے بلکہ ان کرداروں کے ساتھ پورا پورا انصاف کیا اور انہیں عروج کی اس منزل تک پہنچا دیا کہ وہ کردار اور کہانی بھی خود انہی کی معراج معلوم ہونے لگی۔

(۲)۔ابن صفی کے ناولوں کی ایک اور خصوصیت سادگی ہے۔ انہوں نے اپنے ناولوں میں سادہ نثر کا استعمال کیا ہے۔ کہیں بھی کوئی ایسا لفظ سامنے نہیں آتا جو قاری کے لیے مشکل پیدا کرے۔ بلکہ کم پڑھے لکھے لوگ بھی ان کے ناول بہت آسانی اور پسندیدگی سے پڑھتے تھے ان کے ناولوں میں سلاست و سادگی کی امثال جا بجا نظر آتی ہیں بلکہ ان کے ناول مرقع سلاست و سادگی ہیں۔ چند مثالیں درج کرتا ہوں جس سے ان کی سادہ اور سلیس نثر کا اندازہ بخوبی ہوتا ہے۔

''سارے گھر میں ایک عجیب سی ماتمی فضا طاری تھی۔ قصبے کے تھانے پر اطلاع ہو گئی تھی اور اس وقت ایک سب انسپکٹر اور دو ہیڈ کانسٹیبل مقتولہ کے کمرے کے سامنے بیٹھے سرگوشیاں کر رہے تھے۔ خادمہ کے بیان پر انہوں نے اپنی تشویش کے گھوڑے دوڑانے شروع کر دیے تھے۔ ان کے خیال میں وہی پراسرار آدمی قاتل تھا جو رات کو باغ میں ٹہلتا ہوا پایا گیا تھا اور سیتا دیوی رات میں اسی سے جھگڑا کر رہی تھیں۔ ڈاکٹر شوکت ان کی بحثوں سے قطعی غیر مطمئن تھا۔ جیسے جیسے وہ اپنی تجربہ کاری کا اظہار کر رہے تھے اس کا غصہ بڑھتا جا رہا تھا۔

(جاسوسی دنیا نمبر ا۔ (دلیر مجرم)

''کرنل ضرغام کے دونوں بھتیجے انور اور عارف ریلوے اسٹیشن پر ٹرین کی آمد کے منتظر تھے۔ محکمہ سراغرسانی کے سپرنٹنڈنٹ کیپٹن فیاض نے ان کے چچا کی درخواست پر ایک آدمی بھیجا تھا' جسے لینے کے لیے وہ اسٹیشن آئے تھے۔ گاڑی ایک گھنٹہ لیٹ تھی' ان دونوں نے بھی کیپٹن فیاض کا تار دیکھا تھا اور آنے والے کے متعلق سوچ رہے تھے۔

(عمران سیریز۔ نمبر ۲۔ چٹانوں میں فائر)

''وزنی تھیلا اس نے کاندھے سے اتار کر زمین پر رکھ دیا تھا اور جنگل کی تاریک فضا میں دریا کے دوسرے کنارے تک دیکھنے کی کوشش کرنے لگا تھا۔ اسے نہ تو دریا کی گہرائی کا اندازہ تھا اور نہ ہی اس کا علم تھا کہ دریا کس قسم کی بلاؤں سے پر ہوگا۔ ویسے اسے پہلے ہی بتا دیا گیا تھا کہ دریا میں سفر کرنے کا ذریعہ درختوں کے وہ بڑے تنے ہی ہو سکیں گے جنہیں کاٹ کاٹ کر دریا میں اس لیے ڈال دیا جاتا ہے کہ وہ دریا میں بہتے ہوئے ڈھلان کے میدانوں تک پہنچ جائیں جہاں انہیں تعمیراتی کاموں میں لایا جاتا تھا۔''

(شکرال سیریز ''شمال کا فتنہ' ماہنامہ ''نیا رخ'' نومبر ۱۹۸۰ء صفحہ ۶۲)

میں نے صرف انہی تین مثالوں پر اکتفا کیا ہے اگرچہ ابن صفی کے ہر جاسوسی ناول میں اس طرح کی بے شمار مثالیں موجود ہیں۔ یہی وہ سادہ اور سلیس نثر ہے جس کی وجہ سے کم پڑھے لکھے لوگ بھی ان کی نثر کو سمجھ لیتے تھے اور اسی وجہ سے وہ عوام میں اتنے مقبول ہوئے کہ انہیں ''جاسوسی ناول کا بانی'' کہلانے کا شرف

حاصل ہوا۔

اسی سادہ، سلیس اور دل نشین نثر کی بدولت وہ اپنے سے پیشتر اور بعد کے جاسوسی ناول نگاروں میں امتیازی حیثیت کے حامل ہیں۔ جس طرح حضرت گنج بخش کے لیے کہا جاتا ہے کہ ''ناقصاں راپیر کامل، کاملاں رارہنما'' یہی مثال ابن صفی پر اپنے سے پہلے اور بعد کے جاسوسی ناول نگاروں کے لیے مصداق آتی ہے۔ وہ حقیقتاً نوآزموزوں کے لیے پیر کامل اور مکمل ناول نگاروں کے لیے رہنما کی حیثیت رکھتے تھے اور رکھتے ہیں۔ لہٰذا اسلاست اور سادگی ہی وہ عنصر ہے جس کی بنا پر انہیں شہرت دوام حاصل ہوئی اور انہی کی وجہ سے جاسوسی ناول نگاری نے اردو ادب میں اپنا علیحدہ مقام بنایا۔

(۳)۔ ابن صفی کے جاسوسی ناولوں کی ایک اور خصوصیت جس نے انہیں شہرت کے آسمان کی بلندیوں تک پہنچا دیا ان کے ناولوں کا مشرقی رنگ ہے۔ اگر چہ موقع محل اور ضرورت کے تحت ان کے ناولوں میں غیر مشرقی رنگ بھی ملتا ہے مگر بحیثیت مجموعی ہمیں ان کی ہر جاسوسی تحریر میں خالص مشرقی رنگ کی حکمرانی نظر آتی ہے۔ جس کا ٹھوس ثبوت درج ذیل امثال ہیں۔

''وہ اس وقت ایک دیہی علاقے میں کھڑے ہوئے تھے۔ جو شہر سے زیادہ دور نہ تھا۔ یہاں بس یہی ایک عمارت اتنی بڑی تھی ورنہ یہ بستی معمولی قسم کے کچے، پکے مکانوں پر مشتمل تھی۔ اس عمارت کی بناوٹ طرز قدیم سے تعلق رکھتی تھی۔ چاروں طرف سرخ رنگ کی لکھوری اینٹوں کی کافی بلند دیواریں تھیں اور سامنے ایک بہت بڑا پھاٹک تھا جو غالباً صدر دروازے کے طور پر استعمال کیا جاتا ہوگا۔''

(عمران سیریز۔ نمبرا۔ خوفناک عمارت)

''اس چھوٹے سے گڑھے میں دنیا آباد ہے..... کہیں کٹورے کھنک رہے ہیں، لکھنو کے بانکے ہتھیار لگائے آئینہ بند ادھر ادھر مستیاں کرتے پھر رہے ہیں۔ مدک، چرس اور گانجے کی دکانوں پر کافی بھیڑ ہے۔''

(جاسوسی دنیا ''احمقوں کا چکر'')

یہ مشرقی انداز ان کی ہر تحریر میں جھلکتا نظر آتا ہے اور یہ خالصتاً طبع زاد ناول کا طرہ امتیاز ہے۔ انگریزی سے جو ناول اردو میں ترجمہ ہوئے، ان کی اصل انگریزی ہونے کی وجہ سے ان میں مشرقی رنگ مفقود ہے اور یہی ان میں بڑی خامی ہے۔ یہ بات درست ہے کہ ناول کی صنف بھی اردو میں انگریزی سے آئی ہے لیکن جتنے ناول لکھے گئے جو مشہور ہوئے، طبع زاد تھے۔ ڈپٹی نذیر احمد سے فضل کریم فضلی تک جن مصنفین کے ناولوں نے شہرت دوام حاصل کی وہ سب طبع زاد ناول ہیں۔ اگر چہ اس دوران دوسری زبانوں سے ناول ترجمہ بھی ہوئے مگر وہ شہرت اور پسندیدگی حاصل نہ کر سکے جو ان طبع زاد ناولوں کو حاصل ہوئی۔ ان تراجم کی ناکامی کی بڑی وجہ مشرقی رنگ کا مفقود ہونا ہے۔ اور یہی کچھ جاسوسی ناول کے ساتھ بھی پیش آیا اور جب ابن صفی نے طبع زاد جاسوسی ناول کی بنیاد رکھی تو ان کی تحریر کی ایک خصوصیت مشرقی انداز تھا جس کی وجہ سے ان کے ناولوں کو شہرتِ دوام حاصل ہوئی اور وہ جاسوسی ادب کے بانی کہلانے کے حقدار ثابت ہوئے۔

(۴)۔ان کے ناولوں کی شہرت کی ایک اور اہم وجہ عوام میں ان کی نثر کی پسندیدگی ہے۔نثر سے میری مراد جاسوسی ناول نگاری ہے۔عوام میں ان کی پسندیدگی کا یہ عالم تھا کہ ''دلیر مجرم'' جوان کا پہلا ناول تھا' اس کے بعد ہر ماہ ہر شہر کے بازار میں کتابوں کی دکانوں کے سامنے ان کے ناول حاصل کرنے کے لیے قطاریں لگ جاتیں اور ہر نیا آنے والا ناول ہاتھوں ہاتھ بک جاتا۔یہ عوام میں ابن صفی کی پسندیدگی کی ایک ادنیٰ مثال ہے۔ان کی عوام میں پسندیدگی کی ایک اور مثال ملاحظہ فرمایئے۔خود ابن صفی فرماتے ہیں۔

''مجھ سے کوئی سلیم جعفری (ایک وسیع النظر صحافی اور باصلاحیت ٹی وی آرٹسٹ) یہ نہ کہتا کہ صفی صاحب' اردو میری مادری زبان نہیں ہے لیکن آپ جو یہ محاورہ اردو مجھ سے سن رہے ہیں' آپ ہی کی کتب کے مطالعے کی مرہون منت ہے۔'' (ماہنامہ ''نیارخ'' ابن صفی نمبر اگست ۱۹۸۱ء صفحہ ۸۷)

بقول ابن صفی اس قسم کے خطوط انہیں سندھ' سرحد اور بلوچستان سے بھی موصول ہوتے جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ ابن صفی عوام میں اتنے مقبول تھے کہ لوگ صرف ان کے ناول پڑھنے کے لیے اردو زبان سیکھتے۔ چند مثالیں اور ملاحظہ فرمایئے۔روزنامہ انقلاب کے مطابق ایک عام اردو داں ممکن ہے کہ راشٹر پتی کا نام بتانے سے ناکام رہے مگر جب آپ اس سے ابن صفی کے بارے میں پوچھیں گے تو وہ آپ کو ابن صفی کے مقام سے ضرور متعارف کرادے گا۔یہ ثبوت ہے ابن صفی کی مقبولیت کی معراج کا۔''

(ماہنامہ ''نئے افق'' ابن صفی نمبر اگست ۱۹۸۱ء صفحہ ۱۱۳)

مندرجہ بالا امثال سے یہ بات اچھی طرح روشن ہو جاتی ہے کہ ابن صفی کو عوام میں وہ مقام حاصل تھا جو شاید اس سے قبل کسی مصنف کو حاصل نہ رہا ہو۔ان کی مقبولیت نے ان حدوں کو چھولیا تھا جس سے آگے دیوانگی اور دلی لگاوٹ کی انتہا کی حد شروع ہوتی ہے اور یہ حقیقت بھی ہے کہ ان کے بہت سے قاری انہیں دیوانگی کی حد تک چاہتے اور ان کی تحریروں کو پسند کرتے تھے۔کیا یہ ان کی مقبولیت کا ایک روشن پہلو نہیں کہ ریڈنگ لائبریری کا رواج برصغیر میں پہلی بار ابن صفی کی وجہ سے ہوا۔یقیناً صرف ان کے جاسوسی ناولوں ہی کی وجہ سے برصغیر میں جدید ریڈنگ لائبریریوں کا رواج پڑا جو آج ہر شہر کے ہر گلی محلے میں موجود ہیں اور انہی لائبریریوں میں جاسوسی کے علاوہ دوسرا ادب بھی کھپ جاتا ہے۔

کیا یہ بھی ابن صفی کی تحریروں کی معراج کا بین ثبوت نہیں کہ اردو کے ایک نامور نقاد احتشام حسین (مولف داستان اردو) کی ذاتی لائبریری میں ابن صفی کے جاسوسی ناولوں کے لیے ایک الگ الماری مخصوص تھی۔اتنی شہرت' اتنی بلندی' ایسی معراج اس سے پہلے اور بعد میں اردو ادب میں کسی اور مصنف کی تحریروں کو حاصل نہ ہوسکی۔میرامن بھی گزرے اور مشہور ہوئے' رجب علی بیگ سرور نے بھی تاریخ ادب پر انمٹ نقوش چھوڑے مرزا غالب نے بھی '' کہتے ہیں کہ غالب کا ہے انداز بیاں اور'' کے مصداق اردو ادب میں بلند مقام حاصل کیا۔ڈپٹی نذیر احمد ناول نگاری کے بانی کہلائے اور ایک مخصوص طبقے تک مقبول ہوئے۔مولانا عبدالحلیم شرر کے ناول آج بھی بہت مقبول ہیں۔منشی پریم چند کا قد بھی ادب میں بہت بلند نظر آتا ہے اور مولوی عبدالحق

نے بھی اپنی زندگی اردو کے لیے وقف کر کے اپنا نام زندہ جاوید بنالیا۔ مگر ان سب کے مقابلے میں ابن صفی کا نام اور مقام پھر بھی اتنا اونچا نظر آتا ہے کہ کوئی اس تک اپنا ہاتھ نہیں پہنچا سکتا۔ یہ ہے ابن صفی کی معراج اور مقبولیت۔

یہ بھی ابن صفی کی معراج ہے کہ ان کے ناول بڑے بڑے ریکوں میں تو نہیں سجتے مگر لوگوں کے تکیوں کے نیچے ضرور ملتے ہیں۔ ابن صفی کے دوست، دشمن، اجنبی، جان پہچان والے، عوام و خواص غرضیکہ سب ابن صفی کی تحریروں کے قائل ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ زبان سے اس کا اظہار نہ کریں اور نہ قلم سے مگر ہر رات سونے سے قبل وہ ابن صفی کے ناول پڑھنا ضروری سمجھتے ہیں کہ یہ ان کے لیے ایک اکسیر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ بات خود ابن صفی کی زبانی سنیے۔

''ہوسکتا ہے میری کتابیں الماریوں کی زینت نہ بنتی ہوں لیکن تکیوں کے نیچے ضرور ملیں گی۔ ہر کتاب بار بار پڑھی جاتی ہے۔''

(ماہنامہ ''نیا رخ'' ابن صفی اگست ۱۹۸۱ء صفحہ ۸۷)

مندرجہ بالا امثال اور بحث کی روشنی میں یہ بات بالاتفاق کہی جاسکتی ہے کہ ابن صفی کو عوام کے جذبات کی ترجمانی کا ملکہ حاصل تھا اور اسی وجہ سے وہ لوگوں میں اس قدر مقبول تھے کہ ہر شخص رات کو سونے سے قبل ان کا ناول پڑھنا ضروری اور صحت مند تفریح سمجھتا ہے۔ کیا یہی ایک عنصر جاسوسی ادب کے بانی کہلانے کے لیے کافی نہیں۔ ڈپٹی نذیر احمد نے داستانوں کے عروج کے زمانے میں معاشرتی اصلاحی ناول لکھے اور بہت مقبول ہوئے اور پھر ان کی تقلید میں ناولوں کا دور شروع ہوگیا۔ اس لیے وہ ناول کے بانی کہلائے۔ منشی پریم چند نے اپنے افسانوں سے شہرت دوام حاصل کی اور اپنی تقلید کے لیے اپنے موخرین کو نفسیاتی طور پر مجبور کیا اور افسانے کے بانی کہلائے۔ یہی بات ابن صفی پر صادق آتی ہے بلکہ ابن صفی نے تو ایسی شہرت حاصل کی کہ کوئی روشنی ان کی مقبولیت کی شمع کے آگے ٹھہر نہ سکی۔ جو دیا جلا اسے ابن صفی کی شہرت کے چراغ نے ماند کر دیا۔ اور ان کی تقلید یہاں تک کی گئی کہ طبع زاد کرداروں پر بہت کم اور ابن صفی کے تخلیق کردہ کرداروں پر بہت زیادہ ناول لکھے گئے۔ کیا یہ ابن صفی کی معراج اور اولیت نہیں کہ انہوں نے نفسیاتی طور پر اپنے موخرین کو اس پر مجبور کر دیا کہ وہ جاسوسی ناول لکھیں بلکہ یہاں تک عادی اور مجبور کر دیا کہ وہ ابن صفی کے کرداروں سے آگے سوچ ہی نہ سکے۔ یہ ہے ابن صفی کی عوام میں مقبولیت جس کی بنا پر وہ اردو میں جاسوسی ناول کے بانی کہلانے کے صد فی صد حقدار ہیں۔

(۵)۔ ابن صفی کے جاسوسی ناولوں کی ایک اور اہم خصوصیت جو انہیں اپنے ہم عصر اور موخرین سے ممتاز کرتی ہے مضبوط اور مکمل پلاٹ ہے۔ وہ کہانی کا تانا بانا اس طرح بنتے ہیں کہ کہیں بھی جھول نظر نہیں آتا۔ میں نے ابن صفی سے پہلے اور بعد کے چند جاسوسی ناول پڑھے تو مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میں کسی پرائمری کے بچے کی لکھی ہوئی کوئی تحریر پڑھ رہا ہوں۔ کسی ناول میں جاسوسی کی چھاپ تو ہے مگر جاسوسی کا کہیں دور دور تک

بھی پتہ نہیں اور کسی ناول میں اس کے بالکل برعکس ہر صفحے پر ہیرو یا مرکزی کردار کو لڑائی در لڑائی میں مشغول دکھایا گیا ہے۔ کہیں اس طرح کا جھول نظر آتا ہے کہ جو بات شروع میں کسی کردار نے کہی وہ آگے جا کر غلط انداز میں ظاہر کی گئی۔ ہر مقام اور ہر موقع پر مرکزی کردار کو کسی لڑائی یا مصیبت میں گرفتار دکھایا گیا ہے اور ہنگامے در ہنگامے کی عبارت کو جاسوسی ناول کا نام دے دیا گیا۔ ابن صفی اس جگہ فرماتے ہیں۔

''اصل میں انگریزی کی اسپائی اسٹوریز پر مبنی فلموں نے بعض پڑھنے والوں کا ٹیسٹ بگاڑ دیا ہے۔..... اوپر ہوائی جہاز نیچے توپیں..... دائیں سمندر بائیں آتش فشاں، کبھی وہ بموں سے بچتا ہے، کبھی توپوں کے گولوں سے..... توپیں چلیں اور وہ دھم سے گر پڑا..... ارض وسما..... سمجھے شاید قصہ پاک ہوا لیکن..... یہ کیا؟ اس نے تو ایک توپ کے دہانے پر چھلانگ لگائی تھی اور اس کی دم کی طرف سے نکل کر سمندر میں ایک کشتی میں جا بیٹھا..... توپیں منہ دیکھتی رہ گئیں۔ ہوائی جہازوں نے منہ کی کھائی، آتش فشاں منہ پیٹنے لگا اور قاری کا منہ دیکھنے کے قابل..... لیکن..... وہ ہیرو دوبارہ بھی منہ دکھاتا ہے۔ میں باز آیا..... خدا مجھے معاف کرے اور آپ اس قسم کی فرمائش کرنا چھوڑیے۔

(جاسوسی دنیا نمبر ۱۰۳ ''تباہی کا خواب'' از ابنِ صفی بی اے)

مندرجہ بالا عبارت سے صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ ابن صفی اس قسم کے ہلے گلے اور ہلڑ بازی کو ناپسند کرتے تھے اور حتی الامکان ان سے اپنا دامن بچانے کی کوشش کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے جاسوسی ناول کسی مخصوص طبقہ میں نہیں بلکہ ہر طبقہ، عوام و خواص اور ہر مزاج کے لوگوں میں مقبول ہوئے۔

ایک اور بات کہ انہوں نے بہت سے سیریز وار ناول لکھے ہیں لیکن اگر ہم ان سیریز وار ناولوں کو الگ الگ بھی پڑھیں تو وہ اپنے اندر ایک مکمل کہانی اور پلاٹ کے حامل ہیں۔ اگر ہر ناول کو علیحدہ علیحدہ پڑھا جائے تو بھی ایک مکمل ناول ہے اور اگر ہر ناول کو سیریز وار پڑھا جائے تو بھی تمام ناولوں کا آپس میں ربط وضبط بہت مضبوط ہے اور یہ ظاہر نہیں ہونے پاتا کہ ہم سلسلہ وار ناول پڑھ رہے ہیں بلکہ سب ناول ایک مرکزی کہانی کے تابع ہونے کی وجہ سے ایک دوسرے سے مربوط نظر آتے ہیں۔ اس طرح اگر ہم ان کے سلسلہ وار ناول کو علیحدہ علیحدہ پڑھیں تو وہ ایک مکمل کہانی ہے اور اگر دوسرے سلسلہ وار ناولوں کے ساتھ پڑھیں تو لطف اور احساس ربط کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ یہی وہ خصوصیت ہے جس کی وجہ سے وہ اپنے معاصرین میں ایک بلند مقام کے حامل ہیں اور جاسوسی ادب کے بانی کہلانے کے سو فیصد حقدار ہیں۔ ان کی گرفت پلاٹ پر اتنی مضبوط ہوتی ہے کہ کہیں بھی کوئی بات تشنہ نہیں رہتی اور نہ ہی قاری کو کوئی بات نامانوس نظر آتی ہے۔ یہ خصوصیت کسی اور جاسوسی ناول نگار میں نظر نہیں آتی۔ اس سلسلے میں میں امثال سے گریز کروں گا کیونکہ ابن صفی کے ناول اس قسم کی امثال کے مرقع ہیں۔ اور دوسرے ناول نگاروں کی تحریریں اس قسم کے نامکمل پلاٹ اور انداز سے بھری ہوئی ہیں۔ اس سلسلے میں امثال کی ضرورت پیش بھی نہیں آئے گی۔ قارئین خود ہی اس بات کا اندازہ بخوبی لگا سکتے ہیں۔ ابن صفی اور کسی اور مصنف کی صرف ایک ایک جاسوسی تحریر پڑھ لینے کے بعد

قاری اس قابل ہو جائے گا کہ مجھ سے صد فیصد متفق ہو جائے۔

(٦)۔ ہر تحریر میں کوئی نہ کوئی مقصد ضرور پوشیدہ ہوتا ہے اور خاص کر افسانوی ادب کی تخلیق میں کوئی نہ کوئی سیاسی، معاشی، معاشرتی مذہبی یا تفریحی، عنصر ضرور شامل ہوتا ہے جو اس تخلیق کی اساس اور باعث بنتا ہے۔ یہ بات ابن صفی کے ناولوں کی ایک خصوصیت ہے کہ ان کے ناولوں میں کئی عنصر شامل ہوتے تھے۔ بنیادی طور پر انہوں نے قانون کا احترام اور اس کی پابندی کی ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے جاسوسی ناول کی تخلیق کی لیکن اس عنصر کے ساتھ ساتھ ان کے ناول معاشرتی رنگ کی بھی نمائندگی کرتے ہیں۔ ہم ان کے ناولوں کو بیک وقت جاسوسی اور معاشرتی ناول کہہ سکتے ہیں۔ ابن صفی اس عنصر کی طرف اشارہ کرتے ہیں جس نے انہیں جاسوسی ناول لکھنے پر مجبور کیا۔

''میں سوچتا..... سوچتا رہا۔ آخر کار اس نتیجے پر پہنچا کہ آدمی میں جب تک قانون کے احترام کا سلیقہ نہیں پیدا ہوگا' یہی سب کچھ ہوتا رہے گا۔ یہ میرا مشن ہے کہ آدمی قانون کا احترام کرنا سیکھے۔ جاسوسی ناولوں کی راہ میں نے اسی لیے منتخب کی تھی۔ تھکے ہارے ذہنوں کو تفریح بھی مہیا کرتا ہوں اور انہیں قانون کا احترام کرنا بھی سکھاتا ہوں۔''

ماہنامہ ''نیا رخ'' ابن صفی نمبر اگست ۱۹۸۱ء صفحہ ۸۳)

قانون کا احترام سکھانے کے جذبے کے بیان کے ساتھ ہی ابن صفی ان حالات کا بھی ذکر کرتے ہیں جن کی وجہ سے ان کے دل میں لوگوں کو قانون کا احترام سکھانے کا جذبہ پیدا ہوا۔ فرماتے ہیں۔

''۱۹۴۷ء میں جو کچھ ہوا اس نے میری پوری شخصیت کو تہ و بالا کر کے رکھ دیا۔ سڑکوں پر خون بہہ رہا تھا اور عالمی بھائی چارے کی باتیں کرنے والے سوکھے اپنی پناہ گاہوں میں دبکے ہوئے تھے۔''

مندرجہ بالا اقتباسات میں ابن صفی مرحوم نے وہ وجہ بیان کی ہے جو ان کی جاسوسی ناول نگاری کی اساس بنی اور پھر ان حالات کا ذکر بھی کیا جس نے ان کی شخصیت اور ذہن کو تبدیل کر دیا اور انہوں نے شاعری کا لطیف میدان چھوڑ کر جاسوسی ناول کے پرپیچ ریگستان کو منتخب کیا۔ اگر ہم بغور جائزہ لیں تو ان اقتباسات میں ابن صفی نے اپنے جاسوسی ناولوں کے آفاقی پیغام اور اس کی وجوہات کا ذکر کیا ہے۔ قانون کا احترام ان کے ناولوں کا بنیادی مقصد اور ایک مخصوص آفاقی پیغام ہے جسے لوگوں تک پہنچانے کے لیے انہوں نے اس میڈیا کا انتخاب کیا اور وہ اس میں صد فی صد کامیاب رہے بقول ان کے۔ ''میں نے اپنے لیے ایسے میڈیم کا انتخاب کیا ہے کہ میرے افکار زیادہ سے زیادہ افراد تک پہنچ سکیں۔ ہر طبقے میں پڑھا جاؤں اور بحمد اللہ میں اس میں کامیاب ہوا ہوں۔''

ماہنامہ ''نیا رخ'' ابن صفی نمبر اگست ۱۹۸۱ء صفحہ ۸۷)

مگر اس کے ساتھ یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ انہوں نے اپنے اس مقصد کے لیے نصیحت کا استعمال نہیں کیا بلکہ کہانی کے دلچسپ پیرائے میں اپنا پیغام لوگوں تک اس طرح پہنچایا ہے کہ وہ لاشعوری طور پر بھی

ان کی ہمدردیاں قانون کے محافظوں کے ساتھ ہوں۔ اگر ہم ابن صفی کے ناولوں کی اس خصوصیت کا ان سے پہلے اور بعد کے جاسوسی ناول نگاروں کی تحریروں سے مقابلہ کریں تو یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہو کر ہمارے سامنے آتی ہے کہ دوسرے ناول نگاروں کا پیغام اور بنیادی مقصد وہ نہیں تھا جو ابن صفی مرحوم نے اپنے ناولوں میں پیش کیا۔ انہوں نے تو بس ابن صفی کی تقلید کی ہے ناول کی حد تک۔ لیکن غور کرنے پر ہم ان کی تحریروں کو ناول کا نام بھی نہیں دے سکتے۔ کیونکہ ناول کے اجزائے ترکیبی میں سے کوئی ایک بھی ان کی تحریروں میں نظر نہیں آتا۔

مندرجہ بالا بحث سے یہ بات ثابت کرنا مقصود تھا کہ ابن صفی کو اپنے ہمعصر جاسوسی ناول نگاروں میں اس آفاقی پیغام کی نسبت سے امتیازی حیثیت حاصل ہے جو ان کے ناولوں کا طرہ امتیاز ہے۔ مگر دوسرے جاسوسی ناول نگاروں کی تحریروں میں مفقود ہے۔ ابن صفی نے اپنے جاسوسی ناولوں کے ذریعے قانون کا احترام سکھانے کی جو کوشش کی ہے وہ کسی اور مصنف کے حق میں نہیں جاتی اور یہی ابن صفی کا امتیاز اور خصوصیت ہے جس کی وجہ سے وہ جاسوسی ادب کے بانی کہلانے کے حق دار ہیں۔

(۷)۔ بیان نگاری کسی بھی نثری تخلیق کے لیے اکسیر اور کامیابی کی ضمانت ہوتی ہے۔ بیان نگاری کی بدولت ناول کو کامیابی اور ناکامی سے ہمکنار ہونا پڑتا ہے۔ جو مصنف ناول نگاری کے اس عنصر کو اپنے ناولوں میں بخوبی اور بھرپور انداز سے پیش کر سکے وہ ادب کے میدان میں کامیابی سے ہمکنار ہوتا ہے۔ بیان نگاری ناول نگاری کا ایک ایسا ضروری عنصر ہے جس کے بغیر یا جس کے ناقص استعمال سے ناول کی آرائش اور خوبصورتی متاثر ہوتی ہے۔ بیان نگاری کا عنصر ابن صفی کے جاسوسی ناولوں میں بہت اچھے پیرائے میں استعمال کیا گیا ہے۔ ابن صفی نے اس عنصر کو اپنے ناولوں میں اس موثر انداز سے استعمال کیا ہے کہ کوئی مشکل سے ہی ان تک پہنچ سکے گا۔ کسی جگہ کا بیان جذبات' صفات' کردار' بائیوگرافی یا اسی طرح کے دوسرے بیانات سے ناول کا تسلسل ٹوٹنے کا خطرہ ہوتا ہے۔ وہ اس صورت میں جب مصنف کو اپنا قلم صحیح طریقے پر استعمال کرنا نہ آتا ہو اور وہ ان خیالات واحساسات اور موجودات کا بیان اس کھردرے طریقہ سے کرے کہ قاری ناول کے تسلسل کے ٹوٹنے کے سبب ذہنی انتشار میں مبتلا ہو جائے اور ناول کا سارا حسن اور خوبی دھری کی دھری رہ جائے لیکن اگر مصنف انہی خیالات' احساسات اور موجودات کی دلنشین اور بڑی خوبی سے بیان کرے تو قاری کے ذہن میں نہ ہی ناول کا تسلسل ٹوٹنے کا خیال آتا ہے اور نہ ہی وہ بور ہوتا ہے بلکہ ناول کی دلکشی ودلنشینی میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے۔ ابن صفی دوسرے قسم کے مصنفین میں سے تھے جن کی تحریروں سے بیان نگاری کی یہ چاشنی اور دلکشی واضح طور پر محسوس کی جاسکتی ہے۔ چند مثالیں پیش کرتا ہوں۔ "یہ تیسرا آدمی فریدی کا نیا اسسٹنٹ سب انسپکٹر واجد تھا۔ چھبیس' ستائیس سال کا یہ بلند و بالا جوان ٹیکم گڑھ سے تبدیل ہو کر امر سنگھ کی جگہ پر کرنے آیا تھا۔ حمید کی موجودگی ہی میں اس نے اپنے کاغذات کرنل فریدی کے سامنے پیش کیے تھے۔"

''حمید چونک کر اسے گھورنے لگا تھا کیونکہ خود اس کے علاوہ فریدی کے سامنے اس طرح زبان کھولنے کی جرات اور کسی میں نہیں تھی پھر اس سے بھی زیادہ حیرت اسے فریدی کے رویے پر ہوئی تھی۔ اس نے مسکرا کر سر کو جنبش دی تھی اور اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا تھا...... حمید بوکھلا کر کبھی ایک کی شکل دیکھتا تھا اور کبھی دوسرے کی۔ اور پھر ایک ہفتے تک وہ یہی سمجھتا رہا کہ واجد کے روپ میں کوئی بدروح فریدی پر حملہ آور ہوئی ہے۔''

''سردی اتنی شدید تھی کہ اس کی ناک سن ہو کر رہ گئی تھی جسے وہ بار بار ہتھیلی سے رگڑنے لگتا تھا۔ برفباری بدستور جاری تھی۔''

(جاسوسی دنیا نمبر ۱۰۶ ''خونی ریشے'' ابن صفی بی اے)

''جولیانا فٹز واٹر نے کن انکھیوں سے دیکھا! وہ موٹا چینی اسے اب بھی گھورے جا رہا تھا۔ چھوٹے قد کا بھاری بھرکم آدمی تھا' چہرہ گول' آنکھوں اور ناک کی بناوٹ ایسی ہی تھی جیسی عام طور پر چینیوں کی ہوتی ہے۔ عمر چالیس اور پچاس کے درمیان رہی ہوگی' جسم پر عمدہ تراش کا سوٹ تھا۔''

''اس نے سوچا...... اور یکلخت اس کی طرف مڑ گئی اور وہ کچھ اس طرح جھجکا جیسے اچانک کسی قسم کا ذہنی جھٹکا لگا ہو اب جولیا اسے خونخوار نظروں سے گھور رہی تھی اور وہ آنکھیں چرا رہا تھا۔''

(خاص شمارہ عمران سیریز ''جونک کی واپسی'' ابن صفی بی اے)

''اس انتخاب کی وجہ شرجیل کی غیر معمولی طاقت اور فنون سپہ گری میں مہارت تھی لیکن شرجیل نے یہ سفر سرخسان کے سردار کے بیٹے کی حیثیت سے نہیں شروع کیا تھا بلکہ اپنے بارے میں دوسروں کو یہی بتاتا آیا تھا کہ وہ چوبی مکانات بنانے کا ماہر ہے اور سرحد کے اس علاقے میں جانا چاہتا ہے جہاں ان دنوں چوبی مکانات کی تعمیر بڑے زور و شور سے جاری ہے۔''

''شرجیل اپنی گردن سہلا کر رہ گیا لیکن وہ اس طرح ان لوگوں کی طرف متوجہ نہیں تھا' جیسے اسے بھی ان لوگوں کی باتوں سے کسی قسم کی دلچسپی ہو شرجیل سوچ رہا تھا کہ وہ ایک بے حد ذہین لڑکی معلوم ہوتی ہے۔''

(شکرال سیریز ''شمال کا فتنہ'' بحوالہ ماہنامہ نیا رخ۔ نومبر ۱۹۸۰ء۔ صفحہ ۶۴۔ ۷۱)

مندرجہ بالا مثالوں سے یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ ابن صفی کی بیان نگاری اس درجہ سادہ اور دلکش ہوتی ہے کہ قاری کو ناول کا حسن اور بھی زیادہ بڑھا ہوا لگتا ہے۔ یہ خوبی ان کے ناولوں میں تو رچی بسی ہوئی ہے مگر دوسرے جاسوسی ناول نگاروں کی تحریروں میں اس خوبصورتی سے بیان نگاری نہیں ہے۔ یہی امتیاز بن گیا ابن صفی اور دوسرے ناول نگاروں کی تحریروں میں اور اسی امتیاز کے پیش نظر ہم ابن صفی کو بلا مبالغہ اردو کے جاسوسی ادب کا بانی تسلیم کر سکتے ہیں۔

(۸)۔ ابن صفی کے ناولوں کی ایک اہم ترین خصوصیت مزاح کا عنصر ہے۔ انہوں نے اپنی تحریروں میں مزاح کو اس حد تک داخل کیا کہ نہ تو آدمی اس سے اکتا جاتا ہے اور نہ ہی جاسوسی ناول پر مزاحیہ تحریر کا گمان ہوتا ہے۔ کسی مشہور آدمی کا قول ہے کہ ہنسی غم کا علاج ہے۔ یہی مقولہ ذہن میں رکھ کر غالباً ابن صفی نے اپنی جاسوسی

تحریروں میں مزاح کو بھی شامل کرلیا۔ یہ بات خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ جاسوسی خالص خشک اور سنجیدہ احساست کا نام ہے اوراس میں مزاح کا پیوند خوبصورت اور مناسب طریقے سے لگانا کسی منجھے ہوئے ناول نگار کا کام ہے۔ یہ کام ابن صفی نے اس خوبصورتی سے انجام دیا ہے کہ ناول کا تسلسل اور مقصد بھی مجروح نہیں ہوتا اور قاری کو اچھا اور صاف ستھرا خالص مزاح بھی حاصل ہو جاتا ہے۔ ابن صفی کی تحریروں میں یہ عنصر ہر ناول کی سطر سطر میں پھیلا ہوا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ مزاح کی وجہ سے ہی کئی قارئین ابن صفی کا ناول پڑھتے ہیں۔ اگر ہم بغور جائزہ لیں تو ابن صفی ہمیں ایک ناول نگار کے ساتھ ساتھ ایک معتبر اور اچھے قسم کے مزاح نگار بھی نظر آتے ہیں۔ اپنے بیان کی صداقت میں چند اقتباسات درج کرتا ہوں جنہیں پڑھ کر یقیناً قارئین میرے بیان سے اتفاق کریں گے۔

''ہاں' اور ہمیشہ نرم آنچ پر بھونو۔'' عمران بولا۔ ''کفگیر کو اس طرح دیگچی میں نہ ہلاؤ کہ کھنک پیدا ہو اور پڑوسیوں کی رال ٹپکنے لگے۔'' کیپٹن فیاض کی موٹر سائیکل فراٹے بھر رہی تھی اور عمران کیریئر پر بیٹھا بڑبڑاتا جارہا تھا۔ ''شلوار کا لٹھا بوسکی کی قمیص...... شلوار کا بوسکا...... لٹھی لٹھی...... گیا تھا...... لاحول ولاقوۃ بھول گیا...... روکو...... یار روکو' شاید'' فیاض نے موٹر سائیکل روک دی۔ ''بھول گیا'' عمران بولا۔ ''کیا بھول گئے؟'' کچھ غلطی ہوگئی۔'' ''کیا غلطی ہوگئی؟'' فیاض جھنجلا کر بولا۔ ''یار کم از کم مجھے تو نہ الو بنایا کرو۔'' شاید میں غلط بیٹھا ہوا ہوں۔'' عمران کیریئر سے اترتا ہوا بولا۔ ''جلدی ہے یار'' فیاض نے گردن جھٹک کر کہا۔ عمران اس کی پیٹھ سے پیٹھ ملاتے ہوئے دوسری طرف منہ کر کے بیٹھ گیا۔'' ''یہ کیا؟'' فیاض نے حیرت سے کہا۔ ''بس ٹھیک ہے چلو۔'' خدا کی قسم تنگ کر ڈالتے ہو۔'' فیاض اکتا کر بولا۔

''کون سی مصیبت آ گئی۔'' عمران بھی جھنجلاتے ہوئے بولا۔ ''مجھے بھی تماشا بناؤ گے۔ سیدھے بیٹھو' نا۔''

''تو کیا میں سر کے بل بیٹھا ہوا ہوں؟''

''مان جاؤ پیارے۔'' فیاض خوشامدانہ لہجے میں بولا۔ ''لوگ ہنسیں گے ہم پر۔''

''تو بڑی اچھی بات ہے۔''

''منہ کے بل گرو گے سڑک پر۔''

''اگر تقدیر میں یہی ہے تو بندہ بے بس و ناچار ہے۔'' عمران نے درویشانہ انداز میں کہا۔ ''خدا سمجھے تم سے'' فیاض نے دانت پیس کر موٹر سائیکل اسٹارٹ کر دی۔ اس کا منہ پچھّم کی طرف تھا اور عمران کا پورب کی طرف اور عمران اس طرح آگے کی طرف جھکا ہوا بیٹھا تھا جیسے وہ خود ہی موٹر سائیکل چلا رہا ہو۔ راہ گیر انہیں دیکھ دیکھ کر ہنس رہے تھے۔ ''دیکھا' یاد آ گیا نا'' عمران چہک کر بولا۔ ''شلوار کا لٹھا اور قمیص کی بوسکی۔ میں پہلے ہی کہہ رہا تھا کہ کوئی غلطی ہوگئی ہے۔''

''عمران تم مجھے احمق کیوں سمجھتے ہو۔'' فیاض نے جھنجلا کر کہا۔ ''کم از کم میرے سامنے تو اس خبطی پن سے باز آ جایا کرو۔'' ''تم خود ہو گے خبطی۔'' عمران برا مان کر بولا۔

''آخر اس ڈھونگ سے فائدہ؟''

''ڈھونگ...... ارے کمال کر دیا۔ اف فوہ اس لفظ ڈھونگ سے مجھے وہ بات یاد آئی ہے جسے اب سے ایک سال پہلے یاد آنا چاہیے تھا۔'' فیاض کچھ نہ بولا۔ موٹر سائیکل ہوا سے باتیں کرتی رہی۔ ''ہائیں......'' عمران تھوڑی دیر بعد بولا۔ ''یہ موٹر سائیکل پیچھے کی طرف کیوں بھاگ رہی ہے۔ ارے اس کے ہینڈل کو کیا ہوا؟ پھر اس نے بے تحاشا چیخنا شروع کر دیا۔ ہٹو...... بچو...... میں پیچھے کی طرف نہیں دیکھ سکتا۔'' فیاض نے بے بسی سے کہا۔ ''تنگ تم کر رہے ہو یا میں؟ الٹی موٹر سائیکل لیے پھرتے ہو۔ اگر کوئی ایکسیڈنٹ ہو جائے تو؟'' ''چلو بیٹھو۔'' فیاض اسے کھینچ کر بٹھاتا ہوا بولا۔ موٹر سائیکل پھر چل پڑی۔ ''اب تو ٹھیک چل رہی ہے۔'' عمران بڑبڑایا...... آج پھر مجھے تمہاری مدد کی ضرورت محسوس ہوئی ہے۔'' فیاض بولا۔ ''لیکن میں آج کل بالکل مفلس ہوں۔'' عمران نے کہا۔ ''اچھا تو کیا میں تم سے کچھ ادھار مانگنے جا رہا تھا؟'' ''پتا نہیں میں یہی سمجھ رہا تھا۔ ارے باپ رے پھر بھول گیا۔ لٹھ مار کا۔ پائجامہ...... اور قمیص...... لاحول واقوۃ بوسکا...... پلیز شٹ اپ...... عمران...... یوفول۔''

''عمران۔'' کیپٹن فیاض نے اسے مخاطب کیا۔

''اوں ہا......''

''تم آخر دوسروں کو بے وقوف کیوں سمجھتے ہو؟''

''کیوں ہا...... ارے باپ یہ جھٹکے...... یار ذرا چکنی زمین پر چلاؤ۔''

''میں کہتا ہوں کہ اب ساری حماقتیں ختم کر کے کوئی ڈھنگ کا کام کرو۔''

''ڈھنگ...... لو یار...... اس ڈھنگ پر بھی کوئی بات یاد آنے کی کوشش کر رہی ہے۔'' ''جہنم میں جاؤ۔'' فیاض جھلا کر بولا۔

''اچھا......'' عمران نے بڑی سعادت مندی سے گردن ہلائی۔ موٹر سائیکل ایک طویل و عریض عمارت کے سامنے رک گئی۔ جس کے پھاٹک پر تین چار باوردی کانسٹیبل نظر آ رہے تھے۔ ''اب اترو بھی۔'' فیاض نے کہا۔ ''میں سمجھا شاید اب تم مجھے ہینڈل پر بٹھاؤ گے۔'' عمران اترتا ہوا بولا۔ اچانک عمران نے اپنی آنکھوں پر دونوں ہاتھ رکھ لیے اور منہ پھیر کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے ایک لاش دیکھ لی تھی جو فرش پر اوندھی پڑی تھی اور اس کے گرد خون پھیلا ہوا تھا۔ ''اناللہ وانا الیہ راجعون۔'' وہ کپکپاتی ہوئی آواز میں بڑبڑا رہا تھا۔ ''خدا اس کے متعلقین کو جوار رحمت میں جگہ دے اور اسے صبر کی توفیق عطا فرمائے......'' ''میں تمہیں دعائے خیر کرنے کے لیے نہیں لایا یہاں۔'' فیاض جھنجلا کر بولا۔

''تجہیز و تکفین کے لیے چندہ وہاں سے بھی مانگ سکتے تھے۔ آخر اتنی دور کیوں گھسیٹ لائے ہو۔'' ''یار عمران خدا کے لیے بور نہ کرو، میں تمہیں ایک بہترین دوست سمجھتا ہوں۔'' فیاض نے کہا۔ ''میں بھی یہی سمجھتا ہوں مگر پیارے میں پانچ روپے سے زیادہ نہ دے سکوں گا۔ ابھی مجھے...... لٹھی کا بوسکا خریدنا ہے۔

کیا.....لٹھی.....لو یار پھر بھول گیا۔ کیا مصیبت ہے؟''
(عمران سیریز نمبر ا ''خوفناک عمارت'' ابن صفی بی اے)
''تقریباً دو ڈھائی میل چل کر بیل گاڑی برگد کے ایک گھنے درخت کے سائے میں رک گئی اور حمید چاروں طرف دیکھنے لگا۔ اب آپ اس درخت پر چڑھ جایئے جناب۔'' دہقانوں میں سے ایک بولا۔ ''کیوں چڑھ جاؤں' تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا۔'' ''نہیں جناب!'' اس نے بڑی سعادت مندی سے کہا۔ دفعتاً درخت کے اوپر سے آواز آئی۔ ''کیوں بکواس کر رہے ہو۔ اوپر آ جاؤ۔'' اور یہ آواز فریدی کی تھی۔ حمید کے تلوؤں سے لگی اور سر پر بجھی۔ منہ اوپر اٹھا کر دیکھا۔ فریدی ایک بڑی سی مچان پر بیٹھا دکھائی دیا۔ ''یہ پھل دار درخت بھی نہیں ہے پھر آپ اوپر کیا کر رہے ہیں۔'' حمید نے پوچھا۔ ''وقت نہ ضائع کرو' آ جاؤ۔'' حمید نے جھلا کر جوتے اتارے گاڑی سے کودا اور درخت پر چڑھنے لگا۔ مچان پر پہنچ کر اس نے الوؤں کی طرح دیدے نچائے کیونکہ وہاں عجیب قسم کا سامان موجود تھا۔ سامان تو خیر عجیب نہیں تھا لیکن وہاں اس کی موجودگی عجیب لگ رہی تھی۔ ایک طرف ایک بہت وزنی بیٹری رکھی ہوئی تھی اور اس کے ساتھ مائیکروفون بھی تھا۔ ایک جانب دوربین لگی ہوئی رائفل بھی نظر آئی۔ اس کے علاوہ ایک جگہ فیلڈ گلاسز بھی رکھے دکھائی دیے۔ اس تجربے کی تیاری رات بھر ہوتی رہی تھی۔ فریدی بولا۔ ''لیکن یہ بیل گاڑی کہاں جا رہی ہے' اس پر میرے جوتے ہیں۔

''پھر بکواس شروع کر دی۔'' سنجیدگی اختیار کرو۔ حمید نے مائیکروفون اور بیٹری کی طرف اشارہ کر کے پوچھا۔ ''کیا درخت پر چڑھ کر چندہ مانگنے کا تجربہ ہے۔'' فریدی نے دوربین اٹھائی اور ایک جانب دیکھنے لگا اور حمید ہنس کر بولا۔ ''میں سمجھ گیا آس پاس کوئی سوئمنگ پول پایا جاتا ہے۔ شاید آج کی گوپیاں تو دوربین ہی سے دیکھی جائیں گی۔''

''تم بکواس بند نہیں کرو گے۔'' فریدی نے آنکھوں پر سے دوربین ہٹاتے ہوئے کہا۔ ''میں نے کہا تھا کہ تم اس تجربے کا لازمی جزو ہو۔'' ''یعنی خود یہیں بیٹھے رہیں گے اور مجھے گوپیوں کے کپڑے چرانے کے لیے بھیجیں گے۔ نہیں جناب میں دورِ جدید میں اس قسم کا خطرہ مول لینے کو تیار نہیں۔ آج کل کی گوپیاں والدین سمیت سوئمنگ پول میں تیرتی ہیں۔'' ''میں تمہیں اٹھا کر نیچے پھینک دوں گا۔'' ''اور میں انہیں بتا دوں گا کہ اصلی ماکھن چور صاحب درخت پر تشریف فرما ہیں۔'' فریدی نے اس کی گردن دبوچ کر دوربین تھماتے ہوئے کہا۔ ''دیکھو.....ادھر دیکھو۔''
(جاسوسی دنیا نمبر ۱۲۳۔ ''سایوں کا ٹکراؤ۔ ابن صفی بی اے)
ابن صفی کی مزاح نگاری میں ایک قسم کی بے ساختگی ہے قاری کو اس میں کسی قسم کی دماغی کوشش محسوس نہیں ہوتی بلکہ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے قارئین اور ابن صفی کے کردار آپس میں خوش گپیوں میں مصروف ہیں اور ابن صفی کے کردار کسی بات کے جواب میں یہ مزاحیہ باتیں بے ساختگی اور حاضر دماغی و حاضر جوابی سے کر رہے

ہیں۔ انہی مزاحیہ باتوں اور حرکات وسکنات کے بیان سے ابن صفی کے جاسوسی ناول زیادہ مشہور ہوئے یہ تو ایک اٹل حقیقت ہے جیسا کہ میں پہلے بھی بیان کر چکا ہوں کہ جاسوسی یا جاسوسیت ایک خالص خشک اور مشکل موضوع ہے اس میں مزاح کو بہترین اور قابل قبول صورت میں داخل کرنا ایک بہت بڑا کارنامہ ہے۔ چہ جائیکہ مزاح کو ناول میں اس انداز میں داخل کرنا یا اس طرح فٹ کرنا کہ اس تحریر کی معراج وہ مزاح بن جائے، صرف ابن صفی کا ہی کام تھا اور یہی دلیل انہیں دوسرے جاسوسی ناول نگاروں سے بلند تر کرنے کے لیے کافی ہے۔

ابن صفی کی مزاح نگاری کسی طرح بھی اردو ادب کے دوسرے طنز و مزاح نگاروں سے کم نہیں۔ بلکہ ایک صورت میں ابن صفی دوسرے مزاح نگاروں سے بھی بازی لے جاتے ہیں اور وہ صورت یہ ہے کہ دوسرے مزاح نگاروں کی تحریروں میں سادہ قسم کا مزاح پایا جاتا ہے یا ان کی تحریروں میں چند ایک ایسی ہیں جن کی ہر سطر ہر لفظ میں مزاح موجود ہے۔ اس کے برعکس ابن صفی نے ادبی قسم کے سادہ مزاح نگاروں کی پیروی نہیں کی بلکہ عوام اور لوگوں کے لیے خاص اور بہت اونچے درجے کا مزاح پیدا کیا۔ ان کی مزاحیہ تحریروں میں ہر لفظ اور ہر سطر میں قہقہے بکھرے پڑے ہیں اور وہ قاری کو نہ چاہتے ہوئے بھی ہنسنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ مندرجہ ذیل اقتباسات پڑھیے اور یہ اندازہ کیجیے کہ کیا یہ اردو کے کسی بھی صاحب طرز اور نامور مزاح نگار کی تحریر کے برابر یا اس سے بھی بہتر نہیں ہے۔ ''پوری ٹرین سے صرف تین آدمی اترے۔ دو بوڑھے دیہاتی اور ایک جوان آدمی۔ جس کے جسم پر خاکی گابرڈین کا سوٹ تھا۔ بائیں شانے سے غلاف میں لپٹی ہوئی بندوق لٹک رہی تھی اور داہنے ہاتھ میں ایک بڑا سا سوٹ کیس تھا۔ غالباً یہ وہی آدمی تھا جس کے لیے انور اور عارف یہاں آئے تھے۔ وہ دونوں اس کی طرف بڑھے۔ ''کیا آپ کو کیپٹن فیاض نے بھیجا ہے؟'' انور نے اس سے پوچھا۔ ''اگر میں خود ہی نہ آنا چاہتا تو اس کے فرشتے بھی نہیں بھیج سکتے تھے۔'' مسافر نے مسکرا کر کہا۔ ''جی ہاں' ٹھیک ہے۔'' انور جلدی سے بولا۔ ''کیا ٹھیک ہے؟'' مسافر پلکیں جھپکانے لگا۔ انور بوکھلا گیا۔ ''یہی جو آپ کہہ رہے تھے۔'' ''اوہ'' مسافر نے اس طرح کہا جیسے وہ پہلے کچھ اور سمجھا ہو۔ عارف اور انور نے معنی خیز نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ ہم آپ کو لینے آئے ہیں۔'' عارف نے کہا۔ ''تو لے چلیے نا۔'' مسافر نے سوٹ کیس پلیٹ فارم پر رکھ کر اس پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ انور نے قلی کو آواز دی۔ ''کیا؟'' مسافر نے حیرت سے کہا۔ ''یہ ایک قلی مجھے سوٹ کیس سمیت اٹھا سکے گا۔'' پہلے دونوں بوکھلائے پھر ہنسنے لگے۔ ''جی نہیں۔'' انور نے شرارت سے کہا۔ ''آپ ذرا کھڑے ہو جائیے۔'' مسافر کھڑا ہو گیا۔ انور نے قلی کو سوٹ کیس اٹھانے کا اشارہ کرتے ہوئے مسافر کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ ''یوں چلیے۔'' ''لاحول ولاقوۃ'' مسافر گردن جھٹک کر بولا۔ ''میں کچھ اور سمجھا تھا۔'' انور نے عارف کو مخاطب کر کے کہا۔

''اب تار کا مضمون تمہاری سمجھ میں آ گیا ہوگا۔'' عارف ہنسنے لگا لیکن مسافر اتنی بے تعلقی اور سنجیدگی سے چلتا رہا جیسے اسے اس بات سے کوئی سروکار ہی نہ ہو۔ وہ باہر آ کر کار میں بیٹھ گئے۔ پچھلی سیٹ پر انور مسافر کے ساتھ تھا اور عارف کار ڈرائیو کر رہا تھا۔ انور نے عارف کو مخاطب کر کے کہا۔ ''کیا کرنل صاحب اور کیپٹن

فیاض میں کوئی مذاق کا رشتہ بھی ہے۔'' عارف نے پھر قہقہہ لگایا۔ وہ دونوں ہی سوچ رہے تھے کہ اس احمق مسافر کے ساتھ وقت اچھا گزرے گا۔ ''جناب کا اسم شریف۔'' اچانک انور مسافر سے مخاطب ہوا۔ ''کلیر شریف۔'' مسافر نے بڑی سنجیدگی سے جواب دیا۔ دونوں ہنس پڑے۔ ''ہائیں اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے؟'' مسافر بولا۔ ''میں نے آپ کا نام پوچھا تھا۔'' انور نے کہا۔ ''علی عمران ایم ایس سی' پی ایچ ڈی۔ بھئی آپ ہنسے کیوں؟'' عمران نے پوچھا۔ ''اوہ...... سر میں دوسری بات پر ہنس رہا تھا۔'' عارف جلدی سے بولا۔ ''اچھا تو اب مجھے تیسری بات پر ہنسنے دیجیے۔'' عمران نے کہا اور احمقوں کی طرح ہنسنے لگا۔ دونوں اور زور سے ہنسے۔ عمران نے ان سے بھی تیز قہقہہ لگایا اور تھوڑی دیر بعد انور اور عارف نے محسوس کیا جیسے وہ خود بھی احمق ہو گئے ہوں۔ کار پہاڑی راستوں پر چکر کھاتی آگے بڑھ رہی تھی۔ تھوڑی دیر کے لیے خاموشی چھا گئی۔ عمران نے ان دونوں کے نام نہیں پوچھے انور سوچ رہا تھا کہ کافی تفریح رہے گی۔ کرنل صاحب کی جھلاہٹ قابل دید ہوگی۔ یہ احمق آدمی تو ان کا ناطقہ بند کر دے گا اور وہ پاگلوں کی طرح سر پیٹتے پھریں گے۔ انور ٹھیک ہی سوچ رہا تھا۔ کرنل تھا بھی جھلے مزاج کا آدمی' اگر اسے کوئی بات دوبارہ کہنا پڑتی تھی تو اس کا پارہ چڑھ جاتا تھا...... چہ جائیکہ عمران جیسے آدمی کا ساتھ...... آدھے گھنٹے میں کار نے کرنل کی کوٹھی تک مسافت طے کر لی۔ کرنل اب بھی بے چینی سے اسی کمرے میں ٹہل رہا تھا اور صوفیہ بھی وہیں موجود تھیں۔ کرنل نے عمران کو نیچے سے اوپر تک دیکھا...... پھر مسکرا کر بولا۔ ''کیپٹن فیاض تو اچھے ہیں۔''

''اجی توبہ کیجیے' نہایت نامعقول آدمی ہے۔'' عمران نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ اس نے کاندھے سے بندوق اتار کر صوفے کے ہتھے سے لٹکا دی۔ ''کیوں نامعقول کیوں؟'' کرنل نے حیرت سے کہا۔ ''بس یونہی۔'' عمران سنجیدگی سے بولا۔ ''میرا خیال ہے کہ نامعقولیت کی کوئی وجہ نہیں ہوتی۔'' ''خوب۔'' کرنل اسے گھورنے لگا۔ ''آپ کی تعریف؟''

''اجی ہی' ہی' اب اپنے منہ سے اپنی تعریف کیا کروں۔'' عمران شرما کر بولا۔ انور کسی طرح ضبط نہ کر سکا۔ اسے ہنسی آ گئی اور اس کے پھوٹتے ہی عارف بھی ہنسنے لگا۔ ''کیا بدتمیزی ہے۔'' کرنل ان کی طرف مڑا۔ دونوں یک بیک خاموش ہو کر بغلیں جھانکنے لگے اور صوفیہ عجیب نظروں سے عمران کو دیکھ رہی تھی۔ ''میں نے آپ کا نام پوچھا تھا۔'' کرنل نے کھنکار کر عمران سے کہا۔ ''کب پوچھا تھا؟'' عمران چونک کر بولا۔ ''ابھی۔'' کرنل کے منہ سے بے ساختہ نکلا اور دونوں بھائی اپنے منہ میں رومال ٹھونستے ہوئے باہر نکل گئے۔ ''ان لونڈوں کی شامت آ گئی ہے۔'' کرنل نے غصیلی آواز میں کہا اور وہ تیزی سے کمرے سے نکل گیا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ ان دونوں کو دوڑ کر مارے گا۔ عمران احمقوں کی طرح بیٹھا رہا بالکل ایسے ہی بے تعلقانہ انداز میں جیسے اس نے کچھ سنا دیکھا ہی نہ ہو۔ صوفیہ کمرے ہی میں رہ گئی تھی۔ ''آپ نے اپنا نام نہیں بتایا۔'' صوفیہ بولی۔ اس پر عمران نے اپنا نام ڈگریوں سمیت دہرایا۔ صوفیہ کے انداز سے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اسے اس پر یقین نہ آیا ہو۔ ''کیا آپ کو اپنے یہاں آنے کا مقصد معلوم ہے؟'' صوفیہ نے پوچھا۔ ''مقصد......'' عمران چونک کر بولا۔ ''جی ہاں!

مقصد مجھے معلوم ہے اسی لیے تو میں ایئر گن ساتھ لایا ہوں۔''
''ایئر گن؟'' صوفیہ نے حیرت سے دہرایا۔ ''جی ہاں۔'' عمران نے سنجیدگی سے کہا۔ ''میں ہاتھ سے مکھیاں نہیں مارتا۔'' کرنل جو پشت کے دروازے میں کھڑا ان کی گفتگو سن رہا تھا۔ جھلا کر آگے بڑھا۔ ''میں نہیں سمجھ سکتا کہ فیاض نے یہ بے ہودگی کیوں کی؟'' اس نے سخت لہجے میں کہا اور عمران کو کھڑا گھورتا رہا۔ ''دیکھیے نا ...... نامعقول آدمی۔ میں نے تو پہلے ہی کہا تھا'' عمران چہک کر بولا۔ ''آپ کل پہلی گاڑی سے واپس جائیں گے۔'' کرنل نے کہا۔ ''نہیں۔'' عمران نے سنجیدگی سے کہا۔
''میں ایک ہفتے کا پروگرام بنا کر آیا ہوں۔'' ''جی نہیں شکریہ۔'' کرنل بیزاری سے بولا۔ ''میں آدھا معاوضہ دے کر آپ کو رخصت کرنے پر تیار ہوں۔ آدھا معاوضہ کتنا ہوگا؟'' ''یہ تو مکھیوں کی تعداد پر منحصر ہے۔'' عمران نے سر ہلا کر کہا۔ ''ویسے ایک گھنٹے میں ڈیڑھ درجن مکھیاں مارتا ہوں اور......'' ''بس بس'' کرنل ہاتھ اٹھا کر بولا۔ ''میرے پاس فضولیات کے لیے وقت نہیں ہے۔'' ''ڈیڈی پلیز۔'' صوفیہ نے جلدی سے کہا۔ ''کیا آپ کو تار کا وہ مضمون یاد نہیں؟''
''ہوں'' کرنل کچھ سوچنے لگا' اس کی نظریں عمران کے چہرے پر تھیں جو احمقوں کی طرح بیٹھا پلکیں جھپکا رہا تھا۔ 'ہوں' تم ٹھیک کہتی ہو۔'' کرنل بولا اور اب اس کی نظریں عمران کے چہرے سے ہٹ کر ان کی بندوق پر جم گئیں۔ اس نے آگے بڑھ کر بندوق اٹھالی اور پھر اسے غلاف سے نکالتے ہی بری طرح بپھر گیا۔ ''کیا بے ہودگی ہے؟'' وہ حلق کے بل چیخا۔ ''یہ تو سچ مچ ایئر گن ہے۔''
عمران کے اطمینان میں ذرہ بھر بھی فرق نہیں آیا۔ اس نے سر ہلا کر کہا۔ ''میں کبھی جھوٹ نہیں بولتا۔'' کرنل کا پارہ اتنا چڑھا کہ اس کی لڑکی اسے دھکیلتی ہوئی کمرے سے باہر نکال لے گئی۔
(عمران سیریز نمبر ۲ ''چٹانوں میں فائر'' ابن صفی۔ بی اے)
کیا آپ کو اس اقتباس میں کئی جگہ ہنسی نہیں آئی۔ بالکل غیر محسوس اور بے اختیاری سے۔ یہ ابن صفی کی وہ خصوصیت ہے جو انہیں اپنے ہم عصر اور بعد کے جاسوسی ناول نگاروں سے ممتاز کرتی ہے اور انہیں ایسا درجہ حاصل ہوتا ہے جو اردو ادب کی تاریخ میں کبھی کسی کو حاصل نہ ہوا' یعنی نثر نگاری کو۔ یہ خصوصیت چونکہ ابن صفی کے ناولوں میں پہلی بار نظر آتی ہے۔ اس لیے ہم ابن صفی کو جاسوسی ادب کا بانی کہہ سکتے ہیں کہ بھرپور اور تفریحی انداز کی ناول نگاری شروع کرنے کا سہرا ابن صفی ہی کے سر ہے۔
(۹)۔ بیان نگاری کی طرح انداز نگارش بھی کسی نثری تخلیق کو کامیاب بنانے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ اردو نثری ادب کی باقاعدہ ابتدا داستان گوئی سے ہوئی اور اردو کی بہت سی بلکہ کثیر داستانوں کا انداز نگارش دلکش ہونے کے ساتھ ساتھ مشکل ہے۔ ہر داستان میں مشکل الفاظ اور عربی فارسی تراکیب کو بے دریغ اور کھلے دل سے استعمال کیا گیا ہے۔ داستان کے بعد ناول کی صنف نے ترقی کی منازل طے کرنا شروع کیں ناول کی زبان اگرچہ سادہ رہی اور ہے لیکن یہ اپنے انداز نگارش کی وجہ سے ایک مخصوص طبقے تک محدود ہے۔ میری

مراد تاریخی معاشرتی ناولوں سے ہے۔ مولوی نذیر احمد نے باقاعدہ ناول کی بنیاد ڈالی‘ چونکہ ان کا لہجہ ناصحانہ تھا لہٰذا آئندہ آنے والے ناول نگاروں نے بھی ان کی تقلید میں ناصحانہ انداز اختیار کیا۔ عبدالحلیم شرر‘ رتن ناتھ سرشار‘ مرزا رسوا اور اسی طرح چند دوسرے ناول نگاروں کو چھوڑ کر انیسویں صدی کے تقریباً تمام ناول نگاروں کا انداز ناصحانہ رہا ہے اسی لیے وہ ایک خاص طبقے تک محدود رہے بیسویں صدی میں ناول کی صنف نے ترقی کی مگر جدید غزل کا رنگ اس پر بھی اثر انداز ہوا اور ناول میں فلسفے نے جگہ پالی۔ اب بھی ناول تو لکھے جاتے ہیں لیکن عوام کے لیے نہیں بلکہ چند گنے چنے ایسے لوگوں کے لیے جو انہیں خرید سکیں اور پڑھ سکیں۔

اسی منطق کو پیش نظر رکھ کر ابن صفی نے جاسوسی ناول نگاری شروع کی اور اپنے مخصوص طرز نگارش سے جاسوسی ناول کو شہرت کی بلندیوں پر پہنچا کر اپنا نام زندہ جاوید بنالیا ذرا دیکھیے ابن صفی اس بارے میں کیا فرماتے ہیں۔

’’میرا طریق کار ہمیشہ عام روش سے الگ تھلگ رہا ہے میں بہت زیادہ اونچی باتوں اور ایک ہزار کے ایڈیشن تک محدود رہ جانے کا قائل نہیں۔ میرے احباب کا اعلیٰ وارفع ادب کتنے ہاتھوں تک پہنچتا ہے اور انفرادی یا اجتماعی زندگی میں کس قسم کا انقلاب لاتا ہے......؟ ہماری سوسائٹی کے ایک بہت بڑے حصے کے لیے اعلیٰ ترین افسانوی ادب قطعی بے معنی ہے تو پھر میں گنے چنے ڈرائنگ روموں کے لیے کیوں لکھوں؟ میں اس انداز میں کیوں نہ لکھوں جسے زیادہ پسند کیا جاتا ہے شاید اسی بہانے عوام تک کچھ اونچی باتیں بھی پہنچ جائیں۔‘‘

مندرجہ بالا بحث سے میں نے یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ابن صفی نے روایتی ادب کے خلاف بغاوت کی اور اپنے لیے خاصی دلچسپ مگر مشکل راہ منتخب کی ان کے سامنے کوئی خاص مثال بھی نہیں تھی لیکن اپنے انداز نگارش اور دوسری خصوصیات کی بناء پر انہوں نے نہ صرف اس صنف کو کامیاب کر دکھایا بلکہ ان کا نام جاسوسی ادب میں ایک سند اختیار کر چکا ہے ان کا انداز نگارش سادہ سلیس اور رواں ہے کم پڑھا لکھا قاری بھی ان کے ناول آسانی سے پڑھ اور سمجھ سکتا ہے۔ یہی وہ معراج ہے ابن صفی کی جس کی بناء پر وہ جاسوسی ادب کے بانی کہلانے کے صدفی صد حقدار ہیں۔

ابن صفی کون......؟؟

مشتاق احمد قریشی

۱۹۴۷ء میں تقسیم ہند کے فوری بعد جہاں ہندو مسلم قوم کو آزادی ملی وہیں اچانک ہی اہل قلم نے بھی خود اختیاری کے تحت مادر پدر آزادی کا علم بلند کر دیا۔ ترقی پسندی نے فحاشی اور عریانی کا چولا اپنا لیا اور اسے حقیقت پسندی کا عنوان دے کر خوب گرما گرم جنسی چٹخارے دار تحریریں ایک سے بڑھ کر ایک سامنے آنے لگیں۔ نوجوان تو نوجوان سنجیدہ اور پڑھے لکھے افراد کو بھی ان فحش تحریروں نے گدگدایا اور اپنے حصار میں لے لیا۔ ایسے جنسی گرماگرمی کے ماحول میں ۱۹۵۲ء میں ابن صفی نے ایک چیلنج قبول کرتے ہوئے بیڑا اٹھایا اور فحاشی اور عریانی کے اس بڑھتے ہوئے سیلاب کے سامنے بند باندھنے کے عزم کے ساتھ قلم اٹھایا اور عام قاری کا ذوق بدلنے کے مصمم ارادے سے عام پڑھنے والوں خصوصاً نوجوانوں کو فحاشی، عریانی سے ہٹانے کے لئے پوری نیک نیتی سے ہندو پاکستان میں ناول نگاری کا ایک نیا طرز نگارش اختیار کیا۔ جاسوسی ناول، یورپ امریکہ اور دیگر یورپی ممالک میں عام طور پر دلچسپی سے پڑھے جا رہے تھے۔ ابن صفی نے ان سے ہی متاثر ہو کر اردو میں پہلی بار طبع زاد جاسوسی ناول نگاری کی ابتدا کی گو کہ ان سے پہلے جاسوسی ناول کی ابتدا فیروز دین اور ظفر عمر کر چکے تھے لیکن ان کی تحریروں کی بنیاد طبع زاد سے کہیں زیادہ آزاد ترجمے پر تھی جبکہ ابن صفی انگریزی ناول سے صرف متاثر ہوئے تھے ان کے کردار کہانی کا پلاٹ اس کی بنت لفظوں کا چناؤ اور رواں آسان اردو کا انتخاب یہ سب وہ خوبیاں تھیں جو ابن صفی نے بڑی مہارت و خوبصورتی سے اختیار کیں پھر ابن صفی نے جاسوسی ناول، جس کا مزاج ہی اسرار و سراغ ہوتا ہے کو ایک نئی جہت اس میں طنز و مزاح شامل کر کے دی، جو ایک انتہائی مشکل کام تھا جسے اختیار کرنے کی کبھی مغربی مصنفین نے بھی آج تک کوشش نہیں کی کیونکہ مغرب میں یا تو جاسوسی ناول ہوتا ہے جس کی بنیاد اسرار و سراغ رسانی ہوتی ہے یا پھر مزاحیہ طنزیہ تحریریں ہوتی ہیں جن میں اسرار تجسس کا عنصر عنقا ہوتا ہے۔

اس میں قطعی دو رائے نہیں ہو سکتی کہ ابن صفی نے جب نیک ارادوں کے ساتھ اپنے قلم کو اٹھایا تو ان کی صاف ستھری تحریروں کے باعث جہاں قارئین میں مطالعہ کا ذوق پیدا ہوا وہیں اس وقت کی عامیانہ اور فحش تحریریں جو ایک سیلاب بلا کی طرح معاشرے میں زہر گھول رہی تھیں کے سامنے ایک مضبوط بندھ بن گئیں۔ ان کا چبھتا ہوا دلچسپ انداز نگارش، جس نے کم از کم تین نسلوں کو تو اپنے حصار میں لے لیا تھا۔ ابن صفی نے اپنی پیروی اور پیرائے میں لکھنے والوں کا ایک ہجوم بھی پیدا کیا۔ ابن صفی نے اپنے پڑھنے والوں کو اپنی تحریر کے سحر میں اس طرح گرفتار کر لیا تھا کہ لوگوں سے اتنا انتظار نہیں ہوتا تھا کہ ایک کے بعد دوسرے ناول آنے کے وقفے کو صبر سے برداشت کر لیتے۔ لوگوں کی اس طلب، بے قراری، کو دیکھتے ہوئے بہت سے نئے

اور پرانے لکھنے والوں نے کوشش کی خصوصاً اس عرصے میں جب ابن صفی ایک طویل بیماری سے دوچار ہوئے اور انہیں قلم پکڑنے کی سکت نہیں رہی، تو اس وقفے نے ان کے نقال اور ان کے کرداروں پر کئی لکھنے والے پیدا کردیئے، ابن صفی صاحب صحت یاب ہونے کے بعد بھی ان لوگوں سے ناراض نہیں ہوئے بلکہ ان کا تو کہنا تھا کہ میں ان تمام لوگوں کا شکر گزار ہوں جنہوں نے میری غیر حاضری میں میرے قارئین کی دلچسپی اور دلداری کا خیال رکھا۔

ابن صفی ایک بڑے ہی وسیع مطالعے کے مالک تھے، ان کا ذہن کسی ڈیپارٹمنٹل اسٹور کی مانند تھا جس میں زندگی کے تمام شعبہ جات سے متعلق معلومات اور تفصیلات محفوظ تھیں۔ ان کی تحریریں اس بات کی گواہی دیتی ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کے قاری دنیا بھر میں جہاں جہاں بھی رہتے ہوں انہوں نے کبھی یہ محسوس نہیں کیا کہ ان کے شہر، ان کے ملک کے بارے میں ابن صفی کچھ نہیں جانتے یا ان ملکوں، شہروں کے بارے میں اگر کبھی کچھ لکھا تو غلط نہیں لکھا۔ ابن صفی کا یہی کمال تھا کہ ان کے پڑھنے والے کو محسوس ہوتا تھا کہ اس کہانی کا وہ خود ایک کردار ہے وہ خود کو اس کہانی میں دوسرے کرداروں کے ساتھ چلتا پھرتا ہوا محسوس کرتا تھا۔

مختصر طور پر ابن صفی کی کامیابیوں کو ایک جملے میں یوں سمیٹا جاسکتا ہے کہ فحاشی اور عریانی کے خلاف جس مشن پر وہ نکلے، اس میں وہ پوری طرح سرخرو ہوئے۔

ابن صفی صاحب ایک روز بڑے ہی خوش گوار موڈ میں تھے وہ اپنے ماضی کی باتیں کھول رہے تھے کہ میں نے ان سے ان کے بچپن کے بارے میں دریافت کیا تو مسکرا کر شرارت سے میری طرف دیکھا اور پھر سر جھٹک کر بولے سچ سچ بتاؤں اور کہاں سے اور کب سے بتاؤں۔ میں نے کہا جیسا آپ مناسب سمجھیں، چلو میں اپنی پیدائش سے ہی شروع کرتا ہوں۔

سنی سنائی بات ہے اپریل کا مہینہ تھا اور سن ۱۹۲۸ء اپنے دادا مولوی عبدالفتاح مرحوم کے گھر الہ آباد کے ایک قصبے ''نارہ'' میں پیدا ہوا۔ دادا بڑے اچھے بلکہ خاصے اچھے زمیندار تھے انہیں مطالعہ کا بے حد شوق تھا۔ اس لئے گھر میں کتابوں کے انبار لگے رہا کرتے تھے یوں سمجھ لو کہ ان ہی کتابوں کے انبار میں پیدا ہوا اور دنیا میں آنے کے بعد میری پہلی چیخ جو بے اختیار ہوتی ہے ان ہی ڈھیر ساری کتابوں کو دیکھ کر نکلی تھی۔

میں نے ابتدائی تعلیم جو قرآن اور فارسی پر محیط تھی گھر پر پائی۔ ایک بڑے زمیندار کا پوتا ہونے کے باوجود میں نے سیر تفریح گھومنے پھرنے کے بجائے سات آٹھ سال کی عمر میں ہی طلسم ہوشربا کی ساتوں جلدیں ختم کرلی تھیں یوں سمجھ لو کہ بچپن سے ہی کتابوں کا کیڑا بن گیا تھا۔ میرے حصے میں جو انفرادیت نارہ میں آئی تھی وہ تعلیم کے سلسلے میں الہ آباد آنے پر بھی برقرار رہی شہر کی رنگارنگی اثر انداز نہیں ہوسکی۔ بلکہ گاؤں کے علم وفضل کے اثرات مزید اور گہرے ہوگئے۔

میری ایک کہانی طالب علمی کے دور میں اس وقت کے مشہور رسالے ویکلی شاہد بمبئی میں شائع ہوئی تھی اس کا عنوان ''ناکام آرزو'' تھا۔ ایڈیٹر صاحب نے مصنف کی جگہ لکھا۔ نتیجہ فکر، مصور جذبات، حضرت اسرار

ناروی۔ اتنا کہہ کر ایک بلند قہقہہ لگایا۔ تمہیں معلوم ہے اس وقت تک میری داڑھی بھی نہیں نکلی تھی اور انہوں نے مجھے مصور جذبات حضرت اسرار ناروی بنادیا۔ میرے گھر والوں نے (والد صاحب) اس لقب میں ایک اور اضافہ فرمادیا تھا جب وہ مجھے پکارتے تو کہتے "ابے او مصور جذبات ذرا ادھر تو آ"

ابن صفی نے ۱۹۴۴ء میں سولہ سال کی عمر میں ڈی اے وی ہائی اسکول آلہ آباد سے میٹرک کا امتحان پاس کیا یہ اسکول ان کے گھر حسن منزل کے قریب ہی واقع تھا۔ انہوں نے اس اسکول میں پانچویں سے لے کر میٹرک تک تعلیم حاصل کی جبکہ پہلی سے چوتھی تک مجیدیہ اسلامیہ ہائی اسکول میں حاصل کی۔ میٹرک تک پہنچتے پہنچتے بہت کچھ لکھا بلکہ بہت زیادہ لکھا اور مختلف قلمی ناموں سے لکھا۔ ۱۹۴۴ء جب ابن صفی نے میٹرک پاس کیا تھا یہ وہ دور تھا جب جنگ عظیم کے شعلوں نے ساری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ ابن صفی صاحب بتاتے تھے کہ اس جنگ عظیم نے ان کے ذہن پر بڑا اثر کیا تھا۔ دوسری جنگ عظیم وہ زمانہ تھا جب سارے لکھنے والے ادیبوں شاعروں نے اپنی نوکِ قلم کو نشتر کرلیا تھا۔ ابن صفی نے اپنی آٹھویں جماعت کے زمانہ جو غالباً ۱۹۴۲ء کا تھا ایک نظم سنائی تھی جس کا ایک شعر یہ تھا۔

وہ دیکھو افق کے سینے پر لہرائے شہیدوں کے دامن
بن جائے گا لالہ زار وطن کچھ دیر میں شہدا کا مدفن

......☆☆☆......

ابن صفی صاحب کی چھوٹی بہن ریحانہ لطیف (بلاغت) نے اپنے خیالات کا اظہار اپنے قلم سے یوں کیا ان کا یہ مضمون نئے افق اگست ۱۹۸۶ء میں شائع ہوا تھا یہاں اس سے چند اقتباسات دیے جارہے ہیں۔

ہم تین بہنیں اور ایک بھائی تھے۔ ایک بہن خورشید ہم سب میں بڑی تھیں ان سے چھوٹے اسرار بھائی جان تھے بھائی جان سے چھوٹی غفیرہ آپی تھیں اور سب سے آخیر سب سے چھوٹی میں ریحانہ (بلاغت)۔ ہم سب بھائی بہنوں میں بڑی محبت تھی۔ ہم میں سے اگر کسی کو معمولی سی تکلیف بھی ہوتی تو باقی سب تکلیف کو اپنے پر محسوس کرتے۔ یہ ہماری والدہ محترمہ کی اچھی تربیت کا نتیجہ تھا کہ ہم آپس میں اس قدر متحد و متفق تھے کہ دیکھنے والے حیران رہ جاتے۔

ہمارا تعلق الہ آباد سے نہیں بلکہ الہ آباد کے قریبی گاؤں نارا سے ہے۔ ہمارا گھرانا شروع سے علمی و ادبی رہا ہے۔ میری والدہ عربی، فارسی، ہندی میں دسترس رکھتی تھیں، میری والدہ کے نانا حکیم تھے۔ انہوں نے حکمت سے متعلق کئی ضخیم کتابیں لکھی تھیں جو آج بھی ہندوستان میں طب کے طلبا کے کورس میں شامل ہیں۔ میرے دادا مولوی عبدالفتاح ریاست گوالیار میں درس و تدریس کے شعبے سے منسلک تھے۔

بھائی جان کو ذہانت ورثے میں ملی تھی۔ ہماری دادی اپنی اولاد میں سب سے زیادہ ہمارے ابا کو عزیز رکھتی تھیں ان کی وجہ سے وہ ہم سب بہن بھائیوں سے بھی بہت محبت کرتی تھیں۔ الہ آباد سے ایک روزنامہ غالباً اس کا نام "نیا دور" تھا اس میں بھائی جان طغرل فرغان کے نام سے طنزیہ کالم لکھا کرتے تھے ان کے کالم

کا مستقل عنوان ''پوسٹ مارٹم'' تھا پورے شہر میں کالم نگار کا بڑا چرچا تھا۔ لوگ اس شخصیت کے بارے میں جاننا چاہتے تھے جو اتنی بے باکی اور جرات سے حکومت پر طنزیہ کالم لکھتا تھا۔ لیکن طغرل فرغان سے صرف اس کی ماں اور بہنیں ہی واقف تھیں۔

بھائی جان کے قریبی احباب یہ بات اچھی طرح جانتے ہیں کہ وہ کبھی کسی کی دل شکنی نہیں کرتے تھے۔ بھائی جان غصے کو ضبط کرنے کے فن سے خوب واقف تھے۔ بھائی جان کو شکار کا بچپن سے یعنی زمانہ طالب علمی سے بڑا شوق تھا ایک دفعہ انہوں نے ایک بڑا ہی دلچسپ اپنا ہی واقعہ سنایا کہ ایک بار دسمبر کی چھٹیوں میں وہ الہ آباد سے دادی کے پاس نارا چلے گئے وہاں اپنے ایک کلاس فیلو کے ساتھ شکار کا پروگرام بنا کر نکل کھڑے ہوئے۔ جاتے ہوئے دادی نے تاکید کی کہ مغرب سے پہلے پہلے واپس آجانا لیکن واپسی میں دیر ہوگئی اور عشاء کا وقت ہوگیا اور کوئی شکار بھی نہ ہوسکا۔ بھائی جان کو اچھی طرح علم تھا کہ دادی سے زبردست ڈانٹ پڑے گی اور ہوا بھی یہی۔ بھائی جان مسکین صورت بنائے کھڑے رہے اور دادی جیسے ہی سانس لینے کو رکیں فوراً ہی اپنی بے گناہی کا یقین دلانے کے لئے بولے۔ بس آج تو اللہ نے ہماری جان بچالی۔ بھائی جان نے کسی قدر خوف زدہ ہونے کا تاثر دے کر بتایا کہ ہم نے بہت سے پرندے شکار کئے اور جب گھر آنے لگے تو ذبح کئے ہوئے تمام پرندے پھڑ پھڑا کر اڑ گئے۔ میری اور میرے ساتھی کی خوف سے بری حالت ہوگئی تھی۔ اتنا سنتے ہی دادی کا سارا غصہ کافور ہوگیا بے چاری فوراً صدقہ خیرات میں لگ گئیں۔

۱۹۴۷ء میں ہی والد صاحب بمبئی سے کراچی منتقل ہو گئے تھے اس وقت بمبئی سے آنے والی ٹرینیں الہ آباد میں پولیس کے پہرے میں دھلوائی جاتی تھیں۔ ان حالات میں نہ ہم ابا کے پاس پہنچ سکتے تھے اور نہ ہی ابا ہمارے پاس الہ آباد آسکتے تھے۔ بھائی جان کا کبھی کسی سیاسی پارٹی سے تعلق نہیں تھا لیکن ان دنوں جو خون کی ہولی کھیلی جارہی تھی اسے ہندوؤں نے مذہبی رنگ دے دیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس دوران بہت سے لوگ کمیونزم کی طرف راغب ہوگئے۔ اگرچہ بھائی جان باقاعدہ اس پارٹی سے منسلک نہیں تھے لیکن ان کے دوستوں کا وہاں اٹھنا بیٹھنا تھا وہ بھی وہیں ملتے تھے۔ ۱۹۵۲ء میں جب ابا ہمیں لینے پاکستان سے آئے تو ان ہی دنوں بڑی آپا جان کی بیٹی ہمارے پاس بارہ بنکی سے آئی ہوئی تھی۔ ہماری پاکستان روانگی میں تین چار دن رہ گئے تو بھائی جان اسے پہنچانے بارہ بنکی چلے گئے۔ ان ہی دنوں ایک صاحب جو حسن منزل میں رہتے تھے ان کا تعلق سی آئی ڈی سے تھا ان دنوں کمیونسٹوں کی بڑی پکڑ دھکڑ ہو رہی تھی وہ کئی بار بھائی جان کو ملنے گھر آتے رہے۔ اس سے یہ ہوا کہ نہ صرف ہمارے گھر والوں کے ذہن میں بلکہ بھائی جان کے دوستوں اور شاگردوں کو بھی پریشانی ہوگئی کہ شاید پولیس انہیں گرفتار کرنا چاہتی ہے۔

جس دن بھائی جان کو واپس الہ آباد آنا تھا اس روز صبح ہی صبح ان کے چاہنے والے گھر اور اسٹیشن کے درمیانی راستے پر پھیل گئے اور بھائی جان کو حسن منزل لانے کے بجائے کسی دوست کے گھر لے گئے۔ ان کا خیال تھا کہ جب گھر والے پاکستان کے لئے اسٹیشن پہنچ جائیں گے تو وہ انہیں ٹرین چلنے سے تھوڑی دیر پہلے اسٹیشن

پہنچا دیں گے۔ بھائی جان نے ان سب کے جذبوں کا شکریہ ادا کیا اور وہاں سے وہ اپنے گھر حسن منزل آ گئے اور وہاں چھپ کر بیٹھنے سے انکار کر دیا۔ جیسے بھائی جان گھر آئے وہ صاحب جنہیں بھائی جان کی تلاش تھی وہ بھی آ گئے تو بھائی جان نے انہیں دیکھتے ہی کہا میں تو یہاں سے جا ہی رہا ہوں پھر گرفتار کیوں کرنا چاہتے ہو؟ اس پر وہ صاحب حیران رہ گئے اور بے ساختہ ہنستے ہوئے بولے مجھے تمہاری تلاش اس لئے تھی کہ میں یہ مکان جو تم خالی کرنے والے ہو کرائے پر لینا چاہتا ہوں، قبل اس کے کہ تمہارا سامان نکلے میں اس پر قابض ہونا چاہتا ہوں۔ بہرحال بھائی جان خفیہ طریقے سے الہ آباد سے روانگی پر تیار نہیں ہوئے تھے اور اگر وہ ایسا کر لیتے تو الہ آباد کے در و دیوار اس خلوص و محبت کے ان مناظر سے محروم رہ جاتے جو بھائی جان کی روانگی کے وقت وہاں نظر آئے۔

بھائی جان عموماً رات کو لکھتے تھے۔ اکثر پوری رات لکھتے رہ جاتے کبھی ایک نشست میں آٹھ دس صفحے لکھ لیتے اور کبھی تین چار لائنوں سے آگے نہ بڑھتے اور جب ایسا ہوتا تو میں بہت چلاتی، اس لئے کہ بھائی جان لکھتے جاتے اور میں پڑھتی جاتی تھی۔ جب تک میری شادی نہیں ہوئی میں نے چھپا ہوا ناول نہیں پڑھا۔ ہمیشہ مسودہ ہی پڑھتی تھی۔ میری بیٹی عفت ڈیڑھ سال کی تھی، ٹھیک سے بولتی بھی نہیں تھی۔ ان دنوں بھائی جان جو ناول لکھ رہے تھے اس کے نام کے سلسلے میں پریشان تھے۔ عفت کو گود میں لے کر اس سے کہنے لگے بیٹا تم ہی بتاؤ میں کیا نام رکھوں۔ بھائی جان اور بھی باتیں کرتے رہے، اسی دوران عفت نے کچھ بولنے کی کوشش میں جانے کیا کہا کہ بھائی جان اچھل پڑے، واہ کیا نام بتایا ہے۔ میں حیرت سے بھائی جان کی طرف دیکھ رہی تھی، کہنے لگے اس نے لوبولی لا بتایا ہے۔ اور پھر وہ ناول لوبولی لا کے نام سے متعارف ہوا۔

بھائی جان نے پرائمری تعلیم نارا میں ہی حاصل کی تھی چونکہ وہاں گاؤں میں کوئی ہائی اسکول نہیں تھا اسلئے اماں نے الہ آباد میں سکونت اختیار کی حالانکہ اس دور میں کسی خاتون کے لئے یہ بہت مشکل کام تھا کہ وہ چھوٹے چھوٹے بچوں کے ساتھ تنہا کسی اجنبی جگہ سکونت اختیار کرے لیکن ہماری اماں بڑی ہی باحوصلہ خاتون تھیں، والد صاحب چونکہ ملازمت کے سلسلے میں کبھی ایک جگہ جم کر نہ رہ سکتے تھے۔ یہ اماں کی ہی ہمت تھی جو انہوں نے بھائی جان کی تعلیم کا بیڑا اٹھایا اور تنہا ہی ماں اور باپ دونوں کے فرائض انجام دیئے۔

بھائی جان ہمیشہ ہی یہ کہتے تھے کہ میں جو کچھ بھی ہوں اپنی اماں کی جوتیوں کے طفیل ہوں۔ وہ اماں سے بہت ہی محبت کرتے تھے۔ ایک بار میں ان کے اس جملے کا عملی مظاہرہ بھی دیکھ چکی ہوں۔ اماں میرے یہاں آئی ہوئی تھیں۔ بھائی جان اپنی مصروفیات کی وجہ سے پندرہ دن ان سے ملنے نہ آ سکے اور جب آئے تو اماں نے ناراضگی سے کہا ہاں بھئی تم ابن صفی ہو پوری دنیا میں تمہاری شہرت ہے، اماں کا جملہ ابھی ختم بھی نہیں ہوا تھا کہ بھائی جان نے اماں کی چپل اٹھا کر اپنے سر پر رکھ لی یہ اماں سے ان کی بے پناہ محبت کا عملی مظاہرہ تھا جو میں نے دیکھا۔

......☆☆☆......

ابن صفی صاحب کا انتقال ۲۶ جولائی ۱۹۸۰ء ۱۱ رمضان کو بوقت سحری ہوا تھا۔ ان کے بعد کئی سال تک

نئے افق اور نیا رخ کا شمارہ اگست ابن صفی نمبر کے طور پر شائع ہوتا رہا ایسے ہی نئے افق اگست ۱۹۸۰ء کے شمارے میں ابن صفی کے ہم عمر دوست شاہد منصور جو خود بھی بڑی اچھی نظم ونثر پر قادر تھے کی ایک تحریر شائع کی گئی تھی جس سے ابن صفی صاحب کا ایک دور نظروں کے سامنے پھر جاتا ہے۔ جناب شاہد منصور لکھتے ہیں۔

۱۹۵۳ء کا زمانہ تھا۔ جب ہم لیاقت آباد کے ۳ نمبر میں رہا کرتے تھے اور ابن صفی کی رہائش سی ون ایریا میں تھی' انہیں ہندوستان سے آئے ہوئے غالباً ڈیڑھ دو سال ہوئے تھے۔ جاسوسی دنیا وہ پابندی سے لکھ رہے تھے اور عمران سیریز کا خیال ایک بیج کی طرح ان کے دل میں جڑ پکڑ چکا تھا۔ لیاقت آباد اس زمانے میں لالوکھیت کہلاتا تھا۔ ویسے یہ نام ابھی تک لوگوں کے ذہنوں سے محو نہیں ہوا ہے گو کہ اس وقت لالوکھیت یا لیاقت آباد آج کل کی طرح بے پناہ آبادی' اونچی اونچی عمارتوں' سڑکوں' دکانوں' مارکیٹوں اور روشنیوں سے معمور نہیں تھا بلکہ واقعی ایک کھیت ہی تھا ایک وسیع وعریض ریگستانی کھیت۔ نہ سڑکیں تھیں' نہ دکانیں تھیں' اور نہ ہی بجلی تھی۔ ہر طرف دھول ہی دھول' ریت ہی ریت تھی جس میں جنگلی جھاڑیوں میں ٹین کی چھت والے ادھ کچے ایک کمرے والے کوارٹروں کا جنگل تھا جو چٹائیوں کی دیواروں میں لپٹا ہوا حد نگاہ تک پھیلتا چلا گیا تھا۔

فیڈرل کیپٹل ایریا سے نیو کراچی اور نارتھ کراچی (جو بعد میں نارتھ ناظم آباد' اور ناظم آباد کہلایا) تک ایک جنگل تھا' جہاں لوگ شکار کھیلنے جاتے تھے اور حسب توفیق کچھ نہ کچھ مار لاتے تھے۔

ابن صفی کے قریب آنے پر یہ پہلی مرتبہ سمجھ میں آیا کہ جینئس کسے کہتے ہیں۔ شاعری' طنز نگاری' مزاح نگاری' افسانہ' ناول اور سراغ نگاری کے بارے میں تو تقریباً سب ہی جانتے ہیں لیکن یہ بہت کم لوگوں کو معلوم ہو کہ ابن صفی بہت اچھے مصور بھی تھے وہ رنگوں اور لکیروں کے استعمال میں جداگانہ مہارت رکھتے تھے۔ چہرہ سازی اور خاکہ نگاری میں انہیں کمال حاصل تھا۔ لمحوں میں پنسل کی جنبش سے کسی بھی چہرے کو کاغذ پر نمودار کر دیتے تھے۔

ابن صفی کا شمار اردو کے سب سے زیادہ اور مقبول لکھنے والوں میں ہی نہیں بلکہ پڑھے جانے والوں میں ہوتا ہے۔ زندگی کی مختصر مدت میں دو سو پچاس سے زائد ناولیں لکھنا' وہ بھی پابندی سے لکھنا اور ہر ناول میں دلچسپی کو برقرار رکھنا۔ ابن صفی نے اپنے سفر کا آغاز اچانک نہیں بلکہ بہت سوچ سمجھ کر کیا۔ ان کے ذہن وطبیعت پر اسلام کی عظیم اعلیٰ ترین اخلاقی تعلیم کا بڑا گہرا اثر تھا۔ انہوں نے اپنے جاسوسی ناولوں کے ذریعے اپنے معاشرے کی سماجی' اخلاقی برائیوں کے خلاف جہاد کیا ہے۔ ابن صفی کی شخصیت بڑی باغ و بہار تھی۔ بظاہر تو ان کا حلقہ احباب بہت وسیع تھا لیکن درحقیقت بڑا ہی محدود تھا۔ انہیں نئی نسل سے بہت محبت تھی وہ نوجوان شاعروں' ادیبوں کی رہنمائی کرتے رہتے تھے۔

سمرسٹ ماہم نے لکھا ہے کہ "آدمی کی شرافت کا اندازہ اس کے ذوق طعام سے باآسانی کیا جا سکتا ہے۔" ابن صفی کی عادت تھی کہ گھر میں جو کچھ پکتا تھا وہ بغیر کسی کراہت وہچکچاہٹ کے کھا لیا کرتے تھے۔ وہ کھانوں میں کچے قیمے کے کباب کو بہت پسند کرتے تھے۔ شہر بھر میں شاید ہی کوئی ایسی دکان کبابوں کی ہو جو

ان سے رہ گئی ہو۔ جہاں کسی نے کسی کبابی کی دکان کے ذائقے کی تعریف کی اور انہوں نے ادھر کا رخ کیا وہ کباب بڑے شوق سے اور اہتمام سے کھاتے تھے۔ وہ گوشت کھانے کے بڑے شوقین تھے ان کے اسی شوق نے ان میں شکار کا شوق پیدا کر دیا تھا۔

ابن صفی لباس کے معاملے میں بہت سادہ پسند تھے۔ وہ ہمیشہ ایسے کپڑے پہنتے جس سے بدن کو آرام ملے۔ چمکدار اور بھڑکیلے رنگ انہیں قطعی پسند نہیں تھے۔ بھڑکیلے اور شوخ رنگ کے کپڑوں پر دہ خواتین کا حق سمجھتے تھے اور خواتین کا حق مارنے کے وہ سراسر خلاف تھے۔

ابن صفی نے ایڈونچر نگاری کر کے اردو ادب میں ایک بالکل نئی طرح ڈالی' انگریزی میں تو کاؤ بوائے ایڈونچر خوب لکھا جا رہا تھا لیکن ابن صفی صاحب سے پہلے اس طرف کسی نے توجہ نہیں دی۔ ابن صفی نے زمین کے بادل لکھ کر اردو میں مہم جوئی یعنی ایڈونچر لکھنے کی ابتدا کی اس کے بعد انہوں نے شکرال' کراغال' مقلاق' کملاک کی کہانیاں بالکل نئے کرداروں ایرج وعقرب' شرجیل' ضرغام اور کئی دوسرے ذیلی کرداروں کے ساتھ تحریر کیں۔

ابن صفی بزرگوں کا بڑا احترام کیا کرتے تھے خصوصاً اپنے والد صفی اللہ کا وہ جتنا ادب و احترام کیا کرتے اس سے کہیں زیادہ ان کے رعب و دبدبے کے باعث ان سے خوفزدہ بھی رہتے۔ ان کے والد جناب صفی اللہ مرحوم بڑی آن بان اور جاہ وجلال والے بزرگ تھے۔ وہ ایک بڑے زمیندار کے بیٹے ہی نہیں بلکہ خود بھی زمیندار رہ چکے تھے۔ ابن صفی صاحب اُن سے اور وہ اپنے بیٹے سے بہت محبت و شفقت کرتے تھے۔ ابن صفی کا اپنے والد سے محبت کا مظہر خود ان کا یہ قلمی نام ہے جب کہ ان کا تعلیمی' گھریلو بلکہ پیدائشی نام تو اسرار احمد تھا۔ ابن صفی صاحب جب تک اپنے والد کا ذکر دوران گفتگو نہ کر لیتے اس وقت تک ان کی بات پوری نہیں ہوتی تھی۔ ابن صفی کے والد صاحب گورے چٹے دراز قد اور مضبوط جسم کے مالک تھے۔ آنکھیں روشن' سفید بال' سفید داڑھی اور سفید ہی لباس زیب تن کیا کرتے تھے۔ انکی زمینداری تو وہیں نارہ میں رہ گئی تھی اس کے باوجود ان میں زمینداری کی خو بو موجود تھی لیکن پاکستان آنے کے بعد انہوں نے وزیر علی انڈسٹریز میں ملازمت اختیار کی۔

داغ دہلوی کے شاگرد اور مشہور شاعر حضرت نوح ناروی' اسرار ناروی یعنی ابن صفی کے ماموں ہوتے تھے اور یونیورسٹی کے اساتذہ میں فراق گورکھپوری ان کے اساتذہ میں شامل تھے۔ ابن صفی نے اپنے لکھنے لکھانے کی ابتدا افسانہ نگاری اور شاعری سے کی۔ ان کی شاعری میں اور ان کی نثری تحریروں میں ایک دلکش طنز کی کاٹ ہوا کرتی تھی ان کے اس اسلوب نے انہیں نوجوانی میں ہی ادبی حلقوں میں مشہور کر دیا تھا۔ انہوں نے تغرل فرغان کے قلمی نام سے بھی طنز و مزاح کی بہت سی تحریریں لکھی ہیں۔

......☆☆☆......

غالباً ۱۲ مارچ ۱۹۸۰ء کی دوپہر کی بات ہے ابن صفی صاحب کی بیماری کا سلسلہ چل نکلا تھا لیکن ان دنوں طبیعت کافی بہتر ہو چکی تھی اور ابن صفی صاحب نے لکھنا شروع کر دیا تھا۔ ان سے ملنے ان کی عیادت کرنے ان

کے رفیق دیرینہ شکیل جمالی صاحب الہ آباد سے تشریف لائے تھے۔ ان کے ساتھ ان کے دو عزیز بھی آئے تھے۔ سرور جہاں اور ان کے چھوٹے بھائی اصغر جو بڑے ماہر فوٹو گرافر تھے۔ ابن صفی اور شکیل جمالی صاحب اپنے ماضی کو یاد کر کے ایک دوسرے کے بارے میں باتیں سنا رہے تھے کہ میں نے درمیان میں وقفہ محسوس کر کے شکیل جمالی صاحب سے پوچھا کہ آپ کوئی ایسا واقعہ سنائیں جس نے آپ کو متاثر کیا ہو جسے ہم یادگار کہہ سکیں۔ ایک لمحہ توقف کے بعد مسکرا کے معنی خیز انداز میں ابن صفی صاحب کی طرف دیکھتے ہوئے بولے۔

یہ واقعہ ۱۹۴۴ء کا ہے جنگ عظیم کا دور تھا۔ جنگ کے شعلوں نے ساری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ جرمنی کی نازی قوت ساری دنیا کو اپنے زیر اثر دیکھنا چاہتی تھی۔ تمام بڑی طاقتیں جنگ میں ملوث ہو چکی تھیں۔ ہندوستان چونکہ برطانیہ کے زیر تسلط تھا اس لئے وہ بھی جنگ سے کنارہ کش نہ رہ سکا۔ اس زمانے میں ضرورت کی ہر چیز راشن کارڈ کے ذریعے ملتی تھی۔ اسی دور کا ایک واقعہ ہے کہ اسرار (ابن صفی کا نام) کو جب ان کے گھر والوں نے مٹی کا تیل لانے کو کہا تو یہ مٹی کا تیل لینے تیل کے ڈپو پہنچے تو وہاں بہت ہجوم تھا ہر شخص ایک دوسرے پر ٹوٹا پڑ رہا تھا۔ کیونکہ اس زمانے میں قطار کا رواج بالکل نہیں تھا۔ بڑی مشکلوں سے ہم دونوں نے مل کر مٹی کا تیل حاصل کیا جب بھیڑ سے نکلنے لگے تو اسرار کے ہاتھ سے بوتل چھوٹ گئی۔ غالباً پیچھے سے کسی نے دھکا دے دیا تھا' بوتل ٹوٹ گئی تو سارا تیل بہہ گیا اور اس کی انگلیوں سے خون جاری ہو گیا۔ میں نے بے اختیار گھبرا کر پوچھا۔ ''بوتل کیسے ٹوٹ گئی۔'' ''بس ٹوٹ گئی۔ ابن صفی نے جواب دیا۔

''یہ تمہاری انگلیوں سے خون کیوں بہہ رہا ہے۔'' میں نے سوال کیا۔ بڑے ہی طنزیہ انداز میں بولا۔ 'تو کیا ان سے مٹی کا تیل بہنے لگتا۔'' اس پر میرے علاوہ تمام لوگ جو تماشہ دیکھ رہے تھے ہنس پڑے۔ جب ہم گھر کی طرف چلے تو میں نے سوال کیا۔ ''اب مٹی کے تیل کا کیا ہوگا؟'' ''لہو کے چراغ جلیں گے' اماں جنگ میں یہی سب کچھ ہوتا ہے۔

میں دیکھ رہا تھا کہ جب شکیل جمالی صاحب یہ قصہ سنا رہے تھے تو ابن صفی صاحب اپنے مخصوص انداز میں مسکراتے ہوئے گردن ہلاتے جا رہے تھے ان کے چہرے پر ایک انجانی سی مسرت نظر آ رہی تھی۔

ابن صفی کی حیثیت کبھی گرد آلود نہیں ہو سکے گی۔ وہ آج بھی زندہ ہیں اور آئندہ بھی اپنی تابندہ تحریروں کے ذریعے نا صرف زندہ رہیں گے بلکہ اپنے مخالفین سے وہ طنزیہ مسکراہٹ بھی انہوں نے چھین لی ہے جو ان کی مقبولیت اور اپنی محرومی کو چھپانے کے لئے وہ دیا کرتے تھے۔ ابن صفی نے اپنی پہلی کتاب جاسوسی دنیا کا ناول دلیر مجرم جو مارچ ۱۹۵۲ء کو شائع ہوا تھا کے ذریعے انسپکٹر فریدی اور سارجنٹ حمید کو روشناس کرایا۔ سسپنس' مزاح' قانون کی بالادستی اور شکستِ جرم نے لوگوں کے دل موہ لئے۔ اور ابن صفی کی مقبولیت و شہرت آسمان کو چھونے لگی۔ ابن صفی نے خطے میں پڑھنے والوں کی ہی نہیں بلکہ لکھنے والوں کی بھی ایک نئی کھیپ بنائی۔ انہوں نے اپنے قلم کے ذریعے اپنے پڑھنے والوں کے لئے ایک نئی راہ تعمیر کی۔ وہ ایسے سالار قافلہ تھے کہ جب ان کا قلم چلا تو بہت سے قلم ان کے ہم قلم ہو گئے۔ ان کی تحریروں کی مقبولیت ہی نے

ان کے نقال پیدا کر دیئے۔ ان کے مخالفین تسلیم کریں یا نہ کریں لیکن یہ اٹل حقیقت ہے برصغیر میں کتابوں کی اشاعت، وہ بھی اردو کتابوں کی اشاعت جو چند سو یا بہت زیادہ ہوئی تو ایک ہزار ہوا کرتی تھی۔ لیکن ابن صفی کی کتابوں کی اشاعت اور ان کی فروخت نے اس خطے میں ریکارڈ قائم کر کے سیکڑوں نہیں ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں کی تعداد میں شائع ہوئیں اور آج بھی مسلسل شائع ہو رہی ہیں۔ پڑھنے والے آج بھی انہیں اسی دلچسپی سے پڑھتے ہیں۔

یقیناً ابن صفی ایسے سالار قافلہ تھے جس نے برصغیر ہند و پاکستان میں اردو ناول کو از سر نو حیات بخشی اور اردو پڑھنے پر لوگوں کو مجبور کر دیا۔ اور ان کے تحریر کردہ ناولوں کے ذریعے ہزاروں افراد برسر روزگار ہوئے۔

ابن صفی ایک عہد کا نام ہے جس نے اپنی تحریروں سے پوری تین نسلوں کو متاثر کیا ہے۔ مقبولیت کی معراج بڑی مشکل سے کسی مصنف کو حاصل ہوتی ہے۔ دنیا میں کچھ شخصیتیں ایسی ہوتی ہیں کہ جب وہ دنیا سے چلی جاتی ہیں تب اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنے لئے کتنی اور کیسی جگہ بنائی تھی اور ان کی شخصیت کتنی قد آور تھی۔ ابن صفی صاحب کی ذات بھی ایسی ہی تھی۔ ان کے چلے جانے سے نہ صرف ادبی دنیا میں خلا پیدا ہوا ہے بلکہ جاسوسی ادب کی تو دنیا ہی لٹ گئی۔

ابن صفی ملک تقسیم ہونے پر پاکستان تو آ گئے تھے لیکن قلم کو منقسم نہیں ہونے دیا۔ ان کے قلم کا رشتہ اپنی سرزمین سے جڑا رہا۔ وہ کسی مخصوص سماج، معاشرے کو قانون کی عظمت و بزرگی کا احساس نہیں گردانتے تھے۔ ان کا پیغام تو تمام دنیا میں پھیلے ہوئے انسانوں کے لئے تھا۔ یہی وجہ ان کی ہند و پاک میں یکساں مقبولیت اور شہرت کی تھی انہوں نے وہ مثال قائم کی اور وہ معراج حاصل کی جس کی کوئی دوسری مثال نہیں نظر آتی۔

......☆☆☆......

ابن صفی صاحب کے دوست دیرینہ ہم قلم و ہم قدم جناب شکیل جمالی کہتے ہیں کہ ۱۶ اپریل ۱۹۸۰ء کی رات لو بارہ بجے جب میں ابن صفی سے گلے مل کر رخصت ہوا تو فوراً ہی میرے کانوں میں ایک بھرائی ہوئی آواز آئی۔

"آؤ پیارے ایک بار پھر گلے مل لو۔ ابھی میرا جی نہیں بھرا" میں نے مڑ کر دیکھا میرا دوست اپنے دونوں بازو پھیلائے میری طرف بڑھ رہا تھا۔ اس کا چہرہ بے حد اداس تھا اور آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی تھیں۔ میں فوراً لپک کر اس کے گلے سے چمٹ گیا۔

بڑی دیر تک ہم دونوں ایک دوسرے کے سینے سے چمٹے رہے۔ وہ مجھے اس طرح اپنی باہوں میں جکڑے ہوئے تھا جیسے ابھی وہ جدا ہونا نہیں چاہتا ہو۔ میں نے اس کی پیٹھ تھپتھپاتے ہوئے اسے تسلی دی۔ اپنا دل چھوٹا نہ کرو اسرار اب تم خدا کے فضل سے بالکل ٹھیک ہو۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ دوبارہ تم سے ملنے بہت جلد آؤں گا۔

ابن صفی نے جواب میں تو کچھ نہیں کہا البتہ اس کے ہونٹوں پر بڑی اداس اور پھیکی مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔

اس وقت تو میں اس کی مسکراہٹ کی زبان نہیں سمجھ سکا تھا لیکن اب ایسا لگتا ہے جیسے اس کی وہ پھیکی سی اداس مسکراہٹ کہہ رہی تھی۔ ''میرے دوست تم ضرور آؤ گے لیکن میں تمہارے آنے کا انتظار نہ کرسکوں گا۔ بس اسے آخری ملاقات سمجھو اسی لئے میں تم سے دوبارہ گلے مل رہا ہوں اور واقعی وہ ہماری آخری ملاقات ثابت ہوئی۔ ۱۶ اپریل کی رات کو میں اس سے رخصت ہوا تھا اور ۲۶ جولائی کی صبح ہوتے ہوتے وہ مجھ سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے رخصت ہوگیا۔ دوبارہ گلے مل لینے سے شاید اس کا جی تو بھر گیا ہو لیکن اسے کیا پتا کہ وہ میرے سینے میں کتنی آگ لگا کر چلا گیا ہے۔

۲۸ جولائی کی وہ منحوس شام تھی، جب کراچی سے مجھے مشتاق قریشی نے بذریعہ تار یہ اطلاع دی کہ ایشیا کا عظیم ناول نگار ابن صفی اب اس دنیا میں نہیں رہا۔ میری آنکھوں میں ایک دم سے اندھیرا چھا گیا اور ایسا لگا جیسے وہ میرے وجود کا ایک حصہ تھا جو چالیس سال سے میری ذات میں پیوست تھا کہ اس کے بغیر اب میں اپنے آپ کو ادھورا محسوس کرر ہا ہوں۔ اپنے آپ کو ٹوٹا ہوا دیکھ رہا ہوں۔ کاش وہ ایک لمحہ جس نے ابن صفی کی زندگی کا چراغ گل کر دیا میرے ذہن میں یادوں کی ان تمام قندیلوں کو بھی بجھا سکتا۔

آج کا ابن صفی الہ آباد کے ایک چھوٹے سے گاؤں ''نارہ'' میں صفی اللہ صاحب کے ہاں پیدا ہوا تھا جس کا نام ''اسرار احمد'' رکھا گیا۔ اس وقت ماں باپ کو کیا پتا تھا کہ جس بچے کا نام وہ اسرار رکھ رہے ہیں آگے چل کر وہ اس نام کو اپنے قلم کا عنوان بنالے گا اور اسرار ورموز کی دنیا میں اپنی تخلیقات کے ایسے چراغ روشن کرے گا جو برصغیر کے سری ادب میں ہمیشہ درخشاں رہے گا۔

ابن صفی نے ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں ''نارہ'' کے پرائمری اسکول میں حاصل کی تھی، پھر مزید تعلیم کے لئے اپنی والدہ اور چھوٹی بہن بلاغت کے ساتھ الہ آباد آ گئے تھے کیونکہ ان کے والد صفی اللہ صاحب اپنی ملازمت کے سلسلے میں زیادہ تر باہر ہی باہر رہتے تھے۔ ابن صفی کی تمام صلاحیتیں ان کی والدہ کی طرف سے وراثت میں ملی تھیں۔ اس لئے کہ ابن صفی کی ننھیال میں اہل تصنیف بھی گزرے ہیں۔ اپنے زمانے کے مشہور ومعروف حکیم احسان علی مرحوم ابن صفی کے پرنانا تھے انہوں نے طب یونانی پر متعدد کتابیں لکھی تھیں۔ اس کے علاوہ بہت اچھا ادبی ذوق بھی رکھتے تھے گھر میں کتابوں کا انبار لگا تھا۔ ابن صفی نے کتابوں کے اسی انبار میں آنکھیں کھولی تھیں۔ مطالعہ کا شوق بچپن سے ہی پیدا ہوگیا تھا۔ وہ کھیل کود کی بجائے اپنا زیادہ وقت کتابوں کے مطالعے میں صرف کرتے تھے۔ سات آٹھ سال کی عمر میں مشہور ومعروف طلسم ہوش ربا کی ساتوں جلدیں پڑھ کر ختم کر ڈالی تھیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ ابن صفی کے جوہر کھلتے چلے گئے۔ جب ابن صفی صرف ساتویں جماعت میں تھے تو ہندوستان کی پوری فضاء انقلاب کے نعروں سے گونج رہی تھی۔ انگریزوں سے ہندوستان چھوڑ دو کا مطالبہ شروع ہو چکا تھا۔ اس زمانے میں ابن صفی صرف اسرار احمد ناروی تھے انہوں نے ایک بہت اہم انقلابی نظم کہی تھی جو کافی مشہور ہوئی تھی۔ ابن صفی کی ادبی زندگی کا آغاز شاعری سے ہوا تھا' اس میدان میں بھی انہوں نے اپنی ذہانت اور انفرادیت کی تابناک شمعیں روشن کی ہیں۔ (شکیل جمالی صاحب کی یہ تحریر ابن صفی کے انتقال

کے بعد ملی تھی جو بعدازاں نئے افق کے اگست ۷۸ء کے شمارے میں شامل ہوئی تھی۔)

☆☆☆

ابن صفی نے تو صرف ایک لمحے میں اپنی زندگی کا سفر تمام کر لیا' لیکن میں تو ایک لمحے میں یادوں کی ان تمام قندیلوں کو نہیں بجھا سکتا جو چالیس سال سے میرے اندر روشن ہیں۔ کاش وہ ایک لمحہ جس نے ابن صفی کی زندگی کا چراغ گل کر دیا' میرے ذہن میں یادوں کی ان تمام قندیلوں کو بجھا سکتا لیکن یہ قندیلیں تو اب پہلے سے بھی زیادہ روشن اور تابناک ہوگئی ہیں۔

اس وقت جب میں اپنے دوست کے بارے میں کچھ لکھنا چاہتا ہوں تو میری آنکھیں یادوں کی اس تیز روشنی سے چکا چوند ہو رہی ہیں۔ کچھ نظر نہیں آ رہا کہ روشنی کے اس صحرا میں کھو جاؤں اور کہاں سے یادوں اور اس پھیلی ہوئی داستان کا آغاز کروں۔ مجھے ذرا دم لینے دیجئے' میں اپنے کو بہت زخمی زخمی محسوس کر رہا ہوں۔ ذہن کی شاہراہیں' ابھی سنسان و ویران ہیں۔ آج لفظوں کا کوئی قافلہ ادھر سے نہیں گزر رہا۔ بس درد و کرب کی تیز آندھی کے سوا کچھ بھی تو نہیں ہے۔

لیکن ذرا ٹھہریے مجھے آپ کے کرب کا' احساسات کا' بھی پوری طرح اندازہ ہے۔ آپ بھی اسی کرب سے گزر رہے ہوں گے جس سے میں گزر رہا ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ آپ اپنے اس محبوب ترین مصنف کے بارے میں ضرور کچھ نہ کچھ جاننا چاہتے ہیں۔

ابن صفی جن کی کہانیاں آپ اٹھائیس سال تک پڑھتے رہے ہیں۔ جس کے دل کش اسلوب اور سحر انگیز طرزِ بیان سے لطف اندوز ہوتے رہے ہیں جس کے دلچسپ مزاحیہ جملوں پر آپ قہقہے لگاتے رہے ہیں۔ جس کے تخیل کی بلند پروازوں پر حیرت کرتے رہے ہیں جس کے جیتے جاگتے کرداروں کی دھڑکنیں اپنے دلوں میں محسوس کرتے رہے ہیں اور تجسس کی ان دلچسپ وادیوں کی سیر کرتے رہے ہیں جہاں پہنچ کر خود اپنے آپ کو بھول جاتے تھے۔

۱۹۴۸ء میں جب برادرِ محترم عباس حسینی صاحب نے ماہنامہ نکہت الہ آباد کی داغ بیل ڈالی تو ابن صفی ابتدا سے ہی ہماری ٹیم میں شامل ہو گئے اور پھر ۱۹۵۳ء تک وہ باقاعدہ ماہنامہ نکہت الہ آباد کے مدیر معاون رہے۔ وہ اس ماہنامے سے ہی غزلوں' نظموں اور کہانیوں کے علاوہ اپنے قلمی نام طغرل فرغان کے نام سے طنزیہ و مزاحیہ مضامین لکھنے لگے جب یہ سلسلہ شروع کیا تو اس دور کے اہل نظر چونک اٹھے اور انہیں ابن صفی کے غیر معمولی صلاحیتوں کا اعتراف کرتے بنی۔

ابن صفی نے الہ آباد ایوننگ کرسچین کالج سے انٹر میڈیٹ پاس کیا تھا اور ۱۹۴۷ء میں مزید تعلیم (بی اے سال اول) کے لئے الہ آباد میں کچھ ایسے حالات پیدا ہوئے کہ وہ الہ آباد یونیورسٹی میں اپنی تعلیم جاری نہ رکھ سکے اور بعد میں انہوں نے آگرہ یونیورسٹی سے بی اے کیا۔

ابن صفی کی تہہ دار شخصیت' مختلف خوبیوں اور صلاحیتوں کی حامل تھی۔ شاعر' ادیب' طنز نگار ہونے کے

ساتھ ساتھ ان کے اندر درس وتدریس کا بھی خاص ملکہ تھا۔ ۱۹۴۹ء سے ۱۹۵۳ء تک یادگار حسینی اسکول الہ آباد میں وہ ٹیچر تھے۔ آج بھی یہ تعلیمی ادارہ ان کی زریں خدمات کا اعتراف کرتا ہے۔ ستائیس سال کا طویل عرصہ گزر جانے کے بعد بھی ابن صفی کی موت کی خبر سنتے ہی یادگار حسینی انٹر کالج نے ایک تعزیتی جلسے کے بعد اپنے سابق مدرس ابن صفی کے سوگ میں ایک دن کالج بند کر دیا تھا۔

......☆☆☆......

ابن صفی کے متعلق بعض بڑے ادیبوں کا یہ کہنا تھا کہ اگر ابن صفی جاسوسی ناولوں کے چکر میں نہ پڑتے اور "خاص ادب" لکھتے تو آج وہ بہت بڑے ادیب ہوتے۔ شاید کرشن چندر، منٹو، راجندر سنگھ بیدی، خواجہ احمد عباس، کی صف میں کھڑے نظر آتے۔ اس بحث سے قطع نظر بقول جون ایلیا بابائے اردو مولوی عبدالحق کا ایک جملہ ہی ابن صفی کو بڑا ادیب ثابت کرنے کے لئے کافی ہے انہوں نے کہا تھا "اردو پر ابن صفی کا بہت بڑا احسان ہے۔"

حالانکہ ابن صفی اپنی شہرت وناموری اور مقبولیت میں ان تمام محترم ناموں سے جو ادب کی بلندی کے حوالے سے گنوائے جاتے ہیں کہیں زیادہ مقبول اور مشہور ہیں۔ ابن صفی مقبولیت کے بلند ترین مقام پر کھڑے ہیں جو انہوں نے اپنی خداداد صلاحیتوں سے حاصل کیا ہے وہ کسی ستائش باہمی کے نہ قائل تھے نہ خود انہوں نے ایسا کیا۔

بعض ادیبوں نے جو ادب کے حوالدار سمجھے جاتے ہیں نے ابن صفی کے ناولوں کو سستی تفریح کہہ کر مذاق اڑانے کی مذموم کوشش کی ہے۔ حالانکہ ابن صفی صاحب نے اپنے ناولوں میں زندگی کے جتنے اہم پہلوں پر جس طرح قلم اٹھایا ہے اس کے بارے میں شاید یہ نام نہاد ادیب سوچ بھی نہ سکتے ہوں۔ انہوں نے معاشرے کے برے انسانوں کو بے نقاب کر کے برائی سے نفرت کرنے اور برائیوں سے دور رہنے کی ہمیشہ تلقین کی ہے۔ ابن صفی نے سماج کے گھناؤنے کرداروں کو اپنے ناولوں میں اسلئے پیش کیا تا کہ لوگ عبرت حاصل کر سکیں اور ان سے بچ سکیں۔ کسی با مقصد و باشعور ادیب کا فرض اس سے زیادہ کیا ہوگا؟

ادبی حلقے ادبی دائرے ابن صفی کو بحیثیت ادیب قبول کریں یا نہ کریں خود ابن صفی کبھی اس چکر میں نہیں پڑے نہ انہوں نے خود کو ادیب منوانے کی کبھی کوئی کوشش کی۔ ابن صفی صاحب بڑے فخر سے کہا کرتے تھے کہ جغادری ادیبوں کی کتابیں بند الماریوں میں ملتی ہیں اور میری کتابیں لوگوں کے سرہانے ملتی ہیں۔ یہ حقیقت بھی اپنی جگہ اٹل ہے کہ بہت سے لوگوں نے ابن صفی کے ناولوں کی دلچسپی اور تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر اردو پڑھنا سیکھی اور ایسا واقعہ خود میرے گھر میں پیش آیا کہ ہمارے گھر کا ایک ملازم لڑکا جسے قطعی کچھ پڑھنا لکھنا نہیں آتا تھا کبھی اس نے اسکول کا منہ نہیں دیکھا تھا۔ جب وہ مجھ میں اور میری بڑی بہن میں ابن صفی کے ناول کے لئے کھینچا تانی دیکھتا اور بہن اسے بازار سے دوسری کتاب منگوانے بھیجتی تو وہ حیران ہوتا اور پوچھتا آخر ایسی کیا کتاب ہے کہ جس کے لئے یہ دو بہن بھائی جو کسی بڑی سے بڑی بات پر تکرار نہیں کرتے اس کتاب کے لئے بحث پر اتر آتے ہیں۔ ایک روز اس نے اپنے اسی تجسس کے ہاتھوں میری بہن

سے یہ طے کرلیا کہ کتاب لائبریری سے وہ اس شرط پر لا کر دے گا کہ اسے بھی پڑھ کر سنائی جائے۔ بہن نے اس کی یہ شرط منظور کرلی اس طرح ہم بہن بھائی کی تکرار تو ختم ہوگئی لیکن کتاب لانے والے کا اسرار بڑھ گیا جب بہن کا موڈ کتاب پڑھنے کا ہوتا وہ اسے ٹہلا دیتیں وہ بے چین ہو کر آئندہ کتاب نہ لانے کی دھمکی دیتا، روز روز کی پریشانی کا حل اس نے یہ نکالا کہ پہلے اخبار میں شائع ہونے والے فلمی اشتہار پوچھ پوچھ کر پڑھنا شروع کیا پھر ہم سب گھر والوں نے دیکھا کہ اپنا کام ختم کرنے کے بعد ابن صفی کا نیا ناول لئے بیٹھا پڑھ رہا ہے۔ بہن نے پہلے تو اس کا خوب مذاق اڑایا شاید ان کا خیال ہوگا کہ اس طرح وہ نیا ناول انہیں دے دے گا لیکن وہ پڑھتا رہا آخر تنگ کر بہن نے کہا کچھ پڑھنا بھی آتا ہے یا صرف تنگ کرنے کے لئے کتاب لئے بیٹھا ہے۔ لا مجھے دے میں سنا دیتی ہوں۔ اس پر اس نے اٹک اٹک کر خود ناول پڑھ کر سنانا شروع کر دیا۔ یہ واقعہ جب میں نے ابن صفی صاحب کو سنایا تو انہیں ایک مسرت آمیز حیرت ہوئی تھی اور یہ حقیقت ہے ابن صفی کی وجہ سے بہت سے لوگوں کی اردو درست ہوگئی۔ بہت سوں کو اردو پڑھنا آ گئی۔ ناروے کے ڈاکٹر فین تھیسن نے بھی اقرار کیا ہے۔

ابن صفی کے ناولوں کی ایک بڑی خوبی یہ بھی ہے کہ وہ ہر ذوق کی تسکین کا سامان مہیا کرتے تھے۔ ہر طبقہ فکر کا قاری ان کے ناول پڑھ کر مسرت محسوس کرتا تھا۔ مایوسی کا شکار نہیں ہوتا تھا۔ اپنے ناولوں میں انہوں نے ایڈونچر، سیر و سیاحت، ...... سائنس، فکشن غرض جاسوسی ادب کے حوالے سے فحاشی عریانی کے علاوہ وہ سب کچھ پیش کیا جو پڑھنے والوں کے دلوں کو چھو لیتا تھا وہ کہانی کو اس قدر دلچسپ اور تجسس آمیز بنا دیتے تھے کہ ان کا قاری ان کی تحریر میں گم ہو جاتا اور فکرِ دنیا سے چند لمحوں کے لئے ہی سہی آزادی محسوس کرتا۔

۱۹۵۲ء میں ابن صفی کراچی آئے تھے الہ آباد میں انہوں نے جاسوسی دنیا کے صرف سات ناول لکھے تھے جس زمانے میں ابن صفی ماہنامہ نکہت الہ آباد کے معاون مدیر تھے اور شعبہ نظم اور طنز و مزاح کو دیکھتے تھے ان کے ساتھ ہی شعبہ نثر کے معاون مدیر ابن سعید تھے جن کا اصل نام سید مجاور حسین ہے انہوں نے بہت بعد میں الہ آباد یونیورسٹی سے اردو شاعری میں قومی یکجہتی کے عنوان سے مقالہ تحریر کر کے پی ایچ ڈی کی سند حاصل کی اور رومانی دنیا کے بہت سے ناول تحریر کئے۔ ابن صفی صاحب نے ۱۹۵۶ء میں عمران سیریز لکھنا شروع کیا اس وقت تک ابن صفی کے جاسوسی دنیا کے ناول ہندو پاکستان میں دھوم مچا چکے تھے۔ ان کی تحریر کی یہ بڑی خوبی تھی کہ ان کے کردار حمید، فریدی، انور رشیدہ، قاسم اور تو اور کچھ مجرم تک ہمارے معاشرے کے جانے پہچانے محسوس ہوتے۔ ابن صفی کے ناولوں کی یہ بڑی خوبی ہے جو ان کی تحریروں کو سب سے منفرد کرتی ہے تمام لکھنے والے ناول کے پلاٹ میں اپنے کرداروں کو گردش دیتے ہیں جبکہ ابن صفی اپنے کرداروں کے گرد کہانی بنا کرتے تھے۔ ان کی یہ نہ صرف خوبی تھی بلکہ ندرت بھی تھی کہ ان کے کردار کہانی کو آگے بڑھاتے ہوئے چلتے تھے جبکہ دیگر لکھنے والوں کے یہاں کہانی کرداروں کو آگے لے کر چلتی ہے۔

ابن صفی کے تمام اہم کردار چاہے وہ فریدی اور حمید کا ہو یا عمران کا۔ ابن صفی نے قانون کی حکمرانی اور

پاسداری کا ایک خاص مزاج بنایا ہے ان کا کام سراغ رسانی کر کے مجرم کو پکڑ کر قانون کے حوالے کر دینا ہے۔
ابن صفی کے ناولوں کو اگر اصلاحی نقطہ نگاہ سے دیکھا جائے تو ان کی تمام تحریروں کا مرکزی خیال ہمیشہ یہی رہا کہ مجرم خواہ کتنا ہی بااثر اور قوی کیوں نہ ہو کتنا ہی چالاک ہوشیار کیوں نہ ہو اسے آخر ایک نہ ایک دن قانون سے مات کھانا ہی پڑتی ہے اور وہ کیفر کردار کو پہنچ جاتا ہے۔

ابن صفی جاسوسی ناول نگار ہونے کے ساتھ ساتھ ماہر نفسیات بھی تھے۔ انہوں نے اپنے بیشتر ناولوں میں انسانی نفسیات کا بہت اچھا تجزیہ پیش کیا ہے۔ جن ناولوں میں انہوں نے انسانی نفسیاتی مسائل پر لکھا ہے بہت خوب لکھا ہے انہوں نے بعض نفسیاتی کردار بھی تخلیق کیے جو نفسیاتی الجھنوں کا شکار تھے۔ ابن صفی اپنی طنزیہ مزاحیہ تحریروں سے اپنے قارئین کو زندگی کے حقائق سے نہ صرف باخبر کرتے ہیں بلکہ انہیں سمجھنے اور سلجھانے کی فکر بھی دیتے ہیں۔ ان کے مکالمے کی نشتریت' ذہانت' معلومات اور غور وفکر کی دعوت دیتی ہے۔ جب کبھی ان کے کسی قاری نے ان پر کوئی تحقیقی کام کیا یا ڈاکٹریٹ کی سند کے لئے کوئی مقالہ تحریر کیا تو وہ اردو میں طنزیہ ادب میں ابن صفی کے کام کو اور ایک نئے دور کے آغاز سے پہلو تہی نہیں کر سکے گا۔ (بہاولپور یونیورسٹی کے خورشید احمد وٹو صاحب نے ابن صفی پر ایک مقالہ لکھنے کا عزم کیا تھا پھر پتہ نہیں چلا......؟)

......☆☆☆......

''اردو کو زندہ رکھنے میں ابن صفی کا بڑا اہم کردار ہے۔ ابن صفی نے مزاح اور تجسس (سسپنس) کو یکجا کر کے ایک بہت بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔ اس معاملے میں دنیا بھر میں ان کا کوئی ثانی نہیں۔ یہ بات میں اس لئے کہہ سکتا ہوں کہ میں نے بین الاقوامی ادب کا مطالعہ کیا ہے۔'' اور اپنے جرائد نئے افق' نیا رخ' ایکشن' حجاب میں بے شمار انگریزی سراغ رسانی کی کہانیوں کے تراجم شائع کیے ہیں اور یہ بات اوسلو یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے پروفیسر فین تھیسن نے بھی کہی تھی جب وہ ۱۹۸۶ء میں پاکستان آئے تھے۔ انہوں نے تقریباً بیس مختلف زبانوں میں ایم اے کیا تھا جن میں دیگر زبانوں کے ساتھ ساتھ ہندی' اردو اور فارسی بھی شامل ہیں۔ ان کی ہی کوشش سے اوسلو یونیورسٹی ناروے میں شعبہ اردو قائم ہوا' ان کا کہنا ہے کہ ابن صفی کا کمال یہ ہے کہ وہ ایسی آسان اردو لکھتے ہیں جو لغت کے بغیر آسانی سے پڑھی اور سمجھی جا سکتی ہے۔ ایسی اردو جسے انگریزی میں لائٹ اردو کہیں گے۔

ڈاکٹر فین تھیسن نے اپنی اردو تعلیم کراچی یونیورسٹی سے ایم اے کر کے پوری کی تھی۔ ڈاکٹر ابوالخیر کشفی صاحب بھی کسی حد تک ہی سہی ان کے اساتذہ میں شامل تھے۔ انہوں نے ہی ڈاکٹر فین تھیسن کی اردو سے دلچسپی دیکھتے ہوئے انہیں آسان اور رواں اردو کے حوالے سے ابنِ صفی کے ناول خصوصاً عمران سیریز پڑھنے کا مشورہ دیا تھا۔ فین تھیسن نے نہ صرف ابن صفی کی عمران سیریز کا مطالعہ کیا بلکہ وہ اس قدر متاثر ہوئے کہ ان کا کہنا تھا کہ ابن صفی کی تحریروں کو بین الاقوامی طور پر کسی بھی زبان کے مقابلے میں رکھا جا سکتا ہے۔ ابن صفی بہت بڑے ہنرمند ہیں۔ اگر کوئی اچھا مترجم مل جائے جو ان کی کتابوں کا ترجمہ انگریزی میں کر سکے تو ان کا

بہترین ادب میں شمار کیا جائے گا مگر مجھے شک ہے کہ کوئی ایسا اعلیٰ ترجمہ کرنے والا مل سکے' کیونکہ ابن صفی کے طنز و مزاح کا جو انداز ہے اسے ترجمہ کرنے کے لئے مترجم کا اہل زبان ہونا لازمی ہے۔ یعنی کوئی پاکستانی یا ہندوستانی جسے اچھی سے اچھی انگریزی آتی ہو۔ مگر وہ بھی صحیح ترجمہ نہیں کر سکے گا اور جو انگلینڈ کے اہل زبان ہیں ان میں بھی ایسا شخص کہاں مل سکے گا' جسے اردو بھی اچھی آتی ہو اور وہ اس کام میں دلچسپی بھی لے۔

پروفیسر نے کچھ سوچتے ہوئے کہا' ابن صفی ایک ایسے ہنر مند ادیب ہیں جنہوں نے لوگوں کی تفریح کے لئے لکھا ہے یعنی تفریحی ادب لکھا ہے۔ کچھ دن پہلے میری کراچی یونیورسٹی میں شعبہ اردو کے ڈاکٹر ابوالخیر کشفی صاحب سے بات ہوئی تھی۔ انہوں نے بھی یہ کہا تھا کہ ابن صفی کا اردو ادب میں بہت بڑا حصہ ہے' میرے خیال میں اردو ادب میں ان کی بہت بڑی اہمیت ہے' کیونکہ مجھے بہت سے اچھے شاعروں' پروفیسروں سے ملنے کا اتفاق ہوا ہے جن کا کہنا ہے کہ وہ جب بھی تفریح کے طور پر کچھ پڑھنا چاہتے ہیں تو ابن صفی کو پڑھنا پسند کرتے ہیں اور کچھ تو ایسے بڑے ناموں کے لوگ ملے جنہوں نے کہا کہ انہوں نے ابن صفی کی ساری ناولیں پڑھی ہیں۔ ان میں ڈاکٹر ابوالخیر کشفی صاحب تو سرفہرست ہیں اور ایک شاعر ہیں شمیم بلگرامی انہوں نے بھی یہی کہا تھا۔ اور بھی کئی پروفیسر ہیں جن سے بات ہوئی تھی لیکن اس وقت مجھے ان کے نام یاد نہیں آرہے۔

اردو ادب پر ابن صفی کا بہت اثر ہے میں سمجھتا ہوں کہ اردو کی حفاظت کے لئے جو خدمات ابن صفی نے انجام دیں ہیں وہ بڑے بڑے بلند مقام ادیب بھی انجام نہیں دے سکے اور یہ بھی کہ اگر کسی نے ابن صفی کی ساری کتابیں پڑھی ہیں تو وہ چاہے یا نہ چاہے لیکن اس کی زبان اور تحریر پر ان کا اثر ضرور پڑے گا کیونکہ جب آپ ایک مصنف کے ہزاروں صفحات پڑھیں گے تو آپ کی زبان اور تحریر اس کا اثر ضرور قبول کرے گی۔

بہت سے اردو ادب کے شائق کہتے ہیں کہ ان پر ادب کا دروازہ ابن صفی نے کھولا۔ انگریزی کے ایک پروفیسر صاحب نے کہا کہ میں جب جوان تھا تو کچھ نہیں پڑھتا تھا لیکن جب کسی طرح ایک بار ابن صفی کو پڑھا تو پھر پڑھنے کی ایسی عادت پڑی کہ میں اور دوسری کتابیں بھی پڑھنے لگا۔

خود پروفیسر نین تھیسن نے اپنے بارے میں بتایا کہ انہوں نے ابن صفی کو کیسے پڑھنا شروع کیا وہ کہتے ہیں کہ جب میں پہلی بار کراچی آیا تو لوگوں سے ملنے جلنے اِدھر اُدھر نہیں دوڑا بلکہ جو لوگ خود سے ملتے گئے میں ملتا رہا یوں میری خاصی جان پہچان ہوگئی' کراچی آئے ہوئے میرا دوسرا یا تیسرا دن تھا کہ میں دو تین کتابوں کی دکانوں میں گیا میں نے دکانداروں سے پوچھا کہ آپ کا پسندیدہ مصنف کون ہے یا آپ کسے پڑھنا پسند کرتے ہیں دو نے تو کہا ہم پڑھتے نہیں صرف کتابیں بیچتے ہیں جبکہ تیسرے نے کہا کہ میں عمران سیریز پڑھتا ہوں۔ میں نے اس سے پوچھا کہ عمران سیریز کہاں ہے انہوں نے مجھے کچھ کتابیں عمران سیریز کی دکھائیں تو میں نے سوچا کہ انہیں میں بھی پڑھ کر دیکھوں کہ یہ کیا چیز ہے۔ کیونکہ مجھے اردو سیکھنے اور رواں کرنے کے لئے کوئی نہ کوئی ہلکی پھلکی چیز جسے میں آسانی سے پڑھ سکوں کی ضرورت تھی' کیونکہ میں ابھی اردو سیکھنے کے بالکل ابتدائی مرحلے میں تھا۔ میں نے چند کتابیں عمران سیریز کی خرید لیں۔ اس کا پہلا شمارہ پڑھنے

میں مجھے چھ دن لگے کیونکہ مجھے بار بار لغت استعمال کرنے کی ضرورت پڑ رہی تھی کیونکہ میری اردو بالکل ابتدائی مرحلہ میں تھی۔ پہلے شمارے میں یہ تو سمجھ گیا تھا کہ کہانی کیا ہے اور کیا ہوا ہے لیکن اب میں آسانی سے سب کچھ پڑھ لیتا ہوں اردو پڑھنے میں اور سیکھنے میں ابن صفی کی کتابوں نے میری بڑی مدد کی ہے۔ جو کچھ میری اردو میں روانی آئی ہے وہ ابن صفی کی وجہ سے آئی ہے۔

ڈاکٹر فین تھیسن سے بھی کشفی صاحب نے ہی میری ملاقات کا بندوبست کیا تھا۔ وہ بھی اس لئے کہ نہ صرف وہ خود ابن صفی کے پڑھنے والے چاہنے والے تھے اور جب ان کے سامنے ایک ایسا زندہ چلتا پھرتا کردار سامنے آیا جس نے ابن صفی کے ناولوں کے ذریعے نا صرف اپنی اردو کی اصلاح کی بلکہ اپنی زبان و بیان کی درستگی کا سہرا وہ ابن صفی کے سر باندھتا ہے۔ اگر دیکھا جائے تو یہ بھی کشفی صاحب کی ابن صفی سے محبت کا ایک برملا اظہار تھا۔

ڈاکٹر فین تھیسن کا کہنا تھا کہ ابن صفی ایک بڑے تفریحی ناول نگار تھے اگر ہم ان کا موازنہ بین الاقوامی شہرت یافتہ اگاتھا کرسٹی سے کریں تو ابن صفی کی کتابوں میں دو ایک پہلو ایسے ہیں جو اگاتھا کرسٹی کے یہاں نہیں ہیں۔ ایک تو طنز و مزاح' دوسرا کارنامہ جو شاید ان سے پہلے کسی نے بھی انجام نہیں دیا وہ ہے مزاح اور سسپنس کو یکجا کرنا۔ اکثر ہوتا ہے کہ لوگ اگر مزاح لکھتے ہیں تو اس میں سسپنس نہیں ہوتا' اور سسپنس لکھتے ہیں تو مزاح نہیں ہوتا۔ ابن صفی کی کامیابی کی بڑی وجہ ان کی آسان اور رواں اردو بھی ہے۔

اپنے ناولوں میں سسپنس تو غالباً ابن صفی نے مغرب کے نالوں سے لیا ہو میں اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا ہاں یہ کہہ سکتا ہوں کہ وہ مغربی ادب سے واقف تھے اور اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ ایسے ناول نہ لکھ پاتے۔ ویسے ان کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے اپنے اسلوب سے اس میں جدّت پیدا کی لیکن سسپنس کے ساتھ مزاح کو شامل کرنا یہ ان ہی کا کام ہے بلکہ کارنامہ ہے کیونکہ ایسا میں نے بین الاقوامی ادب میں بھی نہیں دیکھا۔

میرا خیال ہے کہ میں ناروے جا کر اپنی یونیورسٹی میں اپنے طلبہ کو ابن صفی کے ناولوں سے اقتباسات نصاب میں شامل کر کے پڑھا سکتا ہوں مثلاً حماقت کے جال کا پہلا باب' احمقوں کی انجمن سے ہم الگ کر کے پڑھا سکتے ہیں کیونکہ ہمارے طلبا کو دو سال میں اردو سیکھنا ہوتی ہے۔

اگر وقت ملا تو میں ابن صفی پر ایک مقالہ لکھنا چاہتا ہوں یا ہو سکتا ہے کہ میں ان کی زندگی اور فن پر ایک کتاب بھی لکھوں۔

(میری کتاب دو بڑے سے ماخوذ)

ابن صفی! مطالعہ فن

ڈاکٹر سیدہ جعفر (بھارت)

جاسوسی ناول کی اہمیت یہ ہوتی ہے کہ وہ زندگی کے رنگارنگ اور بوقلمونی تجربات پر محیط ہوتا ہے اور قاری کو ایک ایسی بصیرت و آگہی عطا کرتا ہے کہ اس کی اہمیت کو عملی زندگی میں نظرانداز نہیں کیا جاسکتا' ہر ادب میں جاسوسی ناولوں کی مقبولیت کا راز اس کے شگفتہ طرز تحریر' فکشن کے موثر انداز اور پلاٹ کی تنظیم و ترتیب اور اس کی غیر معمولی دلچسپی اور جاذبیت' اس کے مہماتی مزاج اور تحیر و تجسس کے عنصر میں مضمر ہوتا ہے۔ اردو کے اکثر نقادوں نے جاسوسی ناولوں کو درخور اعتنا نہیں سمجھا ہے جس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ ایسے ناول کو عصری حسیّت' نئی تکنیک کی کرشمہ سازی' فنی ذکاوت اور جامعیت سے عاری دوسرے درجے کی ایسی تخلیق تصور کیا جاتا رہا کہ جس کا مقصد سستی تفریح ہو' اردو میں اچھے جاسوسی ناول نگاروں کے نام انگلیوں پر گنے جاسکتے ہیں۔

ابن صفی' ہماری زبان کے ان چند ناول نگاروں میں سے ہیں جنہوں نے جاسوسی ناول نگاری کے تقاضوں کو بھی ملحوظ رکھا ہے اور سماجی مسائل کے تناظر میں جرم اور اس کے محرکات کا تجزیہ کرنے کی کوشش کی ہے' ابن صفی کا ہر ناول' سماج دشمن عناصر کی مجرمانہ سرگرمیوں کو بے نقاب کرتا ہے اور ان کے غیر قانونی رویے کے خلاف ایک کھلا چیلنج ہوتا ہے۔ ان کے ناولوں میں ایسے افراد دو صورتوں میں نمودار ہوتے ہیں۔ کبھی اپنے صحیح خدوخال کے ساتھ اور کبھی عظمت و شرافت کے لبادے میں لیکن ابن صفی ان کے ''انداز قد'' سے خوب واقف ہیں۔

بہر رنگی کہ خواہی جامہ می پوش
من انداز قدرت رامی شناسم

ابن صفی ان کی سیاہ کاریوں کا پول کھول کر انہیں بے نقاب کردیتے ہیں۔ جاسوسی ناول نگار اپنے قاری کو زندگی کی ایسی وادیوں کی سیر کراتا ہے کہ جن میں دوسرے ناول نگار قدم رکھتے ہوئے گھبراتے ہیں۔ یہ تحیر' معرکہ آرائی' غور و فکر اور تجسس ابن صفی کی کامیابی کا راز ہے' جہاں سچائی کی جیت ہوتی ہے اور باطل اپنے گناہوں اور جرائم کی گراں باری کے ساتھ دفن ہوجاتا ہے۔ یہ جاسوسی ناول کا سماجی اور افادی پہلو ہے جس کو اکثر نظر انداز کردیا گیا ہے۔

ابن صفی نے ۱۹۵۲ء میں الہٰ آباد سے شائع ہونے والے ماہنامہ ''جاسوسی دنیا'' میں ناول لکھنے شروع کیے۔ پروفیسر اعجاز حسین نے ''اردو ادب آزادی کے بعد'' میں ان کا ذکر بڑے اچھے الفاظ میں کیا ہے۔ جاسوسی ناولوں میں ابن صفی کی انفرادیت ہے کہ انہوں نے اسے مزاح کی چاشنی سے آشنا کیا ہے۔ ہمارے بیشتر ناولوں میں مہم جو کردار' سنجیدہ کردار' اور مزاحیہ کردار کا مقام علیحدہ علیحدہ ہوتا ہے۔ ابن صفی نے اپنے جاسوسی ناولوں میں مزاحیہ کرداروں کی پیش کش سے دو مختلف کام لیے ہیں۔ ایک تو تلاش تجسس کے دوران سنجیدگی کے اثرات کو کم کرنے اور دوسرے

پلاٹ میں واقعات کی کڑیاں جوڑنے کے لیے ان کرداروں سے ابن صفی نے بڑی چابکدستی سے کام لیا ہے۔

ابن صفی کا ایک وصف جو ان کے جاسوسی ناولوں کی کامیابی کا ضامن ہے وہ ان کا سنجیدہ طرز بیان اور وہ مزاحیہ انداز ہے جس سے قاری کو فطری طور پر دلچسپی ہوتی ہے۔ ابن صفی نے اپنے ناولوں کے لیے چند کردار منتخب کر کے ان سے کچھ ایسی خصوصیات منسوب کر دی ہیں جو ہر ناول میں ان کی سیرت کی پہچان بن کر ظاہر ہوتی ہیں۔ قاسم، عمران، فریدی اور حمید ڈھلے ڈھلائے کردار ہیں اور جونہی یہ ناول میں نمودار ہوتے ہیں، ہم ان کے رول اور کارکردگی کا اندازہ لگا لیتے ہیں اور اس کے منتظر رہتے ہیں کہ اس ناول میں یہ کون سی مہم سر کرتے ہیں اور کس مجرم کو قانون کی روشنی میں لا کھڑا کرتے ہیں۔ ان کا قاری ان کے کرداروں سے اچھی طرح واقف ہوتا ہے اور اس موانست نے بھی ابن صفی کے ناولوں کی ہر دلعزیزی میں اضافہ کیا ہے۔ اس سے انکار ممکن نہیں ہے کہ ابن صفی کو جتنے بے شمار پرستار اور قاری ملے ہیں وہ اردو کے بہت کم مصنفین کے حصے میں آئے ہیں۔

ابن صفی کی زبان بڑی شستہ، رواں اور ٹکسالی ہے...... بالعموم جاسوسی ناولوں میں طرز اظہار کے اس پہلو پر بہت کم توجہ مبذول کی جاتی ہے ابن صفی کی معیاری زبان، ان کے برجستہ مکالمے اور ان مکالموں میں ظرافت کے چٹخارے نے بھی جاسوسی دنیا کو بے پناہ مقبولیت عطا کی تھی۔ دشمنوں کا شہر'' ''خوفناک ہنگامہ'' اور ''لاشوں کا آبشار'' ابن صفی کے ایسے ناول ہیں جنہیں ہم جاسوسی ناولوں کی صف اول میں جگہ دے سکتے ہیں۔

اردو کے جاسوسی ناولوں کے ابتدائی دور میں ظفر عمر کا نام خاصی اہمیت رکھتا ہے۔ انہوں نے نیلی چھتری، جیسے ناول پیش کر کے داد تحسین حاصل کی تھی۔ تیرتھ رام فیروز پوری نے انگریزی کے مشہور جاسوسی ناولوں کو اردو میں بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ منتقل کیا ہے۔ ابن صفی کا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے طبعزاد جاسوسی ناول لکھے ہیں اور اپنی گرد و پیش کی دنیا سے ان کا مواد اکٹھا کیا اور اپنے کردار منتخب کر کے اپنے ناولوں میں واقعیت اور حقیقت پسندی کا اضافہ کیا۔

ابن صفی نے چند مہماتی ناول بھی اپنی یادگار چھوڑے ہیں جو انگریزی کے مقبول ناول نگار ''رائیڈر ہیگرڈ'' کے ناولوں کی یاد دلاتے ہیں۔ ان ناولوں میں ابن صفی رائیڈر ہیگرڈ'' کی طرح ایک مہم پسند انسان نظر آتے ہیں، جن کا ذوق جستجو حیرت انگیز انکشافات کا باعث بنتا ہے اور قاری کو ایک نئی دنیا میں پہنچا دیتا ہے......

ابن صفی کے ایسے حیرت انگیز ناولوں میں ''پہاڑوں کی ملکہ، بھیانک جزیرہ اور خونی بگولے'' بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ ابن صفی رائیڈر ہیگرڈ سے متاثر نظر آتے ہیں۔ ابن صفی اگاتھا کرسٹی کے ہم پایہ مصنف ہیں لیکن ان کے شاہکار جاسوسی ناولوں کا مقابلہ کانن ڈائل، گارڈنر، ایڈگر ویلس، فلیمنگ، اور جیمس ہیڈلے چیز کے ناولوں سے کیا جا سکتا ہے۔

ابن صفی اس لیے بھی ایک اچھے جاسوسی ناول نگار ہیں...... کہ انہوں نے قانون کی عظمت اور سماجی قوانین کی افادیت کا احساس دلانے کی کوشش کی ہے۔ جیمس ہیڈلے چیز کی طرح انہوں نے تلذذ پرستی سے سروکار نہیں رکھا اور مجرم کو قابل تقلید ہیرو بنا کر پیش نہیں کیا۔ وہ اپنے تمام ناولوں میں غیر سماجی عناصر سے برسر پیکار دکھائی دیتے ہیں۔ اس لیے ان کے ناولوں کی سماجی حیثیت سے بھی انکار ممکن نہیں ہے۔

ابن صفی کون؟

محمد عارف اقبال، مدیر اردو بک ریویو، دہلی

ابن صفی کون ہیں؟ یہ سوال کبھی کسی اردو کے نقاد نے بھی کیا تھا لیکن نئی نسل کی جانب سے بھی یہ سوال متواتر کیا جاتا رہا ہے۔ اگر واقعی اس سوال کا جواب نئی نسل کو مل جاتا تو شاید ابن صفی مرحوم اور ان کی تخلیقات کے لیے
''اسحاق برراؤ (Isaac Barrow, 1630-1677) مشہور یہودی سائنس داں تھا اور مشہور عالم یہودی سائنس داں اسحاق نیوٹن (Isaac Newton, 1643-1727) کا اصل استاذ اور اس سے صرف تیرہ سال بڑا تھا۔ اس کی یہودیوں کے لیے سائنس کی تحقیق میں بڑی خدمات ہیں۔ لیکن یہودی آج تک اس کا فیصلہ نہیں کر سکے کہ اس کے دو کارناموں میں زیادہ بڑا کارنامہ کون سا ہے۔ اس کا پہلا کارنامہ تھا سائنس میں نادر تحقیق اور اسحاق نیوٹن جیسی شخصیت کو سائنس کی تعلیم دینا۔ اور اس کا دوسرا کارنامہ تھا 1669 میں کیمبرج یونیورسٹی میں لوکیسین پروفیسر (Lucasian Professor) کے منصب سے ازخود استعفیٰ دے دینا تا کہ اس کا شاگرد نیوٹن اس پر فائز ہو سکے۔ جبکہ خود اس وقت اس کی عمر 39 سال اور شاگرد کی عمر 26 سال تھی۔'' (معرکہ دجال اکبر' تفکیر' تدبیر اور تعمیل' صفحہ 159-158 'اگست 2004)

ابن صفی کی حیات میں زیادہ سے زیادہ دولت کمانا اور مال جمع کرنے کی کوئی حیثیت نہ تھی۔ وہ فتنۂ مال میں کبھی مبتلا نہیں ہوئے اور اپنے شفاف اخلاق و کردار سے اس سے بچنے کی تلقین کرتے تھے۔ وہ صحیح معنی میں ایک درویش صفت انسان تھے۔ وہ چاہتے تو ان کی حیات میں ہی ان کے ناولوں کے ترجمے بین الاقوامی زبانوں میں ہو سکتے تھے لیکن انہیں اردو زبان و ادب سے زیادہ عشق تھا جس کی ترقی اور تطہیر و تزکیہ کے لیے انہوں نے ''جاسوسی ادب'' کو ذریعہ اظہار بنایا تھا۔ وہ تو کہتے تھے کہ ''میں اسے سب سے بڑی دولت سمجھتا ہوں کہ جب میں سونے کے لیے لیٹوں تو مجھے فوراً نیند آ جائے'' (پیش رس' ناول مہکتے محافظ)۔ اسی طرح انہوں نے معاشرے میں بداعتدالیوں اور ظلم و فساد کو دیکھتے ہوئے قانون کے احترام پر خصوصی توجہ دی ہے۔ ابن صفی کے الفاظ میں ''...یہ میرا مشن ہے کہ آدمی قانون کا احترام کرنا سیکھے...اور جاسوسی ناول کی راہ میں نے اسی لیے منتخب کی تھی۔ تھکے ہارے ذہنوں کو تفریح بھی مہیا کرتا ہوں اور انہیں قانون کا احترام کرنا بھی سکھاتا ہوں۔ فریدی میرا آئیڈیل ہے جو خود بھی قانون کا احترام کرتا ہے اور دوسروں کو بھی قانون کا احترام کرانے کے لیے اپنی زندگی تک داؤ پر لگا دیتا ہے۔'' (میں نے لکھنا کیسے شروع کیا؟ از ابن صفی)

واضح ہو کہ یہاں ابن صفی نے قانون کے احترام کے ساتھ ایک ایسے کردار فریدی کا تصور پیش کیا ہے جو خود ان کا آئیڈیل ہے۔ قانون کے احترام پر میں نے حال ہی میں لکھا ہے کہ اسے محض ملکی یا بین الاقوامی قانون

(زمینی) تصور نہ کیا جائے بلکہ اس میں ''قانونِ قدرت'' بھی شامل ہے۔(حرف آغاز،ابن صفی۔مشن اور ادبی کارنامہ، 2013) ابن صفی کا فکری اور ذہنی کینوس انتہائی وسیع تھا۔اس وسعت کا مظاہرہ خود ان کے ہر ناول میں دیکھنے کو ملتا ہے۔حسن اتفاق کہ راقم السطور کا آئیڈیل کردار بھی اول روز سے فریدی ہی رہا ہے۔ راقم ہر ممکن کوشش کرتا ہے کہ قانون کا احترام خود بھی کرے اور دوسروں کو بھی قانون کا احترام کرنا سکھائے۔لیکن اس کے نزدیک فریدی کا یہ کردار بھی اظہر من الشمس ہے کہ فتنہ اور فساد فی الارض کے دور میں قانون کے رکھوالے کے بعض قانونی عمل کو بھی جب غیر قانونی سمجھا جاتا ہے تو قانون کا رکھوالا قانون کے نفاذ کے لیے اپنے طریقہ کار میں بعض اوقات تبدیلی بھی کرتا ہے۔ایک ناول کا یہ مکالمہ ملاحظہ ہو۔

''مگر یہ طریقہ غیر قانونی ہے جو آپ نے اختیار کیا ہے!'' دوسرا آدمی بولا۔

''ہاں ایڈگر...... جہاں قانون مجھے بے بس نظر آتا ہے وہاں میں اس کی مدد اسی طرح کرتا ہوں!'' (دشمنوں کا شہر)

اگر اکیسویں صدی کے دوسرے عشرے کو ابن صفی کے revival (احیاء) کے بجائے ان کے فکری اور ادبی مشن کو نشاۃ ثانیہ (renaissance) سے تعبیر کیا جائے تو شاید نامناسب نہ ہوگا۔یقینی طور پر ابن صفی نے ایک شاندار عہد گزار لیا جو اُن کے لیے سخت آزمائش لیکن...... عوام کے لیے آزمائشوں سے نکلنے کا دور تھا۔افسوس کہ نام نہاد اردو ادیبوں اور نقادوں نے ایک عہد اور فکر ساز ادیب کے ساتھ احسان فراموشی کی انتہا کردی۔علم وادب کی تاریخ میں اس کی دوسری مثال شاید موجود نہیں۔واضح ہو کہ نشاۃ ثانیہ دراصل ابن صفی کے فکری اور ادبی مقام کی ہے اور یہ مقام انہیں 1953 ہی میں مل چکا تھا۔اردو ادب کا موجودہ دور تو مقلدین (Followers) کا ہے اور ابن صفی کی فکری وادبی نشاۃ ثانیہ اسی اعتبار سے ہے۔54-1953 میں اگر ہندو پاک میں مشترکہ طور پر اردو زبان وادب کی لسانی تشکیل، فروغ اور مستقبل کے طویل المدت لائحہ عمل کمیٹی کا چیئرمین ابن صفی کو بنا دیا جاتا تو دونوں ملکوں کو جوڑنے میں اردو زبان اہم کردار ادا کرتی اور یہ زبان آج عصر سے ہم آہنگ ہو کر واقعی اس کا شمار نہ صرف بین الاقوامی رابطے کی زبان میں ہوتا بلکہ انگریزی کی طرح یہ بھی علوم وفنون اور ٹکنالاجی کے اعتبار سے کم سے کم ویبسٹر کی طرح اپنے ذخیرہ الفاظ کا منفرد وجود رکھتی۔

ادب اور سماج کے باہمی رشتے کی توضیح کرتے ہوئے کہا جاتا ہے کہ ادب، سماج کے ضمیر سے تخلیق پاتا ہے اس لیے ادب میں معاشرے کا عکس واضح طور پر نظر آتا ہے۔ادب کی ایک اہم صنف ناول کے بارے میں کہا گیا ہے کہ یہ ایک تراشیدہ اور فرضی قصہ ہونے کے باوجود ہماری حقیقی اور علمی سماجی زندگی ہی کا افسانوی بیان ہے۔

ابن صفی مرحوم جس عہد کے ادیب ہیں، وہ اُس وقت کے عالمی اور قومی دونوں سطح پر جنم لینے والے المناک اور خوں ریز واقعات کے چشم دید گواہ ہیں۔انہوں نے دوسری عالمی جنگ (1945-1939) کے ہولناک واقعات واثرات کا بہ چشم خود مشاہدہ کیا۔یہ جنگ اگر چہ دنیا کے مختلف حصوں میں برپا تھی، لیکن برطانیہ اور فرانس کی عالمی جنگ سے براہ راست وابستگی کے سبب انگریزوں کے زیر تسلط ہندوستان پر بھی اس کے گہرے اثرات مرتب ہوئے۔جاپان کے ہیروشیما پر امریکہ (USA) نے پہلا ایٹم بم 6 اگست 1945

کو اور دوسرا ایٹم بم 9 اگست 1945 کو ناگاساکی پر گرایا۔ دنیا کے تمام اہم براعظموں کو محیط یہ مہیب عالمی جنگ اتنی دہشت ناک تھی کہ آج بھی اس کے تصور سے دل کانپ اٹھتا ہے۔ جنگ کے خاتمہ کے بعد مسٹر چرچل نے اعلان کیا تھا کہ برٹش ایمپائر میں 3 ستمبر 1939 سے 29 مئی 1945 تک جنگ کے مجروحین ومقتولین کی کل تعداد گیارہ لاکھ اٹھائیس ہزار تین سو پندرہ تھی جن میں مرنے والے تین لاکھ سات ہزار دو سو دس تھے۔ لیکن اس سے زیادہ بھیانک تصویر جرمنی کی تھی جہاں مجروحین ومہلوکین کی کُل تعداد چالیس لاکھ چونسٹھ ہزار چار سو اڑتیس بتائی گئی جن میں مرنے والوں کی تعداد گیارہ لاکھ اُنیس ہزار تین سَو تھی۔ ابھی دنیا اس خوفناک جنگ سے بِلک رہی تھی کہ ہندوستان میں انگریزوں کی غلامی سے نجات حاصل کرنے کے ساتھ ہی تقسیم کی سرد جنگ شروع ہوگئی۔ پھر 1947 میں تقسیم ہند کے ساتھ ہی دل کو دہلا دینے والے اس خوں ریز فساد کا سلسلہ شروع ہوا جس میں ہجرت کے مارے ہوئے لوگوں کا عرصہ حیات تنگ کر دیا گیا۔ یہاں اپنوں نے اپنوں ہی کا اتنا خون بہایا اور انسانیت کو شرمسار کیا کہ اس کی مثال بڑی مشکل سے تاریخ میں ملے گی۔

سماج کا تعلیم یافتہ طبقہ ہی عام طور پر حساس تصور کیا جاتا ہے لیکن یہ نتیجہ حقیقت سے قریب تر نہیں ہے۔ حساس ہر انسان ہوتا ہے جس کے پاس دل ہو ایسا دل جس پر بے ضمیری اور وحشت کی تہہ چڑھی ہوئی نہ ہو۔ ہوسکتا ہے کہ وہ اپنی کم علمی اور سطحی مشاہدے کے سبب قوتِ اظہار سے محروم ہو لیکن کسی بھی ناخوش گوار واقعہ سے متاثر ہو کر اس کے دل میں کچوکے ضرور لگتے ہیں۔ تعلیم یافتہ طبقے میں ادیب وشاعر کا دل زیادہ ہی حساس خیال کیا جاتا ہے۔ وہ محض حساس دل ہی نہیں رکھتا بلکہ قوتِ اظہار پر بھی قدرت رکھتا ہے۔ یہ اظہار نظم ونثر دونوں صورتوں میں ہوتا ہے۔ دنیائے ادب میں اس کی متعدد مثالیں موجود ہیں۔

ابن صفی اپنے دور کے حساس طبیعت دانشور ہی نہیں بلکہ روشن ضمیر ادیب وشاعر تھے۔ شاعری میں اسرارؔ ان کا تخلص تھا اور اسرار ناروی سے مشہور ہوئے۔ تاہم وہ سکّہ بند ادیب وشاعر نہ تھے۔ ان کے پاس اپنا ویژن تھا اور ادب میں وہ تقلیدِ محض سے گریز کرتے تھے۔ وہ جس فکری بلندی پر فائز تھے اس وقت انہیں ہر ادیب وشاعر حالات کے بادِ مخالف سے کٹ کر روشِ عام کی طرف بہتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ ایسی صورت میں متنوع علوم اور عمیق مشاہدے کا شناور کروٹ بدلتی ہوئی نئی اور کالی دنیا کی چیرہ دستیوں کو بخوبی محسوس کر رہا تھا۔ ایک طرف حساس ادیب کا دل حالات اور واقعات کی وحشت انگیزی سے خون ہو رہا تھا تو دوسری طرف اپنے ہی ہم منصب ادیبوں اور شاعروں کی سطحی سوچ اور غیر معقول حرکتوں سے دل برداشتہ ہوگیا۔ اسے اپنی ہلکی پھلکی تحریروں سے اطمینانِ قلب نہ تھا حالانکہ ان تحریروں کو اس وقت کا ادبی حلقہ بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھ رہا تھا۔

ابن صفی کا سماج سے بڑا گہرا تعلق تھا۔ وہ انسانیت پسند تھے اور بڑی طاقتوں کی وحشت اور بربریت کے خلاف ان کے سینے میں لاوا اُبل رہا تھا۔ انہوں نے اپنی اس کیفیت کو مزاحیہ ادب میں دبانے کی کوشش کی لیکن تاریخ کے وہ جس موڑ پر کھڑے تھے اور آگ و خون میں تڑپتی ہوئی انسانیت کا مشاہدہ کرتے ہوئے وہ کرب و

اضطراب کی جن سنگین وادیوں سے گزرے تھے ان کا ضمیر انہیں مسلسل جھنجھوڑ رہا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ ادب کی راہ سے بڑی طاقتوں کی بدمستی اور سازشی ہتھکنڈوں کو اجاگر کیا جائے جن کے دام میں عالمی سماج پھنستا جارہا ہے۔ ادب میں معاشرے کے عکس کو واضح کرنے کا جو طریقہ کار ان کے ذہن میں تھا اور رفتہ رفتہ ایک "نصب العین" کی صورت میں ڈھل گیا' اس کی مثال اس گھنے درخت سے دی جاسکتی ہے جس کی فنکارانہ تصویر میں فنکار نے ایک پرندہ کو چھپادیا ہے۔ ہر ادیب و شاعر اس درخت کو ٹکٹکی باندھے بغور دیکھتا ہے۔ کسی کی نگاہ شاخوں پر ہوتی ہے اور کوئی پھول اور پھل کی تلاش کرتا ہے۔ کوئی اس سایہ دار شجر کی کشش میں مبتلا ہوتا ہے۔ اس کے برعکس ابن صفی کی آنکھ اس پرندے کو دیکھتی ہے جسے کوئی نہیں دیکھ پاتا۔ ان کی نظر بار بار پرندے پر ٹھہرتی ہے۔ فنکار بھی یہی چاہتا ہے کہ ناظرین درخت کے دل فریب منظر میں نہ کھو جائیں لیکن بے بصیرت ادیب و نقاد اس درخت کے سحر سے نہیں نکل سکے۔ ان میں ادب کے سورما بھی موجود تھے۔ اس کے برعکس ابن صفی کی آنکھوں کے سامنے درخت محض ایک ہیولیٰ تھا اور ان کا "نصب العین" وہ پرندہ تھا جو کسی کو نظر نہیں آرہا تھا۔ بصیرت سے محروم ادیب و شاعر بھلا کیسے گوارہ کرسکتے تھے کہ ایک نوآموز نوجوان ان سے بازی مار لے جائے۔ لہٰذا ترچھی نظروں سے اس کی تحریروں کا مطالعہ ضرور کرتے تھے لیکن اس کے وجود سے انکار کرتے رہے۔ ابن صفی تاریخ کے اُس اہم اور نازک موڑ پر جس حقیقت کا ادراک کرچکے تھے اور جو چیز انہیں آئینے کی طرح شفاف نظر آرہی تھی وہ کیوں کر اس سے صرف نظر کرتے۔ انہوں نے ادب کے جغادریوں کو ان کے حال پر چھوڑ دیا اور اپنے "نصب العین" کے ساتھ تنہا ہی آگے بڑھتے رہے۔ وہ اللہ رب العزت پر غیر متزلزل یقین رکھتے تھے اور اس یقین کی طاقت کے ساتھ حکمت اور عوام کی نفسیات کا خیال رکھتے ہوئے تخلیقی ادب کو نئی سمت عطا کی۔

عصر حاضر کی نام نہاد جمہوریت کی رعایت کرتے ہوئے ابن صفی کے تخلیقی ادب کو "جمہوری ادب" کا نام دینا ایک مجبوری تو ہوسکتی ہے لیکن اس اصطلاح میں کشش محسوس نہیں ہوتی بلکہ یہ اصطلاح ابن صفی کے مزاج اور فکر کے خلاف ہے۔ جمہوری ادب سے ایسا لگتا ہے کہ ابن صفی نے وہی کچھ لکھا جو عوام کو مرغوب تھا حالانکہ ان کی کسی بھی تحریر میں عوام یا خواص کی رعایت نہیں کی گئی ہے۔ ابن صفی نے تو اپنی تحریروں میں انسانیت کو آئینہ دکھایا ہے۔ وہ سماج کو ویسا ہی دکھاتے ہیں جیسا کہ سماج فی الواقع موجود ہے۔ جاسوسی ادب کے توسط سے ابن صفی نے سماجی اور تہذیبی ادب کو جس طرح اجاگر کیا ہے اس کا ایک پہلو تو پریم چند کی کہانیوں اور ناولوں میں دکھائی دیتا ہے لیکن ابن صفی کی تحریروں میں وہ تمام گوشے اجاگر ہوتے ہیں جو عام طور پر پردۂ خفا میں رہ جاتے ہیں۔ کوئی قاتل ہے' کوئی زانی ہے' کوئی شرابی ہے' کوئی چور ہے اور کوئی بین الاقوامی مجرم ہے۔ انہی کے درمیان کوئی ایماندار بھی ہے اور کوئی شراب و شباب سے خود کو بچانے والا بھی موجود ہے۔ ان کی تحریریں اگرچہ حال سے بحث کرتی ہیں لیکن حال کے ساتھ مستقبل کی طرف اس طرح رہنمائی کرتی ہیں کہ کبھی کبھی حال اور مستقبل میں صرف ایک باریک فاصلہ رہ جاتا ہے۔ ابن صفی کی تحریروں میں یہ ایک اہم نکتہ ہے۔ انہوں نے اردو ادب کو ایسے وقت میں لاتعداد نئی اصطلاحوں اور محاوروں سے مالا مال کیا جس وقت اردو

ادب فکری اور فنی اعتبار سے ماضی میں سانس لے رہا تھا۔ لہٰذا ابن صفی کی تحریروں پر ''داستانوی ادب'' کا لیبل چسپاں کرنا بھی درست نہ ہوگا۔ ابن صفی کی تحریروں کو غلط فہمی یا کم فہمی کے سبب بعض حضرات کلاسیکی ادب کا درجہ بھی دیتے ہیں۔ حالانکہ ابن صفی کی تحریریں اردو ادب کے جمے ہوئے پانی میں ایک برقی دھماکہ کے مترادف ہے جس کے تلاطم سے اردو ادب کے منجمد تالاب میں ارتعاش پیدا ہوا اور یہی ارتعاش گویا اس وقت کے ادبی تالاب کے تعفن میں تخفیف کا باعث بنا۔ مگر افسوس کہ ادب کے مافیاؤں نے ادب میں اس انقلابی جہت کو محسوس کرتے ہی اپنے جرم پر پردہ ڈالنے کے لیے اس کے وجود ہی سے انکار کرنے میں عافیت محسوس کی لہٰذا انہوں نے اپنے خودساختہ ادب کی چہار دیواری سے ابن صفی کو تاحیات باہر رکھا۔

اکیسویں صدی میں ادب کی ایک نئی دنیا تشکیل کی جا رہی ہے۔ بیسویں صدی کے جس ادیب کو ادبی مافیاؤں نے باہر کا راستہ دکھایا' آج انہی گروہوں کے ٹوٹے ہوئے چند ادیب و نقاد مرزا غالب کی طرح ابن صفی کے ادبی مقام کو شناخت کرنے میں ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں۔ گزشتہ چند برسوں میں بعض ادیبوں کے مضامین سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ بھی اپنی انگلی میں خون لگا کر شہیدوں میں اپنا نام لکھوانا چاہتے ہیں۔ یہ لوگ خیر سے ادب کے ڈاکٹر بھی ہیں اور تخلیقی ادب میں انہیں انعام و اعزاز سے بھی نوازا گیا ہے۔ ان میں چند مخلصین کو چھوڑ کر ایسا لگتا ہے کہ ہر کوئی اس ''کارِ خیر'' میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینا چاہتا ہے۔ کوئی ابن صفی کو ''جاسوسی ادب کا بے تاج بادشاہ'' کہتا ہے تو کوئی ''ابن صفی اور ذہنی شطرنج کا تیسرا کھلاڑی'' اور کوئی انہیں ''اردو ناول نگاری کے مجتہد'' ہونے کا خطاب دیتا ہے حتیٰ کہ کوئی ان کو 'ظرافت کا امام' قرار دیتا ہے۔ ہنسی آتی ہے ابن صفی کی مداحی میں ایسی تحریروں کو پڑھ کر۔ بڑے سے بڑے ڈاکٹر کی بھی کوئی تحریر ابن صفی کی عوامی مقبولیت' مدح سرائی اور ''آنہ لائبریری'' سے آگے نہیں بڑھتی کیا اردو ادب اب اپنے زوال اور پس ماندگی کی انتہا کو پہنچ گیا ہے کہ اردو ادیبوں اور اسکالروں کو ابن صفی کی تیس سالہ ادبی حیات میں فن اور ادبی خدمات کے عنوان سے کوئی موضوع ابھی تک نہیں مل سکا؟ اردو ادب کی دنیا میں اس مجرمانہ غفلت کو آخر کس نام سے پکارا جائے؟ ابھی چند ہی افراد اس کا ادراک رکھتے ہیں کہ جاسوسی ادب دراصل ادب کا سماجی اور تہذیبی مطالعہ ہے جس میں حال سے باخبری بھی ہے اور مستقبل میں انسانی سماج کے عزائم کی طرف اشارہ بھی ملتا ہے۔

ادب کے طلبا اور ریسرچ اسکالرز ابن صفی کے ناولوں کا مطالعہ عالمی تاریخ' تہذیب اور سماج کے تناظر میں کریں تو انہیں ایسے گوہر نایاب بھی مل سکتے ہیں جن سے اردو ادب کا دامن خالی تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ ابن صفی نے ماضی کے اردو ادب کو حال اور مستقبل سے اس طرح مربوط کر دیا ہے کہ آنے والے پچاس برسوں میں ان موضوعات پر کئی جہتوں سے کام کیا جا سکتا ہے۔ اردو ادب پر ابن صفی کے احسانات یقینی طور پر بیش بہا ہیں جنہیں فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

ابن صفی کے ناولوں کے سماجی و تہذیبی مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان میں برصغیر ہی نہیں بلکہ بین الاقوامی سطح پر جرائم کی ایک نئی دنیا کا انکشاف کیا گیا ہے۔ جرائم کی یہ دنیا عام طور پر اُن لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہے

جن کا تعلق آج کے میٹر دیا میگا سٹی سے ہے۔ انہیں نہیں معلوم کہ ہمارے ملک یا دنیا کے مختلف حصوں میں قبائلی زندگی گزارنے والے انسان کن آزمائشوں سے دوچار ہیں۔ رسم و رواج کے نام پر وہ کس طرح کے استحصالی نظام میں جکڑے ہوئے ہیں۔ وہاں انسانی جانوں کی قیمت فردِ واحد کی وفاداری سے مشروط ہوتی ہے۔ انسانی حقوق کی پامالی وہاں کی طرزِ زندگی میں عام بات ہے۔ دوسری جانب بین الاقوامی سطح پر جدید سائنس اور ٹکنالاجی سے لیس ترقی یافتہ ممالک کے بعض خفیہ گروہوں کے ناپاک عزائم سے ابن صفی نے اپنے متعدد ناولوں میں پردہ اٹھایا ہے۔ اُن خفیہ گروہوں میں اعلیٰ طبقے سے تعلق رکھنے والے تعلیم یافتہ افراد بھی موجود ہوتے ہیں اور ان کے ذریعہ معاشرے میں مختلف پیشوں سے وابستہ لوگ بھی دانستہ یا غیر دانستہ طور پر شکار ہو جاتے ہیں۔ ان خفیہ گروہوں کی جِلت پھِرت سے عام طور پر معاشرے کے لوگ واقف نہیں ہوتے۔ یہ گروہ عام انسانی قتل سے لے کر اقتصادی، معاشرتی اور تہذیبی نوعیت کے جرائم میں ملوث ہوتا ہے۔ اس گروہ کا طریقہ کار بظاہر سادہ لیکن اتنا خفیہ اور ہائی ٹیک ہوتا ہے کہ عام تعلیم یافتہ طبقہ تو اس کی گرد کو بھی نہیں پا سکتا حتیٰ کہ جس ملک میں اس گروہ کے افراد سرگرم ہوتے ہیں وہاں کے سیکوریٹی نظام کو بھی اس کے طریقہ کار اور مقاصد کو سمجھنے میں بعض اوقات دانتوں پسینے چھوٹ جاتے ہیں۔ بین الاقوامی خفیہ گروہوں کے یہ مجرمین کہیں بھی پائے جا سکتے ہیں اور ان کی قیام گاہیں بھی معاشرے کے عام لوگوں سے قریب ہی ہوتی ہیں۔ وہ ہمارے ساتھ اٹھتے بیٹھتے بھی ہیں، کھاتے پیتے بھی ہیں، لیکن ہماری نظر اُن کے کریہہ چہرے تک نہیں پہنچ پاتی۔

اردو فکشن میں ابن صفی نے جس دنیا کی تصویر کشی کی ہے وہ خیالی یا طلسمی دنیا نہیں بلکہ جیتی جاگتی وہ دنیا ہے جس سے ہمارا روزمرّہ کا تعلق ہے۔ ہم اِس دنیا میں جن مسائل سے مسلسل دوچار ہو رہے ہیں، ممکن ہے کہ ان مسائل کو پیدا کرنے میں کسی حد تک ان خفیہ گروہوں کی خدمات لی گئی ہوں اور ان مسائل کو محض معمول کی چیز سمجھنے پر ہمیں مجبور کر دیا گیا ہو۔ عام طور پر ہماری آنکھیں سامنے کی چیز کو تو دیکھ لیتی ہیں لیکن زیادہ دور تک دیکھنے سے یکسر قاصر رہ جاتی ہیں۔ یہ صورت حال تو اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقے کی ہے، عام لوگ تو ان حالات سے انجان ہی رہ جاتے ہیں۔

آپ غور کیجیے کہ اردو ادب میں بالخصوص فکشن کے حوالے سے ابن صفی نے عصر حاضر کے معاشرے کا جو تہذیبی جائزہ پیش کیا ہے، کہیں اور دستیاب ہے؟ تاہم بصیرت رکھنے والے فاضل ادیبوں اور دانشوروں نے ابن صفی کی تحریروں کی چاشنی اور پُر اثر مکالمے کی بڑی تعریف کی ہے۔ یہ بھی کہا جاتا رہا ہے کہ ابن صفی کے ناولوں نے اردو قارئین کے دلوں پر حکومت کی جس کا سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ اس کے برعکس ان کے ناولوں کو تعلیمی نصاب میں شامل کرنے سے قصداً گریز کیا گیا۔ آخر اس کا سبب کیا ہے؟ پریم چند کی کہانیاں تو نصاب میں داخل ہیں۔ ''انارکلی'' بھی داخلِ نصاب ہے۔ ''قصہ چہار درویش'' کو بھی طلبا پڑھنے پر مجبور ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ اردو زبان و ادب کا رشتہ ہی ترقی پذیر عہدِ حاضر سے منقطع کر دیا گیا ہے۔ وہ زبان جو دریا کی طرح تھی، ایک ایسے تالاب میں تبدیل ہوگئی ہے جس میں سرانڈ پیدا ہو چکی ہے۔ کیا ہم نے کبھی غور کیا ہے کہ اس صورت حال کے اصلاً ذمہ دار کون ہیں؟ ہم یہاں معذرت کے ساتھ عرض کریں گے کہ اس کی پوری ذمہ داری

ادبا' اساتذہ اور دانشوروں کے سر ہے جنہوں نے اس زبان کے ارتقا کو یکسر فراموش کر دیا۔ نئے الفاظ کے ذخیرے اس میں داخل نہیں ہو سکے' نئی اصطلاحوں اور محاوروں سے یہ زبان محروم کر دی گئی۔ اکیسویں صدی میں بھی اردو زبان کی کوئی لغت ہمیں میسر نہیں جس میں سال بہ سال نئے الفاظ اور اصطلاحوں کے ذخیرے شامل کیے جاتے ہوں۔

ابن صفی کے دو سو پچاس سے زائد ناولوں میں عہد حاضر میں بولے جانے والے مکالموں اور نئی اصطلاحات کا ایک بڑا ذخیرہ موجود ہے۔ کاش! ہمارے ادبا اور اساتذہ زبان کی فنی اور تاریخی نزاکت سے کما حقہٗ آگاہ ہوتے تو ابن صفی کے ناولوں کے ساتھ ناروا سلوک نہیں کرتے' الا ماشاء اللہ۔ اردو زبان و ادب میں ان کی خدمات سے بھرپور استفادہ کرتے اور عصر حاضر کی زمین میں فکشن کے حوالے سے حقیقی واقعات نگاری کرنے والے عظیم ادیب کو سر آنکھوں پر بٹھاتے۔ لیکن..... قوم کے اساتذہ' دانشوروں اور ادیبوں کی اُمنگیں جب غلامانہ ذہنیت کے سبب سرد پڑ جاتی ہیں تو ان کی بصیرت بھی معدوم ہونے لگتی ہے۔ وہ خود بھی کوئی کارنامہ انجام دینے سے قاصر ہوتے ہیں اور دوسرے کا کارنامہ ان کی آنکھوں میں سوئی کی طرح چبھتا ہے۔ ایسی صورت میں جب منفی اَنا جوش میں آتی ہے تو وہ اپنی ذات کے خول کو ہی مکمل دنیا تصور کرنے لگتے ہیں۔ اس صورت حال میں بھلا قوم اور قومی مفاد کی انہیں کب پروا ہوگی۔ ان سے اجتماعی طور پر پے در پے غلطیاں سرزد ہونے لگتی ہیں' جس کا خمیازہ پوری قوم کو بھگتنا پڑتا ہے۔ آج اردو زبان و ادب جس انحطاط کا شکار ہے' اس کا براہ راست تعلق ہمارے فاضل اساتذہ اور ادیبوں و دانشوروں سے ہے۔ انہوں نے اردو کو اپنی ''زرخرید'' لونڈی تصور کیا۔ کاش اس ''لونڈی'' کو آزاد کرنے کا بھی انہیں خیال گزرتا تو شاید اردو کی موجودہ ناگفتہ بہ صورتِ حال پر ہم سینہ کوبی نہ کرتے۔

ابن صفی کے تخلیقی مشن کے بارے میں یہ بات معلوم ہے کہ انہوں نے ایک منصوبے کے تحت اردو ناول نگاری کا آغاز (مارچ 1952) کیا تھا۔ جنسی لٹریچر کے فحش اور پُرتعفن سیلاب کو روکنے کے لیے انہوں نے ''متبادل چیز'' پیش کرنے پر غور و فکر کیا تو ان سے ناولٹی (Novelty) کی بھی فرمائش کی گئی۔ لہٰذا انہوں نے جاسوسی ادب کی راہ اپنائی اور اس میں ناولٹی کا پورا خیال رکھا۔ تخلیقی ادب میں ان کا بنیادی نصب العین سماج کی تطہیر اور تعمیر تھا۔ ان کی تحریروں میں اردو ادب کی فرسودہ روایات سے انحراف کرتے ہوئے حال اور مستقبل سے مربوط ایسا ویژن ملتا ہے' جس کی دوسری مثال اردو دنیا آج تک پیش کرنے سے قاصر ہے۔ وہ اردو ناول نگاری میں اپنے فن' ادبی رجحان اور منفرد اسلوب کے اعتبار سے بلاشبہ امام کے درجے پر فائز ہیں۔ انہوں نے اپنے پیش رو کی کبھی نقالی نہیں کی بلکہ ان کے فن کی بھی تطہیر کرنے میں کسی پس و پیش سے کام نہ لیا' ساتھ ہی اردو ادب کو بدلتے ہوئے عالمی سماج کے نشیب و فراز اور تغیرات سے روشناس کرایا۔ اُس وقت اور اس دَور میں دنیا جن انقلابات سے گزر رہی تھی' ان کے عوامل اور نتائج کی پیش گوئی کی۔ حیرت ہے کہ ہمارے بعض ادیب و نقاد آج بھی ابن صفی کو سمجھنے کے لیے تیار نہیں حتیٰ کہ وہ اس بات کے بھی قائل نہیں کہ ابن صفی

نے ادب کے ذریعہ سماج کی خدمت کی۔ اس کی بنیادی وجہ غالباً یہ ہے کہ ایسے اردو ادیب و نقاد اُس پس ماندہ سوچ کے حامل تھے جسے بزعم خود وہ ''ترقی پسندی'' کہتے تھے۔ حالانکہ ترقی اسے کہتے ہیں جس میں آگے بڑھنے اور بلند ہونے کی صفت پائی جاتی ہے۔ یہ صفت اس وقت پیدا ہو سکتی ہے جبکہ انسانی زندگی منضبط اور منظم ہو۔ جس ترقی میں آزاد خیالی (free thinking) شامل ہو اور اپنے خالق سے بغاوت کی بُو آتی ہو اُسے تنزّل تو کہا جا سکتا ہے، ترقی نہیں۔ وہ ادب کے ''خالق'' ہونے کا دَم تو بھرتے تھے لیکن اپنے وجود کے خالق سے عملاً منکر رہے۔ ایسی فکر کے حاملین نے آزادیِ خیال کے نام پر انتشار کو ہوا دینے والی تحریک تو جاری رکھی لیکن اپنے وجود اور حیات پر ٹھہر کر غور کرنے کی انہیں کبھی فرصت نہیں ملی۔ ترقی پسند تحریک کے حاملین آہستہ آہستہ اُٹھتے گئے لیکن آنے والی نسل میں ترقی پسندی کی ایسی بیج ڈال گئے کہ وہ ہر معاملے میں نقال تو نظر آتے ہیں لیکن ان کی فکر اور قلمی کاوش میں ترقی کے بجائے تنزل ہی نمایاں طور پر محسوس ہوتا ہے۔ یہاں آج تک کوئی ایسا ادیب پیدا نہیں ہوا جس نے پریم چند کے کام کو بھی آگے بڑھایا ہو۔ واضح ہو کہ اپنے عہد کے عظیم افسانہ و ناول نگار پریم چند (1880-1936) ترقی پسند بعد میں ہوئے تھے۔ ایسا لگتا ہے کہ ''ترقی پسندی'' محض سیاسی اسٹنٹ تھی، اس کا اردو کی حقیقی ترقی سے دور کا بھی واسطہ نہیں تھا۔

ابن صفی نے جس پُر آشوب دور میں اردو ادب کی خدمت شروع کی، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ادب سے سماج کا رشتہ یکسر منقطع ہو گیا تھا۔ البتہ ادب کو سماج سے جوڑنے اور سماج میں تخریبی ذہن پیدا کرنے کے لیے اردو ادب کو بطور آلہ استعمال کیا جا رہا تھا۔ دوسری طرف جنگ عظیم دوم کے بعد تقسیم ہند نے اردو زبان کو قانونی حیثیت سے حاشیہ پر پہنچا دیا تھا۔ رہی سہی کسر تخریبی ذہن رکھنے والے ادیبوں کے ذریعے پوری ہونے لگی۔ ایسی صورت میں بلکہ مخالفتوں اور اندیشوں کے سائے میں صاحبِ طرز ادیب نے ملک و قوم کو علم و ادب کے ذریعے بصیرت کی آنکھیں کھولنے کی دعوت دی۔ مگر افسوس کہ ان کی راہ میں سب سے زیادہ اردو کے وہ ادیب و دانشور مزاحم ہوئے جن کی آنکھوں پر ''ترقی معکوس'' کی پٹی کس دی گئی تھی اور ان کے سرمایہ علم و ادب کی حیات اشتراکیت میں اٹکی ہوئی تھی ان حالات کے باوجود ابن صفی آخر دم تک اللہ رب العزت پر ایمان و یقین کے ساتھ اردو دنیا کے لیے مشعلِ راہ بنے رہے۔ ان کی تحریروں کے تنوع اور افکار تازہ نے ہر طبقے کے قلوب کو مسحور کیا۔ جس نے بھی اس آستانۂ علم و ادب پر دستک دی، اس کا ہو کر رہ گیا۔ جس طرح حق اور سچائی ہر دل کی آواز ہوتی ہے، ابن صفی کی تحریریں بھی دلوں کو مسخر کرنے لگیں یہاں تک کہ دوسری زبانوں کے قاری بھی ان کی تحریروں کو پڑھنے کے لیے اردو سیکھنے لگے۔ سماج میں عام طور پر یہ رجحان پایا جاتا ہے کہ ہم پیشہ لوگ آپس میں متحد ہوتے ہیں لیکن اردو زبان و ادب میں شاید یہ واحد مثال ہے کہ اس کے مخصوص ادیبوں، شاعروں اور نقادوں (جن کی اجارہ داری ادب پر قائم تھی) نے گزشتہ ساٹھ برسوں میں ابن صفی کی عظیم خدمات کا اعتراف نہیں کیا۔ اپنے ایک عظیم ہم عصر ادیب کے ساتھ اردو کے مخصوص نقادوں کی جانب سے یہ ایسا سخت رویہ ہے، جس کی مثال شاید دنیا کی کسی اور زبان کے ادب میں نہیں ملتی۔

اردو ادب کے افق کا چاند......ابن صفی

مشتاق احمد قریشی

ابن صفی صاحب کو ہم سے جدا ہوئے 33 سال ہو گئے ۔26 جولائی 1980ء ان کی تاریخ جدائی ہے۔اس دن وہ ہم سب سے اپنے پڑھنے والوں سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جدا ہو گئے تھے۔سیکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں پڑھنے والوں کو روتا سسکتا چھوڑ گئے تھے۔

ابن صفی اردو ادب میں جاسوسی ادب کے معمار اور ایشیاء کے عظیم ترین مصنف تھے۔وہ 28 اپریل 1928ء کو الہ آباد کے قصبہ نارہ میں جناب صفی اللہ صاحب کے گھر پیدا ہوئے اور ابتدائی تعلیم نارہ میں حاصل کی پھر سیکنڈری اور ہائی اسکول انہوں نے بی اے ڈی اے وی اسکول الہ آباد اور ایونگ کرسچن کالج الہ آباد اور بی اے کی ڈگری آگرہ یونیورسٹی سے حاصل کی۔

ابن صفی صاحب اردو میں سب سے زیادہ پڑھے جانے والے معروف وممتاز ادیب تھے۔انہوں نے اردو کی حقیقی ترقی اور اشاعت میں اپنا غیر معمولی کردار ادا کیا ہے۔انہوں نے اردو ناول نگاری کے فن کو نئی راہ دکھائی اور فحاشی اور لفظی غلاظت سے نجات دلا کر قلم کی حرمت کو بحال کیا اور اخلاقیات کا پابند کیا۔وہ ادب میں خصوصاً اردو ادب میں کسی بھی طرح کی آزاد خیالی کے نام پر بے ہودگی اور فحاشی کے سخت خلاف تھے بلکہ ان خرافات کے متبادل انہوں نے مزاح طنز اور ادبی لطافت کی چاشنی سے اپنے ناولوں کو سجا سنوار کر پیش کیا جبکہ نئے اور پرانے لکھنے والے کسی طرح یہ ماننے کے لیے تیار ہی نہیں تھے کہ بغیر جنس کی چاشنی کے کوئی ناول بازار میں بک بھی سکتا ہے۔ان لوگوں کے کہنے کے مطابق آخر پڑھنے والے کا کیا دماغ خراب ہوا ہے کہ بغیر کسی لذت کے وہ ہمارے ناول خرید کر پڑھے گا عام زندگی میں کیا کم مسائل ہیں کہ ناول جسے وہ اپنی تفریح وطبع کے لیے وقت کو اچھے طریقے پر گزارنے کے لیے پڑھتا ہے اگر اس میں بھی وہ عام معاشرتی مسائل کا رونا لے کر بیٹھ جائے تو پھر اپنے پیسے فضول کیوں خرچ کریں۔یہ انداز فکر لکھنے والوں کا ہی نہیں تھا بلکہ اس وقت کے ناشرین کا بھی یہی فیصلہ تھا۔تقسیم سے قبل اور کچھ عرصہ بعد تک کے دور کے تمام ناول اگر اٹھا کر دیکھے جائیں تو ان سب میں یکساں کہانی یکساں اسلوب ملے گا۔وہی عریانی کی زبانی لذت کی کہانیاں لکھی گئیں لیکن جب ابن صفی صاحب نے ایک عزم کے ساتھ فحاشی عریانی سے نجات دلانے کے چیلنج کو قبول کیا اور نئے عزم و حوصلے کے ساتھ اپنا پہلا ناول دلیر مجرم جو مارچ 1952ء کو شائع ہو کر بازار میں آیا تو ان کے نرالے انداز تحریر نے ان کے عزم کو سچ کر دکھایا ان کا پہلا ہی ناول ہاتھوں ہاتھ لیا گیا اس کے کئی ایڈیشن چھاپنے پڑے۔جبکہ اس ناول کے ناشرین جن میں خود ابن صفی صاحب اور ان کے دوست جناب مجاور حسین رضوی (ابن سعید) جناب جمال رضوی (شکیل جمالی)، عباس حسینی صاحب شامل تھے کو یہ باور کرنے میں خاصی دیر لگی کہ ابن صفی

صاحب کا کہا کرسی نشین ہو گیا اور اردو ناول کے ایک نئے ذائقے کو لوگوں نے نہ صرف پسند کرلیا ہے بلکہ وہ قبول کرلیا گیا ہے۔ یہ اپنے وقت کا وہ پہلا ناول تھا جس نے کسی فحش جملے اور عریاں منظر کے بغیر اپنے پڑھنے والوں کو اپنا گرویدہ کرلیا اور ایسا گرویدہ کیا کہ مزید کی تکرار ہونے لگی اور ابن صفی کے دوسرے ناول کا ان کے پڑھنے والے بے چینی سے انتظار کرنے لگے اور پورے ہندوستان میں دھوم مچ گئی۔ تمام ہی لکھنے والے اور کتابیں چھاپنے والے حیران ہی نہیں بلکہ شدید پریشان بھی تھے کہ یہ کل کے لونڈے نے آخر ایسا کیا لکھ دیا کہ لوگ ٹوٹے پڑ رہے ہیں۔ یہی دیکھنے اور سمجھنے کے لیے ہی ان لوگوں نے بھی بغور ابن صفی کو پڑھا اور پھر وہ بھی پڑھتے ہی چلے گئے۔

جب میں نے اپنے زمانے کے معروف اور مشہور لکھنے والوں سے جن میں جناب مجاہد لکھنوی، جناب شوکت تھانوی، جناب خان محبوب طرزی، جناب قیسی رامپوری، جناب رئیس احمد جعفری اور بہت سے لکھنے والے شامل تھے، ابن صفی صاحب کے ناولوں کے بارے میں پوچھا تو صرف ان میں مجاہد لکھنوی، رئیس احمد جعفری اور قیس رامپوری ایسے تھے جنہوں نے برملا ابن صفی صاحب کے ناولوں کی تحریر کو نہ صرف سراہا بلکہ اس کے نئے پن، اچھوتے پن اور اردو اسلوب کی تعریف بھی کی بقول مجاہد لکھنوی جو تقریباً بارہ سال اپنے آخری دور میں میرے ادارے میں بطور نائب مدیر کام کرتے رہے ہیں ان کا کہنا تھا کہ ابن صفی نے عام روش سے ہٹ کر اپنے ناولوں میں آسان اردو استعمال کی ہے جو عام بول چال میں بولی جاتی ہے جسے رواں اردو بھی کہہ سکتے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ ان کی تحریر ہر طبقے کے لوگوں میں یکساں مقبول تھی اور ہے۔

ابن صفی کے ناولوں میں کردار نگاری اور منظر نگاری کو خاص اہمیت حاصل ہے جب وہ کسی مقام کا محل وقوع یا حدود اربع تحریر کرتے تھے تو ان کا پڑھنے والا خود کو اس مقام میں پہنچا لیتا اور خود کو ان حدود میں چلتا پھرتا پاتا تھا۔ ان کا ہر کردار اپنی جگہ ایک مکمل کردار ہے چاہے وہ ان کی تحریر کے لازمی اور مستقل کردار ہوں یا کہانی کی ضرورت کے مطابق غیر مستقل اور عارضی کردار ہو وہ نئے کرداروں کو بھی اس خوب صورتی سے پیش کرتے تھے کہ وہ اس ماحول اور معاشرے کا پورا پورا حصہ معلوم ہوتے جس کا نقشہ ابن صفی صاحب اپنے قلم سے بناتے تھے۔ کردار چاہے کتنا ہی منفی ہوتا یا مثبت ان کے کرداروں کی بنیاد خیر اور شر کے معاملات پر رکھتے تھے۔ وہ بڑی خوبصورتی سے اپنے کرداروں کی نفسیات اور انسانی جبلت کا تجزیہ کرتے۔ وہ انسان کو انسانیت کی معراج پر دیکھنا چاہتے تھے۔ وہ انسانیت کے نام پر ہر قسم کی درندگی اور حقوق انسانی کے نام پر ہر قسم کے جرائم کی بیخ کنی کرتے تھے وہ بڑے ہی دوٹوک انداز میں اپنے قاری کو اپنا مدعا سمجھاتے تھے۔

جن لوگوں نے ابن صفی صاحب کے ناولوں کو پڑھا ہے وہ خوب اچھی طرح واقف ہیں کہ ان کا قلم کیسا سحر انگیز پر اثر قلم تھا۔ ان کی تحریر ایک طویل عرصہ گزرنے کے باوجود آج بھی بالکل اسی طرح تر و تازہ ہے اور پوری رعنائی سے مہک رہی ہے۔ ابن صفی صاحب آج ہمارے درمیان نہیں ہیں لیکن ان کی جادو اثر تحریریں جو تحیر و تجسس سے لبریز ہیں جو اپنے پڑھنے والوں کو نا صرف تفریح مہیا کرتی رہی ہیں بلکہ ان کی ذہنی اخلاقی

معاشرتی تہذیبی تربیت بھی کرتی رہی ہیں۔ ان کی تحریر کی خوشبو سے اردو دنیا کا گلستان آج بھی مہک رہا ہے
ان کے انتقال کو گو کہ 33 سال ہو گئے ہیں اور 26 جولائی سے چونتیسواں سال شروع ہو رہا ہے اس کے باوجود
کے ایک طویل عرصہ ان کے انتقال کو ہو چکا ہے لیکن ان کی یاد اور ان کی تحریر آج بھی تر و تازہ ہے جبکہ بقول
لوگوں کے زمانہ کافی تیزی سے آگے بڑھ چکا ہے لیکن ابن صفی صاحب کی تحریروں کو پڑھنے والے آج بھی
بالکل اسی طرح ان سے لطف اندوز ہو رہے ہیں جس طرح ان کے ناولوں کی ابتدا میں ہوا کرتے تھے۔

ابن صفی صاحب جنہوں نے ہندوستان بلکہ اردو دان معاشرے کی اخلاقی تہذیبی تربیت کی ذمہ داری
بڑے ہی احسن طریقے سے ادا کی ہے اور انہوں نے اردو ادب میں ناول نگاری کو نئی روش، نیا اسلوب دیا ہے جبکہ
اردو ادب کی نہایت خشک، پوشیدہ اور پیچیدہ انداز تحریر اور ثقیل اور بے معنی الفاظ کے ذخیرہ کے مقابلہ میں انہوں
نے نہایت آسان اور شگفتہ انداز بیان، تجسس اور تحیر کے ساتھ ساتھ جرائم اور سراغ رسانی کے میدان کو اپنے قلم
سے زعفران زار بنا کر لوگوں کو دل کھول کر قہقہے لگانے پر مجبور کر دیا۔ جو نہ ان سے پہلے اور نہ ان کے بعد کسی اور قلم
کار کے بس کا روگ بن سکا اردو ادب کے چند جغادری اور اچھوت لکھاری جو خود کو ادب کا بڑا ٹھیکیدار سمجھتے رہے
ہیں وہ آج بھی اس کے باوجود کہ وہ ابن صفی صاحب کے ناول پوری دلچسپی سے تو پڑھتے ہیں لیکن اقرار اس کا
نہیں کرتے نہ ہی ابن صفی صاحب کو اپنے قبیلے میں جگہ دینے کو تیار ہوتے ہیں۔ چند سکہ بند ادیبوں، شاعروں،
ناول نگاروں جو ادب کے خود ساختہ وارث بنے پھرتے ہیں نے اردو ادب کو اتنا محدود کر دیا ہے کہ ان کے ہم
خیالوں کے سوا کوئی اور اس میں جگہ نہیں پا سکتا۔ چند تنگ نظر لوگ جو سرّی ادب کو کسی طرح ادب ماننے کے لیے
تیار نہیں میرا ان سے سوال ہے کہ کیا الف لیلہ، طلسم ہوش ربا، داستان امیر حمزہ اور دیگر ایسے ہی ادب کے شہہ
پارے جن کی بنیاد ہی سریت اور پراسراریت ہے وہ کیوں ادب کا حصہ ہیں اگر یہ تمام اور ایسی ہی تحاریر ادب
عالیہ یا اردو ادب کو حصہ ہو سکتی ہیں تو پھر ابن صفی کی شفاف صاف ستھری اور با مقصد تحریریں کیونکر اردو ادب کا
حصہ نہیں بن سکتیں۔ ابن صفی صاحب نے اردو کا عصری تقاضوں کے مطابق جدید خطوط پر نہ صرف استوار کیا
ہے بلکہ اپنے فن اپنے ہنر سے مقبول عام بھی کیا ہے۔ ابن صفی صاحب کو پڑھنے والے خوب جانتے ہیں کہ
انہوں نے اپنے ناولوں میں وضاحتی تحریروں سے زیادہ مکالماتی طرز تحریر پر توجہ دی ان کے مکالمات کا اپنا ایک
حسن اور نرالا پن ہے۔ ان کے فن تحریر کا کمال یہ تھا کہ وہ رمزیت تحیر و تجسس سراغ رسانی کو ایک ساتھ اس طرح
گوندھتے کہ پڑھنے والا اپنے اردگرد سے نکل کر اس ماحول میں تیرتا پھرتا جس کو ابن صفی اپنے زور قلم سے زندہ
جاوید بنا دیا کرتے تھے۔ وہ پوری ہوشمندی اور منصوبہ بندی کے ساتھ بڑے سلیقے سے کرداروں کے جذبات و
احساسات کو اجاگر کرتے چلے جاتے تھے۔ ان کے قلم سے قوس وقزح کے رنگ، شگفتگی، شائستگی، رعنائی، شوخ
بیانی، زبان کی ندرت، طنز و مزاح کی چاشنی کے ساتھ ساتھ فکر و نظر معنویت ان کی تحریر کا کمال اپنے عروج پر تھا۔
جی چاہتا ہے کہ یہاں ان کی تحریر کا ایک ٹکڑا جو ان کے قلم کی سحر انگیزی، تازگی فکر، قوت انشا کا فنکارانہ مظہر ہے
پیش کروں۔ یہ حصہ ان کے ناول ''برف کے بھوت'' کا ہے۔

موسم بہار کا آخری پرندہ بھی دردناک آوازوں میں کراہتا ہوا اُڑ گیا۔
ٹیکم گڑھ کی پہاڑیوں پر برف گرنے لگی تھی۔ پہاڑی نالوں کی سطحیں جم گئی تھیں لیکن ان کے نیچے اب بھی پانی بہہ رہا تھا اور جہاں برف کی تہہ زیادہ موٹی نہیں تھی وہاں سے لہریں تک صاف دکھائی دیتی تھیں۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ سورج نکل آتا اور چند ہی گھنٹوں میں برف کی تہہ پگھل جاتی اور نالے پھر اپنی پہلی طوفان خیزیوں کے ساتھ بہنے لگتے۔
درختوں کی شاخیں پتیوں سے محروم تھیں۔ البتہ سدابہار درخت اب بھی اپنی سبز قبا سمیت پرغرور انداز میں سر اٹھائے کھڑے تھے۔
سردیوں میں ساری رونق ختم ہو جاتی ہے۔ درختوں کے تنوں سے لپٹی ہوئی خودرو بیلیں اپنے زرد، نیلے اور سرخ پھولوں سمیت سیاہ رنگ کی پتلی پتلی ڈوریوں کی شکل میں تبدیل ہو کر جھولتی رہ جاتی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کسی نے گوشت چھوڑ کر ہڈیاں پھینک دی ہوں۔ (برف کے بھوت)
یہ تو صرف ان کی ایک کتاب سے مختصر سی تحریر نوٹ کی گئی ہے ایسے شاہکار جملوں سے ان کے ناول خوب آراستہ ہیں۔
غالبًا یہ مارچ یا اپریل 1958ء کی بات ہے جب میں اردو کالج کے آفس میں جناب بابائے اردو مولوی عبدالحق صاحب سے ملا اور ابن صفی صاحب کے بارے میں ایک مشہور معروف ادیب کی شکایت ان سے کی تو انہوں نے برملا فرمایا تھا کہ اردو پر ابن صفی کا بڑا احسان ہے۔
بھارت دہلی میں مقیم اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے تاحیات پروفیسر ایمریٹس جناب پروفیسر گوپی چند نارنگ نے اپنے ایک لیکچر میں کہا ہے کہ ''ہم اردو والے دراصل ایک خاص طرح کی معیار بندی کا شکار ہیں۔ اردو میں ناک بھوں چڑھانے والوں کی کبھی کمی نہیں رہی۔ ابن صفی نے اچھا ادب لکھا ہے، اس کے اندر ایسی حرارت اور ایسی کشش ہے جو سیکڑوں، ہزاروں لاکھوں دلوں کو کھینچتی رہی ہے۔ اس کا اعتراف ادبی طور پر تاریخی طور پر ہونا ہی چاہیے ایک اور معروف ناقد جناب ڈاکٹر محبوب راہی کا کہنا ہے کہ ابن صفی کے ناول ان کی لازوال فنکاری کا ثبوت ہیں۔ ان کے ناولوں میں طنز و مزاح کے بہترین شہ پارے ہونے کے ساتھ ساتھ شعر و ادب، اعلیٰ انسانی اقدار، اخلاقیات، مذہبیات، سائنس، سیاست اور فلسفہ حیات و ممات کی مدلل اور متوازن آمیزش ملتی ہے۔
معروف نقاد جناب شمس الرحمٰن فاروقی کا کہنا ہے کہ ابن صفی کی تحریروں میں حقیقت پسندی اور سماجی شعور اور اصلاح معاشرہ کی کوشش کے کئی نمونے نظر آتے ہیں۔ ابن صفی میں کوئی بات (یا کئی باتیں) ایسی ہیں جو اب بھی ہمارے دل اور ذہن کو متاثر کرتی ہیں۔ ابن صفی کا مرتبہ قرۃ العین حیدر سے کم کیوں ہے جبکہ قرۃ العین حیدر کے پڑھنے والے چند ہزار ہوں گے اور ابن صفی کے پڑھنے والے لاکھوں کی تعداد میں ہیں۔
چلتے چلتے ایک واقعہ بھی بتا تا چلوں غالبًا یہ بات 1986 کے آخر یا 1987ء کے ابتدا کی ہے جب میں اپنی

کتاب طلسم خیال کے بارے میں مختلف حضرات سے ان کی رائے لے رہا تھا اسی سلسلے میں کراچی یونیورسٹی ڈاکٹر ابوالخیر کشفی سے ملنے جانا ہوا وہ اس زمانے میں اردو شعبے کے سربراہ تھے ان کے ساتھی پروفیسروں اساتذہ میں جناب پروفیسر جمیل اختر خان، ڈاکٹر حنیف فوق، جناب سحر انصاری، ڈاکٹر یونس حسنی صاحب اور ڈاکٹر ابواللیث صدیقی پروفیسر ایمرٹس کے طور پر منسلک تھے۔ ایک روز کشفی صاحب کلاس لے رہے تھے میں ان سے ملاقات کے لیے کلاس کے باہر گیلری میں کھڑا ہو گیا۔ کچھ ہی دیر بعد کلاس ختم ہوئی تو ان سے ملاقات ہوئی میں ان کے لیے ابن صفی کا ناول لے کر گیا تھا۔ اس حوالے سے بات ہو رہی تھی کہ جناب پروفیسر جمیل اختر خان تشریف لے آئے اور ابن صفی کا ناول دیکھ کر بولے یہ شخص بھی خوب لکھتا ہے اس نے اچھے اچھوں کی چھٹی کر دی۔ ڈاکٹر کشفی صاحب کسی کام سے ایک طرف چلے گئے جاتے جاتے کہہ گئے کہ طلبا سے ابن صفی کے بارے میں معلوم کر لوں کہ کتنے اسے پڑھتے ہیں کتنے نہیں پڑھتے۔ ان کے کہنے سے میرے ذہن میں ایک بات آئی کہ دیکھوں کہ ادب کے بڑے بڑے نامور لوگوں کو کتنے جانتے ہیں اور کتنے پڑھتے ہیں۔ میں نے گیلری میں اِدھر اُدھر ٹولیوں میں کھڑے طلبا سے بات کی کہ آپ اردو ادب بھی پڑھتے ہیں ان سب نے ہامی بھری۔ میں نے دوسرا سوال کیا۔ آپ نے احمد ندیم قاسمی، غلام عباس، قرۃ العین حیدر، انتظار حسین، رئیس احمد جعفری اور آخر میں ابن صفی کا نام لیا ان میں آپ لوگوں نے کس کو پڑھا ہے اور کس کس کو بحیثیت ادیب جانتے ہیں۔ تقریباً پچیس میں سے بیس طلبا نے یہ کہا ہاں ابن صفی کو جانتے ہیں وہ جاسوسی ناول لکھتے ہیں اور اچھا لکھتے ہیں دو نے کہا ہم نے نہیں پڑھا نہ ہی نام سنا۔ تین نے کہا ہاں پڑھا تو ہے لیکن زیادہ نہیں پڑھا۔ دیگر نامور لوگوں کے بارے میں صرف اتنی ہی بات تمام طلبا نے تقریباً مشترکہ کہی کہ ان لوگوں کے نام تو سنے ہوئے ہیں لیکن پڑھا نہیں ہاں اگر کچھ نصاب میں آ جائے تو وہ مجبوری ہے۔ کتنے لوگ ان لوگوں کو جانتے یا پڑھتے ہیں جبکہ ابن صفی کو ہر اردو پڑھنے والا پڑھتا ہے وہ بھی خرید کر۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے کہا کہ کون ابن صفی اچھا وہ جو جاسوسی ناول لکھتا ہے میں نے پڑھا نہیں لیکن سنا ہے کہ خوب لکھتا ہے پروفیسر جمیل اختر خان نے کہا خوب لکھتا ہے۔ ڈاکٹر حنیف فوق نے کہا میں نے نہیں پڑھا لیکن کشفی صاحب پڑھتے ہیں انہیں شوق سے پڑھتا ہوا کئی بار دیکھا ہے۔ سحر انصاری صاحب مسکرا کر رہ گئے تھے۔

جانے والے تجھے روئے گا زمانہ برسوں

ابن صفی بحیثیت مزاح نگار

پروفیسر مجاہد حسین حسینی۔ ممبرا تھانے

برسوں پہلے کی بات ہے۔ عروس البلاد بمبئی میں رہنے والے ہمارے ایک دیرینہ دوست نے جو گشتی لائبریری چلانے کا کافی عملی تجربہ بھی رکھتے تھے، بمبئی میں ایک اور نئی گشتی لائبریری قائم کی۔ اس موقع پر انہوں نے کتابوں کی اہمیت اور مطالعہ کتب کے جدید ترین طریقوں کے موضوع پر ایک ادبی مذاکرہ منعقد کیا۔

اس مذاکرہ میں راقم السطور نے اپنی افتتاحی تقریر میں کہا کہ بقول امریکی مفکر جان رسکن انسان کو محض منتخب کتابیں ہی پڑھنا چاہیے، اخبار، رسائل اور جاسوسی ناول جیسی، دوئم درجے کی چیزوں پر وقت ضائع کرنا سراسر خلاف عقل ہے۔ دوسرے مقرر (جناب اکرم الہٰ آبادی) نے جو اتفاق سے کئی پراسرار ناولوں کے خالق تھے، اپنی برادری کا دفاع کرتے ہوئے کہا۔ جناب، آپ نے جاسوسی ناولوں کو دوئم درجے کی چیز کیوں سمجھ لیا؟ آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ ہم اپنے جاسوسی ناولوں کی مدد سے، کم پڑھے لکھے لوگوں کو اردو پڑھنا سکھاتے ہیں۔

ایک اور فاضل مقرر مرحوم ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی نے مناظرانہ انداز میں جواب دیتے ہوئے فرمایا۔ ''ممکن ہے، آپ اپنے ناولوں کے ذریعے لوگوں کو اردو پڑھنا سکھاتے ہوں لیکن خطا معاف، جو جاسوسی ناول نگار (بزبان اہل بمبئی) خود ہی دو چوپڑی پڑھیلے ہوں (دو کتابیں پڑھے ہوئے ہوں) وہ کسی اور کو اردو پڑھنا کیا سکھائیں گے۔

اس دلچسپ گفتگو کو سن کر سامعین ہنس پڑے اور بس۔ البتہ سیمینار کے اختتام پر میں نے ڈاکٹر فاروقی سے بڑے ادب سے پوچھا۔ ''ابن صفی صاحب بھی تو پراسرار ناول لکھتے ہیں، ان کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ فاروقی صاحب، فوراً سنجیدہ ہو کر بولے۔

''قبلہ، ہم نے بہ خدا، اردو انہی سے سیکھی ہے۔''

ممکن ہے فاروقی صاحب نے ازراہ عقیدت، ابن صفی کو اپنا استاد کہا ہو، مگر مجھے فخر ہے کہ ابن صفی صاحب مرحوم سچ مچ میرے استاد تھے۔ ابن صفی کا اصل نام اسرار احمد ولد صفی اللہ تھا۔ جب ماں باپ نے ان کا نام اسرار احمد رکھا تھا تو انہیں کیا معلوم تھا کہ بڑا ہو کر ان کا فرزند اسم بامسمیٰ ثابت ہوگا۔ اردو میں پراسرار ناولوں کا ایک نیا عہد اسی کے دم سے شروع ہو کر اسی پر ختم ہوگا۔

ابن صفی ۲۶/ جولائی ۱۹۲۸ء کو قصبہ نارہ ضلع الہ آباد (یوپی) میں پیدا ہوئے تھے۔ وہ جانشین فصیح الملک نواب مرزا خان، داغ دہلوی یعنی ناخدائے سخن حضرت محمد نوح صاحب نوح ناروی کے بہت ہی قریبی عزیز تھے (کسی دور کے رشتے سے ماموں ہوتے تھے)۔ ابن صفی صاحب نے ابتدائی تعلیم اپنے قصبہ میں حاصل کی۔ اس کے بعد شہر الہ آباد آ گئے اور نوح صاحب کے ذاتی مکان جنت محل (واقع حسن منزل) میں رہنے

لگے۔ ڈی اے وی انٹرمیڈیٹ کالج سے انٹرمیڈیٹ کا امتحان پاس کرنے کے بعد الہ آباد یونیورسٹی سے بی اے کیا (درحقیقت بی اے الہ آباد سے نہیں آگرہ سے کیا)۔ بی اے میں ان کے مضامین انگریزی ادب، اردو، سائیکولوجی اور فلاسفی تھے۔ ان مضامین کے علاوہ وہ مختلف موضوعات کی کتابیں بھی دیکھتے رہتے تھے۔ مطالعہ ان کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔

ابن صفی صاحب اکثر شعر بھی کہتے تھے اور نثر بھی لکھتے تھے۔ کچھ مدت تک وہ اپنا کلام حضرت نوح ناروی کو دکھاتے رہے مگر یہ سلسلہ جلد ہی ختم ہوگیا۔ نوح صاحب پرانے رنگ کے استاد تھے اور ابن صفی، نئے رنگ کے دل دادہ۔ پھر بھلا آگ اور پانی میں میل کیسے ممکن تھا؟ (ابن صفی کی چھوٹی بہن بلاعت ریحانہ لطیف کے کہنے کے مطابق صفی صاحب نے نوح صاحب سے کبھی اصلاح نہیں لی وہ دور کے رشتہ دار ہوتے تھے)

سنتے بھی تو کیوں سنتے، اک بزرگ کی باتیں
صبح کو علاقہ کیا، شام کے فسانے سے؟
(مجروح سلطان پوری)

قیام الہ آباد کے دوران ابن صفی کا تعارف جناب سید عباس حیدر حسینی سے ہوا، جو اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ مل کر ماہنامہ ''نکہت'' نکالا کرتے تھے۔ رفتہ رفتہ محلہ حسن منزل میں ''نکہت کلب'' کے نام سے ایک ادارہ وجود میں آ گیا۔ اس کلب میں عباس حسینی، جمال رضوی (عرف شکیل جمالی) ابن صفی، راہی معصوم رضا عرف شاہد اختر، ابن سعید، تیغ الہ آبادی (مصطفیٰ زیدی) محمد احمد نازش پرتاپ گڑھی، مسعود اختر جمال، احمد مجتبیٰ، وامق جونپوری اور بہت سے دوسرے نوجوان شاعر و ادیب جمع تھے۔ ان سب کی کوششوں سے ماہنامہ ''نکہت'' میں چار چاند لگ گئے۔

اس دور میں رسالہ 'نکہت' میں ابن صفی، اسرار ناروی کے نام سے اپنی نظمیں چھپواتے تھے اور طغرل فرغان کے قلمی نام سے نثر میں مزاحیہ خاکے بھی لکھا کرتے تھے۔ ان میں ظرافت کا مادہ قدرت نے بطور خاص ودیعت فرمایا تھا۔ کچھ دنوں کے بعد ''نکہت کلب'' ختم ہوگیا اور ماہنامہ نکہت نے رسالہ کے بجائے کتاب کی شکل اختیار کر لی۔ شروع شروع میں نکہت میں افسانے، نظمیں، غزلیں اور ادبی خبریں ہوا کرتی تھیں۔ آگے چل کر نکہت کے دو ایڈیشن نکلنے لگے۔ ایک کا نام ''جاسوسی دنیا'' رکھا گیا اور دوسرے کا ''رومانی دنیا'' یہ طے پایا کہ اسرار ناروی، ابن صفی کے قلمی نام سے ہر ماہ جاسوسی دنیا کے لیے پراسرار کہانیاں لکھیں گے۔ بہت ہی قلیل مدت میں جاسوسی دنیا اور ابن صفی ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم بن گئے۔ جاسوسی دنیا کی اشاعت برق رفتاری سے بڑھنے لگی اور اب وہ رسالہ بہ یک وقت اردو کے علاوہ دیوناگری اور بنگلہ رسم الخط میں بھی چھپنے لگا۔ ان ناولوں کا انگریزی میں بھی ترجمہ ہوا، شاید انہیں تراجم کو پڑھ کر اس صدی کی بے حد مقبول اور عالم گیر شہرت یافتہ جاسوسی ناولوں کی مصنفہ اگاتھا کرسٹی (AGATHACRISTIE) نے کہا تھا:

''ابن صفی ایشیا کا سب سے کامیاب پراسرار ناول نگار ہے۔''

یہ بھی ایک دلچسپ بات ہے کہ ابن صفی کی مخالفت کے باوجود ان کے احباب نے ان کے نام کے ساتھ بی اے لکھنا شروع کر دیا (جو بہت جلد ان کے نام کا جزو لاینفک بن گیا) جیسے کسی زمانے میں ماہنامہ "نیرنگ خیال" لاہور کے شبلی بی کام کا تصور بغیر بی کام کے ناممکن تھا۔ بالکل اسی طرح ابن صفی کے ساتھ بی اے کا لاحقہ لازمی سمجھا جانے لگا۔

میرے والد مرحوم انگریزوں کے فارن پوسٹ ڈپارٹمنٹ میں ملازم تھے' اسی لیے میرا قیام ۱۹۳۵ء سے شہر بمبئی میں تھا۔ ویسے وطن مالوف شہر الہ آباد (یو پی) تھا۔ اعزہ سے ملنے اکثر الہ آباد جایا کرتا تھا۔ والدہ کی طویل علالت کی وجہ سے ۱۹۵۱ء میں بمبئی سے الہ آباد پہنچا تو تقریباً سال ڈیڑھ سال وہاں قیام کرنا پڑا۔ یادگار حسینی ہائر سکنڈری اسکول کی دسویں کلاس میں میرا داخلہ ہوگیا۔ میری خوش نصیبی سے اس وقت ابن صفی صاحب میرے کلاس ٹیچر تھے۔ وہ اردو پڑھایا کرتے تھے۔ ان کے پڑھانے کا انداز بڑا ہی من موہک اور نرالا تھا۔ اشعار کی تشریح کچھ اس طرح کرتے تھے کہ زیر بحث شعر کے تمام فنی محاسن الم نشرح ہو جاتے۔ اکثر ضمنی طور پر لطیفے بھی سناتے جاتے تھے۔ بعض اوقات ان کے لطیفے اور طنز آمیز جملے بہت مزہ دیتے تھے اور کلاس زعفران زار بن جاتی تھی۔

ایک دن کی بات ہے' ابن صفی صاحب' میر تقی میر کی ایک مشہور غزل پڑھ کر سمجھا رہے تھے۔ اس غزل کا ایک شعر تھا۔

بار بار اُس گلی میں جاتا ہوں
حالت اک اضطراب کی سی ہے!

استاد معظم نے یہ شعر کچھ ایسے لہجہ میں پڑھا اور اس میں پوشیدہ نفسیاتی نکتوں کو یوں واضح کیا کہ مزہ آ گیا۔ آپ جانتے ہیں کہ کلاس میں سبھی شاگرد تو سنجیدہ' ذہین' شوقین اور سعادت مند نہیں ہوا کرتے۔ ایک شریر لڑکا (جس کا نام ضرغام حسین تھا) اٹھ کھڑا ہوا اور بولا۔

''سر شعر کا مطلب ہماری سمجھ میں نہیں آیا۔''

ابن صفی صاحب نے ایک بار پھر شعر کی وضاحت کی لیکن ادھر مرغے کی وہی ایک ٹانگ!

لڑکے نے کہا۔ ''سر' میں اس کو بالکل نہیں سمجھ سکا۔'' اب ابن صفی صاحب کی رگ ظرافت پھڑک اٹھی۔ مسکرا کر فرمایا' بیٹھ جایئے' آپ ابھی اردو شاعری کے لیے نابالغ ہیں۔ ان کے اس ریمارک پر کلاس میں ہنسی کا جو طوفان اٹھا تھا' وہ بیان سے باہر ہے۔

ڈی' اے انٹر کالج (الہ آباد) میں ابن صفی صاحب کے ساتھ میرے چھوٹے چچا' محمد رضا صاحب بھی پڑھتے تھے۔ ان کی روایت ہے کہ ایک مرتبہ کالج کے کسی جلسے میں الہ آباد یونیورسٹی کے ڈاکٹر محمد حفیظ سید مرحوم تشریف لائے تھے۔ وہ ''فارغ البال'' تھے یعنی اس طرح گنجے تھے کہ پیشانی اور سر میں کوئی حد فاصل نہ تھی۔ البتہ سر کے پچھلے حصے سے گردن تک گھنے بالوں کا گچھا سا نظر آتا تھا۔ ابن صفی نے سرگوشی کے انداز میں

ریمارک کرتے ہوئے فرمایا۔

''یار رضا! دیکھتے ہو لوگوں کے آگے داڑھی ہوتی ہے۔ان حضرت کے پیچھے داڑھی ہے۔''

مذکورہ بالا مثالوں سے ابن صفی صاحب کی زندہ دلی اور جولانی طبع کا اندازہ ہوتا ہے۔ظرافت کا مادہ ان میں کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔اکثر ان کی گفتگو اور تحریروں میں پطرس مرحوم کا رنگ جھلکنے لگتا تھا۔مثال کے طور پر ان کے ایک مضمون کے چند جملے میری یادداشت کے کسی گوشے میں اب بھی محفوظ ہیں۔ یہ مضمون ماہنامہ ''نکہت'' میں شائع ہوا تھا۔مضمون کچھ ادب لطیف ٹائپ کا تھا جس میں ایک عاشق نامراد اپنی محبوبہ کو مخاطب کر کے خط لکھتا ہے وہ لکھتا ہے۔

'میرے خوابوں کی ملکہ! دیکھو میں تمہارے بغیر کتنا ادھورا ہوں۔کتنا اداس ہوں۔رات' آدھی سے زیادہ بیت چکی ہے۔چاند کا منہ اتر گیا ہے۔ستاروں کی روشنی رفتہ رفتہ مدھم ہوتی جاتی ہے۔ہواؤں میں نوحوں کی دھن سنائی دیتی ہے۔اب آ بھی جاؤ۔دیکھو تو' سپیدہ سحر نمودار ہو چلا۔ چڑیاں چہچہانے لگیں۔کوؤں نے کائیں کائیں شروع کردی۔ندی کنارے' دھوبی کے گدھے' ڈھیچوں ڈھیچوں کرنے لگے۔خدارا' اب آ بھی جاؤ۔کچھ ہی دیر بعد رات کی رومانویت دم توڑ دے گی۔دھوپ نکل آئے گی۔محبت کا دم نکل جائے گا۔آنا ہے تو بس اب آ بھی جاؤ۔آتی ہو یا پھر ڈنڈا لے کر آؤں؟''

اس اقتباس سے نثر نگاری میں ابن صفی کی اٹھان کا پتہ چلتا ہے۔آگے چل کر جب ہم ان کے لکھے ہوئے جاسوسی ناول پڑھتے ہیں تو ان کی نثر کے جوہر خوب کھلتے ہیں۔ بازاری قسم کے ہزاروں پراسرار ناولوں کی طرح یہ محض قتل و خون اور سراغ رسانی کی سنسنی خیز وارداتیں نہیں بلکہ ان میں گہری تخلیقی ریاضت' منطقی تسلسل' لطف زباں' طنز کی نشتریت' مزاح کی پھلجھڑیاں اور ان سب سے بڑھ کر ''قصہ پن'' کی خصوصیات ملتی ہیں۔ بھرتی کے واقعات' خواہ مخواہ کے تحیر' محیر العقول باتوں' بے مقصد تفصیل اور ڈھیر سارے کرداروں سے اجتناب کیا گیا ہے۔

ابن صفی کے یہاں چند مخصوص کردار ہیں جن کو اپنے قلم کے جادو سے انہوں نے لازوال اور ہردلعزیز بنا دیا ہے۔کرنل احمد کمال فریدی' ان کا پسندیدہ کردار ہے لیکن اگلے وقتوں کے داستانی ہیروز کی طرح وہ مثالی اور بے عیب قطعاً نہیں ہے۔وہ ہزاروں مثبت و منفی انسانی صفات کا حامل ہے۔اس کو غصہ بھی آتا ہے اور پیار بھی۔اس سے غلطیاں بھی سرزد ہوتی ہیں اور کمالات بھی۔وہ سوچنے کے لیے سگار پیتا ہے اور سکون کے لیے کافی۔وہ سانپ بھی پالتا ہے اور کتے بھی۔ ورزش بھی کرتا ہے اور یوگا آسن بھی۔اسے کئی زبانیں آتی ہیں اور عمل تنویم (HYPNOTISM) میں بھی مہارت رکھتا ہے۔وہ مختلف زہروں کی ماہیت و استعمال سے بھی بخوبی واقف ہے اور سانس روکنے پر بھی حیرت انگیز قدرت رکھتا ہے۔وہ خوش اخلاق بھی ہے اور جلاد بھی۔ شراب اور عورت سے کوسوں دور بھاگتا ہے مگر اپنے سینے میں نرم گوشے بھی رکھتا ہے۔اس میں حد سے زیادہ قوت برداشت پائی جاتی ہے اور اس کی آنکھ میں مقناطیسی کشش ہے۔جدید سائنسی مشینوں کی کارکردگی کا علم

بھی رکھتا ہے اور سوسائٹی کے ہر شعبہ میں اس کی عزت کی جاتی ہے۔ مختصر یہ کہ فریدی خود ابن صفی ہے۔ وہ مصنف کے خوابوں کی تصویر بھی ہے اور ان کی تعبیر وتشریح بھی۔ فریدی وہ بھی ہے جو ابن صفی تھے اور وہ بھی ہے جو شاید ابن صفی بننا چاہتے تھے اور نہ بن سکے۔

فریدی کا اسسٹنٹ سرجنٹ ساجد حمید اپنا' الگ ہی مزاج اور رنگ رکھتا ہے۔ وہ ایک لاابالی سا نوجوان ہے۔ جو کھلنڈرا بھی ہے اور باتونی بھی' وہ عورتوں کی کمپنی کا عاشق ہے اور تفریح کا شائق بھی لیکن فریدی کا لاڈلا اور دست راست ہے۔ حمید میں درحقیقت ابن صفی نے کرنل فریدی کی تکمیل ذات کی کوشش کی ہے۔ حمید' فریدی کی کم سخن اور سنجیدگی کی بڑی حد تک تلافی کردیتا ہے اور اس طرح قاری کو" یکسانیت" (MONOTONY) کے دردسر سے بچالیتا ہے۔

علی عمران ایم ایس سی' پی ایچ ڈی' گراں ڈیل قاسم اور دوسرے ثانوی کردار اپنا الگ وجود رکھتے ہیں۔ ابن صفی کی تحریروں میں یوں تو درجنوں قابل ذکر گوشے نظر آتے ہیں لیکن "مزاح کا گوشہ" غیر معمولی صفات کا حامل ہے۔

آرٹ کے موضوع پر حمید کی زبان سے کچھ دلچسپ مکالمے ادا کردیئے گئے ہیں مثلاً!

"جب تمہارا نام شیریں بانو تھا تو تم نے آشا کیوں اختیار کیا؟"

"اوہ' وہ سنجیدہ ہو کر بولی۔ "تم سمجھتے نہیں' فن کار کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔ فن ہی اس کا مذہب ہے۔ وہ نہ ہندو ہوتا ہے اور نہ مسلمان۔"

"یہی منطق تو سمجھ میں نہیں آئی کہ تم دراصل مسلمان ہو اور لوگ تمہیں ہندو سمجھتے ہیں' کمل کمار بھی مسلمان ہی تھا۔ غالباً پیر بخش نام تھا لیکن ہندو سمجھا جاتا تھا۔ تو کہنے کا مطلب یہ ہے کہ جب فن کار کا کوئی مذہب ہی نہیں ہوتا تو وہ ایسے نام کیوں نہیں اختیار کرتا کہ نام سے اس کے مذہب کا پتہ ہی نہ چل سکے۔ اس سلسلے میں "مردنگ" کا نام مجھے پسند ہے۔ اسی طرح تمہیں چاہیے کہ تم اپنا نام "سارنگی' ڈگڈگی' یا ڈھولک" رکھتیں اور کمل کمار "تانپورہ' مجیرا' یا ڈمرو" جیسا کوئی نام اختیار کرتا۔"

(ستاروں کی موت۔ ص: ۱۰۰)

"حقیقت حسن" پر فریدی اور حمید کے مابین حسب ذیل مکالمہ' فلسفہ جمال کی ہزاروں کتابوں پر بھاری ہے۔

"آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟"

"یہی کہ حسن محض بکواس ہے' جس چیز کے معیار کا کوئی تعین ہی نہ ہو اس کا تذکرہ ہی فضول سمجھتا ہوں۔"

"ہز ہارڈ شپ (HIS HARDSHIP) والی ریگستان کی رائے درست معلوم ہوتی ہے مگر اس طرح تو زندگی ممکن نہیں۔"

"تو کیا میں مر گیا ہوں؟"

"قطعی' جس کا احساس حسن فنا ہو جائے' اسے میں مردہ ہی سمجھتا ہوں۔"

حمید بولا۔ ''تب تو، تم یقین جانو! میں مرا نہیں ہوں۔ مجھے اپنی آئرڈیل ٹیئر رکتیا کے پلے بڑے حسین معلوم ہوتے ہیں۔''

میری نظر سے کم از کم اردو کا کوئی پراسرار ناول آج تک ایسا نہیں گزرا جس میں شعروادب پر مزاحیہ انداز میں اس طرح تنقید کی گئی ہو۔

''استاد محبوب نرالے عالم! شاعر کس پائے کے ہوں گے، یہ تو تخلص ہی سے ظاہر ہوتا تھا۔ اتنا لمبا چوڑا تخلص، شاید ہی کسی مائی کے لعل کو نصیب ہوا ہو۔ محبوب نرالے عالم۔ استاد کا قول تھا کہ بڑا شاعر وہی ہے جس کے یہاں انفرادیت بے تحاشہ پائی جاتی ہو۔ لہٰذا ان کا کہا ہوا ہمیشہ بے وزن ہوتا تھا۔ فرماتے تھے۔

''وزن تو سبھی کی شاعری میں ہوتا ہے لہٰذا میری ''بے وزنی'' ہی میری انفرادیت ہے اور اس طرح مجھے بہت بڑا شاعر تسلیم کیا جانا چاہیے۔'' (گھر کا بھیدی)

اپنے ایک اور ناول میں ابن صفی طنز ومزاح کی چاشنی دے کر تنقید شعروادب کے زہریلے تیر اس طرح چلاتے ہیں۔

''کون شاعر پسند ہے آپ کو؟'' حمید نے سائرہ سے کہا۔

''ہر وہ شاعر، جو خالص شاعری کرتا ہو۔ سیاسیات، اخلاقیات یا فلسفہ پر بور نہ کرتا ہو۔''

''ابھی تو آپ اخلاقیات ہی سے متعلق کچھ کہہ رہی تھیں۔''

''نثر میں ہر چیز کا اپنا الگ مقام ہوتا ہے۔ ہیئر آئل میں بال سیاہ کرنے کی ادویات بلاشبہ پائی جاسکتی ہیں لیکن ملیریا یا ٹائیفائیڈ کی دوائیں ہرگز نہیں ملائی جاسکتیں۔ ملائی بھی گئیں تو بے مصرف ثابت ہوں گی۔'' (خونی جھیل)

ایک اور مضحکہ خیز منظر کی تصویر کشی ملاحظہ فرمائیں۔

''آج اتوار تھا اور فریدی کے ملازمین قریب ہی کے ایک کمرے میں ریڈیو پر دیہاتی پروگرام سن رہے تھے۔ ٹھیک اسی وقت اناؤنسر کی آواز سنائی دی۔ ابھی آپ دھوبیوں کے گیت سن رہے تھے۔ اب ایک ضروری اعلان سنیئے، اعلان ختم ہوجانے کے بعد، پھر پروگرام شروع ہوگیا۔ اس بار چماروں کا ناچ نشر ہورہا تھا۔'' (ہولناک ویرانے: ص ۲۸)

اللہ تعالیٰ نے ہمارے استاد مکرم، جناب ابن صفی کو ظرافت اور اختراع پردازی کی صلاحیت بطور خاص عنایت فرمائی تھی۔ حافظہ بھی بلا کا پایا تھا۔ معمولی سے معمولی واقعے کو اتنے پرلطف طریقے پر بیان کرتے تھے کہ وہ ایک مکمل لطیفہ معلوم ہونے لگتا تھا۔

ایک دن گائے کا تذکرہ نکلا۔ فرمانے لگے کہ محض ہندو بھائیوں کی مذہبی کتابوں میں ہی گائے کا ذکر نہیں ملتا بلکہ مسلمانوں کے مقدس قرآن پاک میں بھی گائے کا ذکر ہے۔

رفتہ رفتہ یہ سنجیدہ گفتگو ظرافت کا رنگ اختیار کرنے لگی۔ فرمانے لگے۔

''بہت ممکن ہے آپ لوگوں نے اسی ضمن میں ایک واقعہ سنا ہو۔ ایک مرتبہ ایک صاحب کو بالکل نئی بات سوجھی۔ انہوں نے اس بات پر تحقیق شروع کر دی کہ دنیا کے تمام مذاہب نے اپنی مذہبی کتابوں میں چرند، پرند اور کیڑے مکوڑوں کے بارے میں کیا لکھا ہے؟ یہ محقق صاحب اتفاق سے غیر مسلم تھے اور عربی سے بھی نابلد تھے۔ کسی مسلمان دوست نے انہیں سورہ البقرہ پڑھ کر سنایا اور اس کے ترجمہ و تفسیر سے بھی آگہی بخشی۔ ظاہر ہے کہ یہ سورہ کافی طویل ہے، ترجمہ و تفسیر بیان کرنے میں اور بھی دیر لگی۔ اس کے بعد صاحب موصوف نے فرمایا۔ اب میں آپ کو ''سورہ فیل'' یعنی ہاتھی کا سورہ سناتا ہوں جو قرآن مجید کے آخری پارہ ۳۰ (عمہ یتسائلون) میں ہے۔ ان صاحب نے گھبرا کر کہا۔ ''بھائی جان، ہاتھی والا سورہ پھر کبھی، اتنے بڑے جانور کا حال سننے کے لیے ابھی تو میرے پاس وقت ہی نہیں ہے۔''

ہم سب شاگرد، استاد کے انداز بیان پر کھلکھلا کر ہنسنے لگے۔ آپ کہیں گے کہ لطیفہ شاید ختم ہو چکا ہو گا مگر توبہ کیجیے، ابن صفی صاحب کا بیانیہ (NARRATION) اتنا ہی دلچسپ ہوتا تھا جتنا کہ ان کی تحریریں۔

ایک گلاس پانی پی کر اس داستان لذیذ کو انہوں نے دراز تر کرنا شروع کر دیا۔ فرمانے لگے۔

''مجاہد صاحب! آپ تو بمبئی میں رہتے ہیں نا؟ میں بھی ایک مرتبہ بمبئی جا چکا ہوں۔ ایک بار ایسا ہوا کہ میں گرانٹ روڈ گیا۔ وہاں سے مجھے اوپیرا ہاؤس کی طرف جانا تھا۔ میں نے سوچا کہ بس پکڑ لوں۔ اب جو بس اڈہ پر جا کر دیکھا تو مسافروں کی بڑی لمبی قطاریں تھیں۔ کئی بسیں آئیں اور نکل گئیں لیکن جناب، قطار ہے کہ آگے بڑھتی ہی نہیں۔ جس سے پوچھو، آگے کیوں نہیں جاتے؟ بس یہی جواب ملتا ہے۔ اپن کو کھبر نہیں۔ عاجز آ کر میں قطار میں سے نکلا اور آگے تک دیکھتا چلا گیا۔ ایک دم آگے جا کر حقیقت حال معلوم ہوئی۔ جہاں سے ''کیو'' شروع ہوتا تھا وہاں سب سے آگے دو گائیں کھڑی تھیں۔ بھلا کیوں کر ممکن تھا کہ لوگ اپنی ماں کو راستے سے ہٹا کر خود بس میں سوار ہو جاتے؟''

یہ سچی کہانی سن کر ہم سب لوٹ پوٹ ہو گئے۔

ایک اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھنے والی دو نوجوان لڑکیاں بلقیس اور شاہدہ کسی بات پر علی عمران سے الجھ جاتی ہیں۔ شاہدہ تلخ لہجے میں بولی۔

''میں آپ کا جغرافیہ سمجھنے سے قاصر ہوں۔''

''جغرافیہ کے چند موٹے موٹے اصول یاد رکھیے تو یہ دشواری کبھی پیش نہ آئے۔''

عمران نے ہمہ تن خوش اخلاق بنتے ہوئے کہا۔

''میں چونکہ خط استوا سے کافی فاصلے پر واقع ہوا ہوں...... اس لیے سال بھر ٹھنڈا رہتا ہوں اور میری اپر چیمبر چونکہ سطح سمندر سے زیادہ اونچی نہیں ہے اس لیے وہاں برف جمنے کا امکان کم رہتا ہے۔ باپ موجود ہے، لیکن صورت سے یتیم معلوم ہوتا ہوں۔ میں اتنا کام چور ہوں کہ مجھے حقیقتاً بحرالکاہل میں واقع ہونا چاہیے تھا۔ اب آپ بتائیے کہ ڈول ڈرم (Doldrum) کسے کہتے ہیں۔'' (آہنی دروازہ)

ابن صفی صاحب کے اصل جوہر پاکستان جا کر کھلے۔ وہاں انہوں نے کراچی کی فردوس کالونی میں (درستگی یہاں دفتر تھا گھر نہیں) ذاتی مکان بنوالیا۔ دوسری شادی کی اندھادھند پڑھااور اندھادھند لکھا۔ وہ چینیوں کے اس قول کے قائل تھے کہ :

جو شخص تین دن تک کوئی نئی کتاب نہیں پڑھتا اس کی باتوں میں پھیکا پن آ جاتا ہے۔

آخر کار شب و روز کی محنت شاقہ رنگ لائی اور ان پر جنونی کیفیت طاری رہنے لگی۔ بے ہوشی کے دورے بھی پڑنے لگے۔ پھر وہ چپ چپ رہنے لگے۔ دوستوں سے ملنا جلنا بھی کم کر دیا۔ بالآخر ۲۶ جولائی ۱۹۸۰ء کو دل کے شدید دورے نے اس سرچشمہ نور بصرت کو ہم سے ہمیشہ کے لیے چھین لیا۔

(یہ قطعی درست نہیں ہے صرف مصنف کی خیال آرائی ہے' مولف)

ادب میں سماجی شعور سے جوڑنے والا ادیب

محمد عارف اقبال، مدیر اردو بک ریویو، دہلی

ایک دور میں جاسوسی ناولوں کا تصور تیسرے درجے کی تفریحی تحریروں میں کیا جاتا تھا۔ اسکول اور یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کرنے والے طلبا کو خاص طور پر جاسوسی ناولوں کے پڑھنے سے دور رکھنے کی کوشش کی جاتی تھی۔ جس زمانے میں انگریزی جاسوسی ناولوں کے اردو تراجم شائع ہوا کرتے تھے، انہی دنوں اردو لٹریچر میں فحش نگاری عام تھی۔ اُس وقت انگریزی کے ان ناولوں کے ترجمے بھی کثرت سے ہوئے جن میں جنسی مناظر کی بڑی بے باکی سے تصویر کشی کی جاتی تھی۔ درحقیقت اردو لٹریچر میں فحش نگاری کی وبا، انگریزی کے فحش ناولوں اور رسائل کی دین ہے۔ انگریزی ادب پڑھنے والوں اور مغربی تہذیب و ثقافت سے متاثر لوگوں میں بعض لبرل اور حد درجہ آزاد خیال افراد بھی پیدا ہوئے جو تخلیقی ادب کے فنی تقاضوں سے یکسر محروم تھے۔ انہوں نے محض اپنی ذہنی تسکین کے لیے اردو زبان کو تختۂ مشق بنایا۔ جنسی آوارگی میں مبتلا کرنے والی کہانیاں اردو میں عام ہونے لگیں۔ فحش نگاری نے نئی نسل کے ذہنوں کو اتنا مسموم کر دیا کہ ان میں ذہنی آوارگی جڑ پکڑنے لگی۔ ایسے ہی ماحول میں انگریزی جاسوسی ناولوں کے اردو تراجم شائع ہوئے۔ اُس دور کے اردو مترجمین میں بڑے باصلاحیت لوگ تھے۔ افسوس کہ ان میں سے اکثر نے اردو زبان کی علمی و تعلیمی ضرورتوں کو ملحوظ نہیں رکھا۔ انہوں نے بے سر وپا انگریزی ناولوں کے ترجموں میں اپنی توانائی اور صلاحیت صرف کی۔ اگر وہ انگریزی اور دیگر زبانوں میں شائع ہونے والی انسائیکلو پیڈیائی کتابوں کا ترجمہ کرتے تو اردو زبان پر ان کا بڑا احسان ہوتا۔ ان کی چیزیں آج بھی دستاویز کی حامل ہوتیں اور قوم ان کو سر آنکھوں پر بٹھاتی۔ اس کے برعکس انہوں نے اردو قارئین کو گمراہ کن لٹریچر دیا۔ یہی وجہ ہے کہ فقط 70-60 برسوں میں ان کے نام بھی گم ہو گئے۔ اس کے برعکس مولوی عبدالحق اور مولوی فیروز الدین نے اردو لٹریچر کو جو لغات فراہم کیں، طلبا اور اساتذہ آج بھی ان سے استفادہ پر خود کو مجبور پاتے ہیں۔

ایسا لگتا ہے کہ اُس دور میں سطحی تخلیقی ادب اور جذبات کو برانگیختہ کرنے والے جنسی لٹریچر کا سیلاب آ گیا۔ ایسی صورت میں اُس وقت اردو میں لکھی جانے والی ہر کہانی اور ناول کو ادیب و نقاد ادب کا درجہ دینے سے قاصر رہے۔ کسی حد تک وہ اپنے مؤقف میں حق بجانب بھی تھے۔ شاید اسی وجہ سے انہوں نے اردو ادب کے گرد ایک حصار کھینچ دیا تاکہ ادب کے طلبا اُس دور کے سطحی اردو لٹریچر کی آلائشوں سے محفوظ رہ سکیں۔ ممکن ہے کہ ایسا نیک نیتی سے کیا گیا ہوگا لیکن رفتہ رفتہ اردو ادب میں یہ خرابی در آئی کہ ادب کے طلبا کلاسیکی ادب اور

اپنے اساتذہ سے تو استفادہ کرتے رہے‘ عصری ادب سے ان کا رویہ بے توجہی کا رہا۔ جس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ اخلاق و کردار سے کورے اساتذہ کی چاندی ہوگئی اور کلاسیکی ادب کے حوالے سے نیز ترقی پسندی کے نام پر اردو ادب کو ایک دوسری راہ پر ڈال دیا گیا۔ لہٰذا عصر حاضر کے مخلص ادیبوں اور شاعروں کی تخلیقات بھی سرد خانے میں ڈال دی گئیں اور ان کے خلاف ایسی فضا ہموار کی گئی گویا اردو ادب سے ان کا کوئی تعلق ہی نہیں۔

بیسویں صدی کے عظیم مصنف ابن صفی کی تخلیقات کے ساتھ بھی مخصوص ذہنیت رکھنے والے ادیبوں اور نقادوں نے کچھ ایسا ہی سلوک کیا۔ پہلے تو انہیں ظفر عمر اور تیرتھ رام فیروز پوری جیسا ادیب و مترجم تصور کیا جانے لگا لیکن جب ان کی تخلیقات کے فلسفیانہ رنگ اور ان کی تحریروں میں سماج و زندگی سے ہم آہنگ پیغام اور مقاصد کا ادراک کیا گیا تو نام نہاد ادیبوں اور نقادوں کو اندازہ ہونے لگا کہ اگر ابن صفی کی تخلیقات کی ان کی جانب سے پذیرائی کی گئی تو ادب کے کارخانے میں ان کا خود ساختہ گھروندا ریزہ ریزہ ہو جائے گا۔ لہٰذا کل کے انگریزی سے ترجمہ جاسوسی ناولوں کی طرح ابن صفی کی اوریجنل تخلیقات کے ساتھ بھی وہی رویہ اختیار کیا گیا لیکن۔ خدا کی رسّی کو مضبوط تھامنے والوں کی تحریریں کبھی گرد آلود ہوتی ہیں اور نہ ہی ان کی فکری وسعتوں کو مٹھی میں قید کیا جاسکتا ہے۔ ابن صفی کے انتقال کے صرف تیس برس کے اندر انگریزی کے بین الاقوامی شہرت یافتہ ناشرین کی جانب سے انگریزی اور ہندی میں ان کے ناولوں کے ترجمے کا کام جس رفتار سے جاری ہے‘ ابن صفی کے ہم عصروں میں شاید ہی کسی کو یہ اعزاز حاصل ہوا ہو کیونکہ بقول لئیق رضوی۔

''ابن صفی نے‘ جاسوسی ناول کو بڑا وژن دیا۔ اسے زندگی کے فلسفے اور سماجی شعور سے جوڑا۔ پُر اسرار اور سنسنی خیز وادیوں میں‘ محض تفریحی ہچکولے کھلانے کے بجائے انہوں نے عام طور پر قاری کو جرم کی پرت در پرت سچائیوں سے روبرو کرانے کی جستجو کی۔ تفتیش اور مجرم کی تلاش میں کھو جانے کے بجائے‘ وہ ان سوتوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں جو لگاتار جرم اور مجرم کو اُگل رہے ہیں۔'' (ابن صفی اور سماجی سروکار‘ کتاب نما‘ جولائی 2010)

اردو میں جاسوسی ادب کے مؤسس ابن صفی کا قد اتنا اونچا ہے کہ اس زوال آمادہ دور میں ان کے قد کی بلندی کا تصور بھی محال ہے۔ عشق اور رومانس کی لایعنی اور فحش کہانیوں کو ادب کا درجہ دینے والے ادیبوں اور نقادوں کے دوہرے کردار اور معیار کا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اب بھی جاسوسی ادب کو اردو ادب کا حصہ تسلیم نہیں کرتے۔ وہ تاریخی ادب کو بھی خارج از ادب قرار دیتے ہیں۔ تاہم وہ دن دور نہیں جب رفتہ رفتہ اس راز سے پردہ اٹھے گا کہ اردو کے نام نہاد ادیبوں اور خود ساختہ ناقدوں کے کن مفادات پر ابن صفی کی تحریروں سے ضربیں لگ رہی تھیں اور انگریزی جاسوسی ادب کی مصنفہ اگاتھا کرسٹی کے ہم عصر ابن صفی کے لیے اردو ادب میں داخلہ کیوں ممنوع قرار دیا گیا تھا؟

اردو دنیا کا ہر باہوش‘ ذی شعور اور علم دوست انسان کسی حد تک اس بات سے واقف ہے کہ ابن صفی

نے 1952 سے اردو دنیا میں جو کارہائے نمایاں انجام دیئے وہ ناقابل انکار حقیقت ہے۔ اردو کے خلاف منصوبہ بند سازش کو انہوں نے جس خوبصورتی سے ناکامی سے ہمکنار کیا' اس کی مثال اردو کی تاریخ میں ملنی مشکل ہے۔ مٹھی بھر خودساختہ ادبی جاگیرداروں کے دیوانِ خاص سے اردو کو آزاد کرا کر دیوان عام میں جلوہ افروز کرانا صرف ابن صفی کا ہی کارنامہ ہے۔ اپنے ناولوں کے مکالموں کے ذریعے جس طرح کے مرصع اور مقفع جملوں سے نئی نسل کو ابن صفی نے روشناس کرایا اس سے ایسا لگتا ہے کہ اردو اس کے بعد اپنے اصل محبوب کے دلوں میں دھڑکنے لگی۔ یہی سبب ہے کہ آج بھی اردو ادب سے آشنائی رکھنے والے اہل علم اور اساتذۂ ادب اس اعتراف کو اعزاز سمجھتے ہیں کہ انہوں نے زمانۂ طالب علمی میں ابن صفی کی تحریروں سے ہی لکھنا اور گفتگو کرنا سیکھا ہے۔

ابن صفی آج ہمارے درمیان نہیں ہیں لیکن انہوں نے اپنے سحر انگیز قلم سے تحیر و تجسس کی وادیوں میں ادب کے جو پھول کھلائے وہ ہمیشہ اردو دنیا میں سرسبز و شاداب رہیں گے۔ ان کی خوشبو فضاؤں میں اسی طرح پھیلتی رہے گی اور ان کی لازوال تحریریں قارئین کے دل و دماغ میں ان کی یادوں کو زندہ رکھیں گی۔

اردو ادب میں ابن صفی کا طرہ امتیاز یہ بھی ہے کہ انہوں نے جاسوسی ناول نگاری کے روشن باب کا آغاز کیا۔ انہوں نے جرم و سزا جیسے خشک موضوع کو اپنے شگفتہ طرز تحریر اور طنز و مزاح کی چاشنی سے اتنا دلچسپ اور پُرکشش بنا دیا کہ وہ اردو دنیا میں جاسوسی ادب کے مؤجد کہے جانے لگے۔ اس کے برعکس یہ اردو ادب کی بد قسمتی رہی کہ اس میں اخلاقی اقدار سے گری ہوئی شاعری اور گلشن نندہ ٹائپ کے ناولوں کو تو ادب کا درجہ دیا گیا لیکن ابن صفی کی شفاف اور مقصدی تحریروں کو ادب کے طلبا کے لیے اچھوت بنا کر رکھ دیا گیا۔ بالخصوص تقسیم ہند کے بعد اردو ادب کے چند سکہ بند ادیبوں' شاعروں اور ناول نگاروں نے ادب کا ایک خودساختہ کینوس بنا کر اردو ادب کے دامن کو تنگ اور محدود کر دیا۔ حتیٰ کہ 'الف لیلہ' 'طلسم ہوش ربا' اور 'داستان امیر حمزہ' سے مالا مال اردو ادب میں جاسوسی ادب کو انہوں نے لائق اعتناء نہیں سمجھا جبکہ ابن صفی نے اردو زبان کو عصری تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے اور دو عالمی جنگوں کے بعد بدلتی دنیا کے الجھے ہوئے سنگین مسائل نیز جدید قومی و معاشرتی اذہان کی نفسیاتی اور سماجی پہلوؤں کو اجاگر کرنے میں کلیدی کردار ادا کیا۔ بہروپ بھرنے والے جدید ادیبوں کو اردو زبان کی نشوونما سے بھلا کیا دلچسپی ہو سکتی تھی۔ وہ لوگ جدید ادب کے نام پر اپنی رومانٹک شاعری اور فحش و لچر ادب کی محدود دنیا میں بغلیں بجا رہے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ ابن صفی جیسے عظیم ادیب کو اگر نام نہاد ادیبوں کی مجلس میں جگہ دی گئی تو خود ان کا قد بونا ہو جائے گا۔ تاہم تاریخ کبھی کسی کو معاف نہیں کرتی بلکہ انصاف کرتی ہے۔ جب اردو ادب کی نئی تاریخ لکھی جائے گی تو ان بونے ادیبوں کے قد کا اندازہ لگانا دشوار نہ ہوگا۔ ابن صفی کے بعض ناول تو اردو ادب کے وہ شاہکار ہیں کہ موجودہ اردو ادیبوں کا ایک جتھا بھی اس جیسا لکھنے کی کوشش کرے تو ان کے کسی ناول کا ایک صفحہ بھی لکھنے سے قاصر ہوگا۔

ابن صفی کی ہر کہانی میں مقصدیت نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔ وہ اپنی کہانی میں سماج میں موجود بھانت

بھانت کے کرداروں کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ وہ ادب کو مخصوص عینک سے دیکھنے کے قائل نہیں اور نہ ہی اسے تنگ و تاریک گلیاروں میں محبوس تصور کرتے ہیں۔ ان کا ادبی افق وسیع تر تناظر کا حامل رہا ہے۔ وہ اپنے کسی کردار کے ہاتھوں میں اگر ریوالور تھما دیتے ہیں تو اس کے ساتھ ہی اس کے اندر دھڑکتے ہوئے ایک گداز دل کا احساس بھی زندہ رکھتے ہیں۔ وہ جرم سے نفرت کرتے ہیں' مجرموں سے نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ سماج کو جرائم سے پاک دیکھنا چاہتے ہیں۔ وہ صرف چوری اور ڈکیتی کو جرم نہیں سمجھتے بلکہ جرم پر اُکسانے والے جملہ محرکات کو جرائم کا منبع تصور کرتے ہیں۔ وہ اخلاقی اور سماجی جرائم کے ساتھ ساتھ علمی' سائنسی' تہذیبی' تعلیمی' سیاسی' قبائلی' لسانی اور مسلکی فساد کو بھی جرم ہی سمجھتے ہیں۔ شاید اسی وجہ سے سماج سے تعلق رکھنے والے ہر طرح کے انسان کو وہ اپنی کہانی کا کردار بناتے ہیں۔ ان کی تقریباً تمام ہی کہانیوں میں ''جاسوس'' دراصل سماج کا نمائندہ کردار ہے جو جرم سے نفرت کرنا سکھاتا ہے اور معاشرے کے شر کو بیخ و بُن سے اکھاڑ پھینکنے کا عزم رکھتا ہے تاکہ معاشرہ میں خیر پسند عناصر کو نشو و نما ملے۔

بیسویں صدی کے ادب میں آزادئ فکر کا خاص طور سے بہت چرچا ہوتا ہے جس کا تعلق اصل میں کسی نہ کسی سماجی ردعمل سے ہے۔ اس لیے امیروں اور دولت مندوں کی سفاک ذہنیت کے مقابلے میں غربا اور مساکین کا ردعمل دیکھنے کو ملتا ہے۔ مَردوں کی آزادی کے ردعمل میں عورتوں کی آزادی کا غلغلہ بلند کیا جاتا ہے اور جنسی آوارگی کو شہ ملتی ہے۔ مذہبی رسوم و روایات کا ردعمل ملحدانہ افکار کے نتیجے میں سامنے آتا ہے۔ فی الحقیقت اس طرح کے ردعمل سے برپا ہونے والی تحریکیں بھی انسان کو انتہا پسندی کی طرف لے جاتی ہیں۔ ابن صفی نے اس کے برعکس ادب میں ایسا انوکھا' معتدل اور شفاف تجربہ کیا ہے جو آئینے کی مانند ہے۔ انہوں نے اپنی کہانیوں میں سیکڑوں قسم کے کرداروں سے متعارف کرایا ہے اور ان کے ذریعے عقل و شعور اور غور و فکر کی دعوت دی ہے۔ وہ آزادئ فکر کی معقول توجیہ کرتے ہیں' غیر معقولیت کی ان کے یہاں کوئی جگہ نہیں ہے۔ ان کے نزدیک حسن و عشق ایک سیدھا سادہ معاملہ ہے اور وہ بے لگام عاشق کی ٹھنڈی آہوں کو خلافِ ادب تصور کرتے ہیں۔ وہ ادب میں خیالی دنیا کے حسین قلعے تعمیر نہیں کرتے بلکہ اس کا رشتہ حال سے مربوط کرتے ہوئے حقیقی اور عملی انسانی مسائل کی طرف ہماری توجہ مبذول کراتے ہیں۔ بالفاظ دیگر وہ انداز کے ساتھ ساتھ روشن مستقبل کی ''بشارت'' بھی دیتے ہیں۔

اردو دنیا میں ابن صفی کی خدمات کو یکسر نظر انداز کر دیا جانا محض اتفاق نہیں ہے بلکہ اس کی پشت پر بڑی سوچی سمجھی اسکیم کارفرما رہی ہے۔ اندازہ کیجئے کہ منفرد لب و لہجے کا ادیب و شاعر اردو دنیا کے قارئین کے دلوں پر تو ''حکومت'' کرتا ہو اور اسی دنیا سے وابستہ چند ادیب و نقاد ابن صفی کی خدمات کے سلسلے میں اندھے' بہرے اور گونگے بن گئے ہوں' کیا یہ بات حلق سے نیچے اتر سکتی ہے؟ ابن صفی کی خدمات کا ادراک رکھنے والے اہل علم حضرات اور دانشوروں سے استدعا ہے کہ وہ خود بھی اس موضوع کو آگے بڑھائیں اور تحقیق کی روشنی میں مفاد پرست ادیبوں اور نقادوں کے پُرفریب ادبی رویے کی نقاب کشائی کریں۔ یہ وقت کا تقاضا

ہے کہ اردو ادب پر پڑنے والے ان کے مکروہ سایوں کا تعاقب کیا جائے گا۔ اس سے نہ صرف ابن صفی کی ''مظلومیت'' کا اندازہ ہوگا بلکہ اردو زبان و ادب سے وابستگی رکھنے والے ان سینکڑوں مخلصین کا بھی بھلا ہوگا جو کسی نہ کسی درجے میں اردو ادب کے مافیاؤں کے شکار ہیں۔

انسانی سماج میں سچ، جھوٹ، ظلم، انصاف اور اخلاقیات کی اہمیت ازل سے رہی ہے۔ دنیا کی تمام قوموں میں ان اصطلاحات کی آفاقی حیثیت کو ہمیشہ تسلیم کیا جاتا رہا ہے۔ اسی طرح مذہب کا تصور بھی ہر قوم میں پایا جاتا ہے البتہ یہ ایک الگ موضوع ہے کہ اسلام کے ازلی تصور میں جب گمراہ کن عقائد داخل ہو گئے تو اس کے نتیجے میں ہی بہت سے مذاہب وجود میں آئے۔ اس کے باوجود ہر مذہب میں آفاقی تصورات کم از کم جوں کا توں برقرار رہے۔ انسانی سماج نے کبھی کسی جھوٹے اور فریبی شخص کو اچھا نہیں کہا خواہ وہ دنیا کے کسی بھی مذہب کا پیرو ہو۔ ہر زمانے کا ادیب و مفکر بھی کسی نہ کسی مذہب کا پیرو رہا ہے چاہے وہ اس کا پیشوا ہو یا پیروکار۔ لیکن بیسویں صدی میں انسانی افکار و تصورات میں ایسا انتشار برپا ہوا اور مذہب بیزار آزاد خیالی نے جب جڑ پکڑنی شروع کی تو عالمی سطح پر معاشرے بھی اس سے متاثر ہوئے۔ ادیبوں میں بھی کھلی آزاد خیالی کی روش پیدا ہونے لگی۔ لہٰذا معاشرتی برائیوں اور ظلم و استحصال میں انہیں مذہب ہی میں کیڑے نظر آنے لگے۔ بجائے اس کے کہ وہ اپنے قلم سے مذہب کی اصلاح کرتے، انہوں نے خالقِ کائنات کے وجود ہی سے انکار کر دیا حتیٰ کہ انسانی تاریخ کو بھی اپنی کج فکری کے سبب ایسا مسخ کیا کہ تاریخ کا اعتبار ہی اٹھنے لگا۔ ایسی صورت میں حقائق میں بصیرت رکھنے والوں کو طرح طرح کی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ اس صورت حال کا سب سے بڑا المیہ یہ تھا کہ خودساختہ مذہب بیزار مفکرین و دانشوران اپنی تھیوری کو حقیقت اور آئیڈیل کا رنگ دے کر اصرار کرنے لگے کہ جو کچھ وہ پیش کر رہے ہیں، دراصل وہی حقیقت ہے۔ اس ''دانشورانہ دہشت گردی'' نے علمی و فکری سطح پر ایسی تباہی مچائی کہ بصیرت رکھنے والے ادیبوں اور دانشوروں نے جب احتجاج کیا تو انہیں حاشیہ پر پہنچانے کی کوشش کی جانے لگی۔ حالانکہ رواداری کا تقاضا یہ تھا کہ وہ کھلے دل سے اپنی تھیوری پیش کر کے خاموش ہو جاتے، اس کے مبلغ نہ بنتے اور حقیقی معنی میں آزادیٔ رائے کا احترام کیا جاتا۔ ادب کو ادب سمجھا جاتا اسے کسی اِزم سے جوڑنے کی کوشش نہ کی جاتی۔ دیکھا یہ جاتا کہ اصل میں کون ادیب آفاقی اصطلاحات اور خصوصیات کا حامل ہے اور اس کے ادب میں اخلاقیات کی کس حد تک پاسداری کی گئی ہے۔ اس کے برعکس ادب میں نام نہاد ''نظریات'' کو نہ صرف ٹھونسنے کی کوشش کی گئی بلکہ حرص و ہوس کے سائے میں پروردہ ادیبوں اور نقادوں کی ٹولیوں نے معاشرے پر جبراً اپنے نظریات نافذ کرنے شروع کر دیئے۔ ایسی صورت میں حق پرست ادیبوں کو کنارہ کش ہونے میں ہی اپنی عافیت نظر آئی لیکن چند جانباز حق پسند ادیبوں نے ان کے جبر اور استحصال کا مقابلہ کیا، ان میں ابن صفی بھی شامل تھے۔ انہیں بھی ان کے عتاب کا شکار ہونا پڑا۔ مثل مشہور ہے کہ شیطان جان نہیں لیتا پریشان ضرور کرتا ہے۔ لہٰذا ابن صفی اپنی خدمات کے سبب عوام میں تو مقبول ہوئے لیکن خودساختہ نظریات رکھنے والے ادیبوں نے انہیں ہر محاذ پر زک

پہنچانے کی کوشش کی اوران کی شخصیت کو بے حیثیت بنانے میں کلیدی کردار ادا کیا۔

جاسوسی ادب کا اردو میں کیا مقام ہے اس ضمن میں اردو کے نقادوں نے ابھی تک کوئی حتمی رائے نہیں دی ہے۔ غالباً اس کی وجہ اردو ادب وشاعری میں عشق ومحبت کی وہ روایتی اور بے سروپا داستانیں ہیں جنہیں اگر اردو ادب سے خارج کر دیا جائے تو شاید اس کے دامن میں کچھ بھی باقی نہ بچے۔ ابن صفی چونکہ ایک اوریجنل مصنف تھے لہٰذا اردو ادب میں منفرد تجربہ کرنے کا انہیں بھی حق تھا۔ اس تجربے کا نتیجہ تھا جاسوسی ادب۔ اس سے قبل اردو میں انگریزی جاسوسی ناولوں کے ترجمے شائع ہوتے تھے۔ ظاہر ہے کہ ترجمہ کا کام محض سامان دل بستگی کے علاوہ کچھ نہ تھا۔ اس میدان میں تیرتھ رام فیروز پوری (1885-1954) کا نام بے حد نمایاں ہے۔ کاش کہ تیرتھ رام فیروز پوری اپنی گرانقدر صلاحیت کو جاسوسی ناول کے ترجمے کے بجائے انگریزی میں شائع ہونے والی تاریخی وسماجی کتابوں کے ترجمہ پر صرف کرتے تو اردو زبان کے سرمایہ میں گراں بہا اضافہ ہوتا۔ انگریزی ناولوں کا ترجمہ کرتے وقت تیرتھ رام فیروز پوری کی مجبوری یہ تھی کہ وہ نہ تو کردار کو بدل سکتے تھے اور نہ ہی ناول کے سماجی وثقافتی پس منظر کو، ساتھ ہی اردو کی زمین میں انگریزی پس منظر کے کرداروں کو کھپانا آسان نہ تھا۔ لہٰذا اردو قارئین کے مزاج کی مناسبت سے انہوں نے انگریزی کرداروں میں اردو تہذیب کو اجاگر کرنے کی کوشش بھی کی جس کی وجہ سے وہ ناول کا حقیقی ترجمہ نہ کر سکے۔ اسی بات کو ابن صفی نے اپنے ایک ناول ''سیاہ پوش لٹیرا'' (1954) میں کرنل فریدی کی زبان سے اس طرح بیان کیا ہے۔

''آہ واٹسن میرے عزیز!'' فریدی مضحکانہ انداز میں مسکرا کر بولا۔

''خدا منشی تیرتھ رام فیروز پوری کی مغفرت کرے کہ انہوں نے مجھے اردو میں لاکر بات بات پر آہ بھرنے پر مجبور کر دیا اور میری مٹی اس طرح پلید کی کہ اردو والے مجھے مولوی شرلاک ہومز مدظلہ سمجھنے لگے۔ میں انگریز کے بجائے لکھنؤ کا باشندہ ہو کر رہ گیا۔''

ابن صفی انگریزی جاسوسی ناول کے اردو ترجمہ کی اس خامی یا بہ الفاظ دیگر Blunder کو شدت سے محسوس کر رہے تھے۔ ابن صفی کا مقصد تیرتھ رام فیروز پوری کا مضحکہ اڑانا نہ تھا۔ وہ یہ بھی محسوس کرتے تھے کہ اس طرح کے سطحی ترجموں کی پذیرائی اردو ادب میں نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا انہوں نے ایک نئی راہ اپنائی۔ انہوں نے ہندوستان کی سرزمین کی مٹی سے ایسے کردار تخلیق کیے جو چلتے پھرتے دکھائی دیتے ہوں نیز ان پر وہم اور بناوٹ کے بجائے اصل کا گمان ہوتا ہو۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے اردو ادب میں موجود آلائشوں اور جنسی بے راہ روی کو محسوس کرتے ہوئے ادبی پیرائے میں ایسی نشتر زنی کی کہ جاسوسی ادب کے مطالعہ کے دوران میں بعض اوقات یہ محسوس ہونے لگتا ہے کہ ادب، فلسفہ، سائنس، اخلاقیات اور دیگر علوم کے اسباق کھل گئے ہوں۔ حیرت کی بات ہے کہ ''جاسوسی دنیا'' کے پبلشر محترم عباس حسینی سے بھی ایک سنگین غلطی ہوئی۔ انہوں نے ابن صفی کے ناولوں کے ہندی ترجمہ کے وقت اس بات کو فراموش کر دیا کہ فریدی کا لافانی کردار اپنی الگ زمینی حقیقت اور پس منظر رکھتا ہے۔ افسوس کہ مترجم نے ہندی ترجمہ میں فریدی کے کردار کو ''ونود'' بنا دیا۔

حالانکہ ابن صفی نے فریدی کے والد کا نام نواب عزیز الدین خاں بتایا ہے جو خود بھی اپنے زمانے کے بڑے رئیسوں میں تھے جن کا اپنا شاندار خاندانی پس منظر تھا اور ایڈونچر اُن کی فطرت کا حصہ تھا۔ کاش عباس حسینی اس سلسلے میں زیادہ حساس ہوتے اور ابن صفی کے واضح اشاروں کو سمجھنے میں غلطی نہ کرتے۔ انہوں نے ہندی میں عمران کے کردار کا حشر بھی کچھ ایسا ہی کیا۔

منظر نگاری میں ابن صفی نے روایت سے ہٹ کر قاری کو الفاظ کے پیچوں میں الجھانے سے گریز کیا۔ انہوں نے کم سے کم الفاظ میں ایسی منظر کشی کی ہے کہ منظر کے ہر لفظ پر نگینے کا گمان ہونے لگتا ہے۔ ناول ''عمران کا اغوا'' (جنوری 1959) کا یہ منظر ملاحظہ ہو۔

''ہوا تیز اور خنک تھی... لیکن ریت کا ایک ذرہ بھی اپنی جگہ سے جنبش نہیں کررہا تھا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے ہوا زمین کی سطح سے ٹکرائے بغیر چل رہی ہو۔''

''قاتل سنگ ریزے'' (1953) کا یہ منظر ملاحظہ ہو۔

''وہ کھڑکی کے باہر دیکھ رہا تھا۔ سورج طلوع ہو چکا تھا اور باہر نرم نرم گھاس پر پڑے ہوئے نقرئی قطروں سے کئی طرح کے رنگ جھلکنے لگے تھے۔''

ابن صفی نے اپنے ایک ناول ''پر ہول سناٹا'' (1954) میں ڈرائنگ روم میں منتظر ایک شخص کا خاکہ جس ادبی پیرائے میں بیان کیا ہے کہ اس کی پوری شخصیت قاری کے ذہن میں سمٹ آتی ہے۔ اسے بھی ملاحظہ فرمائیں۔

''ڈرائنگ روم میں ایک پستہ قد لیکن بھاری بھر کم آدمی نظر آیا جس کی پشت دروازے کی طرف تھی اور وہ شاید دیوار سے لگی ہوئی ایک پینٹنگ دیکھ رہا تھا۔ حمید کی آہٹ سُن کر اچانک مڑا۔ آدمی معمر تھا لیکن خدوخال بچکانہ تھے۔ چہرہ بھرا ہوا اور داڑھی مونچھوں سے بے نیاز تھا۔ رخساروں کی جلد کی ہلکی سی نیلاہٹ کہہ رہی تھی کہ وہ روزانہ شیو (shave) کرنے کا عادی ہے۔ آنکھوں میں طفلانہ شوخی کی ہلکی سی جھلک تھی جو اس کی کشادہ پیشانی کے پُر وقار نشیب و فراز کی موجودگی میں کسی شعر کی شُتر گُربگی کی طرح کھٹکتی تھی۔ عمر چالیس اور پچاس کے درمیان رہی ہوگی۔ وہ چائنا سِلک کی پتلون اور ہلکی نارنجی رنگ کی ریشمی قمیص میں ملبوس تھا۔ حمید کو دیکھ کر اس طرح چونک کر خوش آمدید کہنے والے انداز میں مسکرایا جیسے حمید اس کا پرانا شناسا ہو لیکن پھر سنبھل گیا اور اس کے چہرے پر فوری خجالت کے آثار نظر آنے لگے۔''

مذکورہ شخصی خاکہ میں ابن صفی نے ''شتر گربگی'' کا برمحل استعمال جس انداز سے کیا ہے اس سے نہ صرف ان کے شعری ذوق کا پتہ چلتا ہے بلکہ اعلیٰ ادبی ذوق کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ ''زہریلی تصویر'' (1964) میں عمران کی رگ ظرافت خطرات میں گھرے ہونے کے باوجود اس طرح پھڑکتی ہے کہ وہ مجرم کو بھی اردو مشاعرے کی دعوت قبول کرنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ اردو شعرا کی حالتِ زار اور مشاعرے کے انحطاط پر ''جاسوسی ادب'' میں یہ ادبی نشتر ملاحظہ ہو۔

''مجھے کہاں لے جارہے ہو؟''

''راناپیلیس!''

''کیوں؟''

''تمہیں چائے پلاکر دو چار غزلیں سناؤں گا۔ پچھلی رات بھی ایک تازہ غزل ہوئی ہے۔ پیٹ میں درد ہو رہا ہے جب تک کوئی سنے گا نہیں' بدہضمی میں مبتلا رہوں گا۔ سامعین کہاں ملتے ہیں مجبوراً ریوالور کے زور پر مہیا کرتا ہوں' غزل تو الگ رہی تمہیں دوہے بھی سننے پڑیں گے۔''

ادب میں ابن صفی کو جہاں ان کی تحریروں میں طنز ومزاح کی چاشنی سے طرہ امتیاز حاصل ہے وہیں ان کے یہاں انوکھے اور اچھوتے خیال کی آرائش بھی ہے۔ ان کے عمران سیریز کے ناولوں میں عمران کا کردار عصر حاضر کا جیتا جاگتا نمائندہ کردار محسوس ہوتا ہے۔ تاہم اس کی ساخت کچھ ایسی ہے کہ اس پر بیک وقت جدید اور مابعد جدید دونوں کا گمان ہوتا ہے۔ عمران اگر چہ روایتی اصولوں کا قائل نہیں ہے لیکن دشمنوں اور وطن فروشوں کے مقابلے میں وہ شدت سے روایت پسندی کے اصول پر کاربند نظر آتا ہے۔ ایک طرف جہاں وہ روایتی ہتھیاروں سے کام لینا پسند نہیں کرتا تو دوسری طرف موقع ومحل کے لحاظ ناقابل شکست ڈیٹرنٹ (deterrent) کا استعمال بھی بڑی خوبصورتی سے کرتا ہے۔ شاید انہی خصوصیات کی بناپر بعض ادیبوں نے عمران کے کردار کا موازنہ ''طلسم ہوش ربا'' کے معروف کردار ''عمر وعیار'' سے کیا ہے۔ فی الحقیقت عمران موجودہ دور کا ایسا نمائندہ کردار ہے جو مایوسی کی انتہائی صورت حال میں بھی امیدوں اور آرزوؤں کی خوشخبری دیتا ہے۔ ساری دنیا قنوطیت اور اضمحلال کا شکار ہوسکتی ہے لیکن عمران کی لغت میں ان الفاظ کا کہیں بھی گزر نہیں۔ سخت سے سخت حالات میں بھی اس کے چہرے پر پژمردگی کا سایہ دکھائی نہیں دیتا۔ بہ الفاظ دیگر وہ حوصلوں اور امنگوں کا نمائندہ کردار ہے۔ مہم جوئی اور سنسنی خیزی اس کی زندگی کا جز و لاینفک ہے۔ عصر حاضر کے سائنسی وتکنیکی دور کا بھی یہی خاصہ ہے کہ وہ انسان کو آرام سے بیٹھنے نہیں دیتا بلکہ ہر دم چلتے رہنے پر اُکساتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ متحرک رہنے ہی میں زندگی ہے' تھک کر بیٹھ جانا موت کی علامت تصور کیا جاتا ہے۔

موجودہ سائنس وٹکنالاجی کے دور میں ہونے والی تبدیلیوں اور انکشافات پر ابن صفی گہری نظر رکھتے تھے۔ وہ اس بات کا ادراک رکھتے تھے کہ سائنس وٹکنالاجی نے جہاں انسانوں کو کچھ پل کے لیے سکھ وآرام مہیا کیا ہے وہیں اس کے ذریعہ دنیا میں جرائم اور ظلم وتشدد کا بازار بھی گرم ہوتا جارہا ہے۔ وہ جانتے تھے کہ اس حقیقت سے عوام کی اکثریت نہ صرف نابلد رہتی ہے بلکہ ظلم وتشدد کے اصل شکار بھی عوام ہی ہوتے ہیں۔ مصنف کی آنکھوں کے سامنے ہیروشیما اور ناگاساکی کے روح فرسا واقعات رونما ہوئے تھے اور وہ دوسری جنگ عظیم کے خونیں وہلاکت خیز مناظر کے چشم دید گواہ بھی تھے۔ یہ دو عظیم لیکن ہولناک واقعات ایسے تھے جنہیں بھلایا نہیں جاسکتا۔ ظاہر ہے کہ مصنف نے ان واقعات کی پشت پر انسانیت سوز خوفناک منصوبوں کا جائزہ بھی لیا ہوگا اور اپنی سائنسی ومنطقی فکر کی لیب میں جانچنے وپرکھنے کے بعد نتائج بھی اخذ کیے ہوں گے۔ ان حالات

میں سماج کا نمائندہ ادیب وہی ہوتا ہے جو سماج کو نہ صرف مایوسیوں سے نکالتا ہے بلکہ آنے والے حالات و واقعات سے دنیا کو آگاہ بھی کرتا ہے۔ وہ اپنے ضمیر کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے سر پر منڈلانے والی مصیبتوں و خطرات سے بلاتفریق مذہب وملت تمام انسانوں کو باخبر کرتا رہتا ہے اور کسی ملامت کرنے والے کی پروانہیں کرتا حتیٰ کہ اپنے قلم کو قوم کی امانت سمجھتے ہوئے ظلم وزیادتی کے خلاف سینہ سپر ہو جاتا ہے۔ ابن صفی کا قلم انہی خصوصیات کا حامل تھا۔ یہی وجہ تھی کہ شعروادب کی کسی بھی نشہ آور محفل میں وہ شریک ہونے سے ہمیشہ گریز کرتے رہے۔ لہٰذا ان کی تحریروں میں مقصد اور نصب العین نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔

انسان کا جسم اگر ذرا بھی کمزور ہو تو اس کی قوت ماند پڑنے لگتی ہے۔ بڑے سے بڑا طاقتور بھی جسمانی ناتوانی کی مار سے چت ہو جاتا ہے۔ بدنی قوت کے ساتھ اگر وہ قوتِ گویائی اور قوت سماعت سے بھی محروم ہو جائے تو اسے مظلوم انسان سمجھا جاتا ہے' ایسا انسان جس سے زندگی کی رعنائی روٹھ گئی ہو۔ اور اگر انسان کی ذہنی قوت سلب ہو جائے تو گویا اس کے اندر سے زندگی کی حقیقی علامت ہی ختم ہو جاتی ہے۔ انسان کی حقیقت یہی ہے کہ وہ مضبوط وتوانا ہونے کے باوجود انتہائی کمزور ہے۔ اس کے احساسات اتنے نازک ہوتے ہیں کہ ٹھیس لگتے ہی وہ درجنوں نفسیاتی الجھنوں کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس کی نفسیاتی الجھنیں بعض اوقات اپنے ہی جیسے انسانوں کے لیے وبال جان بن جاتی ہیں۔ اس کی زندگی افراط وتفریط کا شکار ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سماج کو نہ کمزور انسان مطلوب ہے اور نہ ہی ایسا جابر وظالم اور مطلق العنان انسان جو اپنے ہی جیسے بھائیوں کے لیے درندہ بن جائے۔ جو طاقت انسان کے جسم کو قوت فراہم کرتی ہے اگر وہی طاقت نشہ بن جائے تو انانیت کی بھٹی میں وہ خود بھی جلتا ہے اور دوسروں کو بھی اپنی انا کی بھینٹ چڑھا دیتا ہے۔ دنیا میں طاقت کی عجیب وغریب کہانی ازل سے دہرائی جاتی رہی ہے۔ طاقت کا نشہ ہی انسان کو فرعون' ہامان' ہٹلر اور بُش بنا دیتا ہے۔ طاقت دراصل وہ قوت ہے جس کا مستحق اور مالک صرف کائنات کا خالق ہے اور کائنات اور اس کے اندر کی ہر چیز مخلوق کا درجہ رکھتی ہے۔ کائنات کے ذرے ذرے میں اسی کی طاقت کا ظہور ہے۔ جس طرح چاند' سورج کی روشنی سے روشن ہے' اسی طرح کائنات کی ہر چیز کی قوت خالقِ کائنات کی طاقت کی محتاج ہے' وہی بلاشرکت غیرے کائنات کا بادشاہ اور رب العالمین ہے۔ لہٰذا مخلوق کے لیے لازم ہے کہ وہ اپنے خالق کی دی ہوئی قوت کی حدود سے تجاوز نہ کرے اور اس کا بندہ اور غلام بن کر رہے۔ انسان کے علاوہ کائنات کی ہر چیز اپنے خالق کے اشاروں پر ہمہ دم گردش کر رہی ہے اور اس کے حکم سے ذرا بھی سرتابی نہیں کرتی۔ سورج' چاند' ستارے' نباتات' حیوانات' جمادات اور دیگر غیر مرئی مخلوقات سبھی اپنے خالق کے دیئے ہوئے مشن کی تکمیل میں ہر لمحہ مصروف ہیں۔

دنیا میں انسان ایک ایسی مخلوق ہے جس میں ناتوانی کی ازلی صفت کے ساتھ قوت کا کہکشاں آباد ہے۔ اس کی ذہنی قوت دنیا کی تمام قوتوں پر حاوی ہے۔ یہی وہ قوت وطاقت ہے جو انسان کو دیگر مخلوقات سے ممیز کرتی ہے اور بسا اوقات انسان اسی طاقت کے زعم میں مبتلا ہو کر خود کو برتر اور اعلیٰ تصور کرنے لگتا ہے' پھر فرعون

بنتا ہے اور کائنات کے حقیقی خالق کو فراموش کر کے خود کو خالق کے درجے پر فائز محسوس کرنے لگتا ہے۔ درحقیقت انسان جب انانیت کی نفسیات میں مبتلا ہو کر اپنے مخلوق ہونے کا احساس کھو دیتا ہے تو اس پر ''خالق ہونے'' کا دورہ پڑتا ہے اور انسان کے تباہ ہونے کا یہی نقطہ عروج ہوتا ہے۔ وہ طاقت کے زعم میں مبتلا ہو کر اپنے ہی جیسے انسان کو غلام سمجھنے لگتا ہے، ظلم کرتا ہے اور ان پر بزور ''طاقت'' حکمرانی شروع کر دیتا ہے۔

ابن صفی کا شمار بیسویں صدی کے ان مصنفوں میں ہوتا ہے جنہوں نے جنگ عظیم دوم کے فسادات اور تباہی کا مشاہدہ کیا تھا۔ وہ ماہر نفسیات ہونے کے ساتھ ساتھ ایک سوشل سائنٹسٹ بھی تھے۔ ان کا مشاہدہ عمیق تھا اور تجزیاتی مطالعہ میں وہ گہری بصیرت رکھتے تھے۔ اس کے ساتھ ہی انسان اور انسانی سماج کے نفسیاتی پہلوؤں پر ان کی گہری نظر تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریروں میں سماج کی نفسیاتی الجھنوں کی واضح جھلک دکھائی دیتی ہے جو بالخصوص جنگ عظیم دوم کے بعد متعدد ازموں (isms) کی شکل میں نمودار ہوا اور ماڈرن سائنس کی روز افزوں ترقی نے تو آگ پر گھی کا کام کیا۔ ابن صفی ان ازموں کو موجودہ دور کی نفسیاتی الجھنوں کی پیداوار سمجھتے تھے کیونکہ انسان نے خالق ومخلوق کے درمیان اتنے دبیز پردے حائل کر دیئے ہیں کہ وہ اپنی تخلیقی قوت کا بزعم خود مطلق العنان خالق محسوس کرنے لگا ہے۔ وہ حقیقی طاقت کا نمائندہ سمجھنے کے بجائے خود کو ''طاقت کا محور'' سمجھنے لگا ہے۔

اردو ادب کے کارخانے میں اب ایسے انجینئروں کی تعداد زیادہ ہوگئی ہے جو مخصوص ذہن کی مخصوص پیداوار کو ہی تخلیق تصور کرتے ہیں۔ حالانکہ اس نظریہ کو خود بیسویں صدی کا ماہر معاشیات اور محنت وسرمائے کے موضوع کا انقلابی فلاسفر کارل مارکس نے ''ادب کو سماجی تطہیر کا ایک مؤثر ذریعہ'' قرار دیا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کے نزدیک ادب کے سماجی تطہیر کا مفہوم کچھ اور ہی تھا۔ اردو ادب میں ترقی پسند تحریک کی پشت پر اسی کے خیالات کارفرما تھے۔ ابن صفی نے بھی ''ادب کو سماجی تطہیر کا ایک مؤثر ذریعہ'' سمجھتے ہوئے اردو ادب میں ایک ایسی صنف کی بنیاد ڈالی جس کے بغیر عصر حاضر کے مسائل کو اجاگر کرنا اُس وقت شاید ممکن نہ تھا۔ ان کی کہانیوں میں ایسا کراہتا ہوا سماج دکھائی دیتا ہے جو صنعتی انقلاب اور سائنس وٹکنالاجی کی پیداوار تھا۔ اس وقت گلاب کی طرح کھلے ہوئے چہرے پر پژمردگی چھانے لگی تھی۔ ہر چہرہ کارخانوں کی چمنیوں اور ماحولیاتی کثافت سے کمہلایا ہوا نظر آ رہا تھا۔ جرائم کے نئے نئے طریقے اختیار کیے جا رہے تھے، ظلم کرنے کے نت نئے ہتھکنڈے رونما ہو رہے تھے۔ ایسے ماحول کا ادب محض خواب وخیال پر مبنی نہیں ہوتا بلکہ اس کی بنیاد ٹھوس ہوتی ہے۔ اور ہر دور کا زندہ ادب وہی ہوتا ہے جو اپنے سماج کی صحیح اور حقیقی نمائندگی کرے۔

ابن صفی موقع شناس ہی نہیں بلکہ رمز شناس مصنف تھے۔ انسانی نفسیات اور معاملاتِ زندگی پر ان کی گہری نظر تھی۔ اردو کو نئے دور میں داخل ہوتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔ پسماندہ قوم کو دی جانے والی طفل تسلّیوں سے بھی وہ خوب واقف تھے۔ ان کو بخوبی احساس تھا کہ اردو کے نام پر الحاد اور اباحیت کے بیوٹی سلون کی کاسمیٹک پیداوار سے بازاری ادب مالا مال ہو رہا ہے۔ صورت حال کی اس سنگینی نے ابن صفی کو آمادہ

کیا کہ وہ نفس امارہ کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں۔ کیونکہ یہ نفسِ امارہ ہی ہے جو انسان کو زندگی کے ہر شعبے میں ذلت اور رسوائی کی دلدل میں دھکیلتا رہتا ہے۔ ابن صفی کی تحریریں بدلتے ہوئے سماج میں بدلتی ہوئی قدروں کی عکاسی کرتی ہیں۔ وہ ایسے سماج کے خواہاں تھے جو مثالی فکر کا حامل اور آئینہ دار ہو۔

محبانِ اردو کی کثیر تعداد اس بات کا اعتراف کرتی ہے کہ بیسویں صدی کی چھٹی دہائی میں ابن صفی جیسا دور بین، نکتہ رس اور اردو سے حقیقی محبت کرنے والا ادیب موجود نہ ہوتا تو اردو کی زمین اس وقت بنجر ہو جاتی جب کہ اس زبان پر غیروں کے ساتھ درپردہ اپنوں کے حملے بھی متواتر ہو رہے تھے۔ ابن صفی اگست 1952 میں اپنے والد جناب صفی اللہ مرحوم کی خواہش پر کراچی ہجرت کر گئے لیکن ان کا دل اسی سرزمین میں اٹکا رہا جس کی مٹی کی بھینی بھینی خوشبوؤں میں انہوں نے بچپن سے شباب تک کا سفر طے کیا تھا۔ الہ آباد کی زرخیز مٹی کی سرسبز و شاداب ادبی فضاؤں کو وہ کیسے فراموش کر سکتے تھے جہاں اپنے احباب کی معیت میں انہوں نے ادب کے چراغ روشن کیے تھے۔ چنانچہ کراچی جیسے دور افتادہ مقام سے بھی انہوں نے حقِ دوستی ہی نہیں بلکہ اپنی مٹی کا قرض بھی اتارنے کی کوشش کی۔ انہوں نے جاسوسی ادب کے بیک وقت دو ایڈیشن شائع کرنے کا سلسلہ شروع کیا اور کراچی کے ساتھ الہ آباد سے بھی عباس حسینی مرحوم کی ادارت میں ابن صفی کی شاہکار تحریریں شائع ہونے لگیں۔ ان کی تحریروں نے محبان اردو کے ہر طبقے کو متاثر کیا اور ان میں سنجیدگی و متانت کے ساتھ کچھ کرنے کا عزم بھی پیدا ہوا۔ شعبہ اردو (ایونگ کرسچین کالج) کے ایک ریٹائر ہیڈ جن کا تعلق الہ آباد ہی سے ہے، کہتے ہیں کہ انہوں نے اردو زبان ابن صفی کی تحریروں سے سیکھی۔ انگریزی کے ایک پروفیسر کہتے ہیں کہ اردو پڑھنے کا ذوق اور اس کی چاشنی کا لطف ان کو ابن صفی کی تحریروں سے حاصل ہوا۔ اگر ابن صفی صرف کراچی تک محدود ہو جاتے تو شاید اردو دنیا ان کی صلاحیتوں سے کبھی روشناس نہیں ہو سکتی تھی کیونکہ تقسیم کے نتیجے میں نفرت کی آگ جس طرح شعلہ جوالہ بن رہی تھی اس عصبیت کے ماحول میں بھلا اردو کی کیا حیثیت ہوتی۔ ایسے میں ابن صفی کی شاہکار تحریروں نے یہ ثابت کر دیا کہ زمین تقسیم ہو سکتی ہے، لیکن دل کو تقسیم کرنا ناممکنات میں سے ہے۔

انسانی تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ روئے زمین پر حضرت آدم (علیہ السلام) کے اتارے جانے کے بعد پہلا جرم قابیل کا اپنے سگے بھائی ہابیل کو قتل کرنا تھا۔ پھر جرم کا لامتناہی سلسلہ ہر قوم میں جاری ہو گیا۔ انسانی تاریخ میں جرائم کی فہرست اتنی طویل ہے کہ اگر اسے نکال دیا جائے تو شاید دس فیصد تاریخ بھی باقی نہ رہے۔

ہر ادیب کا تعلق اپنے سماج اور ماحول سے ہوتا ہے۔ ابن صفی نے تاریخ کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ انہوں نے مختلف اقوام، رنگ و نسل کے رجحانات و نفسیات کو بھی پڑھا تھا۔ چنانچہ اردو ادب میں انہوں نے ایک ایسی صنف کی بنیاد ڈالی جس پر یوروپ اور امریکہ میں پہلے ہی سے تجربات کیے جا رہے تھے۔ بالخصوص برٹش امپیریلزم کا سحر ٹوٹنے کے ساتھ ہی دنیا میں جو واقعات رونما ہوئے اس سے تیسرے درجے کے ممالک خاص

طور سے متاثر تھے۔اس پس منظر میں ابن صفی نے اقوام عالم کے تازہ حالات سے اردو ادب کو متعارف کرایا۔ انہوں نے مختلف ممالک میں جنم لینے والی سازشوں اور جرائم کی پیچیدگیوں سے اردو دنیا کو باخبر کرنے کا سلسلہ شروع کیا۔ یہی وہ صنف ہے جو جاسوسی ادب کہلائی۔ تاہم ایسا لگتا ہے کہ غالب اور میر کی ادبی ورومانی دنیا کے پرستاروں اور ادیبوں کو کسی طور گل وبلبل اور جام ومینا کے سحر سے آزاد ہونا پسند نہیں۔ شاید انہوں نے اردو ادب کی قسمت کو جام ومینا ہی سے وابستہ سمجھ لیا ہے۔ کاش وہ بصیرت کی آنکھوں سے دیکھتے تو ابن صفی کی تحریروں میں انہیں پانچ دہے قبل ہی جدیدیت ومابعد جدیدیت کی تشریح مل جاتی۔

ہندوستان کی آزادی کے 60 برس بعد بھی یہ موضوع ابھی تک زیر بحث ہے کہ اردو میں پاپولر لٹریچر کو ادب کا درجہ دیا جائے یا نہیں۔ بالخصوص ابن صفی کے بارے میں اردو ادیبوں اور نقادوں میں جو سرد مہری پائی جاتی ہے افسوسناک ہے۔ تاہم ہمارے بعض اہل علم اور اساتذہ ابن صفی کو استثنا قرار دیتے ہوئے ادب میں ان کے مقام کو متعین کیے جانے کی اب وکالت ضرور کرنے لگے ہیں۔ چلئے 'دیر آید درست آید' کے مصداق برف تو پگھلنے لگی ہے۔ گزشتہ دنوں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبہ اردو سے وابستہ استاد ڈاکٹر خالد جاوید کے بصیرت افروز مقالے (ابن صفی، چند معروضات' مطبوعہ سہ ماہی اردو ادب' نئی دہلی۔ مئی، جون ۲۰۰۶) سے یہ عندیہ ملتا ہے کہ ''ابن صفی کے ناولوں کو بھی آج اکیسویں صدی میں کلاسیکی اہمیت حاصل ہوسکتی ہے۔ وہ اردو میں ایک روایت کا نام ہیں، مگر یہ روایت ان کے ساتھ ہی ختم ہوگئی۔'' ڈاکٹر خالد جاوید مزید لکھتے ہیں۔ ''ہماری تنقید نے ان کے ساتھ سگا یا سوتیلا کسی بھی قسم کا برتاؤ نہیں کیا ہے۔ یہ کچھ اس قسم کی سچویشن ہے جیسے اعلیٰ قسم کا فلم بین طبقہ اور سنیما کے ناقدین نصیرالدین شاہ کے ساتھ دلیپ کمار کا نام لیتے ہوئے ہونٹ دبا لیتے ہیں یا موسیقی کا اعلیٰ ذوق رکھنے والا طبقہ اشرافیہ بھیم سین جوشی کے ساتھ محمد رفیع کے بارے میں کچھ کہنے میں ہتک محسوس کرتا ہے۔ تو کیا 'پاپولر' کو صرف اس لیے نکال باہر کیا جائے گا کہ عوام نے اسے پسند کیوں کیا۔ ترقی پسند حضرات کو اس پر اور بھی زیادہ غور وخوض کرنے کی ضرورت ہے۔''

ڈاکٹر خالد جاوید نے بڑی رعایت سے کام لیا ہے۔ حالانکہ اب نہ تو ترقی پسندی کا دور ہے اور نہ ہی نام نہاد ادیبوں اور دانشوروں کی اجارہ داری قائم رہی۔ دراصل یہ فتنے کے درمیان حقیقت پسندی کا دور ہے۔ جو بھی فتنے سے کنارہ کش ہوکر حقیقت کو پالے گا درحقیقت وہی سرخرو ہوگا۔ دل کو لگتی ہوئی بات تو یہ ہے کہ اردو ادب کی کم سے کم ساٹھ سالہ تاریخ دجل اور فتنہ پروری کی تاریخ رہی ہے۔ اس دور میں اردو کے بدن پر پلاسٹک سرجری کرائی گئی اور اسے ہی اصل اردو سمجھنے کے فریب اور فتنے میں عوام کو مبتلا کیا گیا۔ البتہ ابن صفی ساری زندگی اس پلاسٹک سرجری کو کھرچتے رہے اور ''مجرموں'' کو بے نقاب کرتے رہے۔

جاسوسی ادب کو اردو ادب کے نصاب میں داخل نہ کرنے کے اسباب سے اسی وقت پردہ اٹھ سکتا ہے جب 1947 کے بعد کے اردو ادب کی تاریخ مرتب کی جائے گی۔ تاہم بعض حقیقت پسند ادیبوں نے اس موضوع پر گاہے گاہے لب کشائی کی جرأت کی ہے۔ بالخصوص پاپولر لٹریچر کے حوالے سے ہمارے چند ادیبوں نے جو

انگڑائیاں لی ہیں اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اردو کی ترقی اور مقبولیت میں پاپولر لٹریچر کے مخصوص کردار کو اب نظر انداز کرنا خود معروف ادیبوں اور شاعروں کے حق میں نقصان دہ ثابت ہوسکتا ہے۔ ان کو یہ بھی اندازہ ہے کہ دنیا کروٹ بدل رہی ہے اور مخصوص سیاسی رجحانات کے حامل ادیبوں و شاعروں کے دن گنے جا چکے ہیں۔ مسئلہ جب زبان کی بقا کا درپیش ہو تو ادب کی ادبی حیثیت بھی مجروح ہونے لگتی ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ادبی شعبوں میں اردو ادب کی جو دُرگت آج بن رہی ہے ماضی میں اس کی مثال نہیں ملتی۔

ابن صفی کے ادبی مقام کو متعین کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ان کی جملہ شاہ کار تحریروں کا مطالعہ کیا جائے۔ ایسا لگتا ہے کہ اردو ادب کے کم ہی ادبا اور نقادوں کو اس کی توفیق ملی کہ وہ ابن صفی کی شاہکار تحریروں کا مطالعہ کریں۔ حیرت ہے کہ آج ادب کے بعض اسکالرز کو یہ بھی نہیں معلوم کہ ابن صفی کون تھے؟ یہاں اس امر کا اظہار بھی ضروری ہے کہ وہ ادیب اور نقاد جو ابن صفی کی تحریروں کے ذریعے اردو زبان کی چاشنی سے روشناس ہوئے انہوں نے بھی بعض حالات یا مصلحتوں کے تحت ابن صفی کے ادبی کارنامے کو بھلا دیا البتہ اردو زبان کی خدمات کے لیے ابن صفی کی تعریف کے پل باندھنے میں وہ آج بھی رطب اللسان دکھائی دیتے ہیں۔ ان حضرات سے استدعا ہے کہ خدا کے لیے اپنی مصلحت کو پس پشت ڈال کر ابن صفی کی خدمات کو اجاگر کریں اور دنیائے ادب میں ان کے اعلیٰ مقام کو متعین کرنے میں اہم کردار ادا کریں۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ ابن صفی کا حق ہے اور ہم یہ فرضِ کفایہ اب بھی ادا کر سکتے ہیں۔

ابن صفی کے مداحوں میں جہاں جملہ شعبۂ حیات کے افراد پائے جاتے ہیں وہیں روشن ضمیر ادیبوں، دانشوروں، شاعروں اور نقادوں کی ایک معتد بہ تعداد بھی ہمیشہ موجود رہی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ادب پر تسلط اور اجارہ داری جن نقادوں کی رہی، انہوں نے ابن صفی کی ادبی خدمات کو اجاگر کرنے والی آوازوں کو دبانے کی ہر ممکن کوشش کی اور بظاہر بڑی حد تک ان کو کامیابی بھی ملی۔ تاریخ شاہد ہے کہ حق کی آواز چند لمحوں کے لیے دبی ہوئی محسوس تو ہوتی ہے لیکن اس کی دھیمی آنچ اچانک شعلۂ جوالا کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ ابن صفی کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔ خود غالب (م، فروری 1869) کی زندگی میں انہیں درخورِ اعتنا نہیں سمجھا گیا۔ غالب کو سمجھنے کی توفیق مولانا الطاف حسین حالی کو ملی۔ انہوں نے ''یادگارِ غالب'' (1897) تصنیف کی تو پھر غالب کی تفہیم و تحقیق کے لیے جوق در جوق ادیبوں اور اسکالرز کی لائن لگ گئی جس کا سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ گویا غالب کے انتقال کے تقریباً 28 برس بعد غالب کی خدمات کو سمجھنے کی کوشش کا آغاز ہوا۔

یہ عجیب اتفاق ہے کہ ابن صفی (رخصت، 26 جولائی 1980) کے انتقال کے تقریباً 28 برس کے بعد ہی ان کی ادبی خدمات کی طرف باضابطہ توجہ دی گئی۔ اس معاملے میں ابن صفی بڑے خوش نصیب تھے کہ وہ آفاقی نظریہ کے حامل جس پائے کے مصنف ہیں، ان کے شایانِ شان ان کی تحریروں کا استقبال کیا گیا۔ ان کے بارے میں معروف فکشن رائٹر اگاتھا کرسٹی کے درج ذیل الفاظ بڑے قیمتی ہیں۔

" I don't know Urdu but have knowledge of detective novels in

the subcontinent. There is only one original writer — Ibn-e Safi."

چنانچہ ٹھیک

ابن صفی کے حصے میں یہ اعزاز دراصل ان کے "صبر جمیل" کا انعام ہے۔ ان کے معاصرین ادبا اور نقادوں کے ترش رویے نے ان کو تا حیات کرب میں مبتلا رکھا۔ اس کے باوجود کسی ردِ عمل کے بغیر انتہائی صبر و شکر کے ساتھ وہ اپنے ادبی مشن میں منہمک رہے۔

جس زمانے میں نکہت پبلی کیشنز' الہ آباد کے مالک عباس حسینی مرحوم کے پاس جاسوسی دنیا اور عمران سیریز کے حقوق بلاشرکتِ غیرے محفوظ تھے' پورے ملک میں ابن صفی کے حوالے سے نکہت پبلی کیشنز کا طوطی بول رہا تھا۔ عباس حسینی کے شاید تصور میں بھی نہیں ہوگا کہ اردو میں ابن صفی کا ادبی خزانہ ان کے لیے مالی ہی نہیں بلکہ شہرت کے اعتبار سے اتنا عظیم ہوگا۔ ان کے دل میں اپنے دوست اور اردو دنیا کے عظیم مصنف ابن صفی کے لیے بلاشبہ بے پناہ محبت ہوگی۔ شاید اسی محبت کے جذبے سے انہوں نے ابن صفی کو ہندی دنیا سے روشناس کرانے کے بارے میں سوچا ہوگا۔ لہٰذا بعض "بہی خواہوں" کے مشورے سے عباس حسینی نے "جاسوسی دنیا" کا ہندی ایڈیشن بھی شروع کر دیا۔ اس کے "سمپادک" کوئی پریم پرکاش ہوا کرتے تھے۔ ہندی ایڈیشن کی اشاعت سے ہندی دنیا کو یقیناً خوشی ہوئی ہوگی لیکن جب اردو کے قارئین نے ہندی ایڈیشن کا مطالعہ کیا تو وہ سخت مایوسی سے دوچار ہوئے۔ ہندی ایڈیشن کی سب سے پہلی خرابی یہ تھی کہ اس میں اردو زبان کی شیرینی صفر ہو کر رہ گئی تھی۔ دوسری سب سے بڑی خرابی یہ تھی کہ دونوں سیریز کے ناولوں کے اہم مستقل کردار کے نام تبدیل کر دیئے گئے تھے۔ مثلاً کرنل فریدی کی جگہ "کرنل ونود" عمران کو "راجیش" اور کیپٹن فیاض کو "کیپٹن ملکھان" میں تبدیل کر دیا گیا تھا۔ کرداروں کے نام کی تبدیلیاں عمران سیریز میں کچھ زیادہ ہی کی گئیں۔ ایکس ٹو کو "یوَن" عمران کے والد رحمان صاحب کو "راکیش بہاری" بہن ثریا کو "نیتا" جوزف کو "میکیف" سلیمان کو "بھولو" ظفر الملک کو "کمل کانت" جولیا کو "جولی" وغیرہ۔ ہمیں نہیں معلوم کہ ابن صفی کو اس بات کا علم تھا یا نہیں یا اس کے بنگلہ یا گجراتی ایڈیشن کے ناشروں نے بھی ایسا ہی کیا تھا' تاہم اس حرکت کو علمی اور ادبی لحاظ سے دیانت کے منافی کہا جائے گا۔ ابن صفی کے شاہکار ناولوں کا حشر' ہندی ایڈیشن میں اس قدر تکلیف دہ ہے کہ یہاں اس کے بیان سے گریز ہی مناسب ہے۔ تاہم یہ کہنا نامناسب نہ ہوگا کہ ہندی ایڈیشن کے تمام ہی ناولوں (تقریباً 230 سے اوپر) میں مترجم پریم پرکاش نے ابن صفی کی ادبی شان اور اسلوب کی ریڑھ ماردی ہے۔ یہ ناول پریم پرکاش یا عباس حسینی کے تو ہو سکتے ہیں' ان میں ابن صفی کہیں نظر نہیں آتے۔ پتہ نہیں خود عباس حسینی مرحوم کو اس کا احساس بھی تھا یا نہیں؟ وہ دانشور جو اَب ابن صفی کی جاسوسی ادبی تحریروں کو "مہا کاویہ" کا درجہ دیتے ہیں' انہی سے دریافت کر لیجیے کہ کرنل فریدی اور عمران کا جو خاندانی پس منظر ابن صفی نے بیان کیا ہے' "ونود" اور "راجیش" جیسے کردار اس پر کیوں کر چسپاں ہو سکتے ہیں۔ ابن صفی کے تخلیق کردہ لازوال کرداروں کے تعلق سے یہ اتنی سنگین غلطی ہے جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ شاید یہی وجہ تھی

کہ ہندی کے یہ ناول زیادہ دنوں تک عباس حسینی کا ساتھ نہ دے سکے۔ ایسا لگتا ہے کہ ہندوستان کی سیکولر تہذیب کے فریب میں ابن صفی کے تخلیق کردہ کرداروں کی مذہبی شناخت بدلتے وقت وہ اس بات کو نظر انداز کر گئے کہ ان کرداروں کی تخلیق منفرد تاریخی، تہذیبی اور ثقافتی پس منظر میں کی گئی ہے۔ ماضی میں نکہت پبلی کیشنز کی اس سنگین غلطی کے برعکس ہندی ترجمہ کی صورت میں ہارپر کالنس اور انڈیا ٹوڈے گروپ کی موجودہ پیش کش سے ابن صفی کی فکر و ادبی جہت کی حقیقی نمائندگی ہوتی ہے۔ یہ سلسلہ کامیابی کے ساتھ اگر آخر تک جاری رہا تو ہندی ادب میں پریم چند کے بعد ابن صفی تنہا منفرد مصنف ہیں جن کی ادبی شناخت ہندی دنیا میں مسلّم ہوگی۔ یہ کریڈٹ ابن صفی کے لائق فرزند احمد صفی کو جاتا ہے جو انجینئر اور سائنٹسٹ بھی ہیں، ساتھ ہی ادیب اور افسانہ نگار ہیں۔ ان ہی کی کوششوں سے انگریزی اور ہندی دنیا میں ابن صفی کے شاہکار ناولوں کے پُرکشش ایڈیشن شائع ہو رہے ہیں۔

ابن صفی کے اعزاز کا سلسلہ یہیں ختم نہیں ہوتا۔ چنئی (مدراس) کے ایک معروف بین الاقوامی انگریزی ناشر ویسٹ لینڈ راور بلافٹ پبلی کیشنز نے مشترکہ طور پر فریدی۔حمید سیریز کے ناولوں کی اشاعت کا بیڑہ اُٹھایا ہے۔ ابتدا میں فنچ سیریز کے چار سلسلہ وار شاہکار ناول (زہریلے تیر، پانی کا دھواں، لاش کا قہقہہ، ڈاکٹر ڈریڈ) کے ترجمے 2011 کے وسط میں شائع ہوئے۔ ترتیب کے لحاظ سے یہ ناول ''جاسوسی دنیا'' کے 60، 61، 62، 63 نمبر پر آتے ہیں جو 1957 میں شائع ہوئے۔ فریدی-حمید سیریز کے یہ ناول انگریزی میں Poisoned Arrow, Laughing Corpse, The Smokewater اور Doctor Dread کے نام سے چھاپے گئے ہیں۔

ان ناولوں کی اشاعت کا دلچسپ پہلو یہ ہے کہ ان کا ترجمہ ایک ایسے معروف و ممتاز ادیب، ناول نگار، شاعر اور نقاد نے کیا ہے جن کو اردو دنیا پروفیسر شمس الرحمٰن فاروقی کے نام سے جانتی ہے اور جنہوں نے اپنی ادبی حیات میں اردو دنیا کے عظیم مصنف ابن صفی کی ادبی خدمات پر مختصر سے مختصر مضمون بھی تحریر کرنے کی زحمت گوارہ نہیں کی۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ خود فاروقی صاحب ابن صفی کی ادبی خدمات کو شناخت کرنے میں پس و پیش سے کام لیتے رہے ہیں۔ حالانکہ انہوں نے ادنیٰ درجے کے شعری مجموعہ پر بھی دل خوش کن تبصرہ کیا ہے۔ لہٰذا یہ قیاس شاید بے جا نہ ہو کہ ابن صفی کی مجموعی ادبی خدمات بھی انہیں کبھی متاثر نہیں کر سکی۔ لیکن قدرت کا یہ بھی عجیب کرشمہ ہے کہ اس نے اردو دنیا کے ایک نامور نقاد کو ابن صفی کے کم سے کم چار ناول کو حرف بہ حرف بار بار پڑھنے پر مجبور کر دیا کہ انگریزی ترجمہ ان ہی کو کرنا تھا اور اس کام میں وہ بلاشبہ کامیاب نظر آتے ہیں۔

پاکستان، ابن صفی کا وطنِ ثانی ہے لیکن ان کا صُلبی اور اصلی تعلق اس ہندوستان سے ہے جہاں انہوں نے اپنی زندگی کے قیمتی اور تلخ و شیریں ایام گزارے۔ بچپن کی خوش گوار یادیں اور دوست واحباب کی صحبتیں یہیں نصیب ہوئیں۔ انہوں نے اپنے ادبی کیریئر کا آغاز یہیں سے کیا اور یہی تحفہ وہ اپنے وطنِ ثانی میں لے گئے۔ مگر افسوس کہ ہندوپاک کے مٹھی بھر ادیبوں اور نقادوں نے جن کے قلم کی سیاہی ایوانِ ادب میں فیصلہ کن

سمجھی جاتی تھی، ابن صفی کے ادبی مشن اور خدمات پر ہمت افزائی کی ایک سطر بھی لکھنے کی زحمت نہیں کی۔ شاید وہ ابن صفی کی شہرت اور مقبولیت سے حسد میں مبتلا ہو گئے تھے۔ کراچی میں ابن صفی کے ایک چہیتے شاگرد اور معروف ادیب جناب مشتاق احمد قریشی لکھتے ہیں کہ ادب کے اماموں میں سے ایک امام علامہ نیاز فتح پوری نے نگار کے ایک شمارہ میں ابن صفی کو ''اردو کا ناسور'' لکھنے سے بھی گریز نہیں کیا۔ حیدر آباد کے ایک رسالہ کے ایڈیٹر کے نام اپنے ایک خط میں مشتاق احمد قریشی مزید لکھتے ہیں۔

''ادب کے سارے ہی جغادریوں کا رویہ ابن صفی صاحب کے ساتھ ایسا ہی تھا، وہ انہیں اپنی کسی صف میں جگہ دینے کو تیار ہی نہیں تھے جبکہ خود ابن صفی صاحب نے تو اپنے ہنر سے، اپنے قلم سے اپنی صفِ اول خود بنائی تھی جس میں ان کی پیروی اور نقل کرنے والوں کی ایک طویل فہرست موجود ہے جبکہ ادب کے کسی اہم اور بڑے سے بڑے مصنف کو بھی یہ اعزاز حاصل نہیں ہو سکا تھا کہ ان کے کرداروں کی، ان کے اندازِ تحریر کی نقل کی گئی ہو......'' (قومی زبان، حیدر آباد۔ اگست، ستمبر 2011، صفحہ 16)

ابن صفی کو خوش قسمتی سے اپنے وطن ثانی پاکستان میں اور وہاں کے توسط سے یوروپ و امریکہ کے اردو حلقے میں چاہنے والوں کی معتدبہ تعداد مل گئی تھی۔ اس کے برعکس ہندوستان میں بزدلی، مایوسی اور خوف کی نفسیات سے اسیر ادیبوں، شاعروں، دانشوروں اور نقادوں کی تعداد زیادہ رہی ہے۔ ان میں ابن صفی کی تحریروں سے اردو سیکھنے والے مخلصین بھی شامل ہیں۔ مگر افسوس کہ وہ بھی محض تماشائی بنے رہے۔ اپنی نجی مجلسوں میں وہ ابن صفی کے محاسن ضرور گنواتے رہے لیکن قلم اٹھانے کی شاید انہیں توفیق نصیب نہیں ہوئی۔ چند حضرات نے کوشش بھی کی تو محض ابن صفی کے تعارف کی حد تک۔ ابن صفی کے انتقال (1980) کے چند برسوں بعد تو یہ سلسلہ گویا بند ہی ہو گیا۔ دوسری طرف نکہت پبلی کیشنز الہ آباد بھی عباس حسینی کے انتقال کے بعد ویران ہو گیا۔ رفتہ رفتہ اردو زبان بھی گھروں میں اجنبی ہونے لگی۔ اردو میڈیم تعلیمی اداروں سے بھی اردو بے دخل کی جانے لگی۔ ٹیلی ویژن کے عام انقلاب نے رہی سہی کسر بھی پوری کر دی۔ ان حالات میں اردو کے نشاۃ ثانیہ کے لیے ابن صفی کے ناولوں سے زیادہ کوئی چیز مؤثر ثابت نہیں ہو سکتی تھی جس طرح (1952) میں ابن صفی نے فحش لٹریچر کے سیلاب کو روکنے کے لیے جاسوسی ادب کا اجرا کیا تھا۔ (1995) میں جب ماہنامہ اردو بک ریویو کا اجرا ہوا، تو معاً یہی خیال آیا کہ اہل علم و ادب کو ابن صفی کے بارے میں بھولی بسری باتیں یاد دلائی جائیں تاکہ فضا ہموار ہو۔ لہٰذا اس مجلّے میں چند اچھے اور منتخب مضامین کی اشاعت کا اہتمام بھی کیا گیا لیکن ایک دشواری یہ تھی کہ ابن صفی کے ناولوں کا ذخیرہ کہیں دستیاب نہ تھا کہ لوگ استفادہ کر سکیں۔ کچھ لوگ متاثر ہو کر تحقیق بھی کرنا چاہتے تھے۔ نئی نسل کے ادبا، شعرا اور دانشوروں کو ابن صفی کی ادبی خدمات کے بارے میں کچھ بھی اندازہ نہ تھا۔ ہند و پاک کے درمیان رشتے میں مسلسل کشیدگی کے سبب ابن صفی مرحوم کے ناولوں کے پاکستانی ایڈیشن بھی دستیاب نہ تھے۔ چند دستیاب بھی ہوئے تو اندازہ ہوا کہ ابن صفی کے شایانِ شان نہیں ہیں۔ ایسی صورت میں یہ فیصلہ کسی نہ کسی کو کرنا تھا کہ ابن صفی کے تمام ناولوں کی منتخب جلدیں (Collected

(Volumes) شائع ہوں اور ہر جلد میں مصنف کی ادبی خدمات اور عہد حاضر میں ان کے ناولوں کی معنویت کو اجاگر کیا جائے۔ ہمارے نزدیک اہم کام یہ تھا کہ ابن صفی کی لازوال ادبی وعلمی خدمات اجاگر کی جائیں۔ ساتھ ہی ادیبوں اور نقادوں کی ناانصافی اور ظلم کے بوجھ سے ابن صفی مرحوم کو آزاد کرایا جائے۔ اردو ادب میں ان کی گرانقدر ادبی خدمات اور مقام کو متعین کیا جائے۔ چنانچہ اس بڑے کام کے لیے قرعہ فال خاکسار کے نام کھلا اور اللہ کے نام سے اس کام کا باضابطہ آغاز کر دیا گیا۔ کئی برسوں سے کام جاری تھا لیکن طباعت کی صورت نظر نہیں آ رہی تھی کیونکہ تمام ناولوں کی اشاعت ہم جیسے خواب دیکھنے والے صحافی کے بس میں نہ تھی۔ دریں اثنا اللہ تعالیٰ نے اس کی صورت بھی پیدا فرما دی۔ چونکہ ہمارے پیش نظر ابن صفی کے ناولوں کی اشاعت سے کاروبار مقصود نہیں رہا ہے لہٰذا فرید بک ڈپو کی طرف سے اشاعت کی پیش کش کو غنیمت سمجھتے ہوئے حامی بھر لی گئی۔ ہمارا اصل ہدف تو ابن صفی کی خدمات کو گھر گھر پہنچانا رہا ہے نہ کہ انٹرنیٹ پر بیٹھ کر محض چیٹنگ کرنا مقصود تھا۔ اسی دوران میں مرتب اور مدیر کے ابن صفی کی حیات و خدمات پر ملک کے متعدد اخبارات و رسائل میں کئی وقیع مضامین بھی شائع ہوئے۔ چند نئے دانشوروں اور اساتذہ نے بھی ابن صفی پر قلم اُٹھانے کی کوشش کی۔ دہلی اردو اکادمی کی جانب سے پہلی مرتبہ پاپولر لٹریچر کے حوالے سے 2007 میں ایک سیمینار منعقد کیا گیا۔ اس سیمینار میں ابن صفی کی ادبی خدمات پر سب سے اچھا مقالہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ڈاکٹر خالد جاوید نے پڑھا۔ مگر افسوس کہ ایک ادیب و دانشور نے اپنے مقالہ میں ابن صفی کے ناولوں کے بیشتر نام غلط لکھے لیکن صدائے احتجاج بلند نہیں ہوا۔ یہ مقالہ کتابی صورت میں اردو اکادمی، دہلی سے شائع بھی ہو گیا۔

فی الوقت صورت حال یہ ہے کہ ''جاسوسی ادب'' کے نام سے ابن صفی کی شاہکار تحریروں پر مشتمل 57 جلدیں مع اداریے منظر عام پر آ چکی ہیں۔ ملک کے طول و عرض میں 50 برسوں کے بعد پہلی بار ابن صفی کو پڑھنے کا جوش و جذبہ ہر طبقے میں پایا جا رہا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ زمینی سطح پر ایک بار پھر اردو کی جڑیں مستحکم ہونے کی طرف گامزن ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا شکر و احسان ہے کہ یہ کام جاری ہے اور برکات و ثمرات کے ظہور بھی ہونے لگے ہیں۔

اِبن صفی۔ جاسوسی ادب کا بے تاج بادشاہ

ڈاکٹر عقیل ہاشمی۔ ہندوستان

کسی بھی زبان کے ادب سے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ وہ انسانی احساس و شعور کا ترجمان ہوتا ہے' نیز انسانی زندگی سے اس کی وابستگی اٹوٹ اور غیر متزلزل ہے۔ گویا تخلیق کا رشتہ راست شعور سے متعلق ہوگا اور یہ قوت ادیب و شاعر کو میسر ہے جیسے وہ اپنے عہد کے نظام حیات کو اس کی کارکردگی کا شریک بناتا ہے وہ اس کے ذریعے معاشرہ اور افراد میں تبدیلی کا خواہاں ہوتا ہے۔ اکثر وہ اپنے اطراف اکناف پھیلی ہوئی منفی قوتوں کے خلاف بھی اس کا استعمال کرتا ہے اور زندگی کو نئی بالیدگی عطا کرتا ہے' عرصہ ہوا جب اردو ادب کے نام سے چھپنے والی تحریروں کو معیاری اور معتبر ثابت کرنے کی باتیں ہوتی رہیں جس کے نتیجہ میں تخلیقی ادب' ادب لطیف' رومانی ادب' قومی ادب' ترقی پسند ادب' اسلامی ادب' بچوں کا ادب اور سری یا جاسوسی ادب کے دائرے بنتے گئے' اس پر مختلف جہتوں زاویوں سے مباحث بھی ہوئے لیکن ادب کے معیاری ہونے کا کوئی پیمانہ نہ بن سکا۔ تاہم اتنا ضرور کہا جاسکتا ہے کہ جس ادب میں انسانی شعور کی روشنی جذبہ کی صداقت احساس ادراک ذوق جمال اور ان کے آپسی ربط وضبط کی شرح کی جائے یا پھر مختصر نظموں میں انسانی زندگی کے اقدار کی تشکیل وتعمیر کی جائے وہی ادب معیاری ہوگا۔ اس میں فن کی ہیئت اس کی پیش کشی میں فنکار ادیب و شاعر کی شخصیت اور اس کی انفرادیت شامل ہو جائے تو یقیناً وہ ادب معیاری کہلائے گا بالفاظ دیگر ادب زندگی کے روشن اور تاریک پہلوؤں کے باہمی آمیزش سے تخلیق پاتا ہے اس میں تخلیق کار کا رویہ بھی شامل ہوتا ہے' جس کی وجہ سے اس کی انفرادیت قائم رہے گی۔ تاہم اردو میں سری ادب یا جاسوسی ادب کو ادب عالیہ میں شمار نہیں کیا گیا لیکن کوئی نصف صدی پہلے ابن صفی نے ماہنامہ جاسوسی دنیا کے تحت ناولیں لکھ کر شائقین اور ماہرین ادب کو کچھ سوچنے پر مجبور کردیا' مگر ہنوز جاسوسی ادب کو ادب عالیہ میں شامل کرنے میں تامل ہے جب کہ شمس الرحمٰن فاروقی نے انگریزی میں ابن صفی کے ناولوں کے تراجم کا آغاز کردیا ہے۔ دراصل ابن صفی کے نزدیک سری ادب کی اہمیت اور افادیت یہ ہے کہ وہ معاشرہ میں مثبت تبدیلی یا سچ کی متلاشی ہوتا ہے۔ وہ قانون کی بالادستی کا قائل ہی نہیں اس کا مبلغ بھی ہے۔ اس کے لئے منفی قوتوں سے ٹکرانا ازبس ضروری ہے اور یہ ٹکراؤ زندگی کے ہر شعبہ میں ممکن ہے۔ سیاسی' سماجی' معاشی' تمدنی غرض ہر جگہ جرأت' دیانت اور بصیرت سے انسانی معاشرہ کو استحصال سے بچانا ہے' اس میں لذت آسودگی تسکین کا جوہر بھی مضمر ہوگا۔ زبان اور بیان کی ندرت اس کے اسلوب کی نشاندہی کرتی ہے۔

ابن صفی جن کا اصلی نام اسرار احمد ہے متحدہ ہندوستان کے ایک خوشحال گھرانہ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام صفی اللہ تھا' دنیائے ادب میں والد کے نام کی مناسبت سے ان کا قلمی نام ابن صفی ہوا۔ ابتدائی تعلیم

مجید اسلامیہ ہائی اسکول الہ آباد سے حاصل کی' آگرہ یونیورسٹی سے بی اے کیا۔ اوائل عمر ہی سے پڑھنے لکھنے کا شوق رہا' کہتے ہیں نصابی کتب کے علاوہ انہوں نے پہلی کتاب طلسم ہوشربا پڑھی اور محض ساتویں جماعت میں تھے کہ اولین کہانی لکھی اور اسے ہفت روزہ ''شاہد'' میں اشاعت کے لئے دیا' میٹرک میں پہونچتے پہونچتے شاعری کا چسکا لگا۔ اس زمانے میں جگر مرادآبادی کے چرچے تھے' چنانچہ انہی کے رنگ میں شاعری بھی کی۔ اس سلسلے میں مشہور شاعر حضرت نوح ناروی سے اصلاح لی۔ اس کے بعد اپنے اردو کے استاد مولانا محمد متین شمس سے رجوع کیا۔ بعدازاں فراق گورکھپوری' سلام مچھلی شہری اور دیگر شعراء کو اپنا کلام سنایا۔ یونیورسٹی کی سطح پر ابن صفی کو ڈاکٹر اعجاز حسین کی شاگردی کا شرف ملا' ان کے لکچرز نے ذہن وفکر کے راستے روشن کردیے اور بجا طور پر انہوں نے ترقی پسندانہ خیالات سے استفادہ کیا۔ ۱۹۴۷ء میں تقسیم ہند کے خونین فسادات سے بہت متاثر ہوے اور اس سلگتے موضوع پر اپنی شاعری کو مرکوز کیا۔ شاعری کے قطع نظر رسالہ نکہت الہ آباد میں طنزیہ اور فکاہیہ مضامین لکھے پھر جلد ہی یعنی ۱۹۵۲ء میں عباس حسینی کو مشورہ دیا کہ سرّی ادب کو علیحدہ روپ ورنگ دیا جائے۔ یوں نکہت میں شائع ہونے والی جاسوسی کہانیاں جاسوسی دنیا کے نام سے چھپنے لگیں۔ اس کا پہلا ناول ''دلیر مجرم'' لکھا جس میں انسپکٹر احمد کمال فریدی اور سارجنٹ ساجد حمید کے کرداروں کو حقیقی انداز میں پیش کیا جو آگے چل کر افسانوی اور لاثانی کردار بن گے۔ جاسوسی دنیا کا یہ سلسلہ عوام وخواص ہر دو طبقوں میں مقبول ہوا۔ یہاں تک کہ لوگوں کو آئندہ ناول کا انتظار رہنے لگا' بلکہ کچھ عرصہ بعد ان کے ناولوں کی شہرت کا یہ عالم ہوگیا کہ اکثر بلیک میں بکنے لگیں۔ واضح رہے کہ ابن صفی سے پہلے جاسوسی ادب کا اردو میں زیادہ چلن نہ تھا اور نہ ہی کوئی طبعزاد لکھنے والے' انگریزی ناولوں کے تراجم کا غلبہ تھا۔ منشی تیرتھ رام فیروز پوری' خاں محبوب طرزی اور شاید ظفر عمر جیسے لوگ مترجم کی حیثیت سے معروف تھے۔ ابن صفی کا کمال فن یہ تھا کہ انہوں نے ہمیشہ طبع زاد پلاٹ مہیا کیے۔ ان کا اسلوب' طرز نگارش اس قدر دلچسپ اور انوکھا ہوتا کہ قاری اس کی لذتوں میں گم ہو جاتا' ان کی جادو نگار تحریر کا یہ عالم تھا کہ ہر طبقہ فکر کا آدمی اس کا دلدادہ تھا۔ کہا جاتا ہے کہ طالب علم ہو کہ استاذ' صحافی ہو کہ سیاست داں حتیٰ کہ مذہبی مزاج کے حامل حضرات بھی صاف ستھرے ادب پڑھنے کی غرض سے ابن صفی کے ناولوں میں رغبت پاتے۔ چنانچہ پروفیسر حسن عسکری ابوالخیر کشفی سے پوچھا کرتے تھے کہ نیا ناول کب آرہا ہے۔ یہی نہیں کہتے ہیں کہ پاکستان کے گورنر جنرل خواجہ ناظم الدین کو ان کے ناول بہت پسند تھے۔ اور خود صدر ایوب خاں' ابن صفی کے ناولوں کا مطالعہ کرتے تھے۔ اس مرحلہ پر دو ایک ایسے واقعات بھی میرے ذہن میں محفوظ ہیں جس سے ابن صفی کی مقبولیت ان کی ہمہ گیر شخصیت کا فسوں اپنا اثر دکھاتا ہے۔ یہ غالباً ۱۹۵۴ء کی بات ہے جب ابن صفی کی طلسماتی تحریریں ہر کس وناکس کو اپنے انداز سے مسحور ومسخر کر چکی تھیں۔ میں میٹرک کے ابتدائی درجوں میں تھا۔ گھر کا ماحول خالصاً علمی وادبی ہونے کے ساتھ ساتھ زیادہ ہی مذہبی تھا۔ والد ماجد کے مطالعہ میں جہاں کیمیائے سعادت رہتی' والدہ ماجدہ بہشتی زیور کی دلدادہ تھیں' بڑے بھائی صاحب گرایجویشن کی تیاری کے ساتھ بڑے شوق سے ناولیں پڑھا کرتے اور جب

سے جاسوسی دنیا کی اشاعت عمل میں آئی تب سے کتب خانہ حیدری کے مستقل ممبر ہو گئے تھے' جہاں باالتزام نئی کتابوں کے علاوہ جاسوسی دنیا' عمران سیریز رومانی دنیا وغیرہ دستیاب رہتیں۔ چنانچہ کتب خانہ میں جاسوسی دنیا کے قارئین کی دلچسپی کے ناطے تین تین کتابیں منگلوائی جاتی تھیں جن کو روزانہ چار آنے کرایہ پر دیا جاتا تھا۔ بھائی صاحب جاسوسی دنیا کا خاص نمبر لے آئے' ان کے مطالعہ کے بعد میں اسکول کی کتابوں کے درمیان چھپا کر اول اسکول لے گیا جہاں مقررہ کردہ نصابی گھنٹوں سے فرار اختیار کرتے ہوئے جاسوسی دنیا پڑھنے کو ترجیح دی لیکن اسکول کے ختم ہونے ہونے تک بھی کتاب ختم نہ ہوئی' تب اسکول کے قریب واقع ہائی کورٹ کے چمن میں جا بیٹھا کہ جاسوسی دنیا ختم کرلوں اور اسکول سے واپسی پر بھائی صاحب کے حوالہ کردوں۔ حسن اتفاق ابھی کتاب کے آخری صفحات پر تھا کہ اچانک ایک صاحب سیکل پر نمودار ہوئے انہوں نے میرے ہاتھ سے کتاب چھین لی' سرورق کو دیکھا۔ جاسوسی دنیا کا عنوان دیکھ کر برس پڑے اور نہایت درشت لہجہ میں کہا کبھی نصابی کتاب بھی اس طرح پڑھی ہے! خدا معلوم کیا جادو ہے ان کتابوں میں جس کو دیکھو دیوانہ وار پڑھنا چاہتا ہے۔ مرے لبوں پہ ایک جملہ مچل کر رہ گیا۔ کاش آپ بھی اسے پڑھ لیتے' مجھے اس کی ادائیگی کا موقعہ نہ مل سکا۔ وہ صاحب یہ جا وہ جا۔ دوسرا واقعہ اس سے بھی زیادہ عجیب ہے۔ والد صاحب کے ایک محترم بزرگ سے یاد اللہ تھی۔ وہ اکثر ان سے ملنے موصوف کے گھر جایا کرتے تھے' وہ بزرگ مستند عالم' ایک اچھے مقرر' ادبی معلومات کے حامل استاد تھے۔ صبح کے وقت چہل قدمی کے لئے نکلے تھے کہ کسی انجانے اسکوٹر سوار نے ٹکر دیدی جس کے باعث مولانا کی کولہے کی ہڈی میں فریکچر آ گیا' ڈاکٹروں نے آپریشن کی بجائے پلاسٹر چڑھا دیا۔ مولانا کے معمولات یکسر بدل گئے۔ طبعیت میں یکسوئی نہ ہونے کی بناء پر جھنجھلاہٹ نے اپنا رنگ جمایا۔ کسی سے سیدھے منہ بات نہ کرتے۔ اسی دوران ان کے ایک شاگرد نے ڈرتے ڈرتے جاسوسی دنیا کا ایک شمارہ لا کر دیا' عرض کیا ذکر واشغال کی مصروفیات کے بعد کچھ وقت نکل آئے تو تفریحاً ہی سہی اس کتاب کا مطالعہ کرلیں۔ اول تو مولانا نے غصے سے شاگرد کی طرف دیکھا۔ کتاب پر اُچٹتی نظر ڈالی اور فرمایا "کیا اس مرحلے میں مری عاقبت خراب کرنا چاہتے ہو"۔ لیکن جلد ہی ان بزرگ نے قیلولہ کے وقت کو جاسوسی دنیا کے لئے وقف کر دیا اور بہت دنوں بعد وہ شاگرد عیادت کو پہونچے تو سخت برہم ہو کر کہا "میاں کیا ابن صفی نے محض یہ ایک ہی ناول تو نہیں لکھا ہوگا"۔ شاگرد نے حوصلہ سے کام لیا اور ابن صفی کے شہکار شماروں کا سلسلہ قائم کر دیا۔

ابن صفی نے کوئی اٹھائیس برسوں تک ڈھائی سو سے زاید جاسوسی کہانیاں لکھیں' انکا اسلوب اتنا دلکش والہانہ جوش اور بیساختہ پن کا حامل تھا کہ قاری اس سے لطف اندوز ہی نہیں بلکہ اس میں کھو جاتا تھا۔ اردو زبان وادب میں بہت کم ایسے ادیب ملتے ہیں جن کا طرز نگارش یکساں طور پر متاثر کرتا ہے۔ شاعری میں غالب کے لہجہ کو بہ آسانی پہچانا جاسکتا ہے۔ اسی طرح نثر میں جہاں سرسید کی سادہ بیانی اور شبلی نعمانی کی فیض رسانی کے علاوہ محمد حسین آزاد کی انشا پردازی نے اپنی انفرادیت کو ثابت کیا وہیں ابن صفی کی تحریریں' ندرت و

کمال زبان و بیان کی شگفتگی نے ایک عالم کو زیر دام کر لیا۔ وہ انسانی حواس پر چھا گئے تھے چنانچہ ان کی ذہنی علالت کے دوران ایسے کئی لکھنے والوں نے ان کی تحریروں کی نقل کرتے ہوئے شہرت و اعزاز پانے کی ناکام کوشش کی لیکن وہ خوبی، رعنائی، سلاست روانی کے علاوہ ناول کی پلاٹ اور کرداروں کی تخلیق سے کوسوں دور رہے۔ ان میں دو ایک نام قدرے معروف بھی ہوئے جن میں ایچ اقبال، ایم اے راحت وغیرہ شامل ہیں۔ ابن صفی کی شخصیت بڑی متنوع تھی۔ وہ بیک وقت سری ادب کے ماہر شاعر، افسانہ نگار، ناول نویس کے ساتھ ساتھ ایک اچھے مصور بھی تھے۔ ان کی طباعی تخلیق نگاری کی صلاحیت یہاں بھی نظر آتی تھی۔ لکھنے کے سلسلے میں انکا یہ وصف خوب نکھر آتا تھا۔ اپنی ناول نگاری پر اظہار خیال کرتے ہوئے ایک مضمون میں لکھتے ہیں۔

''مجھے اس وقت ہنسی آتی ہے جب آرٹ اور ثقافت کے علمبردار مجھ سے کہتے ہیں کہ میں ادب کی بھی کچھ خدمت کروں۔ ان کی دانست میں شاید میں جھک مار رہا ہوں۔ حیات و کائنات کا کون سا ایسا مسئلہ ہے جسے میں نے اپنی کسی کتاب میں نہ چھیڑا ہو، لیکن مرا طریق کار ہمیشہ عام روش سے الگ تھلگ رہا ہے۔''

''آخر کار اس نتیجے پر پہنچا کہ آدمی میں جب تک قانون کے احترام کا سلیقہ نہیں پیدا ہوگا یہی سب کچھ ہوتا رہے گا۔ یہ مرا مشن ہے کہ آدمی قانون کا احترام کرنا سیکھے۔ جاسوسی ناول کی راہ میں نے اسی لئے منتخب کی تھی۔ میری دانست میں محض جاسوسی ناولوں کا پھیلاؤ اس مشن کی کامیابی کے لئے ناکافی ہے۔ ملکی قوانین کی تعلیم کا انتظام عوامی پیمانے پر ہونا چاہیے۔ ہمارے ماہرین تعلیم نے ابھی تک اس پر توجہ نہیں کی ہے حالانکہ یہ بے حد ضروری ہے''۔

عبارت مختصر! اردو ادب میں تخلیقی ادب کا عنوان یقیناً زندگی اور اس کے متعلقات سے بڑا گہرا ربط رکھتا ہے۔ زندگی کے کسی مرحلہ پر بھی احساس اور شعور کو علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ بے شعوری کی حالت میں آدمی سطحی قسم کا ہو جاتا ہے۔ چنانچہ شعر و ادب کے معیار کی بنیاد انسانی احساسات و جذبات پر رکھی گئی۔ جس کے ذریعے آدمی ذہنی آسودگی و تسکین سے ہمکنار ہوتا ہے۔ اس منزل پر ادب کو خانوں میں تقسیم کرنے کا منشا صرف اتنا ہوگا کہ ایک صحت مند ادب کی تخلیق ہو، کیونکہ اچھے اور برے ادب کے درمیان خطِ فصل شعور و آگہی سے ہی کھینچا جا سکتا ہے۔ اس پس منظر میں ادب میں در آنے والی بے شمار تحریریں ان کے مثبت و منفی پہلوؤں کا مطالعہ ازبس ضروری و لازمی ہو جاتا ہے۔ ایسے میں سرّی ادب کی اپنی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے توسط سے زندگی میں رونما ہونے والے متنوع و وسیع واقعات کا ادراک و انکشاف ممکن ہے۔ نیز منفی رجحانات کا سدّ باب، صداقت کو معاشرہ کی روح بنانا نسبتاً آسان ہوگا، اسی خیال کے تحت ابن صفی جیسے جینئس کی ناولیں جیسا کہ خود انہوں نے بتلایا کہ ہماری اسی متحرک زندگی کے آثار و احوال پر قدغن لگانے کے مواقع فراہم کرتے ہیں، ابن صفی کی ناول نگاری گویا تخلیقی ادب ہی کا حصہ ہوگی جہاں زندگی گذارنے کا نازک لمحہ ماضی اور حال پر نظر رکھنے کا حوصلہ ہم آہنگ دکھائی دیتا ہے۔ کیونکہ ادیب اور شاعر کی ذات تہذیبی اور ثقافتی لحاظ سے ملک و قوم کا ورثہ ہوتی ہے، ان کا تخلیقی جوہر انسانیت کی خدمت کو اپنا فرض عین سمجھتا ہے اور یہی ابن

صفی کا مقصد تھا، نہ کہ محض شہرت عزت و دولت کا حصول۔ ایک آخری بات ابن صفی کی عظمت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کیونکہ بحیثیت ایک انسان وہ نہایت سیدھے سادھے، خوشامد تملق یا انانیت کے اسیر نہیں تھے۔ ان کے عزیز و اقارب، دوست احباب، جانے انجانے سبھی اس بات کے معترف تھے کہ ان کے پہلو میں ایک درد مند دل تھا اور ایک نابغہ روزگار عبقری ہونے کے ناطے جاگتا ذہن بھی رکھتے تھے۔ سچ بات تو یہ ہے کہ ادب میں ان کے مقام و مرتبہ کے بارے میں سنجیدگی سے سوچا ہی نہیں گیا۔ آج جب کہ ادب سے لطف اندوز ہونے والوں کی تعداد کم ہوتی چلی گئی ہے۔ ادب اور خصوصاً سری ادب کے اس بے تاج بادشاہ کی عظمتوں کا اظہار نہ کرنا جرم ناسپاسی ہے۔ ویسے بھی ادب کی تخلیق کا راستہ مسدود نہیں کیا جاسکتا۔ زندگی اور آگہی انسان کا پیدائشی حق ہے اور ابن صفی نے اپنی زندگی ادب کی تخلیق کی راہیں ہموار کرنے میں گذار دی۔ یہی ان کی دوامی شہرت کا راز ہے۔ یہاں میر کے اس مصرع کی معنویت کھل کر سامنے آتی ہے ۔

سارے عالم پر ہوں میں چھایا ہوا

پیامبر امن......ابن صفی!

مشتاق احمد قریشی

اردو زبان و بیان اور اردو ادب میں ابن صفی کو ایک منفرد مقام اور ممتاز حیثیت حاصل ہے' ابن صفی صاحب کی عظمت و سربلندی کا یہ اظہار ہی تو ہے کہ ان کو اپنے قارئین سے جدا ہوئے تینتیس (۳۳) برس گزرنے کے باوجود ان کا نام ان کا کام آج بھی اسی طرح تر و تازہ ہے گو کہ اس طویل عرصے میں دو نسلیں پروان چڑھ چکی ہیں اور تیسری نسل بھی تیار ہے۔ ساڑھے تین عشرے گزر چکے ہیں۔ دنیا کا سفر تیزی سے جاری ہے' لیکن اس طویل عرصے میں کہیں دور دور تک' ہمیں ابن صفی جیسا امن کا سفیر نظر نہیں آرہا' اردو زبان و بیان آج بھی یتیم دکھائی دے رہی ہے کہ اردو زبان و بیان کے فروغ میں اپنا کردار ادا کرنے والے ایک ایک کر کے اٹھتے جا رہے ہیں' اور نام نہاد جغادری ادیب بھی ادب نویسی سے کنارہ کش ہوتے نظر آرہے ہیں یا یوں کہیں کہ ادب کا انداز ہی بدل گیا ہے' گذشتہ چوتھائی صدی میں کوئی نام اب تک ایسا سامنے نہیں آیا جس کی بات' جس کی تحریر پڑھنے کے لیے لوگ بے چین و بے قرار نظر آتے ہوں۔ جس طرح محترم ابن صفی کے قارئین ان کی تحریر کے منتظر رہے اور اپنی برملا بے چینی کا اظہار بھی کرتے تھے۔ یہ اعزاز نہ ان سے پہلے نہ ان کے بعد ہی کسی کو نصیب ہو سکا۔

ابن صفی صاحب کے قارئین یہ جانتے تھے کیونکہ ابن صفی صاحب اپنے ہر ناول کی ابتدا میں ہی ہمیشہ تحریر کر دیا کرتے تھے' 'اس ناول کے نام مقام کردار اور کہانی سے تعلق رکھنے والے اداروں کے نام فرضی ہیں' اس کے باوجود ان کا تقریباً ہر قاری ان کردار و مقامات کو حقیقی اور سچ سمجھتے ہوئے خود کو ان کی کہانی میں ساتھ ساتھ چلتا پھرتا محسوس کرتا تھا۔ خود کو ان فرضی مقامات' کرداروں' واقعات کا حصہ محسوس کرتا تھا۔ ابن صفی صاحب کی کہانیوں کی یہ خوبی تھی کہ پڑھنے والا ان میں اس قدر ڈوب جاتا کہ اسے اپنے اردگرد تک کا ہوش نہ رہتا خود کو وہ اس دنیا میں لے جاتا تھا جسے ابن صفی نے اپنے زور قلم سے تخلیق کیا ہوتا۔

آج کتنے لکھنے والے ایسے ہیں کہ جن کی تحریر کا جادو ان کے قارئین کے سر چڑھ کر بولتا ہو۔ محترم ابن صفی کو اللہ تبارک و تعالیٰ نے قلم کے طور پر جادو کی ایک چھڑی عطا فرمائی تھی جس سے وہ امن بھائی چارے کی فضاء کو قانون کی حکمرانی اور جرائم کی بیخ کنی کے ذریعے قائم کرنا چاہتے تھے۔ ان کی تمام ہی تحریریں ان کے پیامبر امن ہونے کا اعلان کر رہی ہیں۔ ان کے ناولوں کا ایک ایک لفظ ان کا قاری پڑھا کرتا تھا' ان کے جذبوں کو پوری طرح محسوس کرتا تھا۔ ان کے جانے کے بعد مجھے آج تک دور دور کہیں کوئی اور ان سا لکھنے والا نظر نہیں آرہا۔ ان کی تحریر کو لوگ الہامی تحریر کی مانند بار بار پڑھا کرتے اور ان کی سیری نہ ہوتی۔ میں کئی ایسے لوگوں سے ملا ہوں جن کا کہنا تھا کہ انہوں نے ابن صفی کے ناول پچاس پچاس بار پڑھے ہیں ان کے ناولوں کی سطر سطر لفظ لفظ صفحہ نمبر سطر نمبر کے ساتھ حفظ تھا' یقیناً یہ ان کے جادو اثر قلم کا کمال اور عطیہ الٰہی تھا۔

یہ میرے محترم ابن صفی صاحب کے قلم کا ہی جادو ہے جو آج بھی سر چڑھ کر بول رہا ہے۔ ان کو گئے ہوئے سوا تین عشرے گزرنے کے باوجود جس طرح پورے خطے ہندو پاکستان میں ان کے نام کا غلغلہ بلند ہوا مجھے بے اختیار سورۃ النشرح کی آیت نمبر ۴ ''ورفعنا لک ذکرک'' یعنی اور ہم نے تیرا ذکر بلند کیا' کے الفاظ میرے ذہن میں گونجنے لگے۔ یقیناً اللہ تعالیٰ قادر مطلق ہے وہ جس کو جس طرح چاہتا ہے عزت و مرتبے سے نوازتا ہے۔ وہ لوگ جو ان کی زندگی میں ان کا نام لیتے ہوئے شرماتے تھے ہچکچاتے تھے آج بڑے فخر و اپنائیت سے ان کی تعریفوں کے پل باندھتے نہیں تھک رہے۔ آج ادب قبیلے کے لوگ جو کل تک سرّی ادب کو اردو ادب میں کوئی مقام دینا تو دور کی بات ادب کی کسی بھی صنف میں شمار کرنے تک سے انکار کرتے تھے' کیونکہ جاسوسی کہانی جس کو میں اور میرے جیسے ابن صفی کے چاہنے والے ابن صفیؒ کے پڑھنے والے دیوانے سرّی ادب کا درجہ دیتے تھے اور ہیں' وہ اسے عوامی مقبولیت کے باوجود ادب کے کسی خانے میں' جگہ دینے کو تیار ہی نہیں ہوتے تھے' آج وہی لوگ بھرے مجمعوں میں اپنی زبان و بیان سے اپنے قلم سے ابن صفی صاحب کی تحریروں سے اپنے تعلق کا برملا اظہار کر رہے ہیں اور اپنی عزت گردان رہے ہیں۔

یقیناً یہ ابن صفی پر اللہ تعالیٰ کا بڑا اکرم و احسان ہے۔ یہ ان کی نیک نیتی اور اپنے قلم کے ذریعے اپنی قوم و ملک کے ساتھ پورے اخلاص نیت سے اچھائی کی طرف رہنمائی کرنے کا ہی صلہ ہے کہ آج بھی ان کے نام کا ڈنکا بج رہا ہے۔ ورنہ تو اپنے وقت کے کتنے بڑے بڑے نام ور لوگ جب خاک میں پنہاں ہوئے تو خاک ہی ہو کر رہ گئے۔ ان کا کام تو کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی طرح باقی رہا جو الماریوں میں بوسیدگی کا شکار ہو رہا ہو گا لیکن ان کا نام لیوا کوئی نہیں رہا۔

خاک میں کیا صورتیں تھیں جو پنہاں ہو گئیں
سب کہاں کچھ لالہ وگل میں نمایاں ہو گئیں

اللہ تبارک وتعالیٰ نے ابن صفی صاحب سے جس طرح پیامبر امن کا کام لیا وہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کی یہ سنت ہے کہ جب بھی دنیا کے کسی معاشرے میں بگاڑ پیدا ہوتا ہے تو وہ اپنے کسی نہ کسی منتخب بندے کے ذریعے لوگوں کو فلاح اور بہتری کا راستہ دکھانے انہیں راہ راست پر لانے کی ذمہ داری سونپتا ہے۔ جس زمانے میں ابن صفی صاحب نے ایک عہد کے ساتھ ایک عزم تازہ کے ساتھ قلم اٹھایا تو اس وقت چاروں طرف فحش عریاں تحریروں نے آگ لگائی ہوئی تھی۔ بڑے بڑے نامور لکھنے والوں کے قلم کو شیطان نے اپنی گرفت میں لے رکھا تھا اور لکھنے والوں کو مخرب الاخلاق تحریروں پر لگا رکھا تھا۔ فحاشی اور عریانی کے رسیا ذہنوں کو جگانے اور انہیں راہ راست دکھانے کے لیے اللہ نے غالباً اپنے بندے ابن صفی کا انتخاب کیا تب ہی انہوں نے اپنے قلم کی کاٹ سے کسی تیز دھار تلوار کا نہیں بلکہ قلب نما کا کام لیا اور اپنے قلم کے زور سے لوگوں کو نہ صرف عریاں اور فحش تحریروں کے چنگل سے نکالا انہیں قانون کا احترام کرنا قانون پر چلنے اور قانون کے خلاف چلنے کے انجام سے باخبر ہی نہیں کیا بلکہ معاشرے میں پھیلے ظاہر اور پوشیدہ جرائم کے خلاف اٹھ

کھڑے ہونے کا درس دیا اور جذبہ حب الوطنی کو ابھار کر اپنے پڑھنے والوں کو اپنے وطن سے اٹوٹ بندھن میں بندھ جانے کی ترغیب بھی دی۔ ان کے جادو اثر قلم کے سحر نے ایک انتہائی بگڑے ہوئے معاشرے میں امن بھائی چارے کی جوت جگائی۔ امن کے اس عظیم پیامبر نے اپنے پڑھنے والوں اپنے چاہنے والوں کو امن بھائی چارے حب الوطنی کی ایک لڑی میں پرو دیا کچھ لوگ یقیناً عملی طور پر اور کچھ لوگ ذہنی طور پر ابن صفی کے قلم کے سحر میں آج بھی اسی طرح گرفتار ہیں جس طرح ابن صفی کی حیات میں تھے۔

ابن صفی صاحب کے جادو اثر قلم کا ہی سحر ہے کہ ہندو پاکستان میں اردو کو فروغ نصیب ہوا۔ بابائے اردو اور ان کے محترم و مکرم ساتھیوں نے اردو کے فروغ و استحکام کے لیے جو کام کیا یقیناً وہ بہت اہم اور معتبر ہے لیکن اس کا تاثر ایک خاص حلقے تک محدود رہا لیکن یہ ابن صفی کے قلم کے جادو کا ہی اثر ہے کہ آج خطے میں کئی مختلف قومی زبانوں کی موجودگی اور فروغ کے باوجود خصوصاً بھارت کے طول و عرض میں اردو کی بقا میں ابن صفی صاحب کی تحریروں کا بڑا دخل ہے۔ جبکہ بھارت کی کئی ریاستوں میں تعلیمی میدان میں اردو کا قطعی دخل نہیں ہے لیکن ان ریاستوں میں بھی اردو نہ صرف بولی سمجھی جاتی ہے بلکہ پڑھی بھی جاتی ہے اس میں ابن صفی صاحب کی تحریروں کا بھی بڑا دخل ہے۔

محترم ابن صفی نے جہاں اپنے پڑھنے والوں کو جرم سے نفرت کا درس دیا وہیں اپنے اور اپنے اردگرد کے ماحول و معاشرے کی اصلاح و فلاح کی بھی تلقین کی ہے۔ ذاتی مفادات کو پس پشت ڈال کر قومی ملی مفادات یعنی اجتماعی مفادات کے فروغ کی بات کی ہے جذبہ حب الوطنی کو ابھار کر سرکشی و بغاوت کی بیخ کنی کی ہے۔ اور ان سب کے ساتھ انہوں نے سب سے اہم کام اردو کی بقا اور احیا کا کیا ہے۔ پاکستان میں تو پاکستان میں سرحد پار بھارت میں دو چار دس بیس نہیں بلکہ سیکڑوں بلکہ ہزاروں افراد آج بھی ابن صفی کی دلکش و دلچسپ تحریر کو پڑھنے کے لیے اردو پڑھ رہے ہیں۔ میں خود اس بات کا گواہ ہوں کہ کئی لوگوں نے صرف اور صرف ابن صفی صاحب کے ناولوں کو پڑھنے کے لیے اردو پڑھنا سیکھی اور آج بھی ایسے لوگوں کی خاصی تعداد موجود ہے، جنہوں نے انگلش میڈیم میں تعلیم حاصل کی جن کا اوڑھنا بچھونا انگریزی ہی ہے مگر انہیں میں نے ابن صفی صاحب کے اردو ناول پڑھتے ہوئے دیکھا ہے۔ ایسے ہی ہندوستان میں بڑی تعداد میں ایسے افراد مل جائیں گے جن کی مادری اور تعلیمی زبان اردو قطعی نہیں ہے یا تھی، نہ انہوں نے اردو زبان میں تعلیم حاصل کی تھی لیکن ابن صفی کے ناول پڑھتے ایسے لوگ بھی پائے گئے ہیں۔ یقیناً یہ ابن صفی صاحب کی تحریر کا حسن کمال تھا جو لوگوں کو کسی مقناطیس کی مانند اپنی طرف کھینچ لیتا ہے۔ یقیناً یہ مرتبہ یہ رتبہ اردو کے کسی اور ادیب مصنف کو اب تک حاصل نہیں ہو سکا جبکہ ابن صفی صاحب کی تحریروں کو تو لکھے ہوئے بھی برسوں گزر چکے ہیں جبکہ برقی ابلاغ (ٹی وی) کے ذریعے نے اردو کا لب و لہجہ بھی خاصا تبدیل کر دیا ہے لیکن ان کی لکھی ہوئی اردو زبان وہ آج بھی اپنی دلچسپی اور دلکشی میں روز اول ہی کی مانند ترو تازہ ہے پڑھنے والا بار بار پڑھنے کے باوجود یہ جانتے مانتے ہوئے کہ میں نے یہ کتاب تو کئی بار پڑھی ہے لیکن وہ اسے اسی طرح متاثر کرتی ہے جیسے اس نے اس

کتاب کو پہلی بار پڑھا ہو کہانی کے تمام کردار مقامات واقعات اس کے ذہن نشین ہوتے ہیں لیکن لکھنے والے کی تحریر کا سحر اسے اپنے حصار سے نکلنے نہیں دیتا' وہ ابن صفی صاحب کے اسلوب کا ایسا اور اس قدر اسیر ہوتا ہے یہ سمجھتے ہوئے جانتے ہوئے بھی ان کے ناولوں کو بار بار پڑھ کر لطف اندوز ہوتا رہتا ہے۔

آج بھی جبکہ ابن صفی کو ہم سے جدا ہوئے تین عشرے گزر چکے اور چوتھا عشرہ بھی ایک چوتھائی گزر چکا ہے۔ لوگوں میں ابن صفی صاحب کے بارے میں تجسس جاگ رہا ہے نئی نسل جاننا چاہتی ہے کہ آخر وہ شخص کون تھا جس نے ایک زمانے کو اپنے قلم کے سحر کا اسیر کر رکھا ہے۔ آج ادب کے جس بلند و بالا مقام پر ان کا ذکر ہو رہا ہے۔ جس طرح ہو رہا ہے یہ اپنی جگہ بڑا ہی حیران کن اور دلچسپ ہے لیکن خود ابن صفی صاحب کو اس بات کا یقین تھا کہ ایک نہ ایک دن ان ناقدری کرنے والوں کی آنکھوں سے پردہ اٹھ جائے گا انہوں نے کبھی بھی اپنی حیات میں اس بات کو نہ اہمیت دی نہ ہی پسند کیا کہ لوگ ان کے منہ پر ان کی جھوٹی تعریفیں کریں اور پیٹھ پیچھے برائی کرتے رہیں کیونکہ انہوں نے ادب کے بڑے بڑے ٹھیکیداروں کا ان کے حواریوں کے رویوں' طرز عمل کا بغور مشاہدہ کیا تھا یہی وجہ تھی کہ انہوں نے ایک سوال کے جواب میں کہا تھا کہ میری کتابیں الماریوں میں بند نہیں بلکہ تکیوں کے نیچے ملیں گی اور واقعی ایسا ہی تھا' ان کے اکثر قاری جب تک ان کی کوئی کتاب مکمل نہ پڑھ لیتے اس وقت تک انہیں نیند نہیں آتی تھی' کتاب پڑھ کر بے چینی کو قرار مل جاتا تھا۔ خود میرے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی معاملہ تھا کہ کئی کئی بار کی پڑھی ہوئی کتاب کو اگر پڑھنے کے لیے اٹھالیا تو پوری پڑھے بغیر ہاتھ سے نہیں رکھی جاتی تھی۔

سوچنے اور سمجھنے والی بات یہ ہے کہ آخر ابن صفی صاحب کی تحریر میں ایسا کیا ہنر اور کمال تھا کہ انگریزی کے مقابلے میں اردو جیسی خستہ و یتیم زبان میں جاسوسی ناول میں اسے کیا چار چاند لگ جاتے تھے جو ہر سطح ہر عمر کے پڑھنے والوں کو اپنی جانب کھینچ لیتے تھے۔ انگریزی کے تمام ہی ہنر مند لکھنے والوں کے جاسوسی ناولوں کو اٹھا کر دیکھ لیجیے اس میں جرم و سزا اور جرم سے متعلق تحقیق و تفتیش تو ملے گی اور زبان و بیان کے اعتبار سے بھی بہترین اسلوب کی حامل ہوں گی لیکن جو بات جو ہنر و خوبی ابن صفی صاحب کی تحریر کا خاصا ہے وہ انگریز کیا فرانسیسی اور دیگر زبانوں کے جاسوسی اور جرائم کے ناولوں میں قطعی مفقود ہے۔ ابن صفی صاحب کا کوئی بھی ناول اٹھا لیجیے اس جرم و سزا' سراغ رسانی کے ساتھ ساتھ بھرپور مزاح اور کسی تیز نشتر کی طرح کاٹ دار طنز بڑی خوبصورتی سے ملتا ہے جو پڑھنے والے کو اگر گدگداتا ہے تو ساتھ ساتھ چٹکی بھی لیتا ہے' تجسس اور سراغ رسانی کے پہلو در پہلو طنز و مزاح کا چسکا دنیا کی کسی بھی زبان میں نہیں ملے گا' تجسس اور سراغ رسانی تو ملے گی مگر طنز و مزاح نہیں ملے گا کیونکہ انگریزی میں یہ موضوع ہی الگ ہے جبکہ ابن صفی نے تجسس اور سراغ رسانی کے ساتھ طنز و مزاح کو اس طرح گوندھا ہے کہ پڑھنے والوں کو حیرت کے سمندر میں ڈوبکیاں لگوانے کے باوجود قاری کہیں بدمزا نہیں ہوتا نہ اسے کہیں تحریر کے بوجھل پن یا ثقیل الفاظ کے باعث تکان یا اکتاہٹ کا شکار نہیں ہوتا ہے' ابن صفی بہت رواں اور سیدھے سادھے اسلوب میں لکھنے والے تھے۔ ان کے تحریر میں اول تو کوئی مشکل لفظ کوئی مشکل ترکیب آتی ہی نہیں اور اگر کبھی کسی مجبوری کے تحت کوئی مشکل لفظ آ بھی جاتا تو اس کی

وضاحت بھی ساتھ ہوتی چلی جاتی تھی، پڑھنے والے کو ابن صفی صاحب کی پرتجسس پرلطف تحریر کو پڑھنے میں نہ کوئی دقت ہوتی نہ اس کا مزا کرکرا ہوتا۔ شاید یہی وجہ رہی تھی کہ تجسس کے مارے ایسے پڑھنے والے بھی ابن صفی صاحب کی تحریر کو پڑھنے لگے تھے جو لکھنا پڑھنا بالکل نہیں جانتے تھے لیکن پڑھنے والوں کے تجسس اور شوق کو دیکھ کر انہیں بھی شوق ہوا کہ آخر ان کتابوں میں ایسی کیا بات ہے کہ لوگ سب کام چھوڑ چھاڑ کر دیوانہ وار پڑھنے میں مصروف ہو جاتے ہیں؟

ابن صفی صاحب پہلے مصنف ہیں جنھوں نے سسپنس اور سراغ رسانی کے ساتھ ساتھ طنز و مزاح کی آمیزش سے اپنے کردار اور واقعات کو جنم دیا ہے اور کہانی کو آسان اور عام بول چال میں بولی جانے والی زبان کا خوبصورتی سے استعمال کیا ہے یہی وجہ رہی تھی کہ اعلیٰ و ادنا ہر سطح کا صاحب علم اور بے علم ان کی تحریر سے یکساں لطف اندوز ہوتے تھے اور آج تک اسی طرح لطف اندوز ہو رہے ہیں اور آئندہ بھی ہوتے رہیں گے۔

اگر میں یہ کہوں تو مبالغہ نہیں ہو گا کہ ابن صفی صاحب کی تحریریں الہامی تحریریں ہیں وہ ایک خاص کیفیت، ایک خاص احساس اور ذمہ داری سے اپنے قلم کا استعمال کرتے تھے۔ ان کا مطالعہ بڑا وسیع اور بلیغ تھا وہ جو کچھ لکھتے پوری معلومات کے ساتھ لکھتے تھے۔

آج میرا دل چاہ رہا ہے کہ کچھ بات ابن صفی صاحب کے حوالے سے اردو میں سری ادب اور ادب عالیہ کی بات کرلوں۔ آخر ایسی کیا بات ہے کہ اردو ادب میں سری ادب کو وہ مقام و مرتبہ حاصل نہیں ہو سکا یا یوں کہا جائے کہ دیا نہیں گیا "سری ادب یا جاسوسی ناول یا افسانہ خصوصاً محترم ابن صفی صاحب کی تحریریں جو عوامی مقبولیت کی معراج کو چھو رہی ہیں، جو عوام کے مزاج و مذاق یعنی معیار کے مطابق ہیں جن میں معاشرے کی گندگی اور برائیوں کے بارے میں تشویش اور کراہیت کے ساتھ ساتھ ان کا مداوا بھی پیش کیا جاتا ہے۔ جو تحریریں دل بہلانے کے ساتھ ساتھ معاشرے کے رستے ہوئے ناسوروں کی اپنے تیز و تند نشتر سے جراحت بھی کرتی ہوں وہ تو ادب سے باہر کر دی جاتی ہے اور جو تحریریں نقادان وقت اور اردو کے حوالے سے نام نہاد معتبر لکھنے والوں کے مطابق معاشرے کے حقائق و مسائل اور گردش ایام کے تضادات و توافق کو مشکل الفاظ و اسلوب اور بوجھل لہجوں میں لکھی جائے جنہیں سمجھنے اور سمجھانے والے معدود چند افراد ہوں وہ ادب عالیہ ہے اور بقول اشفاق احمد صاحب "جو تحریر سر سے گزر جائے سمجھ لو کہ ادب عالیہ ہے" ادب عالیہ کی ایک اور پہچان جو بتائی گئی وہ یہ تھی کہ "ادب ہر کسی کے لیے نہیں کسی کسی کے لیے ہوتا ہے" جبکہ سری ادب جس کو ادب کے ٹھیکیدار عوامی ادب یا مقبول عام ادب سے تشبیہی دیتے ہیں جو عام لوگوں کا دل بہلانے اور تفریح کی غرض سے لکھا جاتا ہے شاید یہی وجہ تھی کہ اردو کے معرف نقاد پروفیسر مجنوں گورکھپوری کو جب اپنے وقت کو قتل کرنا ہوتا تو وہ جاسوسی ناول پڑھا کرتے تھے۔ ان کے بقول جاسوسی ناول صرف انگریزی میں لکھے گئے ہیں جن میں زبان و بیان کی ندرت اور دیگر تمام خوبیاں موجود ہوتی ہیں شاید یہی وجہ ہے کہ انگریزی میں جاسوسی ناول یا سری ادب لکھنے والوں میں ایڈگرایلن پو، سر آرتھر کانن ڈائیل، لیکاک، ایڈگر ویلس اور اگاتھا کرسٹی، رائڈر ہیگرڈ جیسے ناموں کو سری ادب کا بے تاب بادشاہ

سمجھا جاتا ہے بقول اردو نقادوں کے ان لوگوں نے ہی اپنی تحریروں کے حوالے سے جاسوسی ادب کو اعتبار بخشا ہے۔ جبکہ ان نامور انگریزی لکھنے والوں کے تقریباً تمام ہی ناولوں کے اردو میں تراجم ہوئے ان کے پڑھنے والوں کی تعداد انگلیوں پر گنی جاسکتی ہے۔ جبکہ اردو میں طبع زاد کہانیوں کا ڈول بطور ناول جناب ابن صفی نے ہی ڈالا ہے اور یہ بات بھی قطعی درست نہیں ہے کہ اردو میں جاسوسی ادب یا فکشن کی ابتدا انگریزی جاسوسی ناولوں کے تراجم سے کی گئی۔ اگر یہ بات درست ہے تو پھر محمد حسین جاہ کی طلسم ہوشربا کی تمام جلدیں اور پنڈت رتن ناتھ کا فسانہ آزاد، مرزا ہادی اور دیگر اسی دور کے قصہ نویسوں کے لکھے قصے کہاں جائیں گے جبکہ خود ابن صفی صاحب بارہا اس بات کی تکرار کر چکے ہیں کہ ان کی ذہنی نشو و نما میں طلسم ہوشربا اور اس جیسی تحریروں نے بنیادی اور کلیدی کردار ادا کیا ہے جبکہ انگریزی تراجم تو بعد کی چیز ہیں۔

سرّی ادب اور ادب عالیہ میں صرف اتنا ہی فرق نہیں ہے کہ ادب عالیہ صرف چند ہم خیال لوگوں کے لیے لکھا جاتا ہے اور سری ادب عام اور تمام لوگوں کے لیے لکھا جاتا ہے ادب عالیہ کی ایک اور خوبی یہ بھی ہے کہ لکھنے والا اپنے خاص الخاص پڑھنے والوں کی تعریف کرے اور اس کے پڑھنے والے جن کی سمجھ میں وہ ادبی شہکار آئے یا نہ آئے وہ اس کی تعریف میں زمین و آسمان ایک کر دیں۔ اگر سمجھا جائے تو سری ادب خصوصاً ابن صفی صاحب کی تحریریں بنیادی طور پر بامقصد اور اخلاقی اقدار لیے ہوئے ہوتی ہیں جن میں خیر و شر کی معرکہ آرائی اور شر پر خیر کی اقدار کو مضبوط و مستحکم کرتے نظر آتے ہیں۔

ابن صفی صاحب کو کبھی یہ فکر نہیں رہی کہ ان کی کتابیں کون لوگ پڑھتے ہیں اور کون نہیں پڑھتے ان کے لیے یہ بات ہی طمانیت کا باعث تھی کہ جس معاشرے میں بڑے سے بڑے ادیب کی کتاب برسوں میں پانچ سو نہیں بکتی ہیں اس ہی معاشرے میں ان کی کتاب سیکڑوں سے نکل کر ہزاروں بلکہ لاکھوں کی تعداد میں فروخت ہوتی تھیں اور وہ بھی ہاتھوں ہاتھ ختم ہو جاتی تھی۔ ابن صفی صاحب نے اپنے قلم کے زور پر اپنے قارئین خود حاصل کیے' انہیں کسی بانس بلی کے سہارے کی کبھی ضرورت نہیں پڑی انہوں نے جو لکھا جب لکھا جیسا لکھا وہ مقبول عام ہوا چاہے وہ طنز و مزاح ہو شاعری ہو یا جاسوسی ناول ہوں یا معاشرتی نفسیاتی کہانیاں ہوں انہوں نے اپنے قلم کو اپنے معاشرے اپنے مذہب کی بنیادی مقصدی اقدار کے فروغ کے لیے وقف کر رکھا تھا۔ انہوں نے کبھی بھی شر کو خیر پر فتح مند نہیں ہونے دیا ہمیشہ خیر ہی نے شر پر فتح پائی اور مجرم کو کیفر کردار تک پہنچایا ہے۔ ان کی تحریروں نے بڑے بڑے ذہین مجرموں کو قانون کے شکنجے میں جکڑا ہے' ایسے مجرم ذہن رکھنے والے قارئین کو انہوں نے یہی سمجھایا ہے کہ مجرم چاہے کتنی ہی مضبوط منصوبہ بندی کر لے لیکن وہ قانون کی پکڑ سے نہیں بچ سکتا' جانے انجانے میں کتنے ہی لوگ جرم کرنے سے بچ گئے ہوں گے' جرم چاہے چھوٹا ہو یا بڑا جرم جرم ہوتا ہے جو معاشرے میں بدامنی بے چینی اضطراب کو جنم دیتا ہے اور قانون کی بالادستی جس کا درس ابن صفی صاحب نے دیا وہ معاشرے میں امن چین سکون کو جنم دیتی ہے اسی باعث میں انہیں امن کا پیام بر سمجھتا ہوں۔ دل چاہ رہا ہے کہ آخر میں جناب احمد ندیم قاسمی صاحب سے معذرت کے

ساتھ ان کے ایک شعر میں تھوڑی سے ترمیم کر کے پیش کروں۔

کون کہتا ہے کہ موت آئی تو مر جاؤ گے
تم تو ابن صفی ہو کتابوں میں مل جاؤ گے

ابن صفی صاحب کے کچھ اقوال زریں:

''ساری دنیا کے افراد امن پسند ہیں۔ جب تک بہکائے نہیں جاتے' فرشتوں کی طرح زندگی بسر کرتے ہیں اور انہیں بہکانے کی ذمہ داری چند افراد پر ہوتی ہے۔ وہ بڑی عقیدت سے ان دانشوروں کا اُگلا ہوا زہر اپنی روح کی گہرائیوں میں اتار لیتے ہیں۔'' (پرچھائیوں کے حملے۔ جاسوسی دنیا)

''گوشت اور ہڈیوں کے ڈھیر ے کو حیوان کہتے ہیں۔ آدمی تو کھوپڑی میں جنم لیتا ہے اور کھوپڑی ہی میں مر جاتا ہے۔'' (آوارہ شہزادہ۔ جاسوسی دنیا)

''پھر اب تم کیا کرو گے؟''

''اردو ادب کا کوئی نامور نقاد بن کر جاسوسی ناول نویسوں کو گالیاں دیتا پھروں گا'' (جونک کی واپسی۔ عمران سیریز)

''ہم سب پاگل ہیں' محض کچھ دیر کی واہ واہ کے لیے لوگ موت کے منہ میں چھلانگ لگا دیتے ہیں۔ ہر شخص ذاتی آسودگی کی تلاش میں سرگرداں ہے خواہ اس کی راہ جہنم ہی سے کیوں نہ گزرتی ہو۔'' (ستاروں کی چیخیں۔ جاسوسی دنیا)

''اگر خود غرض اور جاہ پسندی سے منہ موڑ لیا جائے' ایک نئے انداز کی سرمایہ داری کی بنیاد ڈالنے کی بجائے خلوص نیت سے وہی کیا جائے جو کہا جاتا رہا ہے تو عوام کی جھلاہٹ دور ہو جائے گی۔

ضرورت ہے کہ انہیں قناعت کا سبق پڑھانے کے بجائے ان کی ''خودی'' کو ابھارا جائے جیسے بعض دوسرے ممالک میں ہوا۔'' (زہریلا سیارہ۔ جاسوسی دنیا)

''ہزار ہا سال کے جابرانہ نظاموں کے دباؤ کی وجہ سے انسانی ذہن بہت زیادہ مشتعل ہو گیا ہے۔ اور ساتھ ہی ان نظاموں سے نکلنے کی تدبیریں بھی سوچتا رہا ہے۔ اسی طرح کے اعصاب بہت زیادہ متحرک ہو گئے ہیں۔ لہٰذا اگر انہیں کسی طرح پرسکون کر دیا جائے تو دنیا جنت بن جائے گی۔ لوگ فرشتوں کی طرح زندگی بسر کریں گے۔'' (مہکتے محافظ۔ عمران سیریز)

''یہ فرنگی بھی عجیب ہوتے ہیں' ان کی ایک ٹولی لوگوں پر گولیاں برساتی ہے اور دوسری ٹولی زخمیوں کی مرہم پٹی بھی کرتی پھرتی ہے۔ ان کا نشانہ ایک دوسرے کو کاٹتی ہوئی دو سرخ لکیریں ہوتی ہیں۔'' (خطرناک ڈھلان۔ عمران سیریز)

''دنیا کا کوئی مجرم بھی سزا سے نہیں بچ سکتا۔ قدرت خود ہی اسے اس کے مناسب انجام کی طرف دھکیلتی ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو تم ایک رات بھی اپنی چھت کے نیچے آرام کی نیند نہ سو سکو زمین میں فتنوں کے علاوہ اور

کچھ نہ اُگے۔" (ہیروں کا فریب۔عمران سیریز)

"سنو جس طاقت کو تم غلط سمجھتے ہو۔ وہ صرف خدا کی طاقت ہے جو ہمیں اور تمہیں طاقت عطا کر کے رحم کرنا سکھاتی ہے۔ طاقت کا صحیح مظاہرہ یہ نہیں کہ تم کمزوروں کو مسل دو بلکہ طاقت کا صحیح مظاہرہ اس وقت ہوتا ہے جو ہمیں اور تمہیں طاقت عطا کر کے رحم کرنا سکھاتی ہے۔ طاقت کا صحیح مظاہرہ یہ نہیں کہ تم کمزوروں کو مسل دو بلکہ طاقت کا صحیح مظاہرہ اس وقت ہوتا ہے جب ہم اپنے نفس سے جنگ کرتے ہیں۔ اپنے اندر بپھرے ہوئے وحشی کو ابھرنے نہیں دیتے۔ جب تک افراد کی داخلی تنظیم اس نظریے کے تحت نہ ہوگی بہتر سے بہتر نظام حیات بھی دیرپا نہ ثابت ہو سکے گا۔ تم آج ایک نظام سے اکتا کر دوسرے نظام کی بنیادیں رکھتے ہو مگر کل وہ بھی ڈھیر ہو جائے گا کیونکہ بنیاد اسی پرانی زمین پر رکھ رہے ہو جس کے نیچے آتش فشاں سوتے ہیں۔ پہلے آتش فشاں کو ٹھنڈا کرو۔" (جہنم کا شعلہ۔ جاسوسی دنیا)

"کرائے کے آدمی روٹی کے لیے سر سے کفن باندھتے ہیں۔ مجھے ان سے ہمدردی ہے اور اس وقت تک رہے گی جب تک ہماری سوسائٹی صحیح معنوں میں انسانی سوسائٹی نہیں بن جاتی۔" (ریت کا دیوتا۔ جاسوسی دنیا)

"زندہ رہنے کے لیے اپنی کھال پر کتنی تہیں چڑھانی پڑتی ہیں! یہ اور بات کہ روح کی کراہ قہقہوں سے بھی جھانکتی ہے۔" (الٹی تصویر۔ جاسوسی دنیا)

"شعرا اور رہنمایان قوم کی دعوتیں خالی از علیت نہیں ہوتیں۔ چونکہ دونوں ہی کی نظریں دوررس ہوتی ہیں۔ لہٰذا دعوت کا مقصد ان سے کس طرح پوشیدہ رہ سکتا ہے۔ شاعر ایسے موقع پر عموماً مساوات کے گیت گاتا ہے اور رہنمائے قوم پر مساوات کا دورہ پڑتا ہے۔ وہ عام آدمیوں پر یہ ظاہر کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ وہ انہی میں سے ایک ہے۔" (شعلوں کا ناچ۔ جاسوسی دنیا)

"حرام خوری آدمی کو سنگدل بنا دیتی ہے۔ اگر یہ ایک ایماندار آدمی کی طرح اپنی روزی خود کماتا ہوتا تو اس کے بچے شرابی اور جواری نہیں ہو سکتے تھے۔ بے مشقت ہاتھ آئے ہوئے پیسے آدمی کو شیطنیت کی طرف لے جاتے ہیں۔" (نیلی لکیر۔ جاسوسی دنیا)

"آپ مجھے کوئی فلسفی ادیب معلوم ہوتے ہیں۔ بلاشبہ بارہ ایسی لڑکیوں کو ہڈیوں کے ڈھانچے کہنا ایک نادر خیال ہے جو عصمت فروشی کرتی ہوں۔ آپ جیسے نہ جانے کتنے ادیب اور شاعر یہاں آتے ہیں۔ جسموں کا سودا ہی کرنے آتے ہیں۔ لیکن پھر شراب پی کر بہکتے ہیں اور اسی قسم کی باتیں کرنے لگتے ہیں۔ ہڈیوں کے ڈھانچے معاشرے کا ناسور' سماج کا گندا پھوڑا' اور نہ جانے کیا کیا' اور پھر آپ جانتے ہی ہیں اس کے بعد کیا ہوتا ہے' وہ سارے عظیم ادبا' شعرا وہ سارا زہر خود پی کر پوری سوسائٹی کو بچا لیتے ہیں۔" (دشمنوں کا شہر۔ جاسوسی دنیا)

"تمہارے یہاں اخوت و مساوات کے بڑے چرچے ہیں لیکن تمہاری قوم کے پچھتر فی صد افراد فقر و فاقہ اور صبر و قناعت کی زندگی گزارتے ہیں اور پچیس فی صد کا یہ عالم ہے کہ دن بھر میں دو ڈھائی پونڈ لیونڈر اپنے کپڑوں پر اسپرے کر ڈالتے ہیں۔" (دوسرا پتھر۔ عمران سیریز)

''اگر آدمی کا دائرہ معلومات اس کی قوت عمل سے زیادہ ہو تو وہ اپاہج ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس صورت میں وہ باتیں تو بڑی لمبی چوڑی کرتا ہے لیکن عملی اعتبار سے صفر ہی رہتا ہے۔'' (ٹھنڈی آگ۔ جاسوسی دنیا)

''دماغی کام کرنے والے عموماً پیتے ہیں۔'' ''کمزور دماغ کے لوگ ہوتے ہوں گے، یہاں تو صرف ایک قہقہہ جو دل کی گہرائیوں سے نکلا ہو ساری ذہنی تھکن دور کر دیتا ہے۔'' (اونچا شکار۔ جاسوسی دنیا)

''آدمی کتنا گر سکتا ہے اس کا اندازہ کرنا بہت مشکل ہے..... مگر دنیا کی دو بڑی طاقتیں، جو اپنے اقتدار کے لیے آپس میں رسہ کشی کر رہی ہیں اس سے بھی زیادہ گر سکتی ہیں۔ ان کے بلند بانگ نعرے جو انسانیت کا بول بالا کرنے والے کہلاتے ہیں کتنے زہر آلود ہیں اس کا اندازہ مشکل ہے۔ یہ ایسے ہی ایک ملک کی کہانی ہے جو اپنے حریف سے نپٹنے کے لیے ایشیا کی لاش پر کھڑے ہونے کی کوشش کر رہا ہے۔'' (وبائی ہیجان۔ جاسوسی دنیا)

''ادھر ادھر کی باتوں میں آدمی ہمیشہ ننگا ہو جاتا ہے۔ یعنی روح اور فرشتے ادھر ادھر کی باتوں میں لازمی ظاہر ہو جائیں گے۔ تم ادھر ادھر کی باتوں پر غیر شعوری طور پر اپنے کردار کی جھلکیاں دکھاتے چلے جاؤ گے۔'' (رائفل کا نغمہ۔ جاسوسی دنیا)

''کچھ مجرم بڑی بڑی رشوتوں سے کام چلاتے ہیں اور کچھ دھونس دھڑلے سے..... لیکن رشتوں کا سہارا لینے والے مجرم نہیں کہلاتے..... کبھی کبھی تو حکومت انہیں خطابات سے نوازتی ہے۔'' (زرد فتنہ۔ جاسوسی دنیا)

'بڑھتی ہوئی عمر، بہترین استاد ہوتی ہے لیکن اسے اپنے اوپر اس طرح نہ طاری کرنا چاہیے کہ آدمی سچ مچ بوڑھا معلوم ہونے لگے۔ (دھواں ہوئی دیوار۔ جاسوسی دنیا)

یقیناً محترم ابن صفی ایک رجحان ساز ادیب تھے انہوں نے ایک عزم ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت معاشرے سے جنسی اور فحش تحریروں کے خلاف علم بغاوت بلند کیا اور وہ اس میں سو فیصد کامیاب بھی رہے اس زمانے کے جس میں ابن صفی نے اپنے لکھنے کی ابتدا کی فحش نگاروں کی ایک پوری جماعت مخرب الاخلاق بے ادبی پر کمر بستہ تھی ایک پورے گروہ کا مقابلہ ابن صفی نے اپنے قلم کے زور پر کیا ہے اور نئے لکھنے والوں کے لیے ہی نہیں بلکہ پڑھنے والوں کے لیے بھی ایک بالکل نئی راہ استوار کی ہے۔ ابن صفی صاحب نے اپنے قلم سے ہی ہند و پاکستان میں اردو اور اردو ادب کی گرتی ہوئی ساکھ بلکہ گرتی ہوئی دیوار کو نہ صرف سہارا دیا بلکہ آنے والی نسلوں کو مستحکم و مضبوط بنیاد بھی فراہم کی ہے۔

جہاں ان کے قلم نے معاشرے میں قانون شکنی کی حوصلہ شکنی کی اور قانون کی بالا دستی اور قانون کے احترام کا درس دیا وہیں لوگوں میں یہ یقین بھی پیدا کیا کہ قانون کی عملداری ہی دراصل میں امن بھائی چارے کی فضا پیدا کر سکتی ہے، یقیناً ابن صفی وہ واحد قلم کار فنکار، ادیب ہیں (میں یہاں تھے نہیں لکھ رہا کیونکہ ان کی تحریر کا سحر ان کے پڑھنے والوں پر آج بھی اسی طرح اثر انداز ہے) جنہوں نے بیک وقت معاشرے کی جہتوں کو متاثر کیا اور نئی راہ پر ڈالا ہے۔ وہ امن کے پیامبر تھے، امن کے پیامبر ہیں اور امن کے پیامبر رہیں گے۔ اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے آمین۔

بابائے جاسوسی

تنویر عادل نجمی

ہزار زیست ہو پائندہ تر، مگر اسرار
اجل نہ ہو تو بنے کون بار غم کا کفیل

اسرار ناروی، ابن صفی، پرکاش سکینہ، طغرل فرغان، سنکی سولجر، عقرب بہارستانی۔
یہ چھ الگ افراد نہیں بلکہ ایک ہی انسان کے چھ مختلف پہلو ہیں، جنہیں ہم انسانیت کے علمبردار آدمیت کے حامی ہر قسم کے تعصبات کے مخالف اور معاشرے پر اللہ کی ڈکٹیٹر شپ کے قائل، ہر دلعزیز ادیب، مزاح نگار، شاعر اور اردو زبان میں ایک مظلوم شعبہ ''جاسوسی ادب'' کے بانی محترم ابن صفی کے نام سے جانتے ہیں۔
جی ہاں، وہی ابن صفی...... جو اپنی لازوال اور نادر تحریروں کی بدولت ہم سب کے دلوں میں زندہ رہیں گے۔ وہ ایک عظیم انسان، سچے پاکستانی اور اسلام کے نام لیوا تھے۔ وہ ایک ایسی بے قرار روح تھے جو دنیا کے تپتے ہوئے صحرا میں خار دار کانٹوں کو تو جسم میں برداشت کر لیتے تھے مگر انسانیت کے جسم میں کسی قسم کی سوزش نہ سہہ سکتے تھے۔ انہوں نے اپنی کتابوں کے ذریعے سپر پاورز کی ریشہ دوانیوں، تھریسیا اور جولیا کی عمران سے یکطرفہ محبت، حمید کے ذہنی فتور...... صفدر کے ہر قسم کی فکروں سے آزاد کام کرنے کی دھن کا تذکرہ کیا ہے۔ علی عمران جیسا احمق بھی ان کے طلسم خیال کا راہی ہے اور...... اور کرنل فریدی جیسا بلند حوصلہ، چٹانی صبر اور اولعزم کردار بھی آپ کے قلم کے ذریعے ہمارے ذہنوں کی وسعتوں میں گھر کر گیا ہے۔
محترم ابن صفی کا مسلک معاشرے پر قانون کی بالادستی قائم کرنا تھا۔ انہوں نے خود ہی کہا تھا ''میرا مشن ہے کہ آدمی قانون کا احترام کرے۔''
ہم نے ان کے ناولوں میں ہمیشہ اسی کو سرفہرست پایا۔ سری ادب زندگی کے ایک مخصوص شعبے سے تعلق رکھتا ہے۔ انسان کا دل اور دماغ ہمیشہ نیکی اور بدی کا محاذ بنے رہتے ہیں۔ حضرت آدمؑ سے لے کر آج تک قتل وغارت گری کا بازار گرم ہے۔ زمین...... خود غرضوں سے کبھی پاک نہیں ہوئی، کچھ لوگ صبر کرنا جانتے ہیں جبکہ کچھ دوسروں کو اذیت پہنچا کر سکون محسوس کرتے ہیں۔ اس مقصد کے لیے وہ مجرمانہ راستے اختیار کرنے سے بھی نہیں ہچکچاتے تاہم وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ دنیا کا کوئی مجرم سزا سے نہیں بچ سکتا۔ قدرت خود اسے مناسب انجام تک پہنچا دیتی ہے۔ ہمیں ان کی کتابوں میں یہی کچھ ملتا ہے کہ ایک طرف خواہشات کا ریلا ہوتا ہے اور دوسری طرف حق کی صدا گونجتی ہے...... پھر کوئی عمران کوئی فریدی جان ہتھیلی پر رکھ کر اس آگ میں چھلانگ لگا دیتا ہے، تو آگ سرد ہو جاتی ہے۔ محترم ابن صفی کی تحریروں کے پیچھے یہی جذبہ کارفرما تھا۔ وہ اس معاشرے کو ایک مثالی معاشرہ دیکھنا چاہتے تھے۔ وہ انسانوں کے اندر جذبہ حب الوطنی، شہریت کا لحاظ اور حقوق کا پاس پیدا

کرنا چاہتے تھے۔

ادب کسی معاشرے کے جسم میں نبض کی طرح حرکت کرتا ہے اور ادیب وہی ہے جو اپنی انگلیوں کی حساس پوروں کے ذریعے نبض کی نرم گرم تیز رو لہریں فوراً محسوس کر لے اور پھر ایسا علاج بھی دریافت کرے جو جسم میں موجود ہر عارضے کو مکمل طور پر صحت عطا کر سکے، میں نہ تو اس جسم کا معالج ہوں نہ نباض بلکہ میں ادب کا ایک حقیر سا قاری ہوں۔ ابھی لکھنے والوں کے اس کارواں میں میں بہت پیچھے ہوں بلکہ نہ ہونے کے برابر۔ مجھے اس شاہراہ پر گامزن کرنے کا سہرا میری آپی سائرہ جی کے سر ہے۔ محترم ابن صفی سے تعارف بھی انہی کے ذریعے ہوا۔ شروعات امیر حمزہ سے ہوئیں اور اختتام ابن صفی پر اور بس، یوں بھی داستانِ امیر حمزہ پرانے وقتوں کی باتیں تھیں اور کچھ کرنل فریدی اور علی عمران کے مسحور کن طلسم نے بھی ہمارے ذہنوں سے طلسم ہوشربا کو فنا کر دیا۔

ابن صفی صاحب کی عظمت کا تذکرہ کرنے کے لیے میرا ذخیرہ الفاظ بہت کم ہے، میرے ناچیز قلم سے نکلنے والے یہ الفاظ اس سمندر کے لیے چند قطرے ہیں۔

ان سے پہلے اردو زبان میں جاسوسی ادب تراجم کے بوجھ سے خمیدہ ہو چکا تھا۔ اس بوجھ کو اتارنے کا کام انہوں نے ہی سرانجام دیا۔ وہ اس بھیڑ میں ایک مردِ آہن کی طرح بلند مقام پر کھڑے نظر آتے ہیں۔ اس شعبے کو انہوں نے جلا بخشی، ان کے بے تحاشا عقیدت مندوں کی وجہ ان کا اچھوتا انداز، واقعہ نگاری کا سلیقہ اور سحر انگیز اسلوب...... ہے۔ ادب خواہ تفریح کے لیے لکھا جائے اس میں کوئی نہ کوئی مقصدیت ضروری ہوتی ہے اور محترم ابن صفی نے اس مقصدیت کے دامن کو کبھی نہ چھوڑا۔ ان سے پہلے ہمارے ادب کے محاذ پر سری ادب کا کوئی سپاہی نہ تھا اور یہ حصہ ہمیشہ شکست خوردہ ہی رہتا تھا اس لیے انہیں جاسوسی ادب کی تاریخ میں ''بابائے جاسوسی'' لکھا جائے گا۔

کیا محترم ابن صفی سے بڑا مصنف پاکستان پیدا کرے گا......؟ نہیں...... قطعی نہیں۔ کیونکہ انسان دوبارہ جنم نہیں لیتا! وہ غالب ہو، میر ہو، اقبال ہو، ساحر ہو، کیا کوئی روپ بدل کر واپس آیا ہے۔ مگر یہ سچ ہے کہ وہ ایک نئے راستے کی طرف نئے جزیرے کی جانب کشتی حیات کی پتوار کو ڈال گئے، اب اس کشتی کو حالات کے بھنور اور زمانے کے ہچکولوں سے نجات دلانا ہمارا کام ہے۔

ادیب دو قسم کے ہوتے ہیں ایک وہ جن کو ادب کے مہا پرش ادیب مان لیتے ہیں۔ ان کا ایک حلقہ بن جاتا ہے۔ ان کی کتابیں ادب کے خزانے میں شامل ہو کر لائبریریوں کے کونے میں اس طرح دفن ہو جاتی ہیں جیسے لحد میں کوئی لاش، عام آدمی انہیں پڑھنا تو دور کی بات ہے ہاتھ لگاتے ہوئے بھی ہچکچاتا ہے...... دوسرے وہ ہیں جنہیں ادبی ٹھیکیدار ادیب ہی نہیں مانتے...... مگر وہ گھر گھر پڑھے جاتے ہیں...... ان کی کتب کی تعریف میں ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا جاتا ہے۔ پڑھنے والوں کے دلوں تک ان کی رسائی ہوتی ہے۔ وہ جھونپڑوں میں بھی مسرت کا پیام لاتے ہیں اور محلوں میں تنگ نظری کو فنا کرتے ہیں۔ وہ ہر جگہ پائے جاتے

ہیں۔ خیالوں، ذہنوں، دلوں اور گفتگو میں۔ آنکھیں انہیں تکتی ہیں۔ ہاتھ انتظار میں ملے جاتے ہیں، بک اسٹالوں کی چکر لگاتے ہوئے ٹانگیں نہیں تھکتیں، اور پھر جب ان کی کتاب آنکھوں کے سامنے آتی ہے تو سوگوار آنکھیں کھل اٹھتی ہیں۔ ہاتھ بے تابی سے کتاب کی طرف بڑھتے ہیں، نہ چلنے کی سکت کے باوجود ٹانگیں ایک نئی امنگ، ہمت، عزم اور جدوجہد کے ساتھ اپنا کام کرنے لگتی ہیں۔ بس محترم ابن صفی اسی دوسری اور ہر دلعزیز صف میں آتے ہیں اور اس میں ان کا مرتبہ ان کا مقام سب سے نمایاں سب سے بلند ہے۔ یہ نام نہاد نقاد اپنی اصلیت کھو بیٹھنے کے لیے زیادہ عرصہ نہیں لگائیں گے جب کہ محترم ابن صفی ہمیشہ ہمارے دلوں میں دھڑکنوں کی طرح بسے رہیں گے۔

ویسے بھی ادیب کا سرمایہ اس کی دولت اس کے پڑھنے والے ہوتے ہیں۔ اس کے قارئین شائقین کی لمبی قطاریں اس کی ہر دلعزیزی کا ثبوت ہوتی ہیں۔ ادیب اپنے پڑھنے والوں کے ساتھ ایک لطیف ناتا جوڑ لیتا ہے۔ احساسات وخیالات کا سندر ساناتا، قلم کے ذریعے پھیلائی گئی چاشنی کے ذریعے بھی یہ ناتا باہم مضبوط ہو جاتا ہے اور پھر جہاں جہاں قاری ادیب کے قلم سے نکلے ہوئے سندر شبدوں کی کلاسیکی مدھرتا میں ڈوبتا جاتا ہے وہاں وہاں اس کے ذہن پر ادیب کا اثر گہرا ہونے لگتا ہے پھر قارئین خود ہی اس بات کا فیصلہ کر دیتے ہیں کہ ادب کے اس اکھاڑے کا اس میدان کا شہسوار کون ہے یہاں پر نقادوں کی ایک نہیں چلتی اور وہ اپنا سامنہ لے کر رہ جاتے ہیں۔ اب یہ ثابت ہوتا ہے کہ قارئین ابن صفی صاحب کے حق میں یہ فیصلہ برسوں پہلے کر چکے تھے اور انہیں میدان کا شہسوار تسلیم کر چکے تھے۔

مجھے جن شخصیات سے ملنے کا ارمان تھا، ان میں سرفہرست محترم ابن صفی صاحب ہی تھے لیکن افسوس کہ ان سے ملاقات کی یہ خواہش کبھی پوری نہ ہو سکی مگر ساحرہ جی ان سے ملاقات کر چکی ہیں۔ یہاں پر ان کے تاثرات، ان کے احساسات، ان کی ڈائری کے وہ صفحات جو محترم ابن صفی صاحب کی عقیدت سے پر ہیں، پیش کرتا ہوں۔ آیئے دیکھیں، انہوں نے اپنی روحانی محبت کا اعتراف کس طرح کیا ہے۔

ایک نامور مصنف جس کی کتابیں دوسرے تیسرے دن ہی بک اسٹالوں سے غائب ہو جایا کرتی تھیں ۔ پاکستان اور ہندوستان میں ان کی ہر کتاب لاکھوں کی تعداد میں شائع ہوتی تھی۔ ہندوستان میں ان کے پبلشر عباس حسینی، محترم ابن صفی کی بدولت کوٹھی بنگلے اور کاروں کے مالک ہیں مگر ابن صفی صاحب اب تک اسی حالت میں ہیں جیسی ہندوستان سے ہجرت کر کے آئے تھے۔ سب سے زیادہ خریدے جانے والے نام ابن صفی کے گھر نہ صرف کسی قسم کا سامان تعیش نہیں ہے بلکہ وہاں بالکل ایک متوسط طبقے کے مثالی مشرقی گھر کا سماں ہے۔ گھر کی صفائی، ستھرائی...... مکینوں کی نفاست اور حسن ذوق کی دلیل ہے وہاں سگھڑ پن ہے، قناعت کا سکون ہے، خلوص کی مسکراہٹ ہے، ان کے گھرانے کے لوگ قناعت اور اطمینان کی دولت سے مالا مال ہیں۔

جب میں محترم ابن صفی سے ملی تو ایسا محسوس ہوا جیسے وقت تھم گیا ہو۔ وہ دن میری زندگی کا حاصل ہے، جسے

شاید میں کبھی نہ بھول سکوں۔ یہ میرا دعویٰ ہے! اور شاید اگر کسی حادثے میں میری یادداشت کو نقصان پہنچ جائے تو بھی ان کا نقش ان کی محبت میرے دل میرے ذہن سے فنا نہ ہو سکے گی۔ محترم ابن صفی ایک معصوم شاعر تھے جنہوں نے جاسوسی ادب کو اپنا کر ہم پر احسان عظیم کیا۔ ان سے ملاقات سے پہلے میری سوچوں کے عکس میں ان کی شبیہہ یہ تھی کہ وہ بھی ''فادر ہارڈ اسٹون'' کی طرح ناقابل شکست اور علی عمران کی طرح لافانی ہوں گے مگر وہ تو دوسروں کے سے ایک کمزور انسان نکلے۔ موت کے سامنے لاچار بے بس مجبور ان سے ملاقات کرتے وقت میں بے حد مرعوب اور خوفزدہ تھی کہ میں ان سے ملنے جارہی ہوں جو بہت اونچے اور بلند مرتبے کے انسان ہیں جنہوں نے فریدی عمران صفدر حمید طاہر انور روشی جولیانا جوزف جیمسن قاسم سلیمان جیسے محبوب اور علامتی کرداروں کو جنم دیا پھر تھریسیا سنگ ہی جابر جیرالڈ شاستری بوغا نانوتہ ریما ڈاکٹر سلیمان سر بنتھال ڈاکٹر فارنگ گارساں فنچ کے علاوہ دوسرے ایسے کردار تخلیق کیے جن کی ریشہ دوانیاں قاری کو ان سے نفرت پر مجبور کر دیں مگر پھر وہ پڑھنا بھی انہی کرداروں کو چاہیں پھر طلسم ہوشربا سے بڑھ کر ''زیرولینڈ'' اور ہوشربا تاریک وادی کی بنیاد ڈالی۔ میرا خیال تھا کہ وہ بھی جنگجو غصہ ور اور سرخ سرخ آنکھوں والے کوئی انسان ہوں گے مگر وہ تو اتنے حلیم شفیق منکسر المزاج معصوم اور خاموش طبع نظر آئے کہ انہیں دیکھ کر میں مبہوت رہ گئی نہ کسی قسم کا غرور نہ خود پسندی اور خودنمائی اور نہ ہی اپنے مشہور ہونے کا تکبر مجھے ان کے دھیمے دھیمے خوبصورت انداز گویائی میں وہ شیریں الفاظ آج بھی یاد ہیں جو انہوں نے میرے سر پر شفقت بھرے ہاتھ رکھ کر کہے تھے اور مجھے بیٹی کہا تھا آج...... آج میں روحانی طور پر یتیم و یسیر ہو گئی ہوں۔ آج ۲۷ جولائی کو مجھے خبر ملی ہے کہ وہ اس جہاں سے رخصت ہو گئے جن کے دم سے رونق تھی۔ محفل جن کے دم سے رواں دواں تھی۔

میری آٹوگراف بک پر ان کی خوبصورت تحریر اشکوں سے پر آنکھوں سے بھی صاف نظر آ رہی ہے۔

احساس کمتری شخصیت کے لیے سم قاتل سے کم نہیں۔

میری محبت کبھی اتنی شدید نہیں ہو سکتی کہ میں اسے اپنی انا پر ترجیح دے سکوں۔

آدمی سنجیدہ ہو کر کیا کرے جبکہ وہ جانتا ہے کہ ایک دن اسے اپنی سنجیدگی سمیت دفن ہو جانا ہے۔

قہقہہ دراصل وہی ہے جو آنسوؤں کے سمندر میں تیرتا ہوا لبوں تک آتا ہے۔ اور پھر یہ کہ!

کسی کے مرنے کا غم اسے ہونا چاہیے جسے خود نہ مرنا ہو

اب میں انہیں کیسے بتاؤں کہ کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جن کے اس جہاں سے چلے جانے پر انسان تو انسان پوری کائنات پر سوگ طاری ہو جاتا ہے پھر آپ کے مداح کیسے نہ آنسو بہائیں۔ غم کا انداز اشک شوئی اور مسرت کا اظہار مسکراہٹ ہے۔

یہ بھی درست ہے کہ

بالآخر تھک ہار کے یارو ہم نے بھی تسلیم کیا!!

اپنی ذات سے عشق۔ ہے سچا باقی سب افسانے ہیں

آپ کا یہ شعر بھی اس وقت آنسوؤں میں ڈوبا نظر آ رہا ہے۔ وہ چلے گئے مگر اپنی نادر تحریروں اور عالمی ادب کے روشن کرداروں کی بدولت نہیں بین الاقوامی سطح پر کھڑا کر گئے۔ ان کی عظمت میں کوئی شک وشبہ نہیں۔ یہی کیا کم ہے کہ آج ان کے کردار بہت سے اناڑیوں کا پیٹ بھر رہے ہیں۔ نئے لکھنے والے ان کے ناولوں سے اصلاح لیتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ۔

ہمت مجھ میں اعتراف کی نہیں

اس کے علاوہ ایک ناول ''طوفان کا اغوا'' میں انہوں نے ایک مشینی آدمی (فولادی) کا تخیلاتی تصور پیش کیا تھا۔ اس کے تقریباً دس سال بعد روسیوں نے اس تصور کو حقیقت بنا دیا۔ اس کے بالکل وہی فنکشن تھے جو ''طوفان کا اغوا'' میں محترم ابن صفی صاحب نے بتائے تھے۔

محترم ابن صفی کے جانے سے اردو ادب کا ایک شاندار اور تاریخ ساز باب تمام ہوا۔ ایک ویرانی ہے جو وہ چھوڑ گئے ہیں اس لیے کیوں نہ روؤں آنسو نہ بہاؤں' کیوں خدا سے احتجاج نہ کروں' اگر یہ سب نہیں بھی تو یہ ابدی جدائی زندگی کے ہر موڑ پر بھاری ہے۔ آج وہ ہم میں نہیں مگر من کی آتما نہیں مانتی' وہ تو آج بھی اسی احساس کے ساتھ ہے جیسے ان کی حیات میں تھی ان کی شوخ تحریریں ایسی تھیں جیسے وہ مسکراہٹوں کی سوغات لٹا رہے ہیں اور اب ان کی یادیں آنسو بن کر روح کی تاریک گہرائیوں میں اترتی سی لگتی ہیں۔ علم وادب کا وہ چمکتا سورج جس کا ذہنی نور ہمارے مجبوں ذہنوں کو منور کرتا تھا وہ ہمیشہ کے لیے کہیں جا چھپا ہے۔ ان کی تحریر شوخی وطنز کا لطیف اور کٹیلا امتزاج ہے۔ برجستہ و بے ساختہ جملوں کا سیل رواں جاری ہے۔ دنیا کی کسی زبان کا سری ادب ابن صفی جیسا قلمکار نہیں پیدا کر سکا۔ ان کی اضافی خصوصیت اس میں مزاح کا ملاپ ہے۔ وہ اس صنف سخن کے بے تاج بادشاہ ہیں اور ان تک پہنچنے والا کوئی نہیں' لیکن اب جاسوسی ادب کا چاند گھٹا ٹوپ بادلوں کی اوٹ میں چھپ گیا' عارضی نہیں مستقل ان کی عظمت کے اعتراف اور عقیدت کے خراج میں یہ چند آنسو چند آہیں جو میری روح کی گہرائیوں سے نکل رہی ہیں' بے حد مختصر ہیں۔ اب مجھے ان کی سمندر جیسی گہری اور بے کراں زندگی' نشیب وفراز' تلاطم'......ہی نظر آ رہا ہے۔ ان کی سنجیدہ سنجیدہ تصویر جس میں وہ گہری سوچ میں ڈوبے ہیں میرے پاس موجود ہے' اور یک بیک یہ شعر یاد آ رہے ہیں جو شاید حضرت اسرار! محترم ابن صفی نے اپنے لیے ہی کہے ہیں۔

مدتوں ذہن میں گونجوں گا سوالوں کی طرح
تجھ کو یاد آؤں گا گزرے ہوئے سالوں کی طرح
ڈوب جائے گا کسی روز جو خورشید انا!
مجھ کو دہراؤ گے محفل میں مثالوں کی طرح !

میری ڈائری کا یہ ورق ہمیشہ میری نگاہوں میں تاریکیاں' تنہائیاں بکھیرتا رہے گا۔ مجھے محترم ابن صفی سدا

یاد رہیں گے اور زندگی ختم ہو جائے گی، تمام ہو جائے گی کیونکہ!
......عزرائیل نے کسی کو بھی نہیں چھوڑنا......

ساحرہ سحر......۲۷ جولائی ۱۹۸۰ء

آج سے تقریباً ساٹھ برس قبل الٰہ آباد کے ایک چھوٹے سے گاؤں 'نارہ' میں صفی اللہ صاحب کے یہاں ایک بچہ پیدا ہوا جس کا نام نیک اسرار احمد رکھا گیا۔ اس وقت ماں باپ اور دوسرے عزیزوں کو کیا معلوم تھا کہ جس بچے کا نام وہ اسرار رکھ رہے ہیں آگے چل کر وہ اس نام کو اپنے قلم کا عنوان بنالے گا اور اسرار و رموز کی دنیا میں اپنی تخلیقات کے ایسے چراغ روشن کرے گا جو برصغیر کے سری ادب میں ہمیشہ درخشاں رہیں گے۔

محترم ابن صفی نے ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں کے پرائمری اسکول میں حاصل کی اور پھر مزید تعلیم حاصل کرنے کے لیے اپنی والدہ اور بہن کے ساتھ الٰہ آباد آ گئے۔ ان کے والد اپنی ملازمت کے سلسلے میں عموماً باہر ہی رہتے تھے۔ محترم ابن صفی کی تمام صلاحیتیں انہیں والدہ کی طرف سے وراثت میں ملی تھیں۔ ان کے ننھیال میں اہل تصنیف بھی گزرے ہیں۔ ان کے پرنانا نے متعدد کتابیں طب یونانی پر لکھی تھیں۔ اس کے علاوہ وہ بہت اچھا اور اعلیٰ علمی ذوق رکھتے تھے۔ گھر میں کتابوں کا انبار لگا رہتا تھا۔ محترم ابن صفی نے کتابوں کے درمیان ہی آنکھیں کھولی تھیں اس لیے بچپن سے ہی کتابوں سے لگاؤ تھا۔ اسے وہ اپنی زبان شگفتہ میں اس طرح بیان کرتے ہیں۔

سورج غروب ہوتے ہی سالخوردہ محرابوں میں ابابیلیں بسیرا لینے لگتیں اور مجھے ایسا محسوس ہوتا کہ جیسے اب باغ سیب میں افراسیاب کی محفل جمے گی اور چالاک بن عمرو، ملکہ حیرت کی کسی کنیز کے بھیس میں اس کی سواری کے ہمراہ اس محفل میں در آئے گا۔ میں گھنٹوں طلسم ہوشربا کے کرداروں کے بارے میں سوچتا رہتا۔ سات آٹھ سال کی عمر میں طلسم ہوشربا کی ساتوں جلدیں پڑھ ڈالی تھیں۔ خواجہ عمرو کے شاگردوں میں برق فرنگی میرا پسندیدہ کردار تھا اور میری خواہش تھی کاش چالاک بن عمرو کی بجائے برق فرنگی ملکہ حیرت پر عاشق ہوتا۔ پتا نہیں کیوں چالاک بن عمرو مجھے کچھ مولوی، مولوی سا لگتا تھا۔

وہ ایک بھرا پرا قصبہ تھا جہاں میں نے آنکھیں کھولی تھیں۔ خوشحال زمینداروں کی بستی تھی ہر طرف فرصت نظر آتی۔ تاش، شطرنج اور گنجفے کی بازیاں جمتیں، کچھ لوگ سیر و شکار سے جی بہلاتے، بعض گھرانے ایسے بھی تھے جہاں زیادہ تر علم و ادب کے چرچے رہتے۔ والد حضور کو مطالعے سے دلچسپی تھی لہٰذا گھر میں ناولوں اور قدیم داستانوں کے ڈھیر لگے ہوئے تھے لیکن مجھے اجازت نہیں تھی کہ ان کو ہاتھ بھی لگاؤں، بس چوری چھپے کوئی کتاب کھسکائی اور ظاہر کرتے ہوئے کہ کھیلنے جا رہا ہوں چھت پر ہولیا۔ سارا سارا دن گزر جاتا آخر ایک دن پکڑا گیا اور والدین میں ٹھن گئی لیکن فیصلہ میرے ہی حق میں ہوا۔ والدہ نے کہا ان بچوں سے تو بہتر ہی ہے جو دن بھر گلی میں گلی ڈنڈا یا گولیاں کھیلتے پھرتے ہیں۔ پھر اس دن سے کوئی روک ٹوک نہیں ہوئی اور میں داستانوں میں ڈوبا رہا۔

آ گے چل کر لکھتے ہیں۔

بہر حال شہر آئے، کچھ دنوں کے لیے مطالعے کا سلسلہ منقطع ہوگیا۔ کتابوں کے ڈھیر گاؤں میں رہ گئے۔ اسکول سے واپس آ کر بڑی الجھن میں مبتلا رہتا پھر ہوائی قلعے بننے لگتے اور خود کو طلسم ہوشربا کی حدود میں پاتا۔ کسی مظلوم جادوگرنی کے لیے کوئی کارنامہ سرانجام دے کر اس کی آنکھوں کا تارا بنتا اور اس کی مدد سے پورا مطبع و کتب خانہ منشی نول کشور کا اٹھوا منگاتا۔ دن گزرتے رہے اور میں سوچتا رہا کہ شہر تو بڑی واہیات جگہ ہوتی ہے جہاں ڈھیروں پیسے نہ ہوں تو آدمی مطالعے کو بھی ترس جائے۔ اس طرح رائیڈر ہیگرڈ نے میرے کچے ذہن پر تسلط جمایا۔ طلسم ہوشربا اور رائیڈر ہیگرڈ کے تاثرات نے آپس میں گڈمڈ ہو کر میرے لیے ایک عجیب سی ذہنی فضا مہیا کر دی تھی جس میں میں ہر وقت ڈوبا رہتا۔ ایسے ایسے خواب دیکھتا کہ بس، خواب اور مطالعے کا سلسلہ جاری رہا۔

محترم ابن صفی صرف ایک بلند پایہ ادیب و شاعر ہی نہیں تھے بلکہ وہ بہترین انسان و دوستوں کے بہترین دوست اور انتہائی ذمہ دار شریف اور وضع دار شخص تھے۔ ان کے ہونٹوں پر رقصاں پر خلوص تبسم ان کے حسن کردار کا اعلان کرتا تھا۔ ان کے سینے میں ایک پرنور دل دھڑکتا تھا جو ہر شخص کے دکھ درد کو فوراً محسوس کر لیا کرتا تھا۔

لکھنے کی ابتدا اس طرح ہوئی کہ ساتویں جماعت میں تھے اس وقت ایک کہانی ان کے ذہنی تخیل سے لفظی پیراہن اوڑھ کر وجود میں آ گئی۔ یہ کہانی انہوں نے ہفت روزہ ''شاہد'' بمبئی میں بھیج دی۔ عادل رشید اس جریدے کے مدیر تھے۔ اس کہانی نے عادل رشید کو اتنا متاثر کیا کہ انہوں نے ہفت روزہ میں کہانی لگاتے وقت محترم ابن صفی کا نام کچھ اس طرح لکھا۔

نتیجہ فکر مصور جذبات حضرت اسرار ناروی۔

پھر ان کی کہانیاں ''شاہد ویکلی'' میں چھپتی رہیں۔ زیادہ تر رومانی کہانیاں تھیں پھر جب میٹرک میں تھے تو اچھی خاصی شاعری شروع کر دی۔ انہی دنوں ''ہندوستان چھوڑو'' تحریک شروع ہو چکی تھی۔ انہوں نے اس ضمن میں ایک بہت ہی اچھی انقلابی نظم کہی تھی جو کافی مشہور ہوئی تھی۔

وہ دیکھو افق کے سینے پر لہرائے شہیدوں کے دامن
پھر باندھے سروں سے اپنے کفن نکلے ہیں فرزندان وطن
بن جائے گا لالہ زار وطن کچھ دیر میں شہداء کا مدفن
خاموش وطن کی تم کو قسم للہ نہ روکو جانے دو۔
گر راہِ وفا میں کام آؤں سیندور سے مانگ بھرے رہنا
بندی نہ مٹانا ماتھے کی تم میری راہ تکتے رہنا!!
میں خواب مین اکثر آؤں گا سینے مین آس رکھے رہنا

اب چھوڑ بھی دو میرا دامن اللہ نہ روکو جانے دو

محترم ابن صفی کی ادبی زندگی کا آغاز شاعری سے ہوا اور اس میدان میں بھی انہوں نے اپنی ذہانت اور انفرادیت کی تابناک شمعیں روشن کی ہیں۔ ان کے کلام میں ایک چاشنی ہے۔ غزلوں میں کیفیات واحساسات کے تانے بانے کچھ اتنی خوبصورتی اور مہارت کے ساتھ بنے گئے ہیں کہ دل بے اختیار داد دینے کو چاہتا ہے۔

اُچٹی ہے جو نیند پچھلی شب سے
بیٹھا ہوں اُداس جانے کب سے
سونے کو ترس ترس گیا ہوں
دیکھا ہے وہ خواب میں نے جب سے
آنکھوں میں پڑھو جو پڑھ سکو
وہ بات نہ سن سکو گے لب سے

اور پھر......

ملک طرب کے رہنے والو یہ کیسی مجبوری ہے!
ہونٹوں کی بستی میں چراغاں دل کے نگر اتنے سنسان

سری ادب کی شاہراہ پر انہوں نے اپنی تخیلاتی گاڑی ۱۹۵۲ء میں ڈالی کہ عباس حسینی صاحب نے ایک ماہنامے کا اجراء بنام 'نکہت' کیا جس کے لیے ابن صفی صاحب نے "طغرل فرغان" اور "عقرب بہارستانی" کے نام سے طنزیہ مضامین لکھے۔ طنز و مزاح سے یاد پڑتا ہے کہ اس بساط ادب میں بھی انہوں نے بہت سے لکھنے والوں کو مات کیا اور جادو اثر تحریروں سے لوگوں پر سحر طاری کیا مگر یہاں بھی ذاتیات اور خوش فہمیاں عروج پر تھیں۔ آج ہم شوکت تھانوی، مشتاق یوسفی، شفیق الرحمان، رشید صدیقی اور پطرس کا ذکر تو بڑے فخر سے کرتے ہیں مگر یہ بڑا نام یہاں بھی ہمیں دکھائی نہیں دیتا تو ہم نادم ہو کر اس نام کی طرف سے اپنی شکل ہٹا لیتے ہیں آج اردو نصاب میں غالب، مومن، پطرس، رشید تو ملیں گے مگر محترم ابن صفی صاحب کے لیے ایک صفحہ بھی نہیں ملے گا۔

بھرحال بے شمار طنزیہ مضامین لکھے۔ جاسوسی ناول لکھنے کا آغاز اس طرح ہوا کہ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ اردو میں جنسی کہانیاں ہی بک سکتی ہیں۔ محترم ابن صفی اس بات سے متفق نہ ہوئے، یوں عباس حسینی نے جاسوسی ماہنامے کی داغ بیل ڈالی، اس کے لیے عباس صاحب نے راہی صاحب (ڈاکٹر راہی معصوم رضا، مشہور فلمی مصنف اور ڈائیلاگ رائٹر) کو منتخب کیا لیکن محترم ابن صفی نے وکٹر گن کے ایک ناول سے مدد لے کر "دلیر مجرم" تیار کیا۔ اس کے نمایاں کردار انسپکٹر فریدی اور سارجنٹ حمید ان کا اپنا تخیل تھے پھر تو سلسلہ چل نکلا اور ۱۹۸۰ء تک چلتا رہا۔ درمیان میں تین سال کے لیے ناسازی طبیعت کی وجہ سے محترم کوئی کتاب نہ لکھ سکے۔ تین سال لوگوں کے لیے تین ہزار سال ثابت ہوئے اور پھر، بیماری سے اٹھنے کے باوجود انہوں نے فوراً

لکھنا شروع کر دیا۔ ڈیڑھ متوالے' کا فقید المثال ایڈیشن لوگوں کو اب بھی یاد ہوگا۔ کتابی دنیا میں ایسا شاید ہی ہوا ہو یعنی ایک ہفتے میں دو ایڈیشن اور تیسرے کی تیاری...... شاید ہی کوئی ناول نگار ہو جس کا ناول اس طرح ہاتھوں ہاتھ لیا گیا ہو۔ کل دو سو چھیالیس ناولز میں سے آٹھ ایسے تھے جس میں کسی نہ کسی طرح انگلش ناول سے مدد لینی پڑی ہو ورنہ باقی سب ہر قسم کی ملاوٹ سے مبرا تھے۔ خالص آپ کی اپنی ذاتی کاوش، یعنی دو سو چھیالیس میں آٹھ ملاوٹ شدہ باقی ان کے اپنے اور یجنل، پھر آخر ادب کے نام نہاد تاجدار یہ کیوں کہتے ہیں کہ انہوں نے ادب کی خدمت نہیں کی۔ بس انہوں نے وہ کچھ نہیں کیا جو چند ہاتھوں کے گرد گھومتا ہے۔ چند افلاطونی باتیں اور ایک ہزاری ایڈیشن کے قائل نہ تھے۔ تفریح تفریح میں چند کام کی باتیں بتا دینا ہی ان کا طرہ امتیاز تھا۔ ہمارے خیال میں انہوں نے ادب کی بہت بڑی خدمت کی ہے۔ ادب میں ان کا بہت بڑا مقام ہے اتنا بلند کہ وہاں تک پہنچنا شاید کم کم کو ہی نصیب ہوتا ہے۔

ان کے چاہنے والوں کی عجیب ترین فرمائشوں میں سے ایک یہ بھی تھی کہ ادبی انعام کے لیے کوشش کیوں نہیں کرتے' ان کا جواب ہمیشہ یہی ہوتا۔

''میرا سب سے بڑا انعام یہی ہے کہ آپ لوگ میری کتابیں پسند کرتے ہیں' انہیں حرف بحرف اس طرح پڑھتے ہیں کہ بعض عبارتیں از بر ہو جاتی ہیں اور آپ بے تکان ان کے حوالے اپنے خطوط میں دیتے ہیں اور مجھے متعدد کتابیں الٹنی پڑتی ہیں کہ میں نے یہ چیز کب اور کہاں لکھی تھی۔ ویسے ایک بات ہے آپ کسی ''پبلک فنڈ'' سے کوئی ایسا ادارہ قائم کیجیے جو اچھی ادبی تخلیقات پر انعام دے سکے تو میں اس کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا دوں گا کیونکہ اس کی نوعیت ''قومی'' ہوگی لیکن شخصی انعام کا تصور بھی میرے لیے توہین آمیز ہے۔

ایک دوسری جگہ رقمطراز ہیں۔

اور ہاں اس خیال کو دل سے نکال دیجیے کہ میں اپنے ہی جیسے کسی انسان سے انعام کا خواہاں ہوں اس کا تصور بھی مجھے احساس کمتری کے گڑھے میں دھکیل دے گا' میرے لیے میرے اللہ کا یہی انعام کافی ہے کہ کتاب فروش میری کتابوں کو کرنسی نوٹ کہتے ہیں۔

یہی کیا کم ہے کہ ابن صفی صاحب کے ناول پڑھنے کے لیے بہت لوگوں نے اردو زبان سیکھی۔ اردو کی اس سے بڑی خدمت اور کیا ہوگی۔ جب ہی تو بابائے اردو نے ابن صفی صاحب کے لیے کہا تھا ''ابن صفی نے اردو کی بہت خدمت کی ہے۔''

اپنے ایک ناول ''پیاسا سمندر'' میں وہ تحریر کرتے ہیں۔ ''جانتی ہو آدمیت کی معراج کیا ہے! آدمی کی معراج یہ ہے کہ وہ اپنے مسائل خود حل کرے۔ اگر اس نے مصنوعی سیارہ خلا میں پھینکنے کی بجائے سرطان کا کامیاب علاج دریافت کر لیا ہوتا تو میں سمجھتا کہ اب اس کے قدم اس راہ کی طرف اٹھ گئے ہیں جس کی انتہا اس کی معراج ہوگی' مگر اس نے چاند تک پہنچنے کی اسکیم بنانے کے بجائے زمین کے ہنگامے پر امن طور پر فرو کرنے کا کوئی ذریعہ دریافت کر لیا ہوتا تو میں سمجھتا کہ اب سمندر پیاسا نہیں رہے گا بلکہ خود بھی سیراب کرنے

کی صلاحیت اس میں پیدا ہو چکی ہے۔''

ان کی عظمت کے بیان کے لیے سینکڑوں صفحات پر سندر موتیوں کی مالا پروئی جاسکتی ہے۔ محترم ابن صفی ڈھائی سو جاسوسی کتب کے علاوہ دوسری مختلف کتب اور ان گنت مضامین کے خالق ہیں ان کے یہاں زبردست طنز ملتا ہے جو نام نہاد شریفوں کو ننگا کر کے رکھ دے مثلاً ان کا ایک طنزیہ بنام ''ڈپلومیٹ مرغ'' تھا۔ اس میں ایک جگہ فرماتے ہیں۔

ڈپلومیسی کا بانی اور خالق شیطان الرجیم تھا۔ سجدے سے نکار اس لیے کیا تھا کہ خاک کے پتلے کو حقیر سمجھا تھا لیکن اللہ پاک کو یہ باور کرانے کی کوشش کی تھی کہ وہ موحد اعظم ہے اس کے علاوہ اور کسی کو سجدہ نہیں کر سکتا ہے۔

ان کا عہد زریں جو حصول آزادی کے وقت شروع ہوا تھا تقریباً تیس برسوں پر محیط ہے۔ اس دوران انہوں نے لاتعداد لوگوں کو متاثر کیا ان کی تخلیق کردہ مسحور کن شخصیات' ہزاروں کی نہیں بلکہ لاکھوں کروڑوں انسانوں کی آئیڈیل کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان کرداروں کے نام خاص وعام میں مشہور ہو چکے ہیں۔ لوگ بڑی محنت بڑی آرزوؤں کے ساتھ اپنے بیٹوں کے نام فریدی' عمران' حمید' صفدر' رکھتے ہیں۔

ان کے کچھ کرداروں نے ایک دو ناول کے بعد ہی ایسا گہرا تاثر پڑھنے والوں پر قائم کیا کہ قارئین نے ان سے دوبارہ ملاقات کی آرزو کی مثلاً ''طوفان کا اغوا'' والی نیلم جو حمید کو ''بابا'' اس وقت بھی کہتی ہے جب وہ کسی حسین ترین لڑکی یا حمید کی اپنی لغت کے لحاظ سے ''یلا یلی'' کے ساتھ بیٹھا ہوتا ہے۔ اس وقت حمید کے پاس سر پیٹنے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہتا' پھر ''لاشوں کا آبشار'' کی کنول کو بھی لوگ اب تک نہیں بھولے۔ صفدر کو زچ کر دینے والی گرٹروڈ بھی یاد ہے انہیں۔ ایسے اور بھی بہت سے کردار ہیں' محترم ابن صفی نے اپنی تحریروں کے ذریعے بہت سوں کی زندگی کے رخ تبدیل کیے ہیں۔ انداز فکر تبدیل کر ڈالا ہے اور ان کی تخریبی سوچ تعمیر کی طرف مائل ہو گئی۔

کیا محترم ابن صفی صاحب اس دنیائے فانی سے رخصت ہو گئے' یہ ایک ایسا سوال ہے جو ہماری آنکھوں کو اشکوں سے بھگو دیتا ہے پھر ایسے لوگ جب بھی یاد آئیں تو آنکھیں اشکوں سے بھیگیں نہ تو کیا کریں۔ انہوں نے خود کہا تھا۔

ابھی سے کیوں شام ہو رہی ہے
ابھی تو جینے کا حوصلہ ہے !

مگر شاید ان کا وقت آ گیا تھا۔ وہ لوگ جنہیں قلم چلانا آتا ہے' وہ محترم ابن صفی سے اپنے تعلق خاطر اور وابستگی کے اظہار کے لیے لکھتے رہیں گے لیکن مجھ جیسے کروڑوں گمنام چاہنے والوں کا کیا ہوگا جن سے ان کا ناتا صرف کتاب کی صورت میں' تحریر کی شکل میں تھا' ان کی ہر کتاب اپنی جگہ شاندار ترین ہے۔ ہر کتاب میں ایک نیا مسئلہ ہے' دنیا کا ایسا کوئی مسئلہ نہیں جو انہوں نے ناول میں پیش نہیں کیا۔ ناولز کے ناموں کی ندرت بھی تو دیکھیے' لاشوں کا آبشار' چیختے دریچے' ہولناک ویرانے' پیاسا سمندر' کالے چراغ' لاشوں کا بازار'

دشمنوں کا شہر، زمین کے بادل اور دوسرے تمام نام ایک الگ حیثیت رکھتے ہیں۔ پورا طلسم ہوشربا پنہاں ہے ان میں۔

اب زیرو لینڈ کے راز سے پردہ کون ہٹائے گا؟

کون ہے جو فریدی کی ذہنی پاکٹ سے جیرالڈ شاستری جیسے مجرم نکلوائے گا؟

علی عمران کی حماقتیں کیا اسی طرح جاری رہیں گی؟

حمید اور شہناز کا کیا بنے گا؟

حمید اسی طرح تشبیہات ایجاد کر سکے گا؟

صفدر اسی دھن سے کام کر سکے گا؟

کیا قاسم اسی طرح چپاتی بیگم کو کوسے گا اور عاصم صاحب سے ڈنڈے کھائے گا؟

کیا اب بھی اسے یلا ایلیوں اور فل فلوٹیوں کی تلاش رہے گی؟

تھریسیا اور جولیا کی یکطرفہ عمران سے محبت کا انجام کیا ہوگا؟

ایکسٹو کا راز کب فاش ہوگا؟

کرنل فریدی کی بلیک فورس کب سامنے آئے گی؟

اب یہ سب خواب ہی ہیں کیونکہ یہ سب تو ان کے ساتھ لحد میں چلا گیا۔ نئے لکھنے والے کہاں اتنی طاقت رکھتے ہیں کہ اس خوبی سے واقعات بیان کر سکیں۔ وقت کا مرہم ہر زخم کو مندمل کر دے گا۔ یادیں ماضی رفتہ کے دھندلکوں میں معدوم ہوتی جائیں گی۔ چراغ سحری بجھتے رہیں گے، نئے دیئے روشن ہوں گے۔ نئی تابانیاں بکھریں گی لیکن مجھے اور میرے ساتھ اور بہت سے لوگوں کو ان چراغوں کا انتظار رہے گا جو ابن صفی صاحب کے چلے جانے سے چھانے والے اندھیروں میں روشنی کی کرنیں پھیلا سکیں گے لیکن......

انتظار، انتظار ہی رہے گا اور ہم سب ختم ہو جائیں گے۔

زندہ رہنے کے لیے کھال پر کتنی تہیں چڑھانی پڑتی ہیں، یہ اور بات ہے کہ روح کی کراہ قہقہوں سے بھی جھانکتی ہے۔

"جو کہہ گئے وہی ٹھہرا ہمارا فن اسرار
جو کہہ نہ پائے نہ جانے وہ چیز کیا ہوتی"

اسرار ناروی

محمد احسن بٹ

آج سے ترپین سال قبل الٰہ آباد کے ایک چھوٹے سے گاؤں ''نارہ'' میں صفی اللہ صاحب کے یہاں ایک بچہ پیدا ہوا تھا جس کا نام ''اسرار احمد'' رکھا گیا۔

اسرار ناروی نے ابتدائی تعلیمات قصبہ نارہ میں حاصل کیں۔ پھر انہوں نے ایونگ کرسچین کالج سے انٹرمیڈیٹ کیا اور بعد ازاں آگرہ یونیورسٹی سے بی۔ اے کیا۔ ان کا گھریلو ماحول بڑا علمی اور ادبی قسم کا تھا 'گھر میں قدیم داستانی' الف لیلوی' طلسماتی ادب سے لے کر' طب' فلسفہ' مذہب اور شاعری کی کتب کی آمدورفت تھی۔ انہوں نے سات آٹھ برس کی عمر میں طلسم ہوش ربا' کی ساتوں جلدیں پڑھ ڈالیں۔ وہ خود لکھتے ہیں کہ انہوں نے بچپن ہی میں مطالعہ کے بے حد شوق کی بنا پر اپنی عمر سے بڑی کتب چاٹ ڈالیں۔

ان کی شعری زندگی کا آغاز بڑے ولولہ انگیز اور جوش پرور ماحول سے ہوا۔ جغرافیہ بتاتا ہے کہ زمین کے نیچے انتہائی گرم لاوا بھاگتا پھرتا ہے اور قید سے نکلنے کی سعی کرتا رہتا ہے اور آخر کار زبردست دھماکے' آگ دھوئیں اور زلزلے کے ساتھ پھٹ پڑتا ہے۔ اسرار ناروی کے دل و دماغ میں بھی جذبات و فکر کا جوالا مکھی دہک رہا تھا اور جب فرنگی راج کے خلاف ہندوستان کے طول و عرض میں پے در پے آتش فشاں پھٹنے لگے تو قصبہ' نارہ' کے اسرار احمد کا برسوں سے دہکنے والا جوالا مکھی بھی اسرار ناروی بن کر پھٹ پڑا۔

اب چھوڑ بھی دو میرا دامن للہ نہ روکو جانے دو

کہتا ہوا اسرار ناروی اپنی محبوبہ کو دلاسا دیتے ہوئے شہادت کے لیے' وطن کی آزادی کے لیے' اپنی ایک محبت قربان کر کے ہزاروں محبتوں کو دوام بخشنے کے لیے روانہ ہوتا ہے اور کس شان سے روانہ ہوتا ہے۔

اب چھوڑ بھی دو میرا دامن للہ نہ روکو جانے دو
وہ دیکھو افق کے سینے پر لہرائے شہیدوں کے دامن
بن جائے گا لالہ زار وطن کچھ دیر میں شہدا کا مدفن
گر راہ وفا میں کام آؤں' سیندور سے مانگ بھرے رہنا
بندی نہ مٹانا ماتھے کی' تم میری راہ تکے رہنا
میں خواب میں اکثر آؤں گا سینے میں آس رکھے رہنا
اب چھوڑ بھی دو میرا دامن للہ نہ روکو جانے دو!

اس ایک بند سے ہمیں تاریخ ہندوستان' تاریخ اسلام اور تاریخ پاکستان کے اس زریں باب' عہد شہادت اور ولولہ و جرات اور آزادی کی تڑپ شعور کی لپک' جذبوں کی دہک کا علم ہوتا ہے کہ ہندوستان کے

طول اور عرض میں مسلمانوں کے دلوں میں اللہ نے کیسا خون بھر دیا تھا جس میں آگ ہی آگ تھی۔ جوش ایمانی، جذبہ مسلمانی، قوت یزدانی سے بھڑکی آگ، پاکستان، وہی پاک سرزمین، وہی اخوت عوام کا مرکز، وہی پاک سندھ، سرحد اور بلوچستان، کشمیر، پنجاب اور بنگال کا پاکستان۔

سفر جاری رہا، کارواں بڑھتا رہا۔ ایک نئی منزل ملی تو سفر ختم ہو گیا لیکن حبس بڑھتا رہا۔ فضائیں دھواں دھواں ہونے لگیں اور اس کا ردعمل یا اظہار اسرار کے یہاں اس طرح سے ہوا۔

تم سمجھتے ہو کہ ہے تختۂ گل میرا جہاں
وہ گھٹن ہے کہ مجھے سانس بھی لینا محال ہے

قیام پاکستان کے بعد پے در پے اس طرح کے ہولناک واقعات پیش آئے کہ پاکستان بنانے والوں کے تصورات ٹوٹ گئے۔ وہ جو خوش رنگ خواب بنے گئے تھے، چھن سے ٹوٹ گئے۔ پاکستان میں تو آ کے احساس ہوا کہ راستہ ہی کھو گیا ہے لیکن وہ اسی کو اپنی منزل سمجھے ہوئے تھے۔ بھٹک گئے تو خود بھی حیران تھے۔

اسی جگہ کیوں بھٹک رہا ہوں
اگر یہی گھر کا راستہ ہے

گھر، جو علامت ہے سکون آرام، پناہ، حفاظت، اور محبت و اخوت کی لیکن اگر 'گھر' کے مکین ہی ایک دوسرے سے مخلص نہ ہوں تو 'گھر' کے بٹوارے ہو جاتے ہیں۔

اسرار نے 'گھر' کی علامت کو بھی استعمال کیا ہے۔

گھر بنانا بھی اسیری ہی تو کہلائے گا
خود کو آزاد سمجھتا ہے تو یہ روگ نہ پال

اگر 'گھر' کی دیواریں اونچی اور بے زبان ہوں تو 'گھر' قفس بن جاتا ہے اور انسان کو روگ بن کر چمٹ جاتا ہے۔ ایک آزاد رو، فطرت پرست و جمال پسند کے لیے وہ گھر قفس ہی ہے، جہاں اس کے بولنے، چلنے، گھومنے، کھانے، پہننے، سونے، حتیٰ کہ پڑھنے اور لکھنے تک پر پابندی ہو۔

یہ اسرار کی ذاتی واردات ہے جو سب کے لیے داستان عبرت بن چکی ہے۔ اسرار نے دھوکے کھائے، فریب سہے، یاروں کی کج ادائی، اور اپنوں کی بیوفائی سہی، خلوص و ایثار کا دامن تھامے ہوئے ہر شکستہ انسان کی خدمت کی۔ اسے سہارا دیا، جینے کا حوصلہ بخشا، آستین کے سانپ پالے، ڈسے جانے کے بعد خدا سے بزبان خامشی احتجاج کیا، انصاف طلب کیا اور پھر ڈسے جانے کو تیار ہو گیا۔

شمار زخم ہائے دل کہاں تک
حساب دوستاں ہے اور ہم ہیں

انسان کو اگر عشق ہے تو صرف اپنی ذات سے باقی تو سب افسانہ! کیا لیلیٰ کیا شیریں، کیا قیس اور کیا

فرہاد! کیا امریکہ کی دوستی اور کیا روس' فرانس کی ہمدردی' سب کے سب افسانے' جن کے تانے بانے سب ہی تارِ عنکبوت' سب فریب' دھوکا' دام ہم رنگ زمیں' انسان کو تھک ہار کے یہ تسلیم کرنا ہی پڑتا ہے' کوئی ثابت قدم رہتا ہے اور کوئی نیکی و بدی کے درمیان حدِ فاصل عبور کر جاتا ہے۔ بظاہر اس دور میں سچا عشق اپنی ذات ہی سے ہے۔ اسرار بھی یہ بات تسلیم کرتے ہیں۔

بالآخر تھک ہار کے یارو ہم نے یہ تسلیم کیا
اپنی ذات سے عشق ہے سچا باقی سب افسانے ہیں

شاعری کی روایات میں عاشقی بھی شامل ہے بلکہ شاعری کی بنا ہی عاشقی ہے۔ اردو شاعری اول تا موجودہ عہد عشق سنگین و دل نشین وارداتوں سے عبارت ہے۔ کہیں میر کی آہیں تو کہیں غالب کی انا' کہیں شیفتہ کی شیفتگی اور کہیں آتش کی شعلہ بیانیاں' کہیں ہجر و فراق' کہیں قرب و وصال' کہیں رونا اور آہ و زاری۔ کہیں ہر دم خوشی اور سرمستی' کبھی داغ کی شوخیاں تو کبھی مومن کی شرارتیں۔

اسرار بھی ایک عاشق مزاج' آشفتہ سر' خیرہ سر شاعر تھا۔ اس روایتی انداز کی شاعری میں بھی اسرار نے اپنی انفرادیت برقرار رکھی ہے۔ کردار کی پختگی' خیالات کی برجستگی' فکر کی شیرینی' زبان و بیان کی خوش سلیقگی' اسرار کی عاشقانہ شاعری کی خصوصیات' اس پر روانی' شستگی' سلاست' الفاظ کی موزوں نشست و برخاست' اشعار کے غازہ و سرخی ہیں۔

چاند نے ہمارے عاشقوں کو ہمیشہ تڑپایا ہے اور بہلایا بھی ہے۔ نفسیات کے نقطہ نظر سے بھی چاند کے اتار چڑھاؤ اور بڑھنے گھٹنے کا انسان کی ذہنی و نفسیاتی کیفیات پہ بڑا اثر پڑتا ہے اور ان عاشقوں کے لیے تو جن کا محبوب چاند کی مانند کبھی آتے کبھی جاتے' تڑپاتے جی جلائے' چاند جی کا جنجال بن جایا کرتا ہے۔

مہ جبینوں نے کسی کام کا چھوڑا نہ ہمیں
چاند چڑھتا ہے تو بن جاتا ہے جی کا جنجال

چاند بھی جیسے رات کو آتا ہے اور صبح پھر اگلی رات طلوع ہونے کے لیے افق کے پردے میں روپوش ہو جاتا ہے اسرار کا محبوب بھی ''چاند فطرت'' ہے جو ملتا ہے مگر چاند کی طرح' دور دور رہتا ہے' بے قرار کرتا ہے اور قریب آ کر عشق کے منہ زور جذبات کو گزرگاہ نہیں دیتا۔ عاشق قرب کی خواہش کرتا ہے تو فردا کے وعدے پر ٹال دیتا ہے۔ ذرا سوچیے تو رات ہو' تنہائی' محبوب ہو اور عاشق صاحب قرب کی خواہش میں تڑپ رہے ہوں' وصال کی آرزو انہیں جلائے دے رہی ہو اور معشوق وصل کی بات کل کی رات تک ٹال دے تو اس سے بڑھ کر ستم اور کیا ہوگا؟

شکریہ وعدہ فردا کا مگر سوچو تو
اور کیا چیز بھلا دل شکنی ہوتی ہے

لیکن محبوب کی یہ دل شکنی سینے کی جلن' اور تیز کانٹے کی چبھن بن کر ایک مستقل کسک' ایک درد لا دوا بن

جاتی ہے لیکن یہی کسک، یہی بے قراری اور یہی جلن جینے کا چلن بھی تو ہے۔ قاتل بھی وہی، مسیحا بھی وہی، درد بھی وہ دوا بھی وہ۔

اسرار کے لفظوں میں ؎

کبھی قاتل کبھی جینے کا چلن ہوتی ہے
ہائے کیا چیز یہ سینے کی جلن ہوتی ہے

اس شعر میں ہائے میں جو لذت، لطافت اور رمزیت پوشیدہ ہے وہی سینے کی جلن کو کبھی قاتل اور کبھی جینے کا چلن بناتی ہے۔ ہائے اس ''ہائے'' کی لذت...... یہ تو درد آشنا دل ہی جان سکتے ہیں۔ اسرار کے ہاں الفاظ کا یہ بے ساختہ، برمحل اور موزوں استعمال اسے اساتذہ کے قریب تر کر دیتا ہے۔ اسرار کی اس ''ہائے'' سے ہمیں غالب کی دو 'ہائیں' یاد آ گئیں۔ ایک تو ؎

ہائے اس چارگرہ کپڑے کی قیمت غالب
جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گریباں ہونا

اور دوسرے ؎

کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ
'ہائے' اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

الفاظ کی اپنی بھی ایک زبان ہوتی ہے، الفاظ کے موزوں استعمال سے وہ زبان بولنے لگتی ہے، لفظ بول پڑتے ہیں، لیکن اب بولتے لفظوں کو سننے کے لیے گوش دل کی ضرورت ہے۔ گوش دل سوختہ، گوش دل گداختہ کی،

شعر کی لطافت کا دارومدار خیال کی ندرت اور نزاکت پر ہے جہاں گنگ لفظوں کو زبان بخشا فنکاری ہے وہاں خیال کے حسن، خیال کی نزاکت، خیال کے جمال کو شعر میں، نازک، جمیل انداز میں بیان کرنا اس سے بڑھ کر فنکاری ہے۔ خیال شیشوں کی دکانداری ہے۔ ٹھیس لگی اور ٹوٹ گیا اور اس نازک نایاب شے کو اسی طرح پیش کرنا ''اللہ اللہ'' ذرا دیکھیے تو اسرار کیسے شیشوں کا کاروبار کرتے ہیں ؎

اس بت کی رگ جاں کے قریں بھی تو وہی ہے
واعظ کی سمجھ میں جو یہ آجائے تو کیا ہو!

اسرار کے خمیر میں شرارت، شوخی، بذلہ سنجی، چٹکیاں، اور گدگدیاں شیفتگی و شگفتگی زیادہ تناسب سے شامل تھی۔ شاید اسرار کے شعروں میں جب اس کی ذات کا یہ پہلو اترتا ہے تو داغ اور مومن کی یاد آ جاتی ہے۔
سرو سا قد ہو، گیسو دراز سیاہ، چہرہ ماہتاب بدن طوفان آمادہ سمندر، بنتے بگڑتے زاویے ایک حرکت پر سینکڑوں کسمساہٹیں، اور حصار جسم کو توڑ کر آسمان چھونے کی خواہش پیدا ہو، ایسے عالم میں تو......! ؎

انگڑائی سے یا جام سے ابلی ہوئی صہبا!

ایسے میں کوئی پی کے بہک جائے تو کیا ہو

اے پری چہرہ لوگو! حسن والو! شیشہ بدن' سیماب تن ماہ وشو' زہرجبینو! جام مے شباب چھلکا دو مے شباب کے...... رندوں دل والوں' متوالوں' دیوانوں کو دے دو' جو چاہتے ہیں' جو مانگتے ہیں......تم ان پہ مہربانی کرو گے تو تمہارا کیا بگڑے گا' کچھ کمی تو نہ ہوگی اس سرتاپا گلبدن میں بھلا۔

؎ اور کس کام کی یہ گلبدنی ہوتی ہے

اسرار انہیں ان سنگدلوں' شیریں دہاں' اور سیم تناں کو ''گلبدنی'' کا مصرف سمجھتا رہا...... مگر شاید اسے گلوں سے شہد نہیں ملا' تب ہی تو جل کے کہتا ہے۔

؎ اس سن وسال پہ نازاں ہو مگر سوچو
وقت کے پاؤں کی زنجیر نہیں ہیں مہ وسال
اے ماہ وشو' گلبدنو' عشوہ طرازو!
تم کو بھی کوئی گر یونہی تر سائے تو کیا ہو!

اگر ماہ وش' گلبدن' سیم تن اپنے سن وسال' حسن اور جمال' جمال کے جلال پر نازاں نہ ہوں تو کون کوہ بے ستوں کاٹے' کون صحرا چھانے' کون شیشے سے سر ٹکرائے اور کون پتھر کھائے' اور اپنے ہی خون میں نہائے۔

اسرار کے رومانوی شعروں کی ذومعنویت' صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں والی کیفیت' لذت آمیز رمزیت' ادھ کھلی بات کا بیان' اشارے' کنائے بڑا لطف پیدا کرتے ہیں' اسرار کے بعض پڑھنے والوں نے تو اسرار سے ان کی تشریح بھی چاہی' اسی سلسلے میں ایک واقعہ تحریر کرتا ہوں۔

کسی صاحب نے اسرار ناروی کو خط لکھا اور وضاحت چاہی درج ذیل شعر کی۔

تجھ سے پہلے تو بہت سادہ ومعصوم تھا دل
تجھ سے بچھڑا تو کئی بار گنہگار ہوا!

پوچھا ان صاحب نے کہ ''آج کل کون سا نمبر چل رہا ہے۔ مبہم باتیں نہ کیا کیجیے' ہر گناہ کی تفصیل ضروری ہے اور یہ تفصیل نثر میں پیش کیجیے۔ مزہ آجائے گا۔''

اسرار نے جواب دیا۔ ''بھائی جی! یہ شعر 'یادوں کی بارات' کا مخفف نہیں ہے۔ خدا کی پناہ...... آپ نجانے کیا سمجھ بیٹھے' میاں یہ دل کی باتیں ہیں' میری نہیں...... دل بے چارہ...... دیکھے' چاہے اور گھٹ گھٹ کر رہ جائے۔''

اسرار ناروی کی یہ باتیں...... دل کی باتیں...... دل والوں ہی کے لیے ہیں۔ اسرار ناروی خود چلے گئے مگر اپنی شوخیاں چھوڑ گئے۔ اسرار...... اے اسرار! اب تمہارے دل کی باتیں کون سمجھائے گا؟ ہم کس سے پوچھیں گے تمہارے ''گناہوں'' کی تفصیل؟ آہ اسرار تم نے بہت ہی عجلت دکھائی پھر یہ اتنی شوخ

وشنگ باتیں کیوں چھوڑ گئے یہ تو اور بھی کاٹتی ہیں۔ تمہاری یادیں اور تمہاری باتیں مل کر ہمیں تڑپاتی ہیں اسرار تم کہا کرتے تھے۔

جو کہہ گئے وہی ٹھہرا' ہمارا فن اسرار
جو کہہ نہ پائے نجانے' وہ چیز کیا ہوتی

کاش اسرار تم وہ ان کہی بھی کہہ جاتے..... تم نہیں ہو تمہارا فن' تمہارا سرمایہ زندہ ہے..... ہاں ہمیں رونا نہیں چاہیے۔ کون کہتا ہے تم چلے گئے۔ تم تو اپنی خواہش کے مطابق تھک کر آرام کرنے وہاں گئے ہو ''جہاں کوئی نہ ہو'' اور تم زندہ رہو گے۔ اس وقت تک جب تک انسان میں پڑھنے لکھنے کا شوق زندہ ہے' اس وقت تک جب تک پیار' محبت زندہ ہے' اس وقت تک جب تک ہنسی زندہ ہے' شوخی اور شگفتگی زندہ ہے..... تم زندہ رہو گے..... تم زندہ رہو گے۔''

جب آنکھ کھلے......!

مشتاق احمد قریشی

آخر وہ کیا بات تھی کہ ابن صفی کے ناولوں کو تقریباً چوبیس سال گزرنے کے اور ادارہ نکہت الہ آباد کو بند ہوئے تقریباً بیس سال بعد جب ابن صفی کی ناول بازاروں میں دکانوں میں ناپید ہوں گے اور ان کے نئے پڑھنے والے یعنی دونئی نسلیں جن کے ہاتھ ابن صفی کا کوئی نہ کوئی ناول لگا اور جس نے حسب معمول حسب عادت اپنے پڑھنے والوں کو اپنے سحر میں جکڑ لیا تب وہ ابن صفی کے ناولوں کی تلاش میں نکلا ہوگا' اس کے علاوہ پرانی نسل کے لوگ جنہوں نے ابن صفی کو خوب اچھی طرح پڑھا تھا وہ بھی ابھی تک ابن صفی کی تحریر کے سحر سے نکل نہیں سکے تھے انہیں بھی ایک بار پھر ابن صفی کو پڑھنے کی طلب رہی ہوگی وہ بھی اس تلاش میں رہے ہوں گے کہ کہیں نہ کہیں سے کوئی نہ کوئی ابن صفی کا ناول دستیاب ہو جائے۔

شاید یہی وجہ رہی ہوگی کہ ۲۰۰۴ تک صبر کرنے کے بعد کچھ ناشرین نے تمام اخلاقی اقدار کو پامال کرتے ہوئے یا پھر پاک و ہند کے درمیان مصنفیں کے حقوق اشاعت کا کوئی واضح معاہدہ نہ ہونے کے سبب ہندوستان میں جس کا جی چاہا یا جس نے یہ محسوس کیا (اُردو بک ریویو دہلی کے محمد عارف اقبال اور فرید بک ڈپو دہلی کے الحاج محمد ناصر خان سے پہلے کتاب والا دہلی کے نعیم راہی نے نئے اُفق اور نیا رُخ ڈائجسٹ سے لے کر شائع کیا اور مینار پاکٹ بکس لارک بک ڈپو دہلی' ملن کمپنی دہلی' سی آئی ڈی ماہنامہ کے چمن دہلوی' کان پور کے محمد درویش' لکھنو کے مظہر عباس وغیرہ یہ ایک طویل فہرست ہے) کہ ابن صفی کے ناولوں کی اشاعت سود مند رہے گی۔ اس نے بلا تردد بغیر وارثین ابن صفی سے رابطہ کیے بغیر کسی رائلٹی کی ادائیگی اور اجازت کے بغیر ابن صفی کے ناول شائع کرنا شروع کر دیئے' ابتدا میں یقیناً ایسے ناشرین کو غیر متوقع کامیابی ملی ہوگی' کیونکہ ابن صفی کے سحر زدہ لوگ تو ان کے ناولوں کی تلاش میں پہلے ہی سے موجود تھے۔ ان کامیاب ترین اشاعتوں کے باوجود اور ابن صفی صاحب کے وارث جناب احمد صفی کے رابطے کے باوجود بھی ان ناشرین نے کسی قسم کی رائلٹی کی ادائیگی کی زحمت گوارا نہ کی اور نہ ہی کسی نے یہ اخلاقی جرات کی کہ ان سے اخلاقی طور پر ہی سہی اجازت بھی لے لی جاتی' یقیناً ان تمام ناشرین نے اخلاقی قانونی معاشرتی اقدار کو پامال کیا۔ یہ تو اس کا تاریخ پہلو تھا۔

ابن صفی صاحب کی کتابوں کا از سر نوع چھپنا اس کا ایک مثبت پہلو یہ ہے کہ ان ناولوں کی اشاعت نو کے باعث وہ تین نسلیں جو ابن صفی کی تحریر سے متاثر ہوئی ان کی تلاش و انتظار کو منزل مل گئی اور یوں ابن صفی صاحب کے تذکرے کے نئے دور کا آغاز ہو گیا۔ آج ابن صفی صاحب کے انتقال کو یعنی انہیں ہم سے جدا ہوئے اپنے قلم سے جدا ہوئے ۲۶ جولائی ۲۰۱۳ کو تینتیس سال پورے ہو چکے۔ اتنے طویل عرصے۔ میں ہمارے خطے ہندو پاکستان کی تاریخی روایت رہی ہے کہ اچھے اچھوں کو بھول جاتے ہیں ان کا سب کیا کرایا ان

کے ساتھ ہی مٹی میں مل جاتا ہے' زمانے کی گردش نے اچھے اچھوں کو بھلا دیا' خود ابن صفی صاحب کے دوست ساتھی' جو ان کے ساتھ ساتھ ادارہ نکہت الہ آباد سے منسلک تھے اور رومانی دنیا کے عنوان سے رومانی ناولیں لکھ رہے تھے جن میں ابن صفی کے ساتھی جناب مجاور حسین رضوی جو ابن سعید کے قلمی نام سے ناولیں لکھ رہے تھے جناب جمال رضوی جو شکیل جمال کے قلمی نام سے لکھ رہے تھے' آفاق حیدر اور دیگر ابن صفی کے ہمجولی جو اپنے فن میں یکتا تھے انمیں سے کتنوں کے کتنے ناول دوبارہ شائع ہوئے اور آج ان ناولوں کے نام کتنے لوگوں کو یاد ہیں یہ اعزاز برصغیر ہندو پاکستان میں ہی نہیں بلکہ پوری اردو دنیا میں صرف اور صرف ابن صفی صاحب کو ہی حاصل ہوا کہ جن کے ایک نہ دو بلکہ ڈھائی سو کے ڈھائی سو ناول آج بھی روز اول کی طرح تروتازہ ہیں اور پوری دل جمعی دلچسپی سے پڑھے جا رہے ہیں۔ بھارت کے نئے ناشرین نے یہ بڑا اہم کام سرانجام دیا ہے گو کہ وہ غیر اخلاقی ہی سہی لیکن بڑا اہم کام کیا ہے شاید ایسا اس لیئے بھی ممکن ہوا کہ ادارہ نکہت الہٰ آباد کافی عرصہ پہلے بند ہو چکا تھا ان غیر قانونی ناشرین نے تین عشرے گزرنے کے بعد ان کا تذکرہ بلند کیا ہے جو کام ان کی زندگی میں نہیں ہو سکا وہ اب انجام پا رہا ہے۔

۲۰۰۴ء کے بعد جب سے ان کے ناول دوبارہ شائع ہونا شروع ہوئے اگر یہ کہا جائے تو غالباً غلط نہیں ہوگا کہ ابن صفی کی ذات اور ان کے ناولوں کا نیا دور شروع ہوا کیونکہ اس عرصے میں ناقدین ادب بھی ابن صفی صاحب کی ناولوں کی طرف متوجہ ہوئے اور مشہور نقاد جناب ڈاکٹر اعجاز فاروقی نے تو جاسوسی دنیا کے چار ناولوں کا انگریزی ترجمہ بھی کر دیا تا کہ نا صرف برصغیر میں رہنے والے انگریزی داں بلکہ بین الاقوامی سطح پر جاسوسی ناول پڑھنے والوں کو ابن صفی سے روشناس کرایا جا سکے۔ یقیناً یہ کام ان نئے ناشرین ابن صفی صاحب کا ہی ہے جنہوں نے ابن صفی صاحب کے ناولوں کی طلب دیکھتے ہوئے ابن صفی صاحب کے ناول چھاپنے کی جرات کی۔ ایک طویل خاموشی جس کا میں خود بھی مجرم ہوں اور دیگر ابن صفی صاحب سے تعلق رکھنے والوں کی خاموشی اور چپ بھی اس خرابی میں شریک رہی ہے۔ جس طرح بھی ہوا اللہ کا شکر ہے کہ ایک طویل عرصہ گزرنے کے باوجود ابن صفی کا تذکرہ بھرپور انداز میں بلند ہو رہا ہے۔ بڑے بڑے نامور لوگ جن کی عمریں گزر گئی لکھتے پڑھتے انہوں نے بھی اپنے عروج کے دور میں ابن صفی کے ناول پڑھے تھے لیکن کبھی اقرار نہیں کیا تھا مجرمانہ چپ سادھ رکھی تھی آج ان کی زبان و بیان بھی کھل کر سامنے آ رہا ہے وہ بھی اقرار کر رہے ہیں ابن صفی صاحب کی تحریر سے اپنی نسبت اپنے تعلق کا اظہار کر رہے ہیں۔ حالانکہ اس قلم قبیلے کے لوگ ابن صفی صاحب کے ناول پڑھنے کے باوجود اپنا منہ نہیں کھولتے تھے اور اگر کبھی منہ کھولتے بھی تھے تو شعلے اگلتے تھے حسد اور بغض کے تیر برساتے تھے اور ادب کے وہ ٹھیکیدار ابن صفی کو ادب پار کرتے رہتے تھے (جس طرح پولیس کسی مجرم کو تڑی پار کرتی ہے)

اہل قلم افراد کی طویل خاموشی کے بعد اب ایک انقلاب نے کروٹ لی ہے جو سفر میں نے اپنے جرائد نئے افق' نیا رخ' آنچل کے ابن صفی نمبروں کے ذریعے شروع کیا تھا اور لوگوں کی بے حسی کے باعث تھک

کر بیٹھ گیا تھا' جو وقت کی دبیز تہہ تلے دب کر رہ گیا تھا اسے جناب احمد صفی نے جناب محمد حنیف نے جناب راشد اشرف نے کمپیوٹر کے ذریعے محفوظ کر کے لوگوں کے لیے آسانیاں فراہم کر دیں' ان برقی ذرائع ابلاغ کے ذریعے اب ہر کوئی آسانی سے ابن صفی صاحب کے متعلق ہر قسم کی معلومات ان کی تصاویر اور ان کی تحریریں پڑھ سکتا ہے دیکھ سکتا ہے' ان حضرات کی شبانہ روز کاوشوں کا ہی صلہ ہے کہ اب میں اور میرے جیسے جانے کتنے لوگ یہ محسوس کر رہے ہیں کہ ابن صفی کے تذکرے کو حیات نو مل رہی ہے۔ یہ تو ان حضرات کا ہی کام ہے جس سے لوگ متاثر ہو رہے ہیں اور ابن صفی صاحب سے اپنے کسی نہ کسی طرح کے تعلق کا اظہار کر رہے ہیں۔ اور یوں ابن صفی صاحب کا مشن آگے بڑھتا محسوس ہو رہا ہے اگر یوں کہا جائے کہ چراغ سے چراغ جل رہے ہیں تو شاید غلط نہ ہو۔

ابن صفی صاحب کی تحریروں سے فیض پانے والے اب ابن صفی کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے ہیں ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ بہت جلد یہ لوگ ابن صفی کے مشن ان کے مقصد کو پا کر ہی دم لیں گے محترم ابن صفی صاحب بڑے عزم و حوصلے سے اردو کی ترویج کی جس مہم پر نکلے تھے جس میں وہ پوری طرح کامیاب بھی رہے تھے۔ اسی باعث انہوں نے ابتدا میں ہی فحش اور عریاں تحریروں کے مقابلے میں سری ادب کی داغ بیل ڈالی تھی یوں تو کہنے والے یہ بھی کہتے رہے ہیں کہ ان سے پہلے سری ادب اردو میں کئی لوگوں نے روشناس کرایا جن میں تیرتھ رام فیروز پوری اور ظفر عمر صاحب کا ذکر اکثر کیا جاتا ہے لیکن اردو میں سری ادب کے تراجم کو چھوڑ کر طبع زاد ناول کی ابتدا جناب ابن صفی صاحب نے ہی کی ہے۔ انہوں نے اس وقت کے نام نہاد ادب یا ادب عالیہ کے مقابلے پر جس مہم جوئی کا آغاز کیا تھا۔ اس میں ابن صفی صاحب نے اپنے قلم سے تلوار کی کاٹ کا کام لیا اور ان تمام عریاں فحش تحریروں کا سر قلم کر کے رکھ دیا اور سری ادب کے ذریعے سرخروئی حاصل کی' آج کے لوگ یعنی نئی نسل بلکہ تقریباً دو نسلیں نہ تو ان لوگوں کے نام سے نہ کام سے آشنا ہیں یا اسے یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ ان تمام ہی نامور لوگوں کا نام بھی اب لینے والا کوئی نہیں رہا' ان لوگوں کی فحش اور عریاں اور اپنے وقت کی مقبول ترین تحریروں کے ساتھ آج ان کے لکھنے والوں تک کو لوگ بھول چکے ہیں۔

یہ بات بھی اپنی جگہ طے شدہ ہے کہ مقصدیت اور حقائق پر مبنی تحریریں نہ صرف ادب کا سرمایہ ہوتی ہیں بلکہ وہ کبھی نہیں مرتی ہمیشہ اپنے قارئین کے قلب و ذہن پر نقش رہتی ہیں جس طرح جناب ابن صفی صاحب کی تحریریں آج بھی ان کے لاکھوں پڑھنے والوں کے دلوں پر نقش ہیں۔ اس کے باوجود کہ نام نہاد ادب کے جغادری ٹھیکیداروں نے اپنی طرف سے پورا پورا زور لگا لیا تھا کہ کسی بھی طرح ابن صفی دنیا ادب میں قدم نہ رکھنے پائے لیکن مثل مشہور ہے کہ ''جا کو راکھے سائیاں مار سکے نہ کوئی'' آج تقریباً ساڑھے تین عشرے گزرنے کے بعد جس طرح ابن صفی کا نام اور کام بلند ہو رہا ہے ان کا تذکرہ اردو ادب کی بلند ترین سطح پر اردو ادب کے نامور لوگ کر رہے ہیں یہ ان پر ان کے رب کا کرم اور ان کی محنتوں کا صلہ الٰہی ہے۔ یقیناً یہ بات اپنی جگہ سولہ آنہ درست ہے کہ جناب ابن صفی نے اردو میں خصوصاً سطحی ادب اور جذبات کو برانگیختہ کرنے والی

تحریر کے سیلاب کے سامنے اپنے قلم اور اپنی تخلیقی قوت سے ایک مضبوط بند باندھا ہے۔ دراصل اردو میں فحش نگاری کا چلن انگریز ناولوں کے تراجم سے آیا اور کسی وبائی مرض کی طرح اس دور کے لکھنے والوں کے قلم سے چمٹ گیا اور فحش لکھنے والوں نے اپنے قلم کی قوت سے اس وقت کی نئی نسل کے ذہن کو مسموم کر دیا۔ ایسے مسموم ذہنوں کی اصلاح اور تریاق کا بیڑا ابن صفی صاحب نے خوب سوچ سمجھ کر اٹھایا تھا جس میں وہ پوری طرح کامیاب رہے آج کا ناقد آج کے ادب عالیہ کے لوگ اپنی دلی کیفیت کا اظہار جس طرح کر رہے ہیں وہ ایک انقلاب ہی ہے جو ابن صفی کی تحریروں نے برپا کیا ہے۔ کیونکہ ابن صفی نے صرف جاسوسی ناول نہیں لکھے بلکہ اپنے جاسوسی ناولوں کے ذریعے لوگوں کو بڑا وسیع اور وقیع نظریہ دیا انہوں نے زندگی کے فلسفے معاشرتی شعور کو پراسرار انداز اور سنسنی خیز ماحول کے ذریعے لوگوں کو ذہنی تفریح فراہم کرنے کے ساتھ ساتھ معاشرے کو جرائم سے پاک کرنے اور ہر قسم کے جرائم سے معاشرے کو پاک رکھنے کی اور قانون کے احترام اور ہر حال میں بالادستی کا درس بھی دیا ہے۔ آج کے ہمارے معاشرے میں جس طرح مجرم اور جرم کو فروغ مل رہا ہے اس کی نشاندہی وہ برسوں پہلے کر چکے ہیں اور اس کا حل بھی پیش کر چکے ہیں۔ ابن صفی کے قارئین خوب جانتے ہیں کہ ابن صفی کے ہر ناول میں باطل پر حق کی فتح ہی ہوئی ہے' کہیں کبھی ایسا نہیں ہوا کہ مجرم فتح مند ہوا ہو اور قانون ہاتھ ملتا رہ گیا ہو۔ انہوں نے ہمیشہ اپنے پڑھنے والوں میں قانون کے احترام کے جذبات کو ابھارا ہے۔ وہ اپنے چاہنے والوں' محبت کرنے والوں کو ہمیشہ تاکید کرتے نظر آتے ہیں کہ انسانی قدر اور اخلاقیات کا فقدان ہی انسانی حقوق کی پامالی کا سبب بنتا ہے۔ ابن صفی صاحب نے ہمیشہ اپنے قارئین کو جہاں تفریح کا سامان مہیا کیا وہیں انہوں نے زندگی کے پرپیچ مسائل پر سنجیدگی سے غور کرنے کی دعوت بھی دی ہے جسے وہ اپنے ناول زرد فتنہ کے پیش رس میں لکھتے ہیں۔

''بعض معاملات پر سنجیدگی سے غور کریں۔ زندگی محض ہنسی خوشی کا کھیل نہیں ہے' یہ اور بات ہے کہ میں ہنسی کھیل ہی کے ذریعے آپ کو زندگی کے حقائق سے قریب تر لانے کی کوشش کرتا ہوں۔

بڑا آدمی صرف وہ ہے جس کی تگ و دو صرف اپنی ہی ذات کے لیے نہیں ہوتی' اگر مال دار ہوتا ہے تو خود کو ایک ''چوکیدار'' سے زیادہ نہیں سمجھتا۔ اس مال کا چوکیدار جو دراصل اللہ کی ملکیت ہے اور اللہ کے بتائے ہوئے طریقوں سے صرف کرتا ہے۔

ہم جو کچھ بھی حاصل کرتے ہیں اللہ کی زمین ہی سے تو حاصل کرتے ہیں اور اس پر ہمارا حق صرف اسی تک ہوتا ہے جو اللہ نے مقرر کر دیا ہے۔'' (زرد فتنہ)

ابن صفی صاحب کے ناولوں کے پیش رس یقیناً ان کی شہکار تحریریں ہیں۔

''ہر وقت چوکنے رہیے کہ کہیں آپ غیر شعوری طور پر دشمن کا آلہ کار تو نہیں بن رہے۔ کسی افواہ کو دوسرے تک پہنچانے والا نادانستگی میں دشمن کی مدد کرتا ہے۔ اس وقت قومی یک جہتی کی حفاظت کرنا ہی ملک وقوم کی سب سے بڑی خدمت ہوگی۔ ایسی افواہوں کو اپنی ذات سے آگے نہ بڑھنے دیجیے جس سے صوبائی تعصب یا

فرقہ واریت کا زہر پھیلنے کا اندیشہ ہو۔" (ہلاکو اینڈ کو)

"کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ انتہائی خوفناک آدمیوں کے درمیان بظاہر ایک بے ضرر سا آدمی کسی ایسے جرم کا مرتکب ہوتا رہتا ہے جو ان خطرناک آدمیوں کے بس کا بھی روگ نہیں ہوتا۔ مثلاً اسمگلرز کے ساتھیوں میں سے کوئی ایک وطن دشمنی پر کمر بستہ ہو جاتا ہے اور اپنے ساتھیوں کو دھوکے میں رکھ کر اسمگلنگ کے سامان کے ساتھ ہی ملک کے اہم راز دشمنوں تک پہنچاتا رہتا ہے...... یہ اسمگلنگ سے بھی زیادہ گھناؤنا جرم ہے۔

یہ بھی درست ہے کہ حالات سے ہی مجبور ہو کر آدمی ایسا قدم اٹھاتا ہے لیکن یہ بھی میرے مشاہدے میں نہیں آیا کہ کسی نے اپنے اس پیر کو کاٹ کر پھینک دیا ہو جس کی وجہ سے ٹھوکر کھائی ہو۔

وقتی حالات یا کسی قسم کی بددلی کی وجہ سے غیر ملکی ایجنٹ بن جانا میری نظر میں ایسا ہی ہے جیسے اپنے ہی کسی عضو پر جارحانہ حملہ کیا جائے۔ ایسی آزمائشوں کے وقت اس سپاہی کو ذہن میں رکھنا چاہیے جو وطن عزیز کی حفاظت کے لیے گولیوں کی بوچھاڑ کے سامنے سینہ سپر ہو جاتا ہے۔" (پہاڑوں کے پیچھے)

ابن صفی صاحب کے یہ چند نمونے ان کے پیش رسوں سے لیے گئے ہیں۔ یقیناً یہ ادب کا اعلیٰ ترین نمونوں میں شمار کیے جائے گے۔ کیونکہ ادب کا بنیادی مقصد ہی تعمیری سوچ کو سامنے لانا ہے۔ اور ابن صفی صاحب کے تمام پیش رس ادب کی اعلیٰ ترین نمائندہ تحریریں ہیں۔ یہ تو غنیمت ہے کہ ایک طویل عرصہ گزرنے کے بعد ہی سہی ادب قبیلے کے لوگوں نے ابن صفی صاحب اور ان کے فن کو تسلیم کرنا شروع کر دیا ہے۔ اب بند زبانوں پر لگے تالے کھلنے لگے ہیں یقیناً بتدریج اس موضوع پر گفتگو ہوتی رہے گی اور ابن صفی کے عزم و حوصلے کو سراہا جاتا رہے گا۔ یہ بات بھی یقینی ہے کہ دیانت واخلاص سے کی گئی محنت کبھی رائیگاں نہیں جاتی وہ دن دور نہیں کہ ابن صفی ادب کے اعلیٰ ترین سنگھاسن پر براجمان ہوں گے جو مقام انہیں ان کی زندگی میں نہیں دیا گیا اس کی ابتدا ان کے انتقال کے تین عشروں بعد ہو رہی ہے' دیر آید درست آید کے مصداق اس میں بھی کچھ حرج نہیں جب آنکھ کھلے تب ہی سویرا ہے۔

سری ادب میں ابنِ صفی کی خدمات

ڈاکٹر خورشید احمد گوریجہ

صدر شعبہ اردو گورنمنٹ کالج، جڑانوالہ

تو ناظرین باتمکین!

سیاقیان خم خانہ اسرار وجرعہ نوشانِ افکار بادہ ساغر قرطاس کو اس طرح مملو کرتے ہیں کہ جب زمرد شاہ باختری نے طلسم ہزار شکل سے رہائی پائی۔ اس کے وزیر باتدبیر نے صلاح بتائی کہ ملک کوہ عقیق گلزار سلیمان کا بادشاہ عالی جاہ فوج بے کراں پہلوانان دوراں رکھتا ہے اور اس ملک سے ڈانڈا طلسم ہوشربا کا ملا ہے۔ حاکم طلسم افراسیاب جادو شہنشاہ ساحراں نہایت زور آور ہے کہ نہیب شمشیر سے اس کے سرکشانِ دہر کانپتے اور تھراتے ہیں اور سحر آزمائی سے سامرئی عہد اور جمشید روزگار کان پکڑتے ہیں۔ اصلاح وزیر زمرد شاہ سمت کوہ عقیق روانہ ہوا اور قطع منازل وطے مراحل جب......"

تو ناظرین باتمکین کے سانس رک جاتے، محفل میں سناٹا چھا جاتا اور سامعین تجسس کے عالم میں دم بخود بیٹھے رہتے۔ عجب گومگو کی کیفیت میں سامعین اگلے جملے سننے کے مشتاق بیٹھے رہتے۔

قصہ گو ہلکی سی پھریری لے کر......جس کا اثر سامعین پر بھی ہوتا......قصے کی کڑیاں ملانی شروع کر دیتا۔ حاضرین میں سے ہر شخص اسرار و تحیر کی دنیا میں گم قصہ سنتا رہتا اور قصہ اسرار و طلسم کی اوگھٹ گھاٹیوں میں ڈوبتا ابھرتا، خوف ودہشت کی وادیوں میں خاک چھانتا......میدان جنگ کے بڑے بڑے مناظر اور خوفناک جنگلوں میں سے ہوتا ہوا کوہ قاف کے جنوں، پریوں، بھوتوں پریتوں کی دل ہلا دینے والی مجلسوں میں اپنے خیمے گاڑتا آگے بڑھتا رہتا، حتیٰ کہ تارے اونگھنے لگتے اور مجلس میں سے کوئی صاحب انگڑائی لے کر دیئے کی بتی کو ذرا سا اکساتے اور قصہ گو چونک کر قصہ کو ایسی جگہ چھوڑ دیتا جہاں سامعین کی دلچسپی دم توڑ رہی ہوتی، محفل سے اصرار ہوتا، ادھر سے انکار ہوتا۔ اتنے میں سپیدہ سحری نمودار ہوتا اور قصہ گو سب کچھ چھوڑ چھاڑ اٹھ بیٹھتا اور باقی کل کہہ کر سامعین کے دلوں میں تجسس کی شمع روشن کر کے محفل برخاست کر دیتا تھا۔

زمانہ کہاں سے کہاں پہنچ گیا۔ نہ اب وہ ناظرین باتمکین رہے ہیں جو ساری ساری رات بیٹھ کر کہانیاں سنتے رہے ہیں، نہ وہ قصہ گو رہے ہیں جو سامعین کی دلچسپی کا سلسلہ ٹوٹنے نہیں دیتے تھے لیکن کہانیوں کا رسیا انسان نہیں بدلا۔ وہ ایسی کہانیاں سننا چاہتا ہے جس سے اس کی رگوں میں سنسناہٹ پیدا ہو۔ تجسس بیدار ہو اور وہ چند لمحوں کے لیے ہی سہی اپنے غم زدہ ماحول سے نجات حاصل کر سکے اس طرح کہانی خواہ داستان کی ہو یا رومانی تاریخی ناولوں اور افسانوں کی یا جاسوسی ناولوں کی ہو اپنے اندر تفریحی عنصر رکھتی ہے جس سے قارئین کی دلچسپی قائم رہتی ہے۔ یہ ایک طے شدہ امر ہے کہ کہانی میں جس قدر تجسس موجود ہو گا اسی قدر اس میں

قاری کی دلچسپی کا زیادہ سامان ہوگا۔ کسی بھی زبان کی داستانوں کی کامیابی کا انحصار تجسس پر ہی ہوتا تھا۔
انیسویں صدی کے آخری ربع میں انگریزی سیاسی تسلط کی بنا پر معاشرتی زندگی میں عظیم انقلاب برپا ہو چکا تھا۔ داستانوی ادب کی جگہ ناولوں نے لے لی تھی۔ بیسویں صدی کے پہلے ثلث میں مشینی دور کی مصروفیات نے افسانہ نگاری کو جنم دیا۔ کہانی سننے کا شوقین انسان کہانی کے بغیر نہیں رہ سکتا تھا اور بڑے بڑے ضخیم ناول پڑھنے کا وقت اس کے پاس نہیں تھا۔ اس لیے افسانہ نگاری نے کہانی کی ضرورت کو پورا کیا لیکن افسانہ ابتدا ہی میں ترقی پسندوں کے ہتھے چڑھ گیا اور حقیقت نگاری کے نام پر عریانی و فحاشی کو ادب میں پیش کیا جانے لگا۔
بیسویں صدی کا قاری جن پری بھوت چڑیل کے وجود کو تسلیم نہ کرتا تھا نہ وہ جادوئی گولوں اڑن کھٹولوں ہی کا قائل تھا وہ ہر پراسرار حرکت کی وجہ جاننے کا مشتاق تھا۔ سائنسی ترقی نے اس کے ذہنی افق کو بے حد وسیع کر دیا تھا۔ وہ اسرار پسند ضرور تھا لیکن وہ ایسی کہانیاں چاہتا تھا جس کے کردار جن پری نہ ہوں۔ کوہ قاف کی ان دیکھی دنیا کی جگہ وہ اپنے گردو پیش کے واقعات سے روشناسی چاہتا تھا۔ چنانچہ قیام پاکستان سے قبل نیلی چھتری اور بہرام کے کارناموں پر مشتمل دو ایک ناول چھپے۔ لوگوں نے ان کی پذیرائی بھی کی۔
داستانوں میں خیر اور شر میں تصادم ہوتا اور داستان کے آخر تک خیر کی قوتیں شر پر غالب آتیں۔ جن دنوں ابن صفی نے ناول نگاری کا آغاز کیا ان دنوں ایم اسلم اور رئیس جعفری کے ناولوں نے اردو قارئین کو مسحور کر رکھا تھا اور لوگ یہ بھول ہی گئے تھے کہ ناول رومانی اور تاریخی ہونے کے علاوہ بھی کچھ ہو سکتا تھا۔ ضخیم ناولوں میں عہد ماضی کے قصے بیان کیے جاتے تھے۔ ان دنوں ایک محفل میں (ان دنوں ابن صفی الہ آباد میں تھے) ابن صفی نے یہ چیلنج قبول کیا کہ قارئین صرف رومانی تاریخی ناول پڑھنا پسند کرتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے جاسوسی دنیا کے نام سے ناول لکھنے کا آغاز کیا اور اردو ادب میں جاسوسی ناول متعارف کروانے اور ان جاسوسی ناولوں کی وساطت سے احمد کمال فریدی اور ساجد حمید' قاسم جیسے کرداروں سے روشناس کروایا۔ اختر شیرانی مرحوم کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ان کے کردار سلمیٰ اور عذرا کے بارے میں لوگ اس قدر پر یقین تھے کہ وہ ان کرداروں کو تلاش کرتے تھے بالکل یہی حالت ابن صفی مرحوم کے کردار فریدی حمید اور قاسم کے ساتھ بھی پیش آئی۔ قارئین کی ایک بڑی تعداد ان کرداروں کو گوشت پوست کا انسان سمجھتی تھی۔ پھر ابن صفی نے ایک اور دھماکہ کیا اور علی عمران ایم ایس سی' پی ایچ ڈی آکسن کا لازوال کردار تخلیق کیا۔ یہ کردار اس قدر زندہ اور حقیقی معلوم ہوتے ہیں کہ ابن صفی کے مرنے کے بعد بھی زندہ ہیں۔ ان کرداروں کی مقبولیت کا اندازہ اس امر سے لگائیے کہ بعض تخلیقی صلاحیتیں رکھنے والے مصنفین ایچ اقبال اور مشتاق قریشی اور انوار صدیقی نے بھی انہی کرداروں پر طبع آزمائی کی حتیٰ کہ بعض مصنفین نے بچوں کی عمران سیریز بھی شائع کرنا شروع کر دی۔
سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایسا کیوں ہے۔ ہمیں داستانی کرداروں کے مافوق الفطرت پہلوؤں پر اعتراض ہے لیکن فریدی کے مافوق الفطرت سپر مین قسم کے کرداروں کو ہم آسانی سے قبول کر لیتے ہیں' کردار ہماری دنیا کے نہیں ہوتے اس کی وجہ بظاہر سمجھ میں آتی کہ مافوق الفطرت تھے جبکہ فریدی ہماری دنیا کا انسان ہے

داستانوں کا ہیرو تن تنہا کئی جادوگروں پر بھاری رہتا تھا اور طلسمات کو توڑتا چلا جاتا تھا۔ ابن صفی کا یہ کردار بھی تن تنہا قوی دشمنوں کا مقابلہ کرتا ہے۔ ملک دشمن عناصر سامراج دشمن افراد غیر ملکی جاسوس تخریب کار سب فریدی کے نام سے کانپتے ہیں اس کی وجہ کیا ہے؟ دیکھا جائے تو اقبال نے جس مرد مومن کا تصور پیش کیا ہے فریدی کا کردار مرد مومن کی صفات رکھتا ہے۔ وہ باطل کے سامنے سینہ سپر ہے۔ وہ باطل قوتوں کے سامنے سرنگوں نہیں ہوتا وہ بارسوخ مجرموں کی بیخ کنی کرتا تھا۔ ہم جب فریدی کو مجرموں کو بے نقاب کرتے دیکھتے ہیں تو بہت خوش ہوتے ہیں وہ ہمارا آئیڈیل کردار ہیں۔ ہماری دلی خواہش ہے ہم سب فریدی جیسے ہو جائیں' بے باک' نڈر' ایماندار' محبّ وطن اور ناقابل تسخیر' لیکن جب اپنے آپ میں سے کسی شخص کو بھی ایسا نہیں دیکھتے' منافقت' سماج دشمنی' ضمیر فروشی' رشوت خوری عام دیکھتے ہیں تو ہم فریدی سے محبت کرنے لگتے ہیں۔

فریدی کے کردار حمید اور قاسم ہماری تفریحی ضرورتوں کو پورا کرنے کا باعث ہیں۔ یہ کردار تفریح مہیا کرنے کے باوجود فحش حرکات کے مرتکب نہیں ہوتے۔ بس زبانی جمع بندی سے کام لیتے ہیں۔ حمید عورت خور مشہور ہے لیکن وہ حرام کاری میں ملوث نہیں وہ بھی محبّ وطن اور ایماندار ہے لیکن فریدی کے مقابلے میں کمزور ہے اور قاسم کا کردار ایسی ناہمواری کو جنم دیتا ہے کہ قاری ہنستے ہنستے بے حال ہو جاتے ہیں۔ ابن صفی کے ایسے ناول از حد مقبول ہوئے جن میں قاسم اپنی حماقتوں سمیت جلوہ گر ہوتا ہے۔ عمران بظاہر بے وقوف نظر آنے والا انسان...... جس کے چہرے پر حماقتوں کے ڈونگرے برستے ہیں۔ بباطن نہایت ذہین انسان ہے وہ ایک خفیہ تنظیم کا سربراہ ایکس ٹو ہے لیکن اس کے قریبی ساتھیوں کو بھی اس کی اس دہری حیثیت کا علم نہیں ہے یہ کردار ذہانت سے بھرپور ہے۔ عمران کو بھی اپنے وطن سے از حد محبت ہے وہ وطن دشمن عناصر کا سر کچل کر از حد خوشی محسوس کرتا ہے اور ہم سب اس کی خوشی میں شریک ہوتے ہیں۔ عمران پسندوں کی تعداد فریدی پسندوں کی نسبت کہیں زیادہ ہے۔

برٹرینڈ رسل نے ایک دفعہ کہا تھا۔

''ان افسانوں میں جنہیں صرف تصوراتی ہونے کا دعویٰ ہوتا ہے زیادہ واقعیت ہوتی ہے۔ بہ نسبت ان سنجیدہ کارناموں کے جو حقائق مہیا کرنے کے دعویدار ہوتے ہیں...... اس کی ایک مثال سائنسی افسانے ہیں جنہیں اب تک محض نوجوانوں کی تفریح کا ذریعہ اور تخیلی دنیاؤں پر مبنی کہا جاتا رہا ہے لیکن اب ہم آہستہ آہستہ مجبور ہو رہے ہیں کہ انہیں پر مغز پیش بینوں کی حیثیت سے دیکھیں۔''

ابن صفی نے جہاں اپنے ناولوں میں اپنے شہروں قصبوں میں رونما ہونے والے واقعات کو موضوع بنایا ہے وہاں انہوں نے سائنس فکشن بھی تحریر کیے ہیں اور ان کے سائنس فکشن پڑھ کر ان کی سائنسی معلومات پر حیرت ہوتی ہے۔ قدیم داستانوں میں جادو کا بٹن دبایا جاتا' تہہ خانہ نمودار ہو جاتا' دیوار کو ہاتھ لگایا جاتا تو دیوار شق ہو جاتی اور کوئی دروازہ نمودار ہو جاتا' جادوگر زمین پر زور سے پاؤں مارتا تو زمین کا سینہ پھٹ جاتا۔ اب جاسوسی ناولوں میں بھی یہی کچھ ہوتا ہے' لیکن جاسوسی ناول نگار اسے کسی جادوگر کی کارستانی پر محمول نہیں کرتا وہ اس کی سائنسی توجیہہ کرتا ہے اور میکنزم کا سہارا لیتا ہے۔ اگر بٹن دبانے سے تہہ خانہ نمودار ہوتا ہے تو

اس کے نیچے میکنزم کا جال بچھا ہوتا ہے۔

اردو کی داستانوں کو ادب عالیہ میں شمار کیا جاتا ہے اور جاسوسی ناول اور جاسوسی کہانیاں پڑھنا ناپسندیدہ فعل تصور کیا جاتا ہے۔ دلیل یہ دی جاتی ہے کہ جاسوسی قسم کی کہانیوں میں جرائم پیشہ افراد کو پیش کیا جاتا ہے۔ جس سے جرائم پیشہ افراد کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے اور جرائم کے نئے نئے طریقے سامنے آتے ہیں۔ ابن صفی نے ایک دفعہ اپنے ایک دیباچے میں لکھا تھا کہ ہابیل قابیل کے واقعہ سے پہلے کسی نے جاسوسی کہانی نہیں لکھی تھی پھر بھی زمین پر پہلا انسان قتل ہو گیا تھا اور کوے کو بھائی کی لاش ٹھکانے لگانے کے لیے رہنمائی کرنی پڑی تھی۔ اس طرح قتل انسانی فطرت میں شامل ہے اس طرح بدفطرت انسان جرائم بھی کرتے ہیں، لیکن ابن صفی کی کوئی ایک کہانی ایسی بتادیجیے جس میں جرائم پیشہ افراد کو قانون پر برتری حاصل ہوئی ہو ماسوائے سیریز ٹائپ کہانیوں کے..... جن میں اگلی کہانی کے لیے مجرم کو قائم رکھنا ضروری تھا ابن صفی کے بعض کردار فریدی کی طرح ناقابل تسخیر نظر آتے ہیں ابن صفی نے ان کرداروں کو کئی جگہ قائم بھی رکھا ہے۔ یہ بین الاقوامی مجرم ہیں ان میں سنگ ہی، تھریسیا، بمبل بی آف بوہیمیا، ٹو یوڈا، جیرالڈ شاستری، ڈاکٹر ڈریڈ، گنتی کے چند کردار ہیں۔ ان کرداروں کا ایک جواز یہ بیان کیا جاسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے شیطان کو بھی حیات ابدی بخش رکھی ہے۔ اقبال نے مرد مومن کے مقابلے پر ابلیس کا تصور بھی پیش کیا ہے جو دراصل قرآنی تصور ہے۔ ابن صفی کے برے کردار اور سماج دشمن جرائم پیشہ کردار مرد مومن کے لیے چیلنج ہیں۔ فریدی اور عمران جو مرد مومن کی سی صفات رکھتے ہیں وہ ایمان کی قوت سے سرشار ہیں اور کئی بار ابلیسی قوتوں سے نبرد آزما ہو کر فتحیاب ہوئے ہیں۔ شر و خیر کا تصادم ہی تو کہانی کو آگے بڑھانے کا باعث بنتا ہے۔

علامہ اقبال نے کہا تھا ۔

کارہا ہے ازل سے تابہ افروز

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تابہ امروز

چراغ مصطفوی سے شرار بولہبی

جاسوسی ناول نگار پر جرائم کی حوصلہ افزائی کا الزام غلط ہے۔ خاص طور پر ابن صفی پر تو ایسا الزام تہمت معلوم ہوتا ہے۔ ابن صفی اصلاح معاشرہ پر یقین رکھتے تھے۔ انہوں نے اپنے ناولوں میں معاشرے کے ان ڈھکے چھپے گوشوں سے پردہ اٹھایا ہے جن کے نیچے گندگی کے ڈھیر لگے ہوئے ہیں۔ وہ صرف گندگی اور بو کی نمائش نہیں کرتے بلکہ اس گندگی کو دور کرنے کی سعی بھی کرتے نظر آتے ہیں۔ دوسری جنگ عظیم کے موقع پر فاتح فوجوں نے مفتوح علاقوں کی عورتوں سے جو سلوک کیا تھا۔ ابن صفی کا جادو نگار قلم اس کا ذکر ان الفاظ میں کرتا ہے۔ ''روشی ایک اینگلو برمیز عورت تھی...... کبھی لڑکی بھی رہی ہوگی...... لیکن یہ بہت پرانی بات ہے...... یہ اس وقت کی بات ہے جب سنگاپور پر جاپانیوں نے بمباری کی تھی اور جدھر جس کے سینگ سمائے تھے بھاگ نکلا تھا۔ روشی چودہ سال کی ایک لڑکی تھی۔ اس کا باپ سنگاپور کا ایک تاجر تھا لیکن بہت بڑے تاجر کی بیٹی ہونے کا یہ مطلب تو نہیں کہ روشی تین دن کے فاقے کے بعد ایک کپ چائے کے عوض لڑکی سے عورت نہ بن

جاتی...... ہوسکتا ہے اس کے باپ کو ایک کپ چائے بھی میسر نہ آئی ہو...... کیونکہ اس میں لڑکی سے عورت بننے کی صلاحیت نہیں تھی۔ بہرحال روشی اس کے انجام سے آج بھی ناواقف تھی اور اب وہ پچیس سال کی ایک پختہ کار عورت تھی...... لیکن گیارہ سال قبل کی روشی نہیں تھی...... چائے کا وہ کپ اسے آج بھی یاد تھا اور وہ اب تک ایک نہیں درجنوں آدمیوں کو ایک ایک کپ چائے کے لیے محتاج کر چکی تھی۔ (بھیانک آدمی، عمران سیریز) اور جب وہ عمران کے طرز عمل سے متاثر ہو کر تائب ہوتی ہے تو اس کا ردعمل یہ ہوتا ہے۔

''مشورہ......! میں چاہتی ہوں'' روشی خشک لہجے میں بولی۔ ''آپ یہی کہیں گے کہ اب باعزت طور پر زندگی بسر کرو لیکن میں اس مشورے کا احسان اپنے سر پر نہیں لینا چاہتی۔ ذلیل سے ذلیل آدمی بھی اکثر ضرور سوچتا ہے کہ اسے باعزت طور پر زندگی بسر کرنا چاہیے۔'' ان جملوں کو پڑھ کر منٹو، خواجہ احمد عباس، عصمت چغتائی اور کرشن چندر کے ''طنز کی یاد تازہ ہوگئی ہے۔ ابن صفی چونکہ ترقی پسند نہیں تھے اس لیے حقیقت کے نام پر وہ عورت کو عریاں نہیں کرتے۔

ابن صفی جاسوسی ناول نگاری کے آغاز کا پس منظر بیان کرتے ہوئے رقم طراز ہیں۔

''پھر ایک دن ایک ادبی نشست میں کسی بزرگ نے کہا۔ ''اردو میں صرف جنسی افسانوں کی مارکیٹ ہے اس کے علاوہ اور کچھ نہیں بکتا۔ میں نے کہا۔ ''یہ درست ہے لیکن ابھی تک کسی نے بھی جنسی لٹریچر کے سیلاب کو روکنے کی کوشش نہیں کی۔'' کسی طرف سے آواز آئی۔ ''یہ ناممکن ہے جب تک کوئی متبادل چیز مقابلے پر نہ لائی جائے۔'' متبادل چیز......'' میں نے سوچا...... میں نے کہا۔ ''اچھی بات ہے میں دیکھوں گا کہ اس سلسلے میں کیا کر سکتا ہوں۔'' یہ ۱۹۵۱ء کے اواخر کی بات ہے جب افسانوی ادب بشمول ناول میں افسانویت کے علاوہ اور سب کچھ بکثرت پایا جاتا تھا اور ناول میں ناولٹی مفقود تھی۔ میں نے اس ناولٹی پر زور دیتے ہوئے جاسوسی ناول لکھنے کا فیصلہ کیا۔ جنوری ۱۹۵۱ء کی بات ہے جنوری ۵۲ء میں میرے مشورے پر ادارہ نکہت نے ماہانہ جاسوسی ناولوں کا سلسلہ شروع کیا۔ سلسلے کا نام ''جاسوسی دنیا'' تجویز ہوا۔ اب تک ایک سو اسی ناول لکھ چکا ہوں۔ (بیسویں صدی کے ساتویں عشرے کی بات ہے) ان میں صرف آٹھ جزوی یا کلی طور پر انگریزی سے ماخوذ ہیں باقی سب طبع زاد ہیں الہ آباد میں صرف سات ناول لکھے تھے اس کے بعد اگست ۵۲ء میں کراچی سے عمران سیریز کے ناول شروع کیے۔'' (بقلم خود۔ الف لیلیٰ ڈائجسٹ ابن صفی نمبر) ابن صفی ہر ماہ دو ناول تحریر کرتے تھے اور قارئین کو ان کے ناولوں کا انتظار اس شدت سے رہتا تھا کہ بک اسٹالوں پر پیشگی بکنگ ہو جاتی تھی۔ خود راقم الحروف کئی مرتبہ اس لیے محروم رہ گیا کہ پیشگی بکنگ نہ کرا سکا تھا۔ اب بحمد اللہ ابن صفی کے ناولوں کا مکمل سیٹ میرے پاس محفوظ ہے۔

ذکر ہو رہا تھا ابن صفی کی زود نویسی کا وہ ہر ماہ جاسوسی دنیا اور عمران سیریز کا ایک ایک ناول لکھتے مجھے نہیں معلوم یہ ناول کس تعداد میں چھپتے تھے لیکن ان کے ناولوں کو پڑھنے والوں کی تعداد لاکھوں تک پہنچتی تھی۔

ایک ایک ناول کئی کئی ہاتھوں میں پہنچتا تھا۔ اکثر لائبریریاں بھی دن کے حساب سے نہیں گھنٹوں کے حساب سے ناول کرایہ پر دیتی تھیں اور شاید ہی کوئی ناول ہوگا جو ایک ہی نشست میں نہ پڑھا جاتا ہو۔

جن دنوں ابن صفی نے جاسوسی ناول نگاری کا آغاز کیا تیرتھ رام فیروز پوری کے ترجمہ شدہ جاسوسی ناول عام تھے شرلاک ہومز اور آرسین لوپن کے کردار قارئین کو لبھاتے تھے' ظفر عمر نے آرسین لوپن کے کردار کو بہرام کے روپ میں اس طرح پیش کیا کہ وہ طبع زاد محسوس ہونے لگا۔ شرلاک ہومز ایک ذہین جاسوس کے طور پر جانا جاتا تھا جو ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر سارا معمہ عقل کے بل پر حل کرلیا کرتا تھا۔ ابن صفی کے کردار صرف ڈرائنگ روم کے کردار بننے کے بجائے میدان عمل میں مصروف کار نظر آتے ہیں۔ میں نہیں جانتا کہ ابن صفی کے کرداران کے طبع زاد ہیں یا انہوں نے کسی یورپی ناول نگار کے کرداروں سے متاثر ہوکر انہیں تراشا ہے۔ جو بھی صورت حال ہو ابن صفی کے کرداروں کی تراش خراش خالص مشرقی ماحول میں ہوئی ہے۔ گزشتہ چالیس پینتالیس سالوں میں جاسوسی ناولوں کو جو پذیرائی حاصل ہوئی ہے اس کا باعث صرف اور صرف ابن صفی مرحوم ہیں۔ ان کے قریب ترین حریف اکرم الہ آبادی تھے۔ انہوں نے خان بالے اور شوکت کے کردار تراشے تھے لیکن اہل نظر جانتے ہیں کہ خان بالے اور شوکت کے کردار ابن صفی کے فریدی' حمیدی اور قاسم کی بھونڈی نقل (کیری کیچر) میں نظر آتے ہیں۔ ابن صفی کے ناولوں کی تعداد سیکڑوں تک پہنچتی ہے اور شاید ہی کوئی ناول نگار ہوگا جس نے سینکڑوں کی تعداد میں ناول تحریر کیے ہوں اور ہر ناول معرکتہ الآرا ہو۔

دشمنوں کا شہر' لاشوں کا آبشار' زہریلا آدمی' ڈاکٹر دعاگو' لاش کا بلاوا' زہریلی تصویر' لاشوں کا بازار' شعلوں کا ناچ' موت کی چٹان' طوفان کا اغوا' عمران کا اغوا کی سلسلے کی کہانیاں عمران ہی کے یادگار سلسلے ہیں' دلچسپ حادثہ' زہریلا سیارہ اور ڈیڑھ متوالے۔ شعلوں کے سلسلے کی تمام کہانیاں اور ڈاکٹر ڈریڈ اور زمین کے بادل ابن صفی کے معرکتہ الآرا ناول ہیں۔ یوں تو شاید ہی کوئی ناول ہوگا جو کمزور کہانی یا کمزور کردار نگاری کی بنا پر قارئین کی توجہ مبذول نہ کرواسکا ہوگا۔

ابن صفی ایک مصلح تھے وہ اپنے گرد وپیش کی دنیا کو سنوارنا چاہتے تھے اس کے لیے کبھی وہ طنز کا حربہ اختیار کرتے ہیں اور کبھی سنجیدگی سے اپنی بات کہتے ہیں۔ روشی کے بیان میں طنز کی کاٹ ہمیں محسوس ہوتی ہے۔ اسی طرح "دشمنوں کا شہر" کا نادر ایک پیشہ ور مولوی کا وعظ سن کر راہ راست پر آجاتا ہے وہ مرجانا قبول کرتا ہے لیکن راہ راست سے ہٹنا پسند نہیں کرتا۔ انہوں نے اپنے بیشتر ناولوں میں کرداروں کے نفسیاتی تجزیے کیے ہیں۔ لاشوں کا آبشار میں ڈاکٹر بارنگ اور زہریلا آدمی کا سکتر صاحب نفسیاتی الجھنوں کا شکار ہیں اسی کشمکش نے ان کو مجرم بنادیا ہے آزادی کے بعد ہمارا جو رویہ من حیثیت القوم رہا ہے ابن صفی نے کئی ناولوں میں ان پر بھرپور طنز کیا ہے۔

ابن صفی ایک مخلص انسان تھے اور خلوص دل سے قانون کی حاکمیت کے قائل تھے۔ "لاش کا بلاوا" ناول میں وہ اس کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

"میں کہتا ہوں اگر تم قانون کو ناقص سمجھتے ہو تو اجتماعی کوششوں سے اسے بدلنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے اگر اس کی ہمت نہیں ہے تو ہمیں اس قانون کا پابند رہنا پڑیگا۔ اگر تم اجتماعی حیثیت سے اس کے خلاف آواز نہیں اٹھا سکتے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تم اس سے متفق ہو اب اگر متفق ہونے کے باوجود بھی تم اس کی حدود

سے نکلنے کی کوشش کرو تو تمہاری سزا موت ہی ہونی چاہیے۔" "زہریلا سیارہ" میں کرنل فریدی کی زبان سے یہ جملے سنیے۔ ہوٹل کا ڈائریکٹر اسے کہتا ہے کہ وہ تو انقلابی معلوم ہوتا ہے۔

"حدود اللہ میں رہ کر یقیناً انقلابی ہوں، اللہ کبھی اس پر برہم نہیں ہوسکتا کہ کوئی قوم اپنے حالات کو مدنظر رکھ کر اپنے وسائل کی تقسیم کا مناسب انتظام کرلے۔"

بات تو سچی ہے جناب، ہماری تاریخ میں ایسے سربراہان مملکت بھی گزرے ہیں جو سر کے نیچے اینٹ رکھ کر کھردرے فرش پر سویا کرتے تھے، وہ اپنے لیے محل نہیں بناتے تھے۔"

ابن صفی کے یہ جملے ایک مصلح اور واعظ کے جملے معلوم ہوتے ہیں لیکن وہ اس وعظ کو اپنے فن میں اس طرح سمو کر پیش کرتے تھے کہ اس سے فن متاثر نہیں ہوتا البتہ قاری ضرور متاثر ہوتا تھا اس طرح ابن صفی ایک مصلح کا کردار بھی ادا کرتے تھے۔ "دشمنوں کا شہر" کی ابتدا ایک پیشہ ور مولوی کے وعظ سے کروائی ہے۔ خدا کے پیغام کے زبردست اثر سے ایک عادی جرائم پیشہ شخص نادر کی تالیف قلب ہوجاتی ہے اس سے ابن صفی کا نقطہ نظر کھل کر سامنے آجاتا ہے کہ اگر نظام مصطفیٰ صلی علیہ وسلم قائم کردیا جائے تو جرائم کا قلع قمع ہوجائے گا۔ ابن صفی جرائم کے ساتھ ساتھ جرائم کے بنیادی اسباب کو تلاش کرنے اور انہیں دور کرنے کے حق میں ہیں اگر جرائم کے اسباب ختم نہیں ہوں گے تو ایک مجرم مرے گا تو دس اس کی جگہ لے لیں گے۔ زندگی کے بارے میں ان کا نقطہ نظر بڑا واضح اور مثبت ہے۔ ابن صفی کا ناول "اونچا شکار" ان مجرموں کی کہانی ہے جو اس بھروسے پر جرم کرتے ہیں کہ وہ سرآوردہ انسان ہیں ابن صفی ایسے جرائم پیشہ سربراہ کے سر ضرور کچلتے ہیں۔ "شیطان کی محبوبہ" میں وہ ہمیں ہماری بے حسی پر یہ کہہ کر چونکاتے ہیں۔

"ہماری زمین کے سینے میں کیا نہیں ہے مگر ہم مفلس ہیں...... کاہل ہیں...... ہمیں باتیں بنانی آتی ہیں ہم تقریریں کرسکتے ہیں ایک دوسرے پر اپنی ذہنی برتری کا رعب ڈال سکتے ہیں ایک دوسرے کی جڑیں کاٹنے کے لیے اپنی بہترین ذہنی صلاحیتیں ضائع کرسکتے ہیں لیکن ہم سے تعمیری کام نہیں ہوسکتے۔"

ابن صفی اسمگلروں، بلیک مارکیٹروں، بلیک میلروں، جواریوں جعلسازوں کی عبرتناک داستانیں بیان کرتے اور مجرموں کے انجام سے جرائم کی راہ روکتے ہیں وہ مزاح کی شیرینی سے بھی کام لیتے ہیں اور طنز کے تیر بھی برساتے ہیں۔ غیر ملکی سفارت خانوں کے ذریعے ملکی سالمیت کو پہنچنے والے نقصان کی نشاندہی بھی کرتے ہیں اندرون ملک غداروں کا محاسبہ بھی کرتے ہیں۔ بیسویں صدی سائنسی ایجادات کی صدی ہے۔ جس نے انسان سے انسان ہونے کا شرف چھین لیا ہے انوکھے رقاص میں ان کی طنز کی نشتریں ملاحظہ ہو ایک شخص قتل ہوگیا ہے لیکن دوسرے انسان اسی طرح محو رقص رہتے ہیں ابن صفی اس پر لکھتے ہیں۔

موسیقی کی لہریں منتشر ہوتی رہیں رمبا کا دور چلتا رہا۔ قطعی یہ نہیں معلوم ہوتا تھا کہ آج یہاں کوئی آدمی کسی حادثے کا شکار ہوگیا تھا۔ وہ سب یا تو پاگل تھے یا چوپائے...... بالکل ایسا لگ رہا تھا جیسے ہرنوں کے کسی جھنڈ پر کسی شکاری نے فائر کیا ہو، ایک گرا دوسرے بھاگ نکلے۔ پھر جہاں ان کے پیر تھے وہیں پھر چرنا چگنا شروع

کردیا۔ اپنے نقصان سے بے نیاز، بے پروا، ساز چیخ رہے تھے، پیر متحرک تھے، سڈول پیر سبک اور سڈول پنڈلیاں...... لیکن شاید وہ جسم ہی جسم تھے...... مشینوں کی طرح متحرک جسم لیکن...... دفعتاً ایسا معلوم ہوا جیسے کسی نے لیکن کہا ہو...... پھر دوسرے سازوں نے چیخنا شروع کردیا...... یہ بیسویں صدی ہے، ناچو، ناچتے رہو، ایک آدمی کی موت پر مغموم ہو کر کیا کرو گے ہوسکتا ہے کل تم سب ہی جانوروں کی طرح مرجاؤ، ہائیڈروجن بموں سے پھیلنے والی وبائیں تمہیں چٹ کر جائیں تم سب ایک ایسی کشتی میں سوار ہو جو ڈوبنے والی ہے۔ پھر کسی دوسرے کے متعلق سوچ کر کیا کرو گے۔ اپنی اپنی فکر کرو۔ تم سب اس بڑے بہت بڑے دھماکے کے منتظر ہو جس سے بچ کر کہیں نہ جاسکو گے...... کل زمین کے چیتھڑے اڑ جائیں گے، میٹھے پانی کے چشموں سے زہر ابلے گا۔ مستقبل صرف ایک دھماکہ ہے، جس کی پشت پر دنیا کی بہترین عقلیں ہوں گی مگر وہ خود عقل سے بے نیاز ہوگا۔ تم سب سائنسی جہالت کا شکار ہونے والے ہو۔"

کیا ابن صفی کی یہ تحریریں اس لیے نظر انداز کردی جائیں گی کہ ان پر جاسوسی ناول کا لیبل لگا ہوا ہے۔ درحقیقت یہ تحریریں، ایم اسلم، رئیس جعفری کے بے مغز ناولوں سے زیادہ اہم ہیں۔ منٹو، عصمت چغتائی، غلام عباس، کرشن چندر، خواجہ احمد عباس اور احمد ندیم قاسمی کی تحریروں سے یہ زیادہ جاندار تحریریں ہیں، عالمی سیاست پر اور عالمی غنڈہ گردی پر ابن صفی کے تبصرے حیرت انگیز حد تک حقیقت کی عکاسی کرتے ہیں۔ ابن صفی کے نقال بہت سے ہیں لیکن ان میں کوئی ابن صفی نہیں ہے۔ میں ان مصنفین سے گزارش کروں گا کہ وہ ابن صفی کے کرداروں پر طبع آزمائی کرنے کی بجائے اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو بروئے کار لاکر نئے کردار تخلیق کریں۔ اگر ان میں تخلیقی صلاحیتیں موجود ہیں تو ان کے تخلیق کردہ کردار بھی ضرور کامیاب ہوں گے۔ کسی قاری نے ابن صفی کو مشورہ دیا تھا کہ وہ اگاتھا کرسٹی کی طرح لکھا کریں انہوں نے قاری سے سوال کیا تھا کہ اگاتھا کرسٹی کیوں نہیں ان کی طرح لکھتیں، بس یہی بات میں نقال حضرات سے کہوں گا کہ وہ کسی کے نقال کیوں بنیں۔ کیوں نہ ایسا ادب تخلیق کریں کہ دوسرے ان کی نقالی کریں انعام درانی نے لکھا ہے۔

"مجھے حیرت ہے کہ جس مقدار میں ابن صفی نے لکھا ہے ان کی متعدد تخلیقات میں معیاری حسن اور داستان گوئی کے پیچ وخم اور زیر و بم کیونکر برقرار رکھے جاسکتے ہیں۔ یقیناً یہ ابن صفی کی انفرادیت ہے اور اسے انہوں نے اپنا لہو جلا کر برقرار رکھا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ جاسوسی ادب کے بارے میں چوٹی کے نقادوں کی الرجی ایک دن ختم ہوگی اور اس صنف افسانہ کو بھی "درخور اعتنا" قرار دے کر ابن صفی کو وہ مقام دیں گے جس کے وہ داقعی مستحق ہیں۔" (الف لیلیٰ ڈائجسٹ۔ ابن صفی نمبر) ابن صفی اردو کا سب سے زیادہ پڑھا جانے والا مصنف ہے اس پر پی ایچ ڈی سطح کا تحقیقی کام ہونا چاہیے۔ مغربی ممالک نے جاسوسی ناولوں پر فلمیں بنائیں۔ مقالات لکھے، صنف اسرار و رموز واضح کیے ہیں۔ جامعہ کراچی کو ابن صفی پر تحقیقی کام ضرور کروانا چاہیے اس سے جاسوسی ناول نگاری کے فن کے خدوخال ابھریں گے اور ابن صفی کے فنی کمالات بھی نمایاں تر ہو کر سامنے آئیں گے۔

روشنی کی آواز (جاسوسی دنیا' الہ آباد)۔ایک جائزہ

راشد اشرف

''ذرا ان سے کہیے کہ عمران کے مماثل ایک ہی جملہ لکھ کر دکھا دیں۔'' (ابن صفی اپنے نقالوں کا تذکرہ کرتے ہوئے ایک قاری سے مخاطب ہو کر)

دسمبر ۲۰۱۲ میں پٹنہ کے ادبی جریدے 'آمد' میں ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کی مرتب کردہ ابن صفی مرحوم کے جاسوسی ناولوں کی فہرست شائع ہوئی۔ مذکورہ فہرست ہرگانوی صاحب کی کتاب ''ابن صفی کے جاسوسی ناولوں میں طنز و مزاح'' (مطبوعہ ایجوکیشنل پبلشنگ پریس' دہلی۔ جنوری ۲۰۱۳) میں بھی شامل کی گئی۔ راقم الحروف نے مذکورہ فہرست میں موجود اغلاط کی نشان دہی اپنے دو مختلف مکتوبات کے ذریعے کی جو بالترتیب لاہور کے جریدے 'الحمراء' اور 'آمد' میں شائع ہوئے۔ مزید تحقیق اور ہندوستانی احباب سے تصدیق کے بعد یہ بات سامنے آئی کہ فہرست میں درج زیادہ تر غلط عنوانات کے حامل ناول دراصل ٹائپنگ کا شاخسانہ ہیں۔ البتہ دو ناول بعنوان ''سائے کا قتل'' اور ''روشنی کی آواز'' میں سے موخر الذکر الہ آباد سے ہمارے کرم فرما جناب غیور خان نے بکمال محبت ارسال کیا جبکہ 'سائے کا قتل' کی بابت دہلی کے ڈاکٹر خالد جاوید کا کہنا ہے کہ یہ ناول بھی الہ آباد ہی سے شائع ہوا تھا اور وہ اسے نقلی ناول مانتے ہیں۔ ڈاکٹر خالد جاوید نے 'سائے کا قتل' کی فراہمی کا عندیہ دیا ہے۔ خالد جاوید نے 'روشنی کی آواز' سے متعلق سماجی رابطوں کی ویب سائٹ فیس بک پر شروع ہونے والی ایک بحث کے جواب میں راقم الحروف اور جناب احمد صفی سے رابطہ کیا۔ یہ بات بھی باعث دلچسپی ہوگی کہ کچھ عرصہ قبل تک' راقم اور احمد صفی صاحب' عمران سیریز کے ناولوں ''گھر کا بھیدی' اور 'موت کا مہمان' سے پاکستان میں اشاعت کے حوالے سے لاتعلقی ظاہر کر چکے تھے لیکن مدیر اردو بک ریویو عارف اقبال اور ڈاکٹر خالد جاوید کے ذریعے علم ہوا کہ دونوں ناول ہندوستان سے ادارہ نکہت کے تحت شائع ہوئے تھے۔ قصہ یہ تھا کہ مذکورہ ناول پاکستان میں شائع نہیں ہوئے تھے۔ ابن صفی مرحوم نے روزنامہ حریت کے لئے ڈاکٹر دعاگو قسط وار لکھنا شروع کیا جس کا آغاز ۲۰ اکتوبر ۱۹۶۳ سے ہوا اور یہ کتابی شکل میں مارچ ۱۹۶۴ میں شائع ہوا۔ بھارتی قارئین کو طویل انتظار کی زحمت سے بچانے کے لئے عباس حسینی نے ابن صفی کی مشاورت سے یہ طے کیا کہ جب ڈاکٹر دعاگو کی اتنی قسطیں شائع ہو جائیں جو کہ عمران سیریز کے ایک عام شمارے کے برابر ہوں تو اسے الہ آباد سے بھی شائع کر دیا جائے۔ چنانچہ بھارت میں ڈاکٹر دعاگو تین حصوں میں شائع ہوا جن کے نام بالترتیب گھر کا بھیدی (جون ۱۹۶۴) 'موت کا مہمان (جولائی ۱۹۶۴) اور ڈاکٹر دعاگو (اگست ۱۹۶۴) تھے۔ (ابن صفی۔ کہتی ہے تجھ کو خلق خدا غائبانہ کیا۔ مرتب و مولف' راقم الحروف)

یہاں احمد صفی کے حالیہ مکتوب بنام ڈاکٹر خالد جاوید سے یہ اقتباس ملاحظہ کیجیے۔

''مجھے آپ کے ساتھ ناولوں کے مشتبہ ناموں پر ہونے والی گفتگو یاد ہے۔ میں اس لیے آپ سے تصدیق چاہ رہا تھا کیونکہ میں نے آپ سے اختلاف کیا تھا کہ گھر کا بھیدی نام کی کوئی کتاب ابو نے تحریر نہیں کی تھی۔ بعد کو آپ ہی کے ذریعے یہ بات کھلی تھی کہ ڈاکٹر دعا گو تین حصوں میں الہ آباد سے شائع ہوئی تھی اور پہلے حصے کا یہ نام رکھا گیا تھا۔ میں نے اپنی اصلاح فوراً کرلی تھی۔''

ابن صفی مرحوم کی بیماری کے دوران الہ آباد سے اس زمانے میں شائع ہونے والے ناولوں کے اداریوں کا جائزہ لیا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ عباس حسینی کس قدر پریشان تھے۔ وہ جاسوسی دنیا کے ناول پرنس وحشی (الہ آباد۔۱۹۶۰) کے اداریے میں لکھتے ہیں۔

''محترم ابن صفی نے یہ کہانی بستر علالت پر لکھی ہے۔ میری خواہش ہے کہ آپ سب' خواہ آپ کسی عمر کے ہوں' یا کسی بھی مذہب یا فرقے سے تعلق رکھتے ہیں' اپنے گردواروں میں' مندروں میں' گرجاؤں میں' مسجدوں میں جا کر اپنے ڈھنگ سے محترم ابن صفی کی صحت یابی کے لیے دعا کریں۔ محترم ابن صفی ہمارے لیے ایک نعمت ہیں اور ان کی شخصیت اس برصغیر کے لاکھوں' کروڑوں افراد کے لیے ایک قیمتی سرمایہ ہے۔''

مذکورہ بالا ردعمل کوئی نئی بات نہیں تھی۔ ابن صفی کی معمولی سی علالت عباس حسینی پر کس طرح اثر انداز ہوتی تھی' اس کا اندازہ جاسوسی دنیا کے ناول ''تجوری کا گیت'' (مارچ ۱۹۵۳) کے اداریے سے لگایا جا سکتا ہے۔ عباس حسینی رقم طراز ہیں۔

''ہم ہر شمارے میں موصوف (ابن صفی) کی صحت کے بارے میں اس لیے لکھتے رہتے ہیں کہ ان بدباطن' بدطینت اور خبیث عناصر کی بیخ کنی ہو سکے جو چاندی کے چند ذلیل سکوں کی خاطر محترم ابن صفی کے بارے میں افواہیں پھیلا کر لوگوں میں بدگمانی پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ محترم ابن صفی اپنی تمام صلاحیتوں کے ساتھ زندہ ہیں۔ ابھی حال ہی میں ادارہ نے ایک نئے ماہنامے 'طلسمی دنیا' کا اجراء کیا تھا۔ اس کی مقبولیت سے متاثر ہو کر ادارہ نے ایک اور ماہنامے 'تاریخی دنیا' کے اجراء کا فیصلہ کیا ہے۔''

ابن صفی کی علالت کے دوران عباس حسینی جاسوسی دنیا کے پرانے ناول شائع کرتے رہے تھے۔

عباس حسینی کے ادارہ نکہت سے شائع کردہ ناولوں کی ایک فہرست سے بھی اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ ''روشنی کی آواز' عباس حسینی مرحوم ہی نے شائع کیا تھا البتہ الہ آباد سے شائع ہوئے ناولوں کے بالکل برخلاف' اس ناول پر نمبر شمار اور سن اشاعت (اندرونی صفحے کی مخصوص جگہ پر) درج نہیں کیا گیا ہے۔ واضح رہے کہ مذکورہ دونوں ناول' کراچی سے شائع ہونے والے ناولوں کی فہرست کا نہ تو حصہ ہیں اور نہ ہی ابن صفی کے ناولوں کے قانونی حقوق رکھنے والوں کے نمائندے فرزند ابن صفی جناب احمد صفی ان سے واقف ہیں۔ یہ دونوں ناول ابن صفی مرحوم نے کراچی سے شائع نہیں کیے اور یہی نکتہ سب سے اہم ہے' اگر یہ ناول ابن صفی کے تحریر کردہ ہوتے تو ان کی کراچی سے اشاعت ایک طے شدہ امر ہوتا۔ ابن صفی ہر ناول کے مسودے کی کاربن کاپی الہ آباد بھیجا کرتے تھے جبکہ اصلی مسودہ ان کے پاس محفوظ رہتا تھا جو کراچی ایڈیشن کی اشاعت

مراحل کے دوران استعمال کیا جاتا تھا۔

یوں تو پاکستان کی طرح ہندوستان سے بھی درجنوں لکھنے والوں نے ابن صفی کے کرداروں پر طبع آزمائی کی اور یہ عباس حسینی کے ادارہ نکہت سے شائع ہونے والے ناولوں کے ساتھ ساتھ بازار میں گردش کرتے رہے تھے۔ کراچی میں ابن صفی اور الٰہ آباد میں عباس حسینی' ان جعلی لکھنے والوں کی نشان دہی اور بعض حالات میں ان کے خلاف قانونی کاروائی بھی کرتے رہے تھے۔ لیکن اب یہ بات سامنے آئی ہے کہ 'سائے کا قتل' اور 'روشنی کی آواز' ادارہ نکہت ہی سے شائع کیے گئے۔ لیکن یہاں سے سوال اٹھتا ہے کہ آخر اس کی کیا وجہ رہی ہوگی؟ اس ضمن میں احمد صفی کا بیان ملاحظہ کیجیے۔

''روشنی کی آواز کا معاملہ رہ گیا تھا۔ ہم نے اس کے سرورق اور اندرونی صفحات کے درشن پہلی دفعہ کیے ہیں۔ میرے نزدیک تحقیق طلب بات یہ نہیں کہ یہ ابن صفی کا ناول ہے کہ نہیں۔ کیونکہ یہ تو ثابت ہے کہ یہ ان کا ناول نہیں ہے۔ تحقیق طلب بات ان عوامل کی نقاب کشائی ہے جن کے نتیجے میں یہ ناول نکہت کی فہرست میں شامل کیا گیا۔''

احمد صفی مزید وضاحت کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

''ایک اور بات یہ کہ ابو نے کبھی بھی کوئی ناول لکھ کر محفوظ نہیں کیا۔ خواہ بھارت ہو یا پاکستان' ساری زندگی یہی رہا کہ جیسے جیسے لکھتے جاتے تھے کتابت کے لیے بھیجا جاتا رہتا تھا۔ آخری صفحات کے لکھے جانے کے فوراً بعد ہی کتاب طباعت کے لیے تیار ہو جاتی تھی۔ ایکسٹرا کتاب کا کوئی تصور نہیں تھا۔ سن باون کے بعد سے مسودے کراچی ہی سے جایا کرتے تھے۔ اگر کوئی ناول سیریز سے ہٹ کر بھی لکھا گیا' جیسے ڈاکٹر دعا گو یا صحرائی دیوانہ وہ بھی الگ سے ہندوستان بھیجا گیا اور شامل اشاعت کیا گیا۔ دوسری بات یہ ہے کہ ابن صفی نے اپنے لکھے پر کبھی نظر ثانی نہیں کی۔ یہ ایک خداداد صلاحیت تھی۔ آپ ان کے اولین دور کے مسودے دیکھیں یا دور آخر کے صرف ایک ہی ورژن ہوتا تھا۔ ایسا کبھی ہوا ہی نہیں کہ کوئی چیز لکھی گئی اور اسے رد کر کے فائیلوں یا ردی کی ٹوکری کی نظر کر دیا گیا ہو۔ اور اسے اس قابل نہ سمجھا گیا ہو کہ اس کی اشاعت نہ ہو سکے۔ اس مبینہ ناول کی تحقیق میں سب سے اہم پہلو اس کا سن اشاعت ہے۔ راشد نے ایک اور بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ الٰہ آباد ایڈیشنز میں شمارہ نمبر اور سن اشاعت ضرور ہوا کرتا تھا جو اس ناول کے اندرونی مخصوص صفحات میں نظر نہیں آ رہا۔ ابو کی بیماری کا دور ایک بہت مشکل دور تھا۔ کراچی میں اسرار پبلی کیشنز اور ہمارے گھر کا خرچہ ابو کی تحریروں ہی سے چلا کرتا تھا۔ ایسے میں تین سال تک بے روزگار ہو جانے سے سوچیے کیا نہ گذرتی ہوگی۔ ایسے میں دیگر لوگوں کی کتابیں بھی شائع کی گئیں تا کہ پبلی کیشنز کا کام چلتا رہے۔ سکنڈ ایڈیشنز بھی نکلتے رہے۔ اور کم از کم ایک ضعیف روایت کے مطابق یہ تجویز بھی پیش ہوئی تھی کہ ابن صفی کے نام سے کہانیاں لکھوا کر ادارے کو زندہ رکھا جا سکے۔ لیکن کم از کم پاکستان میں اس تجویز پر عمل نہیں کیا گیا۔ الٰہ آباد میں بھی یقیناً ایسی صورتحال پیدا ہوئی تو ہوگی۔ رومانی دنیا اور طلسمی دنیا اپنی جگہ مگر اب بھی تاریخ یہی بتاتی ہے کہ نکہت پبلی کیشنز کا دارومدار بنیادی طور پر جاسوسی

دنیا ہی پر تھا۔ ابو کے انتقال کے بعد کسی بھی طرح کی سیریز ادارے کو قائم نہ رکھ سکی۔ تو کیا ایسا ممکن نہیں کہ ایسے ہی کسی وقت میں کوئی ناول کسی سے لکھوا کر شائع کرا دیا گیا ہو۔ ابو نے کبھی اس ناول کا تذکرہ نہیں کیا۔ اور نہ اسے اپنی ناولوں کی فہرست میں شامل کیا۔ لیکن اگر ان کی کوئی ایسی تحریر موجود تھی تو وہ کبھی تو تذکرہ کرتے۔ چونکہ الٰہ آباد سے تصانیف کی اشاعت کا معاملہ حسابِ دوستاں در دل والا تھا لہٰذا اس ناول کا حساب بھی ادھر ادھر ہی ہو گیا ہوگا۔ اس لیے اس ناول کی تاریخ اشاعت بہت اہم ہے۔ صرف چند ادوار میں ایسا ہو سکتا ہے جبکہ پاکستان سے مسودہ نہ جا پا رہا ہو۔ یعنی سن اکسٹھ سے سن تریسٹھ تک، سن پینسٹھ کی جنگ کے فوری بعد اور پھر اس کے بعد سقوط مشرقی پاکستان والے زمانے میں۔ سوائے بیماری کے زمانے کے، ہر دور میں تھوڑے ہی دنوں میں متبادل ذرائع ترسیل ڈھونڈ کر مسودہ فراہم کیا جاتا رہا ہے۔ اس تحقیق کے سرے ان خطوط پر الٰہ آباد ہی میں مل سکتے ہیں۔ بہر حال فی الحال ان حقائق کے زیرِ نظر اس بات پر تو متفق ہونا پڑتا ہے کہ یہ ناول ابن صفی کا لکھا ہوا نہیں ہے۔ تحقیق اس بات کی ہونی چاہیئے کہ یہ کس کا لکھا ہوا ہے اور کن حالات میں اسے نکہت نے شامل اشاعت کیا۔"

(مکتوب بنام جناب محمد حنیف، غیور عالم خان و راقم الحروف)

واضح رہے کہ جناب احمد صفی کی مذکورہ بالا آراء "روشنی کی آواز" کے محض تین صفحات کے مطالعے کے بعد دی گئی ہے۔ یہی خیال جناب محمد حنیف (نگراں کار ابن صفی ڈاٹ انفو) کا بھی ہے۔ تادمِ تحریر، دونوں حضرات اس ناول کا مکمل طور پر مطالعہ کر چکے ہیں۔

الٰہ آباد سے موصول شدہ "روشنی کی آواز" کا سن اشاعت مئی ۱۹۷۱ ہے، اس کے مکمل مسودے کے بغور مطالعے کے بعد چند معروضات اس ضمن میں پیش خدمت ہیں۔ سب سے پہلے تو اس بات کا تذکرہ ضروری ہے کہ ابتدائی تین صفحات ہی نے یہ بات راقم پر واضح کر دی تھی کہ "روشنی کی آواز"، ابن صفی مرحوم کی تحریر نہیں ہے، مکمل ناول کے مطالعے کے بعد راقم یہ کہنے میں عار نہیں سمجھتا کہ۔

۱۔ یہ ایک انتہائی بھونڈی اور کمزور تحریر ہے جس کی کسی ایک بھی سطر سے اس کا تعلق ابن صفی جیسے لازوال مصنف کے ساتھ جوڑنا ایک بد دیانتی سے زیادہ کچھ نہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اس ناول کا کوئی بھی حصہ ابن صفی کی کسی بھی تحریر کے مقابلے میں پیش نہیں کیا جا سکتا۔

۲۔ اس ناول کا لکھنے والا ایک اوسط درجے کی معلومات رکھنے والا شخص تھا۔ سائنسی معلومات میں صفر تھا، نقالی کے فن سے نابلد تھا۔

۳۔ مذکورہ ناول میں اس کے مصنف نے جاسوسی دنیا کے دو یادگار ناولوں "برف کے بھوت" اور "نیلی روشنی" سے اقتباسات نقل کرنے کے بعد ان کو مختلف جگہوں پر 'ٹانکنے' کی بھونڈی کوشش کی ہے۔ بالخصوص "فزارو"، جو ایک تفریحی مقام ہے اور سیتل گھاٹی جہاں ابن صفی مرحوم نے "برف کے بھوت" کے تانے بانے بنے ہیں، ان جگہوں کے نام مذکورہ ناول میں جا بجا استعمال کیے ہیں۔

۴۔ کیپٹن حمید اور کرنل فریدی کے آپس کے فقروں سے مصنف کی موضوع پر کمزور گرفت کی نشان دہی

ہوتی ہے۔

۵۔ کیپٹن حمید کے کردار کو اس بری طرح مسخ کر کے پیش کیا گیا ہے کہ ایک طرف جہاں حمید ایک جنس زدہ شخص کی حیثیت سے سامنے آتا ہے دوسری جانب ناول میں پیش کیے گئے نسوانی کردار کسی قحبہ خانے کی پیداوار نظر آتے ہیں۔ یہاں ابن صفی مرحوم کے ناول ''ڈیڑھ متوالے'' (۱۲ نومبر ۱۹۶۳) کے یادگار پیش رس کے وہ فقرے تازہ ہوتے ہیں جب صفی صاحب نے جعلی لکھنے والوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا تھا ''ان میں سے ایک تو ایسا ہے جس نے فحاشی کی حد کر دی۔ حمید اور فریدی کو بھی...... باز بنا کر رکھ دیا۔''

۶۔ مصنف نے ابن صفی کے گزشتہ ناولوں کا محض سرسری مطالعہ ہی کیا تھا اور بعض مقامات پر تو یہ احساس ہوتا ہے کہ شاید وہ ابن صفی کے فلسفے کو دس فیصد بھی نہیں سمجھتا تھا۔

''روشنی کی آواز'' کن حالات میں لکھا گیا' کیوں لکھا گیا' کس لیے لکھوایا گیا اور ادارہ نکہت کی ایسی کیا مجبوری تھی کہ یہ قدم اٹھانا پڑا' اس تمام باتوں کی وضاحت شاید اب نہ ہو سکے۔ یہ بات بھی حل طلب ہے کہ جب عباس حسینی مرحوم نے ابن صفی کی تین سالہ بیماری کے دوران کسی دوسرے سے ناول نہیں لکھوائے جبکہ اس وقت نکہت کی بقا خطرے میں پڑ گئی تھی تو بہت آگے چل کر ۱۹۷۱ میں ایسا کیوں کیا گیا؟

مذکورہ ناول کی ورق گردانی سے سامنے آنے والی چند مزید باتوں کی نشان دہی ضروری ہے۔

مصنف نے کرنل فریدی کو محض ایک روایتی پولیس والے کے طور پر سمجھا اور اسی طرح پیش کیا۔ روشنی کی آواز کے کرنل فریدی اور کیپٹن حمید کے آپسی فقرے اور بالخصوص نوک جھونک کا گھٹیا معیار دیکھ کر راقم کے ذہن میں جوش ملیح آبادی کی ''یادوں کی برات'' کا وہ حصہ تازہ ہو گیا جس میں جوش صاحب نے یاد رفتہ کو آواز دینے کی غرض سے لکھنؤ کے سفر کا احوال بیان کیا ہے۔ ریلوے اسٹیشن پر ''اکے'' دیکھ کر ان کی طبیعت اس قدر بگڑی کہ وہ بے اختیار کہہ بیٹھے کہ اگر ان پر سکندر اعظم کو بھی بٹھا دیا جائے تو وہ بھی کسی دیہاتی......کا......معلوم ہو''۔

''روشنی کی آواز'' میں کیپٹن حمید اور ایک نوجوان نسوانی کردار ''سارا'' کے رومان کا منظر پڑھ کر قاری کو یقین نہیں آتا کہ وہ ابن صفی کی کوئی تحریر پڑھ رہا ہے۔ گھاس پر چت لیٹی ہوئی مائل بہ التفات سارا' چاندی رات' تیز تیز چلتی ہوئی اس کی سانسیں اور حمید کے زانو پر رکھا اس کا سر۔ مصنف بھول گیا کہ ابن صفی نے اسی قبیل کے ناولوں کا رستہ روکنے کے لیے جاسوسی ناول نگاری کا آغاز ایک چیلنج کے ساتھ کیا تھا۔ وہ یہ بھول گیا اور انتہائی حیرت کی بات ہے کہ اسے شائع کرنے والا بھی یہ فراموش کر بیٹھا کہ وہ ''روشنی کی آواز'' کو مئی ۱۹۷۱ میں شائع کر رہا ہے جہاں ایک طرف ابن صفی اپنے قاری کو حال ہی میں ''ریگم بالا'' جیسی انتہائی مضبوط پلاٹ کی حامل سیریز کا تحفہ دے چکے ہیں جس میں کردار کی مضبوطی کے اعتبار سے کیپٹن حمید میں ہمیں کرنل فریدی ہی کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔

یہ بات سب جانتے ہیں ابن صفی نے جہاں کرنل فریدی اور کیپٹن حمید کے کرداروں کو کبھی ان کی حیثیت سے کم تر نہیں دکھایا تھا وہاں فریدی کے محکمے کے دیگر کرداروں کا بھی ایک معیار وضع کیا تھا چاہے وہ اس محکمے کا

کوئی ایجنٹ ہی کیوں نہ رہا ہو۔ 'روشنی کی آواز' میں ہوٹل نیو اسٹار کی ریپسپشن نسٹ چالیس پینتالیس برس کی. ایلین کا کردار ایک ایسا کردار ہے جو درحقیقت فریدی ہی کے محکمے کی ایک عورت ہے۔ مصنف نے یہ خیال بھی پرانے ناولوں سے مستعار لیا ہے لیکن ایلین کے کردار کو اس سوقیانہ انداز میں پیش کیا کہ طبیعت بیزار ہو جاتی ہے۔ حمید اور ایلین کی پہلی ملاقات پر پیش کیے گئے ڈائلاگ میں جہاں حمید کسی سڑک چھاپ جنس زدہ انسان کے روپ میں آتا ہے وہاں ایلین بھی غیر ضروری حد تک ایک فاحشہ کے روپ میں نظر آتی ہے۔ ایک جگہ منظر نگاری ملاحظہ ہو۔

''وہ ہر وقت ہوٹل کے نجی ایکسچینج سے حمید کا نمبر ملائے رکھتی، صرف اتنا ہی نہیں بلکہ ڈیوٹی آف ہو جانے کے بعد بھی وہ گھنٹوں حمید کے کمرے میں بیٹھ کر اپنے عشق کا اظہار کرتی رہتی۔ انداز میں کافی بے باکی اور بے جھجک پن (بے جھجک پن نامی ترکیب ابن صفی نے کسی ناول میں استعمال نہیں کی ہے) تھا۔ گفتگو کرتے وقت وہ اس پر بری طرح جھکی پڑتی تھی۔ ایک موقع پر وہ حمید سے اس لہجے میں مخاطب ہے۔ ''نائیں نائیں تم بالکل جھوٹ بولتا ہے ڈارلنگ۔'' مس ایلین حمید کے سینے پر جھک گئی۔ ''ہم تم سے میرج کرے گا۔''

اسی طرح قاسم کا کردار جاسوسی دنیا کا ایک یادگار کردار ہے۔ لیکن روشنی کی آواز میں اس کردار کی بھی نہایت بھونڈے اور بازاری طریقے سے پیش کیا گیا ہے۔ مصنف نے مزاح کے عنصر کو نمایاں کرنے کی سعی میں قاسم کو اس کی ناک پر انگلی، سر اور کمر پر ہاتھ رکھ کر اسٹیج پر ٹھمکے تک لگوا دیے۔ ابن صفی کے دیگر ناولوں کے برخلاف' قاسم بغیر اطلاع کے ناول کے ایک منظر میں جس طرح آیا تھا' اسی طرح غائب بھی ہو گیا۔

ابن صفی ڈاٹ انفو کے نگراں کار جناب محمد حنیف نے مذکورہ ناول کو حرف بہ حرف پڑھا' ذیل میں ان کا تجزیہ بھی پیش کیا جا رہا ہے۔

''میں نے روشنی کی آواز کا مکمل مطالعہ کیا ہے۔ ابن صفی کے ہر ناول سے میں کوئی نہ کوئی دلچسپ پیراگراف اخذ کر سکتا ہوں لیکن باوجود کوشش کے کوئی انتخاب نہ کر سکا۔ مصنف بلاشبہ ہندوستان میں رہائش پذیر ہے جو کہ اس کے اردو کے مختلف الفاظ سے عیاں ہے۔ ایک جگہ ڈانس فلور کے لئے ڈائس کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ اسی طرح صفحہ ۴۰ پر لیڈی جمشید کہتی ہے۔ ''وہ ایسا تھا ساجد کہ......'' یہ ابن صفی کے لکھنے کا طریقہ نہیں۔ صفحہ ۵۸ پر لکھا ہے۔ ''ہال میں لوگ اب ان پر جملے پھینک رہے تھے۔''

واضح رہے کہ یہ ابن صفی کے لکھنے کا طریقہ نہیں۔

صفحہ ۶۰ پر قاسم کئی بار دھپ سے زمین پر گر پڑتا ہے۔ ابن صفی کا قاسم گرنے کے بعد اتنی آسانی سے خود سے نہیں اٹھ سکتا۔ اسی طرح صفحہ ۷۴ پر دو سائے لکھا ہے جبکہ دو سایوں درست ہے۔ صفحہ ۹۵ پر حمید تولیا کاندھے پر ڈالے ہوئے باتھ روم سے نکلتا ہے۔ اس سے قبل ابن صفی نے کسی ناول میں حمید کے سلسلے میں یہ منظر بیان نہیں کیا۔ صفحہ ۹۶ پر فریدی کہتا ہے۔ میں محکمہ سی آئی ڈی سے تعلق رکھتا ہوں۔ فریدی ہمیشہ سنٹرل بیورو آف انٹیلی جنس کا صیغہ استعمال کرتا ہے۔ ان تمام باتوں کے علاوہ ناول کا پلاٹ نہایت کمزور ہے۔ ٹیکم

گڑھ۔سیتل گھاٹی۔میجر نصرت۔قاسم۔یہ سب صرف اور صرف ابن صفی کا انداز اپنانے کی ناکام کوشش کے سوا کچھ بھی نہیں کہ عام قاری آسانی سے دھوکہ کھا سکے۔"

"روشنی کی آواز" کے اندازِ تحریر کے بارے میں احمد صفی راقم کے نام ایک مکتوب میں کہتے ہیں۔

"بہر حال ابو کے طرزِ تحریر سے متعلق تمام نکات پر میں محمد حنیف صاحب اور راشد اشرف سے متفق ہوں۔ اگر دیکھا جائے تو دلیر مجرم اور برف کے بھوت کے زمانے میں بھی ابو کے قلم سے فریدی اور حمید کے مکالمات میں جھول نہیں تلاش کیا جا سکتا۔ابو کے اپنے قول کے مطابق جاسوسی دنیا لکھنا عمران سیریز کے مقابلے میں زیادہ مشکل تھا۔عمران ایک متلون مزاج کردار ہے اور اس کے لیے آپ کچھ بھی لکھ کر صاف بچ نکل سکتے ہیں (اسی لیے آپ کو جعلی صفیوں اور دیگر جعسازوں کے یہاں عمران سیریز تو ملے گی لیکن فریدی پر لکھنے والا کبھی چل ہی نہ سکا)۔فریدی اور تمام متعلقہ کردار اپنی تمامتر نفسیاتی تفصیلات کے ساتھ مکمل ہیں۔اور کوئی بھی ایسی بات جو ان کے کردار سے مطابقت نہ رکھتی ہو پڑھنے والے کو فوراً چبھتی ہے اور وہ کہہ اٹھتا ہے کہ یہ فریدی یا حمید نہیں کہہ یا کر سکتا۔اور یہی زیرِ نظر ناول کے متفرق صفحات کے بارے میں کہا جا رہا ہے۔"

"روشنی کی آواز" کے مطالعے کے بعد اور اندازِ تحریر کے تعلق سے چند مثالوں کو تلاش کرنے کے بعد یہ بات یقین سے کہی جا سکتی کہ یہ اندازِ تحریر ابن صفی کا ہرگز نہیں ہے۔یہاں معیار سے قطع نظر، اسلوب کی بات کو اگر دیکھا جائے تو یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ ابن صفی زبان کی صحت کا ہر ممکنہ خیال رکھتے تھے۔اس زمانے میں اتر پردیش اور الٰہ آباد جو اردو رائج تھی اس میں اور پاکستان میں مروجہ اسلوب کے مابین بہرحال ایک واضح فرق تھا۔ایک مثال دیکھیے۔صفحہ ۱۱۱ پر لکھا ہے۔

"لیڈی جمشید کے ہونٹوں میں بدستور سگار لگا ہوا تھا۔"

ہونٹوں میں سگار "لگا" ہونا ہندوستان کا طرزِ تحریر ہو سکتا ہے، پاکستان کا نہیں۔اور دو مثالوں کی مدد سے یہ ثابت کیا جا سکتا ہے کہ ابن صفی نے فریدی کو سگار پیتے ہوئے دکھایا ہے تو کس طرح منظر کشی کی ہے۔یہ دو مثالیں بالترتیب "نیلی روشنی" اور "ڈاکٹر ڈریڈ" نامی ناولوں کی ہیں جن میں فریدی کے ہونٹوں میں سگار دبا ہوا ہے نہ کہ لگا ہوا۔اس بات کو اس طرح سمجھا جا سکتا ہے کہ جس طرح پاکستانی میڈیا کے اعصاب پر ایک لفظ "حوالہ" سوار ہو گیا ہے، اسی طرح ہندوستان میں جا بجا اور جا بیجا کہا جاتا ہے "اس بات کو لے کر" ڈراموں میں، نیوز چینلز پر......غرض ہر جگہ۔ہمارے یہاں کے کئی لوگ بھی غیر محسوس طور پر اس کا استعمال کرنے لگے ہیں۔مگر کیا ابن صفی ہوتے تو کبھی اپنی تحریر میں اس کا استعمال کرتے......؟ یقیناً اس کا جواب نفی میں ہوگا......!

جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے کہ "روشنی کی آواز" میں کرنل فریدی کا کردار ایک روایتی تھانے دار جیسا ہے۔ابن صفی نے ہمیشہ فریدی کو کسی کیس کی تفتیش کرتے وقت اپنے وضع کردہ اصولوں پر عمل کرتے دکھایا ہے۔ہم سب جانتے ہیں کہ فریدی کے طریقہ کار سے اس کا ڈی آئی جی تک ناواقف ہوتا تھا اور ہمیشہ ناول کے آخر ہی میں محکمے بشمول حمید پر تمام راز عیاں ہوتے تھے۔"روشنی کی آواز" میں کرنل فریدی "چلو تو سارے زمانے کو

ساتھ لے کر چلو' کی تفسیر بنا نظر آتا ہے۔حمید کی بات تو ایک طرف 'ٹیکم گڑھ کی پولیس کا محکمہ بھی فریدی کے طریقہ کار سے واقف ہوتا ہے۔

جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے کہ ۱۹۷۱ آتے آتے تو کیپٹن حمید بھی گویا کرنل فریدی ہی کا پرتو نظر آنے لگا تھا' متانت اس کے مزاج کا حصہ بن چکی تھی (بحوالہ ریگم بالا سیریز۔۱۹۷۱)۔لیکن ''روشنی کی آواز'' میں' جو کہ ۱۹۷۱ میں شائع ہوا' کیپٹن حمید کے فقرے لکھتے وقت مصنف یہ بھول گیا کہ وہ کیپٹن ہے نہ کہ ابتدائی زمانے کا کھلنڈرا سارجنٹ۔''روشنی کی آواز'' سے کیپٹن حمید کے چند فقرے پیش کیے جاتے ہیں۔

☆اچانک گھر سے ٹیلی گرام آگیا کہ میرا ابکرا آج کل کسی کے عشق میں گرفتار ہو گیا ہے اور اس نے اندھا دھند شراب پینی شروع کر دی ہے۔میرا وہاں پہنچنا ضروری ہے۔ہو سکتا ہے نشے کی حالت میں وہ سول میرج کر لے۔

☆(فریدی سے مخاطب ہو کر)۔یقین مانیئے کہ مس ایلن کے لپ اسٹک سے بھرے ہوئے سرخ سرخ ہونٹ دیکھ کر بس رال ٹپک پڑتی ہے۔

☆ایک میری ہی مثال ہے کہ جب تک سونے سے قبل کتے کی بولی نہیں بول لیتا' اس وقت تک مجھے نیند نہیں آتی

☆اچھا آپ وعدہ کیجیے کہ کسی روز میرا بھونکنا ضرور سنیں گی۔

☆میں مچھلی بہت شوق سے کھاتا ہوں۔اس شوق کا آپ کو اسی سے اندازہ ہو جائے گا کہ میں روزانہ صبح کو اپنے سر پر مچھلی کے تیل کی مالش کرتا ہوں۔

☆میں اس وقت دنیا کا احمق ترین انسان دکھائی دیتا ہوں جب خانساماں کدو کی ترکاری پکا کر میرے سامنے رکھ دیتا ہے۔اس وقت میں بالکل الوؤں کی طرح اپنے دیدے نچایا کرتا ہوں مگر زبان سے ایک لفظ نہیں کہہ سکتا کیونکہ خانساماں کا پورا ہولڈ میرے اوپر ہے۔سارا بینک اکاؤنٹ اسی کے نام ہے۔

☆ہو سکتا ہے کہ کھانے کے بیچ میں میری طلب زور کر جائے اور میں بھونکنا شروع کر دوں تو پھر سب گڑبڑ ہو جائے گا۔میں اپنی طلب پر ایک لمحے کے لیے بھی قابو نہیں پا سکتا کیونکہ میری زبان اینٹھنے لگتی ہے اور دونوں کلے بہت بری طرح سے ٹوٹ رہے ہیں۔

☆میں دس میل فی گھنٹہ کی رفتار سے سر کے بل دوڑ سکتا ہوں۔ایک سانس میں پانچ سیر کچی گاجریں چبا سکتا ہوں۔

☆سگرٹ کے دھوئیں سے ہی کچھ تسکین پہنچے گی کیونکہ بڑی دیر سے طلب ''لگی ہوئی'' ہے۔

☆مس ایلن اپنی موٹی کمر لچکاتی ہوئی حمید کے پاس بیٹھ گئی۔حمید نے کہا ''ہم بالکل ٹھیک بولتا ہے۔جو ہم سے لو کرتا ہے اس کا ہارٹ فیل ہو جاتا ہے۔اب تک ففٹی کیس ہو چکے ہیں۔

واضح رہے کہ یہ محض چند مثالیں ہیں۔'روشنی کی آواز' نامی پورا ناول ہی اسی قسم کی فضولیات سے اٹا ہوا ہے۔

فریدی اور حمید کے باہمی مکالمے' کرنل فریدی کو پس قامت ظاہر کرتے ہیں۔ کرنل فریدی اور حمید کے جملوں پر ہنسے؟ ایسا شاذ ونادر ہی ہوا کرتا تھا۔ تبسم زیرلب سے معاملہ آگے کم ہی کم بڑھا کرتا تھا.. حمید کے کسی دلچسپ و بے ساختہ جملے کے ردعمل میں کرنل فریدی کے لیے ابن صفی کا مخصوص پسندیدہ جملہ یہ تھا۔

''فریدی بے اختیار مسکرا پڑا''

لیکن حمید کے بے تکے جملوں پر فریدی جتنی مرتبہ اس ایک ناول میں ہنستا دکھایا گیا ہے' شاید جاسوسی دنیا کے تمام ناولوں میں اتنی مرتبہ نہ ہنسا ہوگا۔ ایک موقع پر وہ حمید سے کہتا ہے ''نہیں بھائی! آج کل ٹیکم گڑھ کے حالات کچھ ٹھیک نہیں ہیں۔'' فریدی۔ نے حمید کو کبھی اس لہجے میں مخاطب نہیں کیا۔ لکھنے والے نے یہ نہیں سوچا کہ کل کا ''برخوردار'' اور ''فرزند'' آج ''بھائی'' کیسے ہوگیا؟

درج بالا پیش کردہ فقرے ہوں یا ''طلب زور کر جائے'...... ''خانساماں کا پورا ہولڈ میرے اوپر ہے''...... ''کلے ٹوٹ رہے ہیں'' جیسا انداز بیاں...... یہ اس قماش کے جملے ہیں جن کا ابن صفی نے اپنے کسی ناول میں تو کجا' کسی متفرق تحریر میں بھی نہیں کیا تھا۔ کیپٹن حمید ابن صفی کا ایک مضبوط کردار ہے۔ کیا ابن صفی کو اس سے یہ کہلوانے کی ضرورت تھی کہ وہ جب تک کتے کی بولی نہیں بول لیتا' اسے نیند نہیں آتی......؟ یہ تو اپنی ہی تحریر' اپنے ہی اسلوب کو اپنی آنکھوں کے سامنے ذبح کرنے والی بات تھی...... قاری کو ہمیشہ کے لیے خود سے متنفر کرنے کے مترادف تھا۔ ابن صفی ایک ذہین قلمکار تھے اور ان کے یہاں اس نوع کے منظر نگاری و بیانیے کی برتنے سے کوئی گنجائش ہی نہیں تھی۔ ان کے تحریر کردہ ۲۴۵ (پاکستان میں) ناولوں میں قطعی طور پر ایسی کوئی دوسری مثال نہیں ملتی۔ یہ گھٹیا اردو کی ایک مثال ہے اور ابن صفی اس قسم کی عامیانہ نثر سے کوسوں دور تھے۔ آج یہ بات کھلے دل سے تسلیم کی جا چکی ہے کہ ابن صفی کی لکھی نثر نے برصغیر پاک و ہند کے قارئین میں اردو سے لگاؤ اور محبت کا راستہ ہموار کیا۔ ان میں بہتیرے آج اعلیٰ عہدوں پر فائز ہیں۔ حال ہی میں (جون ۲۰۱۳) دلی سے اردو بک ریویو کے تحت شائع ہونے والی ضخیم ترین کتاب ''ابن صفی۔ ادبی مشن اور کارنامہ'' میں ہندوستان سے تعلق رکھنے والے کئی پروفیسر حضرات و معروف صحافیوں نے فن اعتراف ابن صفی کیا ہے اور یہ کہا ہے کہ وہ آج ابن صفی کی نثر کی بدولت ہی یہ مقام حاصل کر پائے ہیں۔ اگر ابن صفی اسی قسم کی نثر لکھتے جیسی مثالیں اوپر درج کی گئی ہیں تو ان کا شمار بھی ان لوگوں ہی میں ہوتا جو وقت کے ساتھ ساتھ بھلا دیے گئے اور آج جن کے ناموں سے بھی کوئی واقف نہیں ہے۔ اگر روشنی کی آواز ابن صفی ہی کا ناول ہوتا تو ان سطور کے راقم کو یہ مضمون لکھنے کی ضرورت کبھی پیش نہ آتی۔ اس لیے کہ ابن صفی' ابن صفی کبھی نہ کہلاتے۔

''روشنی کی آواز'' کا ماہ و سن اشاعت مئی ۱۹۷۱ ہے۔ یہ سقوط ڈھاکہ کا سال تھا۔ حالات مذکورہ سال کے اوائل ہی سے بگڑنا شروع ہو گئے تھے۔ ۲۵ مارچ سے ان میں شدت آئی تھی۔

اگر عمران و جاسوسی دنیا کے ناولوں کے ماہ و سن اشاعت کا جائزہ لیا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ اس شورش زدہ سال میں پاکستان سے عمران سیریز کا ناول نمبر ۶۰ ''پہاڑوں کے پیچھے'' ۱۸ مارچ ۱۹۷۱ کو شائع ہوا

تھا جبکہ ناول نمبر ۶۱ ''بزدل سورما'' ۲۱ اکتوبر ۱۹۷۱ کو شائع ہوا تھا' دوسری جانب جاسوسی دنیا کا ناول نمبر ۱۱۰ ''اجنبی کا فرار'' ۴ جنوری' ناول نمبر ۱۱۱ ''روشن ہیولی'' یکم جون جبکہ ناول نمبر ۱۱۲ ''زردفتنہ'' ۱۶ اگست ۱۹۷۱ کو شائع ہوا۔ زیر نظر مضمون میں احمد صفی کا بیان نقل کیا گیا ہے جس میں وہ کہتے ہیں کہ ''صرف چند ادوار میں ایسا ہوسکتا ہے جبکہ پاکستان سے مسودہ نہ جا پا رہا ہو۔ یعنی سن اکسٹھ سے سن تریسٹھ تک' سن پینسٹھ کی جنگ کے فوری بعد اور پھر اس کے بعد سقوط مشرقی پاکستان والے زمانے میں''

مذکورہ بالا مثالوں کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ کراچی سے الٰہ آباد مسودے کی ترسیل میں درپیش مسائل کی بنا پر جناب عباس حسینی نے ''روشنی کی آواز'' کا انتخاب کیا گیا ہو۔ عباس حسینی نے ایسا کیوں کیا تھا۔ اس بات کا جواب اب کبھی نہ مل سکے گا۔ ہاں' یہ ضرور ہے کہ ہندوستان میں قیام پذیر عباس حسینی و ابن صفی کے دوست مجاور حسین رضوی اس کی کوئی تاویل پیش کرسکیں کہ وہ نکہت الٰہ آباد کی ٹیم کے واحد اہم ترین شخص ہیں جو اس وقت حیات ہیں۔

'روشنی کی آواز' کے رد میں ایک اہم ترین نکتہ یہ بھی ہے اگر یہ واقعی ابن صفی ہی کا ناول ہوتا تو اس کے بعد کے ناولوں میں بھی یہی اسلوب اور یہی ڈائیلاگ دیکھنے میں آتے۔ اس دعوی کی پرکھ کے لیے جاسوسی دنیا کے ناول روشن ہیولی اور زردفتنہ دیکھے جاسکتے ہیں جو مئی ۱۹۷۱ کے فوراً بعد شائع ہوئے تھے۔ مذکورہ ناول بلاشبہ یادگار ناول کہلائے جاتے ہیں اور ان میں وہی رنگ نمایاں ہے جس کے لیے ابن صفی شہرت رکھتے تھے۔

ڈیڑھ متوالے کے پیشرس میں ابن صفی نے لکھا تھا۔ ''پھر جب میری صحت یابی کی خبریں اخباروں میں چھپنے لگیں تو یار لوگوں نے یہ شوشہ چھوڑا کہ میرے اور عباس حسینی صاحب کے تعلقات خراب ہوگئے ہیں۔ اب بھارت میں میری کتابیں ان کے ادارے سے شائع نہیں ہوں گی۔ ان بیچاروں کو یہ نہیں معلوم کہ ایک درجن کتابیں تو میں عباس حسینی کی مسکراہٹ ہی پر قربان کرسکتا ہوں (بشرطیکہ کسی بات پر جھینپ کر مسکرائے ہوں)''

ابن صفی مرحوم کے پاس ان کے ناولوں کے الٰہ آباد ایڈیشن بھی پہنچتے تھے۔ گمان ہے کہ ابن صفی ''روشنی کی آواز'' کی اشاعت کی خبر سے واقف نہیں ہوں گے۔ اگر ہوتے ...... اسے پڑھتے ...... تو شاید عباس حسینی مرحوم کو سچ مچ جھینپ کر مسکرانا ہی پڑتا .... اور صفی صاحب کو ان پر ایک درجن کتابیں قربان کرنے کا موقع مل ہی جاتا ......!

اُردو میں مقبول ادب اور سائنس فکشن کے روح رواں ابنِ صفی

پروفیسر مجید بیدار۔ ہندوستان

سنجیدہ ادب درحقیقت انسان کی ایجادی صلاحیتوں کا علمبردار ہوتا ہے اور ایسے ادب کے ذریعے نہ صرف ذہن کی پرتیں کھلتی ہیں بلکہ قاری کے علم و اکتساب میں اضافہ بھی ہوتا ہے۔ چنانچہ سنجیدہ ادب کی اہمیت و افادیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ سنجیدہ ادب کے ساتھ ساتھ آج کی دنیا میں مقبول ادب یا پاپولر لٹریچر کی اصطلاح کو بھی مقبولیت حاصل ہو رہی ہے۔ جو درحقیقت عام انسانوں کی فکر وفہم اور ان کی دلچسپی کی نمائندگی کرتا اور انسان کو تفریحی ماحول سے وابستہ کرتا ہے۔ لازمی ہے کہ تفریحی ماحول صرف ہنسی مذاق کا پروردہ نہیں بلکہ اس کے توسط سے بھی سنجیدہ معاملات کی عکاسی ممکن ہے۔ طویل عرصے تک اردو میں ''جاسوسی ادب'' کو غیر معیاری اور انسانی تجسسات کو بڑھانے والا تصور کر کے اس میں موجود ٹوہ کی صلاحیت کی وجہ سے اس کی اہمیت سے انکار کیا جاتا رہا لیکن آج کے ترقی یافتہ زمانے میں یہ بات واضح ہوگئی ہے کہ انسانی تجسّس نے نئی نئی ایجادوں اور ترقیات کے دروازے کھول دیئے ہیں۔ اس لئے ایسا ادب جو تفریحِ طبع کے ساتھ ساتھ ذہنی گرہوں کو کھولنے کا سبب بنتا ہے اسے بلا شبہ اہمیت کا حامل سمجھا جانا چاہیے اور ایسا ادب مقبول ادب یا پاپولر لٹریچر کی حیثیت سے شناخت رکھتا ہے۔ اگرچہ اردو نثر میں انگریزی ناولوں کے ترجمے کی وجہ سے جاسوسی ادب اور مقبول ادب کا سلسلہ شروع ہوا۔ تیرتھ رام فیروز پوری اور رام سروپ کے جاسوسی ناول انتہائی مقبول ہوئے لیکن اردو کے جاسوسی ادب کے بے تاج بادشاہ ابن صفی اس وجہ سے اہمیت کے حامل ہو گئے کہ انہوں نے سائنس فکشن کے توسط سے ایسے مقبول ادب کی بنیاد رکھی جس میں سراغ رسانی اور تفتیش کے جدید رویوں کے علاوہ انسانیت کو بچانے کے جدید تقاضوں کی نمائندگی ہوتی ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ قتل وخوں اور غارت گری کے علاوہ اخلاق سوز حرکات کی کسی ناول میں نمائندگی کی جائے تو اس قسم کے ناول کی وجہ سے منفی اثرات مرتب ہونے کے امکانات قوی ہوتے ہیں لیکن ایسے ناولوں کا دوسرا پہلو یہ بھی ہوتا ہے کہ جب قاتل نئے نئے طریقوں سے اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کرے تو انسان اپنی ذہنی صلاحیتوں کے توسط سے اس کی غلط روش کو نہ صرف ہدف بنا سکے بلکہ اس کی سرکوبی کا طریقہ بھی اختیار کر سکے۔ ابن صفی کے جاسوسی ناولوں میں اسی انداز کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ وہ نہ صرف ایک انسانیت دوست قلم کار ہیں بلکہ اپنے رویے کے ذریعے دنیا میں بڑھتی ہوئی بے اعتدالی' بے راہ روی اور دہشت گردی کو ختم کرنے کے لئے مقبول ذرائع کا استعمال کر کے انسان کو اخلاق اور تہذیب سے وابستہ رکھنا چاہتے ہیں۔ یہی وہ قیمتی وصف ہے جو ابن صفی کے ناولوں میں قتل وخون اور غارت گری کے علاوہ مار دھاڑ کے منظر کی نمائندگی کرنے کے باوجود انسانیت کو صلاح اور فلاح سے ہم آہنگ کرنے کی خصوصیات کو نمایاں کرنے کے اعزاز کی دلیل بنتا ہے۔ ابن صفی نے جاسوسی

ناولوں میں جہاں تفتیش کرنے والے نمایاں کردار جیسے فریدی اور عمران کے توسط سے ایک جانب حقیقت کی تلاش کی طرف توجہ دی تو دوسری جانب حمید اور قاسم کے کرداروں کے علاوہ سینئر پولیس کے عہدہ دار آصف کے توسط سے ناولوں میں طربیہ عناصر کی نشاندہی بھی کی۔ محبت کی بے لوث نمائندگی کے لئے انور اور رشیدہ کے کرداروں کو پیش کر کے ابن صفی نے مرد اور عورت کی چاہت کے بے مثال نمونے پیش کیے۔ عورت کے روپ میں جولیانا فٹز واٹر اور مادام تھریسیا کے کردار میں ان تمام تفتیشی عناصر کو شامل کر دیا جو درحقیقت یوروپی عورت کے بدلہ لینے کے جذبے اور ٹوٹ کر چاہنے کی خصوصیت کے علمبردار ہیں۔ اگر چہ ابن صفی کے بیشتر ناول سائنس فکشن کی نمائندگی کرتے ہیں لیکن ''دھواں ہوئی دیوار'' کے علاوہ ''شعلوں کا ناچ'' اور ''جہنم کا شعلہ'' ایسے ناول ہیں جن میں سائنس فکشن کی بھرپور نمائندگی دکھائی دیتی ہے۔ فریدی کے کردار میں ابن صفی نے ان اوصاف کو یکجا کر دیا ہے جو مرد کے وقار اور اس کی قوامیت کی دلیل ہے جس کے نتیجے میں حمید نے اسے کرنل ہارڈ اسٹون کے خطاب سے نوازا ہے۔ ابن صفی کے ناولوں میں حمید کا کردار اگر چہ مضحک رویوں کا علمبردار ہے لیکن اس کے رویے میں عام انسان کی موقع پرستی نمایاں ہونے لگتی ہے۔ جب کہ ابن صفی نے قاسم کے کردار کو اس درجہ نمایاں کیا ہے کہ بلاشبہ رتن ناتھ سرشار کے ناول کے کردار میاں خوجی کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ اور یہ حقیقت بھی کھل کر سامنے آتی ہے کہ ابن صفی نے اردو ناول نگاری کی تاریخ کو فریدی، حمید، انور اور قاسم جیسے کردار سے وابستہ کر کے ناول نگاری کی تاریخ میں بیش بہا اضافہ کیا ہے جس سے ان کی مقبول ادب سے وابستگی اور ناولوں میں سائنس فکشن کی شمولیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

اسرار احمد کے نام سے شاعری اور خواتین کے ادب سے دلچسپی رکھنے والے ادیب نے جب پہلی مرتبہ جاسوسی ناولوں کی طرف توجہ دی تو الہ آباد سے شائع ہونے والے ماہنامہ ''نکہت'' اور ''جاسوسی دنیا'' جیسے رسالوں میں سب سے پہلے ان کے ناولوں کی پذیرائی ہوئی اور اسرار احمد نے ابن صفی کے نام سے شہرت حاصل کی۔ ان کے قلم کی روانی کا یہ عالم تھا کہ بیک وقت ''نکہت'' اور ''جاسوسی دنیا'' کے لیے ہر ماہ ایک ایک ناول لکھ کر جاسوسی ادب کی نمائندگی کرتے رہے۔ اگر چہ ابن صفی کے عہد میں ہی کئی دوسرے جاسوسی ناول نگاروں نے اسی نہج پر اپنے قلم کی جولانی دکھائی اور جاسوسی ادب کی نمائندگی کرنے والے رسالوں کی بھی کثرت ہوگئی چنانچہ دہلی سے ''مجرم'' شائع ہونے لگا اور قانون داں۔ ایم۔ اے۔ کی جاسوسی تحریریں توجہ کا ذریعہ بن گئیں اور کئی اردو کے ناول نگاروں نے جاسوسی ادب کی طرف توجہ دی جس کے نتیجے میں عجیب و غریب دنیاؤں کی سیر پر مبنی ناول لکھے گئے جن میں اظہار اثر، سراج انور اور سلامت علی کے ناولوں کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ''ستاروں کی سیر'' ''ستاروں کے قیدی'' ''خوفناک جزیرہ'' ''کالی دنیا'' اور ''زمرد'' جیسے ناولوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ ابن صفی نے جس دور میں جاسوسی ناول کو عوامی توجہ کا مرکز بنایا اسی عہد میں اردو کے بیشتر ناول نگاروں نے سائنس فکشن کی طرف توجہ دی لیکن ایسے ناول نگاروں کے قلم سے جو ادب فروغ پانے لگا اس کی حیثیت Saga ہوگئی۔ خود کرشن چندر کے ناول ''الٹا درخت'' اور ''ایک گدھے کی سرگذشت''

بھی ساگا کی سرشت میں شامل ہیں جب کہ ''خوفناک جزیرہ'' ''کالی دنیا'' کے علاوہ ''زمرد'' کو بھی ساگا ناول میں شمار کیا جاتا ہے۔ ابن صفی نے اپنے ناولوں میں ساگا کی خصوصیات کی بجائے تفتیش اور سراغ رسانی کے عوامل کو شامل کر کے ان تمام جدید رویوں کو ناولوں کی زینت بخشی جو درحقیقت سائنسی ترقیات کے نتیجے میں سراغ رسانی کا وسیلہ بن چکے ہیں۔ اس کے علاوہ ابن صفی نے سائنسی ایجادات سے بھرپور استفادہ کرتے ہوئے اپنے ناول کے کرداروں میں ایجادی صلاحیتوں کو بروئے کار لایا ہے چنانچہ ان کے بیشتر ناولوں میں فریدی اور عمران کے کردار جہاں ایک عام انسان کی زندگی بسر کرتے ہیں وہیں سراغ رسانی اور تفتیش کے نئے نئے طریقے اختیار کر کے نہ صرف قاری کو حیرت میں ڈال دیتے ہیں بلکہ اندازہ ہوتا ہے کہ ان دونوں کرداروں نے اپنی ذہنی صلاحیتوں کا استعمال کر کے عام قاری کی ذہنی صلاحیت کو بھی بلند پروازی عطا کی ہے۔ ایک دور تھا کہ ابن صفی کے مقبول ادب کا یہ عالم تھا کہ ہر اردو کا قاری ان کے ناولوں کا منتظر رہتا تھا۔ ان کا ناول ''شوگر بینک'' کی اشاعت سے پہلے ہی اس ناول کی بے شمار کاپیاں پہلے سے بک ہو چکی تھیں۔ ابن صفی نے صرف ناول نگاری اور مقبول ادب کی طرف ہی توجہ نہیں دی بلکہ سائنس فکشن کو اردو میں متعارف کرواتے ہوئے زبان و بیان کی خدمت بھی انجام دی۔ ان کے ناولوں میں جہاں شعر و ادب کی آبیاری کا تصور ملتا ہے وہیں پیروڈی کی خصوصیات بھی جلوہ گر ہیں۔ ان کے ناولوں کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ روایات کے پاسدار اور ادب میں جدید تجربوں کے حد درجہ مخالف ہیں اور انہوں نے ایشیائی تہذیب کو اپنے سینے سے لگائے رکھا ہے۔ اس کے علاوہ ہندوستانی تہذیب ان کے ناولوں میں رچی بسی بلکہ چلتی پھرتی دکھائی دیتی ہے اور انہوں نے ہر ناول میں اپنے تفتیشی رویے کے علاوہ سائنس فکشن کے توسط سے ظلم و بربریت اور قتل و خون و غارت گری کی ازلی شکست کا بھرپور نمونہ پیش کیا ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی ایک اہم رویہ ہے کہ ابن صفی نے اپنے جاسوسی ناولوں کے توسط سے جہاں اس ملک کی تہذیب کو مقبول ادب کے توسط سے نمائندگی دی ہے وہیں ہندوستانی رسم و رواج اور ملی جلی معاشرت کی بھرپور نمائندگی کی ہے۔ گو کہ انہوں نے پاکستان میں سکونت اختیار کر لی تھی اور وہ تمام ناول پڑوسی ملک میں بیٹھ کر لکھا کرتے تھے لیکن ان کے کسی ناول میں بھی سرحدی اختلافات اور ملکی سازشوں کی طرف نشاندہی نہیں ملتی بلکہ وہ اپنے جاسوسی ناولوں میں انگریزوں کے شاطر رویے اور ان کی وجہ سے ساری دنیا میں پھیلنے والی بدامنی کا ضرور اظہار کرتے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ ابن صفی نے اپنے ناولوں میں مقبول ادب اور سائنس فکشن کی بھرپور نمائندگی کی لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ابن صفی عالمی برادری کے روح رواں ہیں اور انہوں نے ساری انسانیت کے دکھ کو قصے کہانی میں بیان کر کے کرداروں کے توسط سے مسائل کے حل کی طرف توجہ دی ہے اور یہ مسائل سماجی، معاشی اور معاشرتی مسائل سے زیادہ سراغ رسانی اور انٹلی جنس سے متعلق ہیں اور یہ بھی حقیقت ہے کہ سماج اور معاشرے میں انصاف نہ ملنے کی وجہ سے کوئی انسان ظلم و زیادتی یا پھر تشدد کا شکار ہوتا ہے۔ غرض ابن صفی کے ناول جاسوسی ادب کے نمائندہ ہیں لیکن ان ناولوں میں انسانی طرز معاشرت اور

مشرقی حسیت اپنا اثر دکھاتی ہے جس کے ساتھ ہی ابن صفی نے ان ناولوں کے ذریعے مستقبل شناسی کا کارنامہ بھی انجام دیا ہے۔ بلاشبہ جس دور میں ابن صفی نے ناول لکھے وہ دور قتل وخون اور ظلم وزیادتی سے اس قدر وابستہ نہ تھا جتنا کہ آج کا دور دہشت و بربریت کا غماز ہوتا جارہا ہے۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ابن صفی نے مستقبل میں انسانی روش کی شناخت کرلی تھی اسی لیے انہوں نے جاسوسی ناولوں کے توسط سے انسانی شعور کو بیدار کرنے کی کوشش کی اور ان کے ناولوں نے ایک عہد کے اہم طبقے کو متاثر کیا اور ناولوں کو جدید سائنسی ایجادات اور تجربات سے مالا مال کرکے انہوں نے مقبول ادب اور سائنس فکشن کی روایت کو فروغ دیا ۔غرض جب تک اردو ادب زندہ رہے گا ابن صفی کے ناولوں اور ان کے کارناموں کو مقبول ادب اور سائنس فکشن کی حیثیت سے شہرت حاصل رہے گی۔

بقلم خود

زریں قمر

محترم ابن صفی کے بارے میں مختلف مکتبہ ہائے فکر افراد کی آراء پر مشتمل سروے مکمل کیا ہی تھا کہ میرے ذہن میں خیال کا ایک کوندا لپکا کیوں نہ ان کی تحریروں کے بارے میں خود ان کے خیالات بھی معلوم کیے جائیں کیونکہ اب وہ ہمارے درمیان موجود نہیں ہیں تو ان کی تحریروں ہی کو ہم نے ذریعہ بنایا کیونکہ جب تک وہ زندہ رہے لوگوں کے اعتراضات اور مطالبات کے جواب اپنے ناولوں کے دیباچے میں دیتے رہے۔ چنانچہ ہم نے ان کے تقریباً سوا سو ناول اکٹھا کیے اور ان کے دیباچوں کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد زیر نظر مضمون مرتب کیا۔

لوگ عموماً ان سے سوال کرتے تھے کہ انہوں نے سری ادب ہی کو کیوں منتخب کیا۔ دیگر رائج موضوعات مثلاً عشق و محبت پر کیوں نہیں لکھا؟ تو اس کا جواب انہوں نے عمران سیریز کے ایک سو چھبیسویں ناول لاشوں کا بازار کے دیباچے میں یوں دیا۔

''میں نے کوشش کی ہے کہ پڑھنے والوں کے مشوروں پر پوری طرح عمل کیا جائے لیکن بعض مشورے ایسے بھی ہوتے ہیں جنہیں میں قابل اعتنا نہیں سمجھتا' کیونکہ میرا اپنا معیار بھی تو کوئی چیز ہے' یہ مشورے جن پر میں کان نہیں دھرتا زیادہ تر عشقیہ اور جنسی ناولوں کے لیے ہوتے ہیں۔ میں ان پر کان یوں نہیں دھرتا کہ یہ سب میرے بس کا روگ نہیں' نہ میں افلاطونی عشق کا قائل ہوں اور نہ جنسی بے راہ روی کا۔ لہٰذا آپ کو میرے ناولوں میں نہ لیلیٰ مجنوں کی کہانیاں مل سکتی ہیں اور نہ کسی ڈان ژون کی داستان۔ ویسے میری جاسوسی ناول نویسی کی داستان ہی اس داستان سے شروع ہوتی ہے۔

''غالباً ۱۹۵۲ء کی بات ہے۔ اچھے خاصے پڑھے لکھے آدمیوں کی ایک نشست میں کتابوں اور مصنفوں کی مقبولیت کے بارے میں بحث چھڑ گئی' ایک صاحب کہنے لگے کہ جنسی لٹریچر کے علاوہ اور کسی کی مارکیٹ نہیں ہے اور نہ ہو سکتی ہے۔ بس اسی دن سے مجھے دھن ہو گئی کہ کسی طرح جنسی لٹریچر کا سیلاب رکنا چاہیے۔ کافی سوچ و بچار کے بعد یہ طے پایا کہ جدید طرز پر جاسوسی ناولوں کا ایک سلسلہ شروع کیا جائے لہٰذا جاسوسی دنیا کی داغ بیل ڈال دی گئی۔ اس وقت اردو کے جاسوسی لٹریچر میں آنجہانی تیرتھ رام فیروز پوری کے تراجم یا محترم ظفر عمر حیات کے چند ناولوں کے علاوہ کچھ بھی نہ تھا لیکن جاسوسی دنیا کے اجراء کے تقریباً چھ ماہ بعد ہی ہندو پاکستان میں جاسوسی لٹریچر کا سیلاب آ گیا۔ اور آج میں ان صاحب سے پوچھتا ہوں کہ جنسی لٹریچر کا وہ سیلاب کہاں ہے؟ مگر ان کی آواز میرے کانوں تک نہیں پہنچتی۔

الٰہ آباد کی جاسوسی دنیا سے ابن صفی نے اپنے فنی سفر کا آغاز کیا۔ ہر ماہ ایک ناول شائع ہونے لگا اور ان کے

ناولوں اور ان کے منفرد انداز نے اتنی شہرت حاصل کی کہ ان کا جوبلی نمبر شائع ہونے کی باری آ گئی۔ اس زمانے میں جاسوسی دنیا کے دیباچے عباس حسینی صاحب لکھتے تھے۔ ''دہرا قتل جناب ابن صفی کا ۶۲ واں ناول تھا۔ اس کے دیباچے میں عباس حسینی صاحب ابن صفی کے متعلق لکھتے ہیں۔

''خوفناک ہنگامہ'' جاسوسی دنیا کا جوبلی نمبر جس شان وشوکت سے نکلا اسی طرح اس کا خیر مقدم بھی کیا گیا۔ لوگوں کے انتظار اور جاسوسی دنیا سے محبت کا وہ نظارہ قابل دید تھا۔ جب ناول شائع ہونے سے قبل دفتر میں ہزاروں شائقین کے سوالیہ چہرے گھومنے لگے۔ ''جوبلی نمبر آیا؟'' یہ سوالیہ لحجہ شدت اختیار کرتا گیا جوبلی نمبر کی اشاعت اردو میں بے شک ایک نئے باب کا اضافہ ہے اور یہ حقیقت ہے کہ ابن صفی کا سحر طراز قلم ہمیشہ نئی چیزیں اور نئے واقعات سامنے لاتا ہے۔

''ایشیا کا واحد ناول نگار ابن صفی دنیا کا واحد مصنف ہے جو مزاح، رومان، تحیر، استعجاب، ہوشربا، سنسنی خیز، بھیانک اور جرائم سے متعلق واقعات کو ایک سانچے میں ڈھال دیتا ہے۔ اس کا جواب اردو ادب میں ہی نہیں عالمی ادب میں بھی نہیں ہے۔ ابن صفی پچیس ناول پیش کر کے اپنا یہ چیلنج منوا چکا ہے کہ وہ اپنی طرز کا واحد ادیب ہے۔'' عباس حسینی!!

عباس حسینی صاحب نے اتنی جرات تو کی کہ ابن صفی کو دنیا کا واحد ناول نگار کہا ہے جس نے جرائم سے متعلق واقعات کو ایک سانچے میں ڈھال دیا ہے اور انہیں اپنی طرز کا واحد ادیب کا اعزاز دیا ہے۔ حالانکہ بعض افراد انہیں ادیب کا درجہ دینے کے بھی سخت مخالف ہیں۔ ان کی زندگی میں بھی یہ بات متنازعہ ہی رہی کہ ابن صفی ایک اچھے ادیب ہیں۔

''ساتواں جزیرہ'' میں وہ ایک صاحب کے اسی طرح کے سوال کا جواب یوں دیتے ہیں۔

''اس بار ایک صاحب نے ایک دلچسپ خواہش کا اظہار کیا ہے فرماتے ہیں آپ جب اتنا اچھا لکھ سکتے ہیں تو ادبی انعام کے لیے کوشش کیوں نہیں کرتے۔ خاص طور پر ایک ناول اس کے لیے بھی لکھیے، میرا دعویٰ ہے کہ آپ کامیاب رہیں گے۔

''جناب عالی! میرا سب سے بڑا انعام یہی ہے کہ آپ میری کتابیں پسند کرتے ہیں انہیں حرف بہ حرف اس طرح پڑھتے ہیں کہ بعض عبارتیں ازبر ہو جاتی ہیں اور آپ بے تکان ان کے حوالے اپنے خطوط میں دیتے ہیں اور مجھے متعدد کتابیں الٹنی پڑتی ہیں کہ میں نے یہ چیز کب اور کہاں لکھی تھی۔

''ویسے ایک بات ہے آپ کسی ''پبلک چونی فنڈ'' سے کوئی ایسا ادارہ قائم کیجیے جو اچھی ادبی تخلیقات پر انعام دے سکے تو میں اس کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا دوں گا کیونکہ اس کی نوعیت قومی ہو گی لیکن شخصی انعام کا تصور بھی میرے لیے توہین آمیز ہے یا پھر شخصی انعام کی کوشش اس صورت میں کر سکوں گا جبکہ اس کا تعلق کسی بہت بڑے عالم یا دانشور کی ذات سے ہو کیونکہ علما کے مقابلے میں تو میں زندگی بھر خود کو کمتر ہی محسوس کرتا رہوں گا۔''

اس کے علاوہ ''ریگم بالا'' میں اس مسئلے کو پھر چھیڑا گیا ہے۔''اس بار پھر ایک صاحب نے ادب میں میرے مقام کا مسئلہ چھیڑا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ میں ''ادیب'' نہ سہی لیکن ''مشاہیر'' کے ساتھ میرا نام بھی لیا جا سکتا ہے۔ میں ان سے متفق نہ ہوتا لیکن اسی دوران کراچی کا ایک ماہنامہ نظر سے گزرا جس میں معلومات عامہ سے متعلق ایک سوالنامہ شائع ہوا ہے اس کا پانچواں سوال اس طرح شروع ہوتا ہے۔ کیا آپ کو ان مشہور شخصیات کے اصل نام یاد ہیں۔ (ا) داتا گنج بخش (ب) حافظ شیرازی (ج) مولانا ابوالکلام آزاد (د) فردوسی (س) شیر شاہ سوری (ط) شوکت تھانوی (ہ) بھولو پہلوان (ی) ابن صفی۔ ملاحظہ فرمایا آپ نے مرتب کی کوشش...... ہے مجھ میں اتنی ہمت کہ بھولو پہلوان صاحب کو بیچ سے ہٹا کر شوکت تھانوی کے برابر کھڑا ہو سکوں۔ ایک ادبی بزرگ سے اس زیادتی کا شکوہ کیا تو بڑی سنجیدگی سے بولے۔''تم دنیائے ادب کے بھولو پہلوان ہو اس لیے ریاض جاری رکھو فضول باتوں میں نہ پڑو دنگل ہو کہ قلم کی بازی گری سب پیٹ کے لیے ہے۔ اس (مرد قلندر) کی بات دل کو لگی اور یہ حقیر پر تقصیر بہ طیب خاطر دھندے سے لگ گیا۔ بہر حال کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اب اس قصے کو ختم کیجیے، نہ مجھے ادیبوں میں تلاش کیجیے نہ مشاہیر میں، آپ تو بس یہ دیکھا کیجیے کہ کس کتاب میں کس حد تک آپ کا جی بہلانے میں کامیاب ہوا ہوں اور مجھے لکھ بھیجا کریں۔''

''ادب'' ہی سے متعلق ایک اور دیباچہ میری نظر سے گزرا۔ یہ ''تیسری ناگن'' کا دیباچہ ہے اس میں ابن صفی لکھتے ہیں۔

''اس کے بعد ان خطوط کا نمبر آتا ہے جن میں مجھ سے فرمائش کی گئی ہے کہ میں ''ادب'' کی بھی کچھ خدمت کروں، عجیب بات ہے کہ جب میرا کوئی ناول بہت پسند کیا جاتا ہے تو مجھ سے ''ادب'' کی خدمت کرنے کی فرمائش ضرور کی جاتی ہے۔ بھائی آپ تو صرف مجھے اردو کی خدمت کرنے دیجیے (اس کے باوجود کہ صرف ونحو کی غلطیاں مجھ سے بھی سرزد ہوتی ہوں گی) آپ میری اس وقت کی خوشی کا اندازہ نہیں لگا سکتے جب مجھے کسی سندھی یا بنگالی بھائی کا خط بہ ایں مضمون ملتا ہے کہ محض آپ کی کتابیں پڑھنے کے شوق کی وجہ سے اردو پڑھ رہا ہوں۔ پڑھ کر سنانے والوں کا احسان کہاں تک لیا جائے۔ اب بتایئے میں ''ادب'' کی خدمت کروں یا میرے لیے ''اردو'' ہی کی خدمت مناسب رہے گی۔ ویسے اپنے نظریات کے مطابق میں ادب کی بھی خدمت کر رہا ہوں، سوسائٹی کی بھی اور میری اس خدمت کا انداز نہ تو بدلتے ہوئے حالات سے متاثر ہوتا ہے اور نہ وقتی مصلحتوں کے تحت کوئی دوسری شکل اختیار کر سکتا ہے۔ بہر حال میں قانون کا احترام کرنا سکھاتا ہوں۔

''کچھ لوگ'' ادب میں میرے مقام کی بات شروع کر دیتے ہیں۔ اس سلسلے میں عرض ہے کہ آپ کی نظروں میں میرا کوئی نہ کوئی مقام ضرور ہے ورنہ آپ کو اس کی فکر ہرگز نہ ہوتی۔

''ویسے اگر آپ ''ادب میں مقام'' کے سلسلے میں مجھ سے کچھ سننا ہی چاہتے ہیں تو سنیے۔ اساطیری کہانیوں سے لے کر مجھ حقیر کی کہانیوں تک آپ کو ایک بھی ایسی کہانی نہ ملے گی جس میں جرائم نہ ہوں...... اور آج بھی

آپ جسے بہت اونچے قسم کے ادب کا درجہ دیتے ہیں اور جس کا ترجمہ دنیا کی دوسری زبانوں میں بھی آئے دن ہوتا رہتا ہے کیا جرائم کے تذکروں سے پاک ہوتا ہے؟ کیا اس کے مضر رساں پہلوؤں پر ہمارے نقاد کی نظر پڑتی ہے؟ اگر نہیں...... تو کیوں؟ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ مجرمانہ ذہنیت رکھنے والے لوگ کہانیوں میں بھی (جو دراصل ذہنی فرار کا ذریعہ ہوتی ہیں) پولیس یا جاسوس کا وجود نہیں برداشت کر سکتے' چلیے پولیس کو اس لیے برداشت کرلیں گے کہ وہ للکار کر سامنے آتی ہے لیکن جاسوس تو بے خبری میں پتا نہیں کب گردن دبوچ لے۔ لہٰذا اگر مجھے ادب میں کوئی مقام پانے کی خواہش ہے تو جاسوس کو چھٹی دینی پڑے گی۔ لیکن میں اس پر تیار نہیں کیونکہ مجھے ہر حال میں شر پر خیر کی فتح کا پرچم لہرانا ہے۔ میں باطل کو حق کے سامنے سربلند نہیں دکھانا چاہتا' میں معاشرے میں مایوسی نہیں پھیلانا چاہتا...... ایسی مایوسی جو غلط راستوں پر لے جائے۔

بس تو پھر آپ بھی مقام وقام کا چکر چھوڑیے اور مجھے وہیں رہنے دیجیے جہاں میں ہوں' اگر آپ کو میری کہانیاں پسند ہیں اور آپ یہ محسوس کرتے ہیں کہ میں آپ کے تھکے ہوئے ذہنوں کے لیے معیاری تفریح مہیا کر رہا ہوں تو میں اسی پر مطمئن ہوں۔''

''ابن صفی نے اتنا لکھا اور اتنا ڈوب کر لکھا کہ انہیں اپنی صحت کا بھی خیال نہیں رہا اور وہ سخت بیمار ہو گئے اور یہ بیماری اس حد تک بڑھ گئی کہ وہ تقریباً تین سال تک اپنے قارئین سے دور جا رہے۔ اس بارے میں وہ ''ڈیڑھ متوالے'' میں لکھتے ہیں ۔

کیا سمجھتے ہو جام خالی ہے
پھر چھلکنے لگے سبو آؤ!!

''آج پھر تین سال بعد آپ سے مخاطب ہوں کہ آپ کی دعاؤں نے ہی دوبارہ اس قابل کیا کہ پھر خدمت کر سکوں' میرا سینہ فخر سے تن جاتا ہے جب یہ سوچتا ہوں کہ میری صحت یابی کے لیے مسجدوں' مندروں' کلیساؤں اور گوردواروں میں دعائیں مانگی جاتی تھیں۔ مجھ تک میرے پڑھنے والوں کے خطوط بھی پہنچتے تھے لیکن جواب دینے سے قطعی معذور تھا بس کڑھ کر رہ جاتا تھا۔ بالکل ناکارہ ہو کر رہ گیا تھا۔ توقع نہیں تھی کہ پھر لکھنے کے قابل ہو سکوں گا۔ ایسے محسوس ہونے لگا تھا جیسے کبھی کچھ لکھا ہی نہ ہو۔ بیماری کی ابتدا' نروس بریک ڈاؤن سے ہوئی تھی پھر یادداشت پر اثر پڑا اور اس کے بعد مستقل طور پر دوسرے تیسرے شدید قسم کے قلبی دورے پڑتے رہے۔ ادھر یاران طریقت تھے کہ طرح طرح کی افواہیں پھیلا رہے تھے۔ ابن صفی پاگل ہو گیا' کاٹنے دوڑتا ہے' ابن صفی نے پینے کی حد کر دی تھی (حالانکہ میری سات پشتوں میں بھی کبھی کسی نے نہ پی ہو گی) اس لیے ایک دن نروس بریک ڈاؤن ہو گیا۔ ابن صفی کا کسی سے عشق چل رہا تھا' اس نے بے وفائی کی' دل شکستہ ہو کر گوشہ نشین ہو گیا (حالانکہ گھٹیا قسم کے عشق کا تصور ہی میرے لیے مضحکہ خیز ہے)

آخری اطلاع یہ تھی کہ ابن صفی کا انتقال ہو گیا۔ اس خبر پر سچ مچ دل اسی طرح بھر آیا تھا جیسے میں خود ہی ابھی ابھی ابن صفی کو مٹی دے کر واپس آیا ہوں' پھر درجنوں ابن صفی پیدا ہو گئے جواب بھی بفضل تعالیٰ بقید حیات

ہیں اور دھڑلے سے میرے کرداروں کی مٹی پلید کررہے ہیں۔ ان میں سے ایک تو ایسا ہے جس نے فحاشی کی حد کردی۔ حمید اور فریدی کو بھی رنڈی باز بنا کررکھ دیا۔ سوچیے اور سر دھنیے' خدا ان سب ہوں کی مغفرت فرمائے اور مجھے صبر وجمیل کی توفیق عطا کرے۔

پھر جب میری صحت یابی کی خبریں اخبارات میں چھپنے لگیں تو یار لوگوں نے یہ شوشہ چھوڑا کہ میرے اور عباس حسینی کے تعلقات خراب ہوگئے ہیں۔ اب بھارت میں میری کتابیں ان کے ادارے سے نہیں شائع ہوں گی (ان بے چاروں کو شاید یہ نہیں معلوم کہ ایک درجن کتابیں تو میں عباس حسینی کی مسکراہٹ پر قربان کرسکتا ہوں۔ (بشرطیکہ کسی بات پر جھینپ کر مسکرائے ہوں)

اب کچھ ایسی باتوں کا ذکر سنیے جو بیماری کے دوران میرے لیے مزید اذیتوں کا سبب بنی رہی تھیں۔ یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ میں دنیا کا مظلوم ترین مصنف ہوں۔ لاہور کے بعض پبلشرز نے مل کر میری ساری کتابیں چھاپ ڈالیں (میری اجازت کے بغیر) ایک وقتی اپاہج کا مال تھا اس لیے ایک ہی کتاب کو کئی پبلشرز نے بیک وقت چھاپ کر مارکیٹ میں ڈھیر کردیا۔...... یہ ہوا کہ اس ہیچ مقدار کی کتابیں چھ چھ آنے میں فٹ پاتھ پر بک رہی تھیں۔ اکثر کتابوں کے نام بدلے گئے اور پڑھنے والوں کو دھوکا دیا۔ کراچی میں ایک ذات شریف نے میرے ناول ''زہریلا آدمی'' کے کرداروں کے نام تبدیل کیے اور اسے اکرم الہ آبادی کے نام سے چلا دیا۔ اکرم الہ آبادی بھی خاصے مشہور لکھنے والے ہیں اسی طرح ان کی بھی توہین کی گئی۔ جس قوم میں ایسے افراد موجود ہوں کیا وہ قوم دنیا میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل ہوسکتی ہے؟ حشر کی بات دور کی ہے انہیں دنیا میں ہی بھگتنا پڑے گا انشاء اللہ! منتظر رہیں۔

رہی مختلف قسم کے ابنوں اور صفیوں کی بات تو یہ بے چارے سارے قافیے استعمال کرچکے ہیں لہٰذا اب مجھے کسی ''ابن خصی'' کا انتظار ہے۔ میری دانست میں تو صرف یہی قافیہ باقی بچا ہے۔ کوئی صاحبہ (اسی قافیے والی) عرصے سے غلط فہمی پھیلا رہی ہیں کہ وہ میری کچھ لگتی ہیں لیکن یقین کیجیے کہ میرے والد صاحب بھی ان کے جغرافیے پر روشنی ڈالنے سے معذور ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔''

ابن صفی کی شہرت کو دیکھتے ہوئے بہت سے لکھنے والوں نے ان کے طرز کو اپنانا شروع کردیا تھا اور دولت کمانے کا ایک نسخہ ان کے ہاتھ لگ گیا تھا۔ انہوں نے ابن صفی کے کرداروں کو اپنی مرضی سے استعمال کرنا شروع کردیا تھا۔ ''سہمی ہوئی لڑکی'' کے پیش رس میں ابن صفی لکھتے ہیں۔

''ایک صاحب نے کسی ایسے مصنف کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ میری اجازت سے میرے کردار استعمال کررہا ہے اور میں نے اسے اس سلسلے میں مفید مشورے بھی دیے ہیں۔

''بھئی اس سلسلے میں اس کے لیے میرا مفید مشورہ یہی ہوسکتا تھا کہ وہ میرے کردار استعمال کرنے کے بجائے اپنی صلاحیتوں پر بھروسہ کرے۔ ویسے ان صاحب سے درخواست ہے کہ مجھے اس کتاب کا نام اور ادارے کا پتا لکھ بھیجیں جہاں سے یہ کتاب شائع ہوئی ہے۔'

''گیارہ نومبر'' کے پیش رس میں بھی اسی نقالی کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

''اب آیئے بے چارے مصنف کی طرف کہ اسے بہت دنوں کے بعد پھر وہی پرانا مرض لاحق ہو گیا ہے لیکن اس بار بنگلہ بھاشا میں ہوا ہے یعنی مشرقی پاکستان کے دو پبلشروں نے میرے کچھ ناولوں کا بنگلہ ترجمہ چھاپا ہے اور اس پر میرے نام کی بجائے ''مراد پاشا'' اور ''آ لک باری'' رسید کر دیا ہے یعنی اردو میں تو صرف چوریاں ہی ہوتی تھیں لیکن بنگلہ میں تو ڈاکہ پڑا ہے مجھ پر۔''

آ لک باری صاحب نے عمران سیریز کی ''بھیانک آدمی'' کو ذبح کیا ہے اور مراد پاشا نے شعلوں کے پورے سیٹ پر دھاوا بول دیا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر یہی غریب کیوں ایسوں کے ہتھے چڑھتا ہے۔ ان پبلشروں کے خلاف قانونی کارروائی کی جارہی ہے اور انشاء اللہ انہیں کراچی ہی کی عدالت میں حاضر ہونا پڑے گا۔

سنا ہے کراچی میں کوئی گجراتی اخبار عمران سیریز کا کوئی ناول نہ صرف چھاپ رہا ہے بلکہ کرداروں کی ایسی فلمی تصاویر بھی دے رہا ہے جسے دیکھ کر بعض عمران پسند آپے سے باہر ہو گئے ہیں۔ فلمی تصاویر وہ اخبار چھاپ رہا ہے اور صلواتیں مجھے سننی پڑ رہی ہیں۔ یہ دوسرا مرض ہے جو مجھے لاحق ہوا ہے۔ اب آپ مجھے مشورہ دیجیے کہ عدالتی کارروائی مناسب رہے گی یا گنڈے تعویز کروں۔ خرچ دونوں میں ہوتا ہے۔ لہٰذا آپ خرچ کی پروا مت کریں مجھے اپنے مشوروں سے مالا مال فرمائیں ورنہ آپ جانتے ہیں کہ میرے کرداروں پر ناول لکھنے والوں کی تعداد تو اب گنڈے تعویز کی دسترس سے بھی نکل کر ٹائیفون اور ڈی ڈی ٹی کی حدود میں داخل ہو گئی ہے۔''

پھر ابن صفی کے قارئین نے بھی ان نقل کرنے والوں کے خلاف اتنا شور مچایا کہ ابن صفی کو ''تیسری ناگن'' کے دیباچے میں لکھنا پڑا......!

''یاروں کہاں تک دیکھوں؟ کیا کیا دیکھوں ویسے اس میں کچھ قصور آپ کا بھی ہے۔ آپ فریدی، حمید اور عمران کے علاوہ اور کسی کردار کی کہانیاں پڑھنا ہی نہیں چاہتے، کئی لوگوں نے کوشش کی خلوص نیت سے چاہا کہ آپ ان کے علاوہ بھی کسی کو لفٹ دیں لیکن آپ ٹس سے مس نہ ہوئے۔ نقلی ہی سہی، پڑھیں گے انہی کرداروں سے متعلق۔ آپ اس سے انکار نہیں کر سکتے اگر انکار ہے تو یہ فرمائیے کہ آخر ان حشرات الارض کی کھپت کہاں ہوتی ہے۔ عالم ارواح سے تعلق رکھنے والوں کو جاسوسی ناولوں سے دلچسپی نہیں ہو سکتی لہٰذا اب مجھے اس مسئلے پر بور کرنا چھوڑ دیجیے۔ ویسے میں آپ سے وعدہ کر چکا ہوں کہ اگر کسی نے بھی ظفر الملک اور جیمسن کو ہاتھ لگانے کی کوشش کی تو اسے اس کے لیے عدالت میں جوابدہ ہونا پڑے گا۔''

پھر نقالی کا یہ سلسلہ ابن صفی کی زندگی کے ساتھ ساتھ چلنے کے بعد ان کی وفات کے بعد بھی چلتا رہا۔ اور اب تک چل رہا ہے۔

''زمین کے بادل'' کے پیش رس میں ابن صفی نے اپنے سب سے پہلے جاسوسی ناول کے بارے میں لکھا

ہے کہ انہوں نے پہلا ناول کس طرح لکھا۔

''میرا پہلا ناول ''دلیر مجرم'' تھا' پہلا ناول تھا اس لیے کسی بیرونی سہارے کی بھی ضرورت تھی لہٰذا اس کا مرکزی خیال مغربی ادب سے لیا گیا تھا۔ یہ ایک جرمن مصنف کا کارنامہ تھا جس پر دنیا کے کئی مصنفوں نے طبع آزمائی کی ہے۔ مثال کے طور پر پیٹرشنی نے اسی پلاٹ کو سینٹرل ڈیزائن کے نام سے پیش کیا ہے۔ وکٹر گن نے یہی کہانی آئرن سائیڈس کے نام سے لکھی ہے۔ وکٹر گن کا انداز پیٹرشینی سے کہیں بہتر ہے' اس کے مقابلے میں پیٹرشینی کا ناول کسی بچے کا لکھا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ حالانکہ پیٹرسینی وکٹر گن سے زیادہ مشہور ہے۔ ہندی میں بھی آپ کو اسی پلاٹ پر ایک ناول ''قیامت کی رات'' کے نام سے مل جائے گا اس کے مصنف کا نام مجھے یاد نہیں رہا' ہاں تو ''دلیر مجرم'' کا پلاٹ میں نے انگریزی سے لیا ہے لیکن فریدی اور حمید میرے اپنے کردار تھے' میں نے اس کہانی میں کچھ ایسی دلچسپیوں کا اضافہ بھی کیا ہے جو اوریجنل پلاٹ میں نہیں تھیں۔ اس کے علاوہ جاسوسی دنیا میں ایسے ناول اور بھی ہیں جن کے پلاٹ میں نے انگریزی سے لیے تھے مثلاً پراسرار اجنبی' رقاصہ کا قتل' ہیرے کی کان' خونی پتھر...... ان پانچ ناولوں کے علاوہ آپ کو میرے ایک سو دو ناولوں میں ایک بھی ایسا نہیں ملے گا جس کا پلاٹ میرا اپنا نہ ہو۔ انور' رشیدہ' عمران اور قاسم جیسے خاص کردار میرے اپنے تخلیق کردہ ہیں۔ ذہنوں سے چپک جانے والے دوسرے کردار بھی اوریجنل ہیں مثلاً سنک ہی اور ایسے ہی دوسرے کردار۔ البتہ خوفناک ہنگامہ' کا کردار پروفیسر درانی'' انگریزی سے آیا ہے۔ صرف کردار ہی' کہانی میری اپنی ہے۔ اسی طرح ''پہاڑوں کی ملکہ' میں بن مانس اور سفید ملکہ'' بھی انگریزی سے ہی آئے ہیں لیکن پلاٹ میرا اپنا ہے۔ عمران کے سارے ناول بے داغ ہیں۔ ان میں نہ آپ کو کوئی ایسی کہانی ملے گی جس کا پلاٹ انگریزی سے لیا گیا ہو اور نہ کوئی ایسا کردار ملے گا۔

اس طرح ان ایک سو دو ناولوں میں بمشکل سات یا آٹھ ناول ایسے نکلیں گے جن میں کسی قسم کی ملاوٹ مل سکے۔ ورنہ بقیہ سب خالص ہیں۔ وہ پانچ ناول جن کے پلاٹ میں نے انگریزی سے لیے ہیں ترجمے نہیں ہیں' ان کی ایک ایک سطر پر میرا دعویٰ ہے۔''

ابن صفی کے جاسوسی ناولوں میں جب کچھ پڑھنے والوں کو مار دھاڑ کی کمی محسوس ہوئی اور ہیرو کی برتری پر انہیں حرف آتا محسوس ہوا تو انہوں نے ابن صفی کو بہت سے خط لکھے جن کا جواب ابن صفی نے اپنے ناول ''تباہی کا خواب'' میں دیا ہے۔

اصل میں انگریزی کی اسپائی اسٹوریز پر مبنی فلموں نے بعض پڑھنے والوں کا ٹیسٹ بگاڑ دیا ہے اور وہ مجھ سے بھی یہی چاہتے ہیں کہ میرا ہیرو ہر حال میں فولاد کا پٹھا ثابت ہو' اوپر ہوائی جہاز' نیچے توپیں' دائیں سمندر' بائیں آتش فشاں' کبھی وہ بموں سے بچتا ہے' کبھی توپ کے گولوں سے...... توپیں چلیں اور وہ دھم سے گر پڑا...... ارض وسما...... سمجھے شاید قصہ پاک ہوا' لیکن یہ کیا؟ اس نے تو ایک توپ کے دہانے پر چھلانگ لگائی تھی اور اس کی دم کی طرف سے نکل کر سمندر کی ایک کشتی میں جا بیٹھا۔ توپیں' منہ دیکھتی رہ گئیں' ہوائی

جہازوں نے منہ کی کھائی' آتش فشاں منہ پیٹنے لگا' اور قاری کا منہ دیکھنے کے قابل...... لیکن وہ ہیرو دوبارہ بھی منہ دکھاتا ہے...... میں باز آیا...... خدا مجھے معاف کرے اور آپ اس قسم کی فرمائش کرنا چھوڑ دیے۔ میں تو کہانی کی دلچسپی کا قائل ہوں' کہ آپ کچھ ہی دیر کے لیے سہی...... اپنی الجھنوں سے نجات پالیں اور بس۔''

ایسے لوگ جو جرائم میں اضافہ کی وجہ جاسوسی ادب کو سمجھتے ہیں انہیں ابن صفی نے ''مہلک شناسائی'' میں معقول جواب دیا ہے۔ ''آج میں خدا کو حاضر و ناظر جان کر یہ اطلاع دے رہا ہوں کہ میں نے ہابیل اور قابیل والی ٹریجڈی سے پہلے کوئی جاسوسی ناول نہیں لکھا تھا لیکن کوا بے چارہ آج تک پشیمان ہے کہ اس نے حضرت آدم کو مٹی کھود کر دفن کر دینے کا فن کیوں سکھایا؟ کوے کا خیال ہے کہ اس کی اس غلطی کی بناء پر آج اولاد آدم آدمی ہی کو زندہ دفن کر دینے کے فن میں طاق ہو گئی ہے۔

اوپر کی عبارت کا مفہوم مع سیاق و سباق سلیس اردو میں لکھیے اور اردو ادب کے ان چودھریوں کو روانہ کیجیے جو یہ کہتے ہیں کہ جرائم کی تعداد میں اضافہ ہونے کا سبب جاسوسی لٹریچر ہے۔ یقین کیجیے کہ وہ آپ کے اس حل شدہ امتحانی پرچے پر رسید تک نہ دیں گے کیونکہ پرچا ان کا اپنا سیٹ کیا ہوا نہیں ہے' یا ہو سکتا ہے وہ آپ کو لکھ بھیجیں کہ ہابیل اور قابیل والی ٹریجڈی غلط فہمی کی بنا پر ہو گئی تھی۔ وہ دونوں سمجھتے تھے کہ اب کوئی دوسری عورت پیدا ہی نہ ہو گی لیکن وہ کبھی اس کا اعتراف نہ کریں گے کہ سارے ہی جرائم کسی نہ کسی غلط فہمی کی کوکھ سے جنم لیتے ہیں۔

مستقبل سے مایوسی غلط فہمی ہی کی پیداوار ہے اور آدمی کو جرائم کی طرف لے جاتی ہے۔ مستقبل سے مایوس ہو کر یا تو آدمی جرائم کرتا ہے یا پھر کسی ایسے کرنل فریدی کی تلاش میں ذہنی سفر کرتا ہے جو قانون اور انصاف کے لیے بڑے سے بڑے چہرے پر مکا رسید کر سکے اور یہی تلاش ہیروازم کی کہانیوں کو جنم دیتی ہے۔''

ابن صفی کے جاسوسی ادب نے کوئی مجرم پیدا نہیں کیا کیونکہ ابن صفی نے اپنے جاسوسی ادب کو معاشرے کی اصلاح کے لیے استعمال کیا ہے۔

ابن صفی کے ہاں مجرموں کے لیے معافی نہیں ہے وہ مجرم کو سزا ضرور دلواتے ہیں اور ان کا عبرتناک انجام ان کے پڑھنے والوں کے لیے ایک سبق ہوتا ہے۔ ان کے ہاں مجرم ہیرو نہیں ہوتا ''بے چارہ شہ زور'' کے پیش رس مین ابن صفی لکھتے ہیں۔

''عالم بالا سے پلاٹ نہیں ٹپکتے' اس زمین پر جنم لیتے ہیں اور زمین پر جو کچھ ہوتا ہے اسی سے متعلق لکھوں گا۔ کسی جاگیردار کے مظالم کی داستان سن کر یہ پلاٹ ترتیب دیا تھا۔ اس قسم کے مظالم کا انجام کیا ہو سکتا ہے' علامیہ دہشت ناک' اس کی ممکنہ صورت ہے ہر چند کہ جاگیردار کے جرم اور قانون کے محافظوں کی چشم پوشی نے اسے ایک بہت بڑا مجرم بنا دیا تھا لیکن قانون بہر حال اپنی جگہ اٹل ہے...... مجرم کو سزا ضرور ملے گی خواہ دوسروں کے لیے وہ کتنا قابل رحم کیوں نہ ہو۔''

ابن صفی اپنے جاسوسی ادب کو فلاحی ادب بھی کہتے ہیں ''بزدل سورما'' کے پیش رس میں وہ لکھتے ہیں۔

''آپ اچھے ہوں یا برے، جس گھر میں آپ بیٹھے ہیں اس کے در و دیوار کی حفاظت آپ پر واجب و لازم ہے۔ جس طرح بھی ممکن ہو اس کی حفاظت کیجیے' آنکھیں کھلی رکھیے کہ کہیں آپ نادانستگی میں تو اس گھر کی تباہی کا باعث نہیں بن رہے ہیں۔ صوبائی عصبیت' فرقہ ورانہ منافرت اور دشمنوں کے فراڈ سے بچنے کا سلیقہ تو آپ میں ہونا ہی چاہیے۔ وطن عزیز کے مشرقی حصے میں ابھی جو کچھ ہو چکا ہے اس کا اعادہ اور کہیں نہ ہونے پائے' یقین کیجیے اگر ہم چوکس رہیں تو بیرونی دشمنوں کے سارے حربے کند ہو کر رہ جائیں گے۔

اس وقت دنیا کو صیہونیت اور بنیا ازم سے جو خطرات لاحق ہیں اب ڈھکے چھپے نہیں رہے۔ ان کے خلاف ایک طاقت ور ذہنی محاذ کی ضرورت ہے۔

زیر نظر کہانی کا موضوع صیہونیت ہی ہے جس کی وضاحت آپ کو آئندہ کہانی میں ملے گی ورنہ میں بے چارہ ایک جاسوسی ناول نگار...... لاحول ولا قوۃ ایسے کہنے کو تو میں یہ بھی کہہ سکتا ہوں کہ جاسوسی ادب خالص فلاحی ادب ہے کیونکہ جتنی دیر آپ اس تفریح میں مشغول رہتے ہیں' بغض' حسد' کینہ اور نفرت وغیرہ آپ کے پاس پھٹکنے بھی نہیں پاتے۔ آپ کا ذہن قانون کی محافظت کرنے والے ہیروز کے قدم بہ قدم رواں دواں رہتا ہے۔''

یہ پیش رس اس زمانے سے تعلق رکھتا ہے جب سقوط ڈھاکہ ہوا تھا اور مشرقی پاکستان ہم سے جدا ہو گیا تھا لیکن کسی اور ناول نگار کے ہاں ہمیں وطن کے حالات حاضرہ پر اس انداز میں شاید ہی اظہار رائے مل سکے۔

''ہلاکو اینڈ کو'' میں بھی اسی انداز کا پیش رس موجود ہے۔

''پچھلے تین چار ماہ کے دوران کئی غیر ملکی جاسوس پکڑے گئے ہیں۔ اخباری اطلاعات کے مطابق ان کی نشاندہی عوام ہی نے کی تھی۔ مجھے خوشی ہے کہ سری ادب کے مطالعے نے عام آدمی میں بھی اس قسم کی سوجھ بوجھ پیدا کر دی ہے کہ وہ مشتبہ لوگوں پر نظر رکھ سکے۔

کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ دشمنوں کے ایجنٹ ہماری آنکھوں میں دھول جھونک جاتے ہیں۔ اور ہمیں احساس تک نہیں ہوتا۔ وہ ہمیں کمزور کرنے کے لیے ہماری قومی یکجہتی پر ہمارے ہی ذریعے ضرب لگاتے ہیں اور ہمیں پتا بھی نہیں چلتا۔ مثال کے طور پر وہ افواہوں کے ذریعے ایسی من گھڑت کہانیوں کو شہرت دینے کی کوشش کرتے ہیں جن سے صوبائی تعصب یا فرقہ واریت کا زہر پھیل سکے۔ ہم اس کا پتا تو نہیں لگا سکتے کہ کوئی افواہ کہاں سے پھیلی ہے لیکن اس پر ضرور قادر ہیں کہ اس افواہ کو دوسرے کانوں تک نہ پہنچنے دیں۔

ہر وقت چوکنے رہیے کہ کہیں آپ خود ہی غیر شعوری طور پر دشمن کے آلہ کار تو نہیں بن رہے؟ کسی افواہ کو دوسروں تک پھیلانے والا نادانستگی میں دشمن کی مدد کرتا ہے۔ اس وقت قومی یکجہتی کی حفاظت کرنا ہی ملک و قوم کی سب سے بڑی خدمت ہوگی۔ ایسی افواہوں کو اپنی ذات سے آگے نہ بڑھنے دیجیے جس سے صوبائی تعصب یا فرقہ واریت کا زہر پھیلنے کا خدشہ ہو۔''

ابن صفی کو زندگی کی منفی قدروں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ مندرجہ بالا مثالیں اس کا ثبوت ہیں۔ اس نوعیت

کا ایک پیش رس ''جزیروں کی روحیں'' کا ہے۔ اس میں وہ لکھتے ہیں۔

''ہاں اس بار پھر کاغذ کا مسئلہ درپیش ہے۔ اس وقت جبکہ یہ پیش رس لکھ رہا ہوں یقین کے ساتھ نہی کہہ سکتا کہ اس کتاب کے مقدر میں بھی ڈھنگ کا کاغذ ہے یا نہیں؟ کوشش تو کی جا رہی ہے کہ سفید کاغذ دستیاب ہو جائے، لیکن اگر نہ مل سکا تو آپ بھی صبر ہی کیجیے گا۔ کیونکہ میں اپنی ایک پائی بھی بلیک مارکیٹ کی نذر کرنے کو تیار نہیں، اگر سرکاری نرخ کے مطابق سفید کاغذ مل سکا تو فبہا ورنہ پھر کوئی رنگین ہی کاغذ استعمال کیا جائے گا۔ غالباً آپ کو بھی بلیک مارکیٹ کرنے والوں سے ہمدردی نہ ہوگی۔''

جس طرح ابن صفی اپنے پڑھنے والوں کو وقتاً فوقتاً مفید مشورے دیتے رہتے تھے۔ اسی طرح ان کے قارئین بھی اکثر انہیں مشورے لکھ بھیجتے تھے جس سے ان کی دلچسپی کا اندازہ ہوتا تھا اور ابن صفی صاحب ان مشوروں کو قبول بھی کر لیا کرتے تھے۔ یا پھر بڑا دلچسپ سا کوئی جواب دے دیتے۔

''قاتل ہاتھ'' کے پیش رس میں ایک جگہ ابن صفی صاحب لکھتے ہیں۔

''ان میں سے بہتیرے حضرات نے میری 'ذاتیات' سے متعلق بھی بے تکے قسم کے سوالات کیے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ آخر اس سے پڑھنے والوں کو کیا سروکار کہ مجھے کریلے پسند ہیں یا نہیں یا صرف نیم چڑھے کریلے پسند ہیں۔ میٹھا میٹھا ہپ اور کڑوا کڑوا تھو کی عادت میں تو مبتلا نہیں! میرے کتنے بچے ہیں؟ کون سی پیتے ہیں؟ نہیں پیتے تو وجہ لکھئے کتابوں کو ہی پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ آپ عشق و محبت کے قائل نہیں، آخر ایسا کیوں ہے؟ کیا کبھی کوئی گہری چوٹ کھائی تھی؟''

''بہت بڑی چوٹ کھائی تھی یارو...... کہ پیدا ہو گیا تھا...... اور اب آپ جیسوں سے نبٹ رہا ہوں۔''

ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

اس بار ایک عجیب حرکت اور بھی ہوئی ہے کسی صاحبزادے نے کتابوں کی پشت پر چھپنے والی میری حالیہ تصویر میں بڑی خوبصورت داڑھی اور مونچھوں کا اضافہ کر کے 'برائے فوری توجہ' مجھے بھجوائی ہے لہٰذا ان کی تشفی کے لیے میں نے اس بار تصویر کا پوز بدل دیا ہے۔ ممکن ہے انہیں یکسانیت گراں گزری ہو۔ ہر معاملے میں مجھ سے نئے پن کے متوقع رہتے ہیں یار لوگ۔''

''جنگل کی شہریت'' کے پیش رس میں ایک صاحب کا مشورہ اور اس کا جواب ملاحظہ ہو۔

''ایک صاحب نے لکھا تھا کہ تھریسیا اور عمران کی شادی کرا دی جائے تو بڑا مزہ آئے...... بھائی آپ کو کیا مزہ آئے گا پہلے آپ اس کا جواب دیجیے پھر میں اس رشتے کی تجویز پر غور کروں گا۔ ویسے عمران کا یہ قول آپ کے علم میں بھی ہوگا کہ وہ ابھی شادی کے قابل ہی نہیں ہوا ہے۔

ایک اور صاحب رقم طراز ہیں کہ آپ کو سیاست میں ضرور حصہ لینا چاہیے لیکن شرافت سے بھائی جان۔ سیاست اور شرافت کو میرے فرشتے بھی یکجا نہیں کر سکیں گے لہٰذا مجھے ہوائی قلعے بنانے اور کہانیاں لکھنے دیجیے۔''

''نیلم کی واپسی'' کا پیش رس ملاحظہ ہو۔

''اس بار بھی جواب طلب خطوط کا انبار سامنے ہے۔ لوگ اس پر برہم ہیں کہ سلیمان کی شادی کرادی گئی ہے۔ بھائی اگر مالک نالائق ہے تو اس میں ملازم کا کیا قصور؟ آخر اس کے سہرے کے پھول کیوں نہ کھلیں؟ کم از کم ملازم ہی کی مٹی پلید ہونے سے بچا لیجیے۔ شادی نہ کرنا کوئی اچھی بات تو نہیں ہے۔ خود اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر ٹھنڈے دماغ سے سوچیے' کیا آپ سالوں اور سالیوں سے محروم رہنا پسند کریں گے......؟

کچھ حضرات اس پر مصر ہیں کہ جوزف کی بھی شادی کرائیے' عمران کی نہ سہی' ایکسٹو کی ٹیم کے سارے افراد کی شادیاں ہونی چاہئیں۔

ارے کیا میں نے ٹھیکہ لے رکھا ہے شادیاں کرانے کا؟ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں......اور پھر آپ کو کیا پتا کہ ان حضرات کی شادیاں ہو چکی ہیں یا نہیں۔ اس نوعیت کے سرکاری ملازمین بال بچوں کو ساتھ نہیں رکھا کرتے' پھر مجھے کیا پڑی ہے کہ ان کے لواحقین کا بھی تذکرہ کروں۔''

''ہیروں کا فریب'' کے پیش رس میں جو مشورہ دیا گیا ہے وہ ملاحظہ ہو۔

''دوسرے صاحب نے مشورہ دیا ہے کہ میں ارل اسٹینلے گارڈنر کی طرح لکھا کروں' کیوں لکھا کروں بھائی؟ کیا آپ گارڈنر کو مشورہ دے سکیں گے کہ وہ میری طرح لکھا کریں؟ ویسے آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ گارڈنر کی کہانیوں کے ترجمے اردو میں نہیں چلتے اور انگریزی میں بھی ان کے پڑھنے والوں کا ایک مخصوص طبقہ ہے۔ ہر طبقے میں ان کی کتابیں مقبول نہیں ہیں۔

بحمداللہ آپ کے اس حقیر پاکستانی مصنف کی کتابیں ہر طبقے میں پڑھی جاتی ہیں پھر کیا وجہ ہے کہ وہ کسی کی نقالی کر کے خود کو محدود کر لے۔ میرا اپنا الگ انداز ہے اور میں اس پر مطمئن ہوں۔''

''طلسمات کا دیوتا'' کے پیش رس میں جو کچھ ابن صفی نے لکھا ہے اس کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ جاسوسی ادب میں عورت اور مرد کا فرق جس طرح مٹایا گیا ہے وہ اس کے کتنے خلاف ہیں۔

''کم از کم ایک صاحب کے ایک خط کا جواب دینا بے حد ضروری سمجھتا ہوں۔ وہ پوچھتے ہیں کہ آخر آپ کی کتابوں میں عورت اور مرد دور دور کیوں رہتے ہیں؟''

سوال بڑا ٹیڑھا ہے لیکن سیدھا سا جواب ملاحظہ فرمائیے۔

''ابھی ہمارا معاشرہ ارتقاء کی منزل میں ہے جہاں عورت اور مرد کے درمیان کم از کم ایک چپل کا فاصلہ تو ہونا ہی چاہیے۔ تفصیل اس اجمال کی یوں ہے کہ اگر مردوں کے دوش بدوش ترقی کی راہ پر چلنے والی کوئی عورت کسی فٹ پاتھ پر چل رہی ہو اور آپ اسے سہواً بھی ٹکراؤ ہو جائے تو آپ اسے دوش بدوش کی بجائے پاپوش بدست دیکھیں گے۔''

''بیمبو کیسل'' کے پیش رس میں ایک قاری کے دلچسپ سوال کا جواب ابن صفی نے بڑے اچھے انداز میں دیا ہے اور وہ حقیقت سے بہت قریب ہی نہیں بلکہ حقیقت پر بھی مبنی ہے۔

''ایک صاحب نے پوچھا ہے کہ آخر کب تک اپنے نام کے ساتھ بی۔ اے لکھواتے رہیں گے؟ اب تو بڑا

مضحکہ خیز لگنے لگا ہے۔ اس سلسلے میں اس کے علاوہ اور کیا عرض کروں کہ میرے زیادہ تر پڑھنے والے میرا نام بی اے کے دم چھلے کے بغیر دیکھنا پسند نہیں کرتے۔ انہیں اس پر کسی نقلی ابن صفی کا دھوکا ہوتا ہے اور تو اور دھما کا کے پروڈیوسر مولانا ہپی نے بھی مجھے اس سلسلے میں نہیں بخشا۔ گراموفون کے ریکارڈوں تک پر بی۔ اے کا ٹھپہ لگوا دیا ہے۔ اشتہارات میں ابن صفی ذرا سا اور بی۔ اے گز بھر کا لکھواتے ہیں۔ یونیورسٹی کے ایک پروفیسر دوست نے ایک بار کہا تھا کہ ایکسٹرنل سے ایم۔ اے بھی کر ڈالو۔ میں نے کہا کیا فائدہ کہلاؤں گا تو بی۔ اے ہی۔ خواہ ڈاکٹریٹ کیوں نہ کرلوں۔ کہنے لگے ٹھیک ہی کہتے ہو، ابن صفی ایم۔ اے یا ڈاکٹر ابن صفی نقلی ہی معلوم ہوگا۔ میرے سلسلے میں پڑھنے والے عجیب ہیں۔ اپنی حالیہ تصویر کتاب کی پشت پر چھاپنی شروع کی تھی کہ چاروں طرف سے شور اٹھا، پرانی ہی چلے گی، مونچھوں والا ابن صفی نہیں چلے گا۔ وہی پرانی تصویر بدستور چھاپتے رہو، سوائے دوستو پبلک کے بے حد اصرار پر پھر وہی چھاپنی پڑی۔ مطلب یہ کہ میں اپنی کسی حماقت کا خود ذمے دار نہیں ہوں مجھ سے زبردستی حماقتیں ''سرزد'' کرائی جاتی ہیں۔

''دہشت گرد'' کے پیش رس میں لکھتے ہیں۔

''ایک صاحب نے لکھا ہے کہ آپ انگلش میں بھی لکھنا شروع کر دیجیے۔ اس طرح آپ کی اقتصادی حالت بھی مغربی ملکوں کے مصنفوں کی طرح ہو جائے گی۔ انگریزی میں ساری دنیا کا مارکیٹ آپ کو ملے گی، اگر باہر ہی کا کوئی پبلشر بھی مل گیا تو اتنی رائلٹی ملے گی کہ آپ بھی ارل اسٹینلے گارڈز کی طرح اپنا ہوائی جہاز رکھ سکیں گے۔

بھیا! ہوائی جہاز رکھ تو سکوں گا لیکن اس پر بیٹھے گا کون؟ تھان پر بندھا ہنہنایا کرے گا یا زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ اس پر بھی ''ابن صفی کا ہوائی جہاز'' لکھوالوں گا اور دیکھ دیکھ کر خوش ہولیا کروں گا۔''

میری جیسی بھی اقتصادی حالت ہے اس پر رب العزت کا احسان مند ہوں، مگن ہوں...... دولت کی ریل پیل ذہنی سکون کی دشمن ہوتی ہے، آدمی مشین بن کر رہ جاتا ہے، میرے لیے بس اتنا ہی کافی ہے کہ میری ضروریات پوری ہوتی رہیں اور مجھے آپ سے قرض نہ لینا پڑے۔ میں اسے سب سے بڑی دولت مندی سمجھتا ہوں کہ جب میں سونے کے لیے لیٹوں تو مجھے فوراً نیند آ جائے۔''

''مہکتے محافظ'' کا پیش رس نظر سے گزرا تو احساس ہوا کہ ابن صفی میگزین اور اس کے ایڈیٹر جناب مشتاق احمد قریشی صاحب سے انہیں کتنی انسیت تھی۔

''دوسرے صاحب رقمطراز ہیں کہ جب میگزین آپ کی ملکیت نہیں ہے تو آپ نے یہ دردسر کیوں مول لیا ہے (ویسے ان کو میگزین بے حد پسند آیا ہے اور ''تزک دوپیازی'' کو خاصے کی چیز سمجھتے ہیں) پھر لکھتے ہیں آپ کے نام سے کوئی دوسرا کیوں فائدہ اٹھائے؟ کیا آپ اتنے غریب ہیں کہ ایک میگزین نہ نکال سکیں؟''

بھیا گزارش ہے کہ کسی دوسرے کے فائدے سے مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچتا۔ خود مجھے نکالنا ہوتا تو کبھی کا نکال چکا ہوتا، کیا آپ حضرات دس دس روپے کے شیئر خرید کر میری مدد نہ کرتے (اگر اتنا ہی غریب ہوتا)

یہ بھی نہ سوچیے کہ کسی دوسرے کے کام آ کر آپ خسارے میں رہیں گے اور پھر وہ صاحب میرے دوست بھی تو ہیں (مشتاق احمد قریشی صاحب) پہلے بھی عرض کر چکا ہوں اور ہاں مطمئن رہیے آہستہ آہستہ اس میگزین کی روش عام ڈگر سے بالکل الگ ہو جائے گی اور اس سے آپ کی دلچسپی بھی برقرار رہے گی۔"

"زیبرا مین" کے پیش رس میں بھی ابن صفی میگزین سے متعلق لکھتے ہیں۔

"ایک صاحب نے لکھا ہے کہ آخر میگزین میں آپ اپنی منظومات شائع کیوں نہیں کرتے؟ عرض ہے کہ آپ کی خواہش اس بارے میں پوری کی جارہی ہے اور میگزین میں "صفحہ دل" کا اضافہ کیا جارہا ہے۔ اب میری منظومات بھی آپ کی نظر سے گزرتی رہیں گی اس کا تو نام ہی ابن صفی میگزین ہے لہٰذا سارا کھایا پیا اگلوا لیجیے۔

اور سب سے آخر میں سب سے اہم بات، ابن صفی کے تاثرات مذہب کے بارے میں۔ مختلف موقعوں پر انہیں کئی ایسے خطوط بھی موصول ہوئے تھے جن میں ان کی رائے پوچھی گئی تھی کہ وہ کس "ازم" کو پسند کرتے ہیں تو ہر جگہ ابن صفی نے دوٹوک جواب دیا تھا "اسلام کو"

"پاگلوں کی انجمن" کے دیباچے میں وہ لکھتے ہیں۔

"اس سلسلے میں پہلے بھی بہت کچھ لکھ چکا ہوں، بہ بانگ دہل کہہ چکا ہوں کہ معاشرے میں اللہ کی ڈکٹیٹر شپ چاہتا ہوں، لیکن سوال تو یہ ہے کہ یہ ڈکٹیٹر شپ کیونکر قائم ہو؟ میں نے اکثر یہ سوال زبانی بھی دہرایا ہے اور جس قسم کے جوابات سے دوچار ہوا ہوں ان کا تجزیہ کرنے پر حسب ذیل نتائج حاصل کیے۔ بعض لوگ داڑھیاں رکھنے پر تیار نہیں، بعض خواتین دوبارہ پردہ کرنے پر تیار نہیں، جو عیش جس کو نصیب ہے وہ اسے ترک کرنے پر تیار نہیں خواہ وہ ناجائز ذرائع ہی سے کیوں نہ نصیب ہوا ہو۔ بعض نوجوان افراد اپنی پوشش تبدیل کرنے پر رضامند نہیں۔ بعض لوگ محرم اور نامحرم کے چکر سے نکل جانے کے بعد دوبارہ اس میں پڑنے کے لیے تیار نہیں۔

یار دکیا رکھا ہے ان باتوں میں۔ تمہارا ظاہر کچھ بھی ہو لیکن دل مسلمان ہونا چاہیے۔ کچھ نیکیاں سچے دل سے اپنا کر دیکھو آہستہ آہستہ تم خود ہی کسی جبر و کراہ کے بغیر اپنا ظاہر بھی اللہ کے احکامات کے مطابق بنا لو گے۔

بس پھر جیسے ہی تم انفرادی طور پر اللہ کے احکامات کے آگے جھکے یہ سمجھ لو کہ ایک ایسا یونٹ بن گیا جس میں اللہ کی ڈکٹیٹر شپ قائم ہے۔ انفرادی طور پر اپنے حالات سدھارتے جاؤ پھر دیکھو کتنی جلدی ایک ایسا معاشرہ بن جاتا ہے جس پر اللہ کی حاکمیت ہو، قرآن پڑھو اس پر عمل کرو، اسے علم الکلام کا اکھاڑہ نہ بناؤ، جس طبقے کے تم شاکی ہو اس کی اصلاح کی سوچو۔ ظلم و تشدد کا تصور تک ذہن میں نہ لاؤ۔ ہمیشہ یاد رکھو تم اس کے غلام ہو جس کی مظلومیت انقلاب لائی تھی۔ یاد کرو طائف کا وہ واقعہ جب میرے آقا و مولاؐ کی جوتیاں تک لہولہان ہو گئی تھیں۔"

اس کے علاوہ اپنی ایک کتاب "دھواں ہوئی دیوار" کے پیش رس میں یوں لکھتے ہیں۔

"قریب قریب تمام ماڈرن ازم میرے مطالعے میں آ چکے ہیں۔ میں تو اللہ کی ڈکٹیٹر شپ کا قائل ہوں۔

اس میں اس کی گنجائش نہیں ہوتی کہ جب جتنے پیگ کا نشہ ہوا ویسا ہی بیان داغ دیا۔ آپ بھی کسی ازم وزم کے چکر میں پڑنے کے بجائے، اسلام کو سمجھنے کی کوشش کیجیے۔ اسلام کے علاوہ اور سارے ازم محض وقتی حالات کی پیداوار ہیں اور کسی ایک ازم کی کوئی دشواری کسی زمانے میں دوسرے ازم کی پیدائش کا باعث بنتی رہی ہے۔ اسلام کے علاوہ دنیا کا کوئی بھی ازم اپنے حرف آخر ہونے کا دعویٰ نہیں کرسکتا۔ اسلامی نظام حیات آج بھی قابل عمل ہے لیکن اس کے لیے انفرادی طور پر ہر آدمی کو ایماندار بننا پڑے گا اور یہ بے حد مشکل کام ہے لیکن اس مشکل کا بھی آسان ترین حل بعض یار لوگ یہ بتاتے ہیں کہ عبادت محمد رسول اللہ کے بتائے ہوئے طریقے پر کرلو...... اور روٹی کے لیے کسی یہودی کے در پر ہاتھ پھیلاؤ کوئی مضائقہ نہیں۔

لیکن میرے بھائی میں روٹی بھی اسی اصول کے تحت چاہتا ہوں جس کے تحت عبادت کرتا ہوں، بس میرا سیاسی رجحان اللہ کی ڈکٹیٹر شپ کا قیام اور میرا فن سکھاتا ہے قانون کا احترام۔"

اسی نوعیت کا ایک اور پیش رس ان کی کتاب "خطرناک انگلیاں" کا ہے ملاحظہ ہو۔

"پچھلی بار ایک صاحب کے خط کے جواب میں جمہوریت، ڈکٹیٹر شپ اور اسلام کی بات چلی تھی۔ اس پر ایک بھائی بہت برافروختہ ہوئے اور فرمایا کہ میں نے ادھوری باتیں کی ہیں۔ بھائی صاحب! سوال کی مناسبت سے وہ ایک جواب تھا کوئی مقالہ سپرد قلم کرنے نہیں بیٹھا تھا۔

اچھا اب پوری بات سن لیجیے اور پھر مجھ پر الزام لگایئے گا کہ میں حکومت سے کوئی انعام لینا چاہتا ہوں یا ایک سرمایہ دار گھرانے سے منسوب انعام کا متمنی ہوں۔ اگر میں اس سوال کے جواب میں کوئی مقالہ لکھ رہا ہوتا تو اگلی سطریں مندرجہ ذیل ہوتیں۔

"شہنشاہیت نے اسلامی سماجی ارتقاء کی راہ روک لی تھی ورنہ دنیا کے بھانت بھانت کے ازموں کا منہ نہ دیکھنا پڑتا اور بھائی اسلام کو تو تماشا بنالیا ہے یار لوگوں نے، جسے دیکھو ایک نئی تفسیر لیے دوڑا آرہا ہے لیکن وہ وقت دور نہیں جب دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہوجائے گا۔ انشاء اللہ عالم اسلام بیدار ہو رہا ہے۔

اور ہاں اس خیال کو دل سے نکال دیجیے کہ میں اپنے ہی جیسے کسی انسان سے انعام کا خواہاں ہوں۔ اس کا تصور بھی مجھے احساس کمتری کے گڑھے میں دھکیل دے گا۔ میرے لیے میرے اللہ کا یہی انعام کافی ہے کہ کتاب فروش میری کتابوں کو "کرنسی نوٹ" کہتے ہیں۔

امید ہے کہ آپ کی تشفی ہوگئی ہوگی۔ بھائی صاحب اگر میرے سر میں لیڈری کا سودا سماتا تو کبھی کا لیڈر بن کر اب تک دریا برد ہوچکا ہوتا۔ کیا سمجھے، میری طرف سے بدگمان نہ ہوا کیجیے، میں ہمیشہ غریب مسلم عوام کے ساتھ رہا ہوں، اور ان شاء اللہ مرتے دم تک رہوں گا کیونکہ میں بھی غریب ہی ہوں۔ غربت ہی میں ہوش سنبھالا تھا اور اللہ سے دعا ہے کہ غریبوں کے ساتھ مجھے اٹھائے۔"

میں جوں جوں یہ مضمون مرتب کرتی جارہی تھی، میرے دل میں ابن صفی کے لیے عقیدت بڑھتی جارہی تھی۔ ابن صفی کو اب تک میں ایک جاسوسی ادیب ہی کی حیثیت سے جانتی تھی لیکن جب میں نے اس مضمون

کے سلسلے میں ان کے دیباچوں سے ان کے متعلق حقائق جمع کرنے شروع کیے تو مجھے احساس ہوا کہ وہ بہت بڑے انسان تھے اور ایک سچے مسلمان بھی۔

میرا خیال ہے کہ کسی بھی لکھنے والے کو ایک ادیب کا درجہ دینے کے لیے اور اس کی تصنیفات کو ادب میں مقام دلانے کے لیے اس کا انداز تحریر ہی وہ ذریعہ ہوتا ہے جس کو کسوٹی پر پرکھنے کے بعد اس کے مقام کا فیصلہ کیا جا سکتا ہے اور اپنے انداز تحریر کے اعتبار سے میری نظر میں ابن صفی ایک اچھے ادیب تھے' انہوں نے جاسوسی ادب ضرور تخلیق کیا ہے لیکن انہوں نے کبھی بھی جرائم یا مجرموں کی حوصلہ افزائی نہیں کی ہے۔ان کے انداز تحریر میں وہی زندگی اور روشنی ہے جو ہمیں اکبرالہ آبادی کی شاعری میں ملتی ہے۔اکبر نے اپنے اشعار کے ذریعے معاشرے کی برائیوں پر طنز کیا ہے اور ابن صفی نے اپنی نثر نگاری میں طنز و مزاح کے ایک بہترین انداز کو اپناتے ہوئے مختلف برائیوں سے پردہ اٹھایا ہے۔کاش اب پھر کوئی ایسا ابن صفی پیدا ہو سکے جسے زمانے کی بے قدری کی پروانہ ہو اور وہ ایک ادیب نہ مانے جاتے ہوئے بھی ادب کی خدمت کرتا رہے۔

ڈپلومیٹ مرغ
ابن صفی

حرف آغاز

طنز ومزاح میرا فن نہیں بلکہ کمزوری ہے۔ کمزوری اس لیے کہ میں صاحب اقتدار نہیں ہوں۔ صاحب اقتدار واختیار ہوتا تو میرے ہاتھ میں قلم کی بجائے ڈنڈا نظر آتا اور میں طنز کرنے یا مذاق اڑانے کی بجائے ہڈیا توڑتا دکھائی دیتا۔ (الحمدللہ کہ میری یہ کمزوری قوم کی عافیت بن گئی اور قوم بلا سے ''واہ واہ'' نہ کرے اسے ''ہائے ہائے'' تو نہیں کرنی پڑے گی۔ اس قلمدان کے لیے یہی بہت ہے)۔

قلمدان پر چونکنے کی ضرورت نہیں۔ دراصل ہیچمدان لکھنا چاہتا تھا لاشعوری طور پر قلمدان لکھ گیا جس کا نفسیاتی پس منظر یہی ہوسکتا ہے کہ بسیار نویسی کی بنا پر خود کو قلمدان تصور کرنے لگا ہوں۔

ڈپلومیٹ مرغ اور دوسرے طنزیات ومضحکات ملاحظہ فرمایئے کل چودہ عدد ہیں۔ ان میں طالب علمی کے زمانے سے اب تک کے وہ مضامین شامل ہیں۔ جو ادھر اُدھر سے مشتاق احمد قریشی کے ہاتھ لگے ہیں۔ میرے پاس ان کا کوئی ریکارڈ نہیں۔ مشتاق احمد کے بیان کے مطابق ان کی تلاش وجستجو اب بھی جاری ہے اور مجھے یقین ہے کہ وہ ایسے ہی کئی مجموعے مرتب کرسکیں گے۔ ریکارڈ نہ ہو میرے پاس لیکن مجھے یاد تو ہے کہ میں نے کتنا لکھا ہے۔

زیر نظر طنزیات اور پیروڈیز میں سے ''آب وفات'' دیوانے کی ڈائری میں افسانہ کیونکر لکھتا ہوں۔ چاپلوسی ایک ادبی نشست اور اب کدھر جاؤں ۵۲ء سے قبل بھارت میں طغرل فرغان کے نام سے لکھے گئے تھے اور وہیں شائع بھی ہوئے تھے۔ ''اب کدھر جاؤں'' بعض تبدیلیوں کے ساتھ یہاں ''عالمی'' ڈائجسٹ میں دوبارہ شائع ہوا تھا۔

بہر حال جو کچھ بھی ہے حاضر ہے۔ مشتاق صاحب کا خیال تھا کہ اس مجموعے کا مقدمہ ''کسی اور'' سے لکھوایا جائے۔ میں نے کہا بھائی بحیثیت جاسوسی ناول نگار میں خود ہی ان اصناف ادب کے لیے ''کوئی اور'' بن سکتا ہوں۔ لہٰذا اس مجموعے کے ''مقدمے'' کے لیے بھی دنیائے ادب کے لیے ''کوئی اور'' بن سکتا ہوں لہٰذا اس مجموعے کے ''مقدمے'' کے لیے بھی دنیائے ادب کے اسی ''دس نمبری'' کی خدمات حاصل کیجیے۔ کسی شریف آدمی کی ''بے عزتی خراب کرانے'' سے کیا فائدہ۔ اگر کسی صاحب نے ازراہ مروت کچھ بھی لکھ دیا تو اپنے حلقے میں بسور بسور کر کہتے پھریں گے ''یار کیا بتاؤں فلاح صاحب سر ہوگئے تھے...... لکھنا ہی پڑا...... ورنہ بھلا میں...... لاحول ولاقوۃ......!''

نفس مضمون سے متعلق کارٹون بھی ملاحظہ فرمایئے۔ یہ کارٹون مستقبل کے بہت بڑے کارٹونسٹ جمشید انصاری نے بنائے ہیں۔ پورے یقین کے ساتھ انہیں مستقبل کا بہت بڑا کارٹونسٹ لکھ رہا ہوں (اگر انہوں نے کسی وجہ سے پٹری بدل نہ دی تو آپ دیکھ لیں گے)

والسلام

ایک ادبی نشست

چاپلوسی

دیوانے کی ڈائری

کے چند اوراق
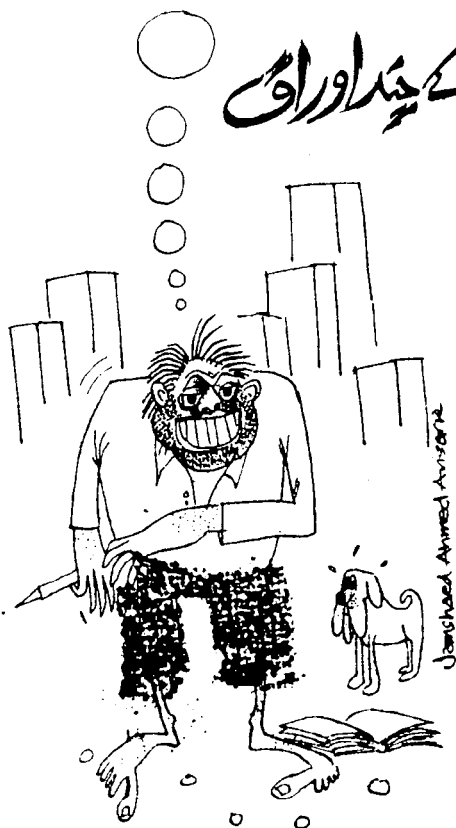
پردیسی لُٹیرا

شیر کا شکار

لالو کھیت کا خلیفہ
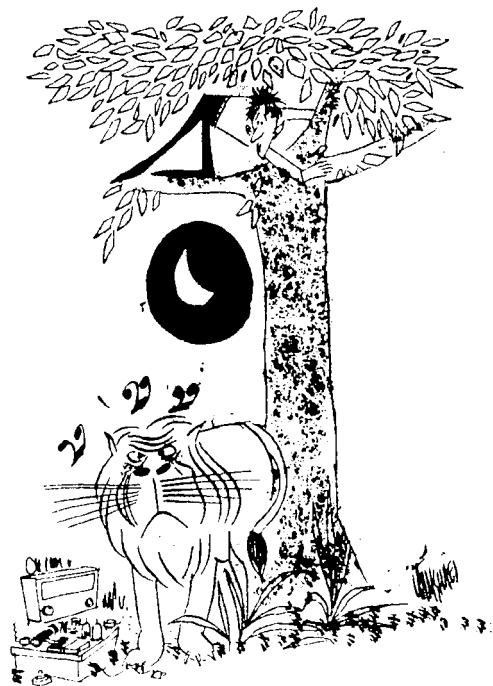
آبِ وفات

میں افسانہ کیونکر لکھتا ہوں؟

قصّہ

ایک

ڈپلومیٹ مرغ

کا
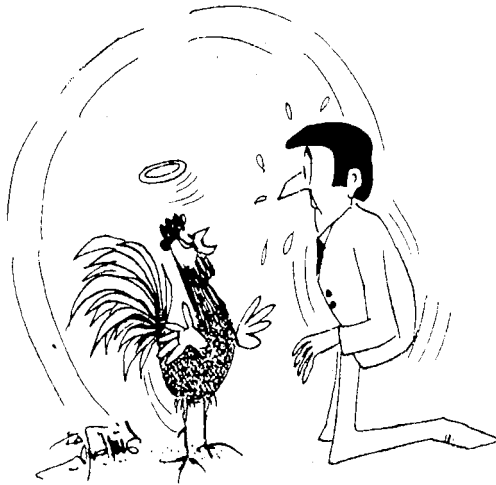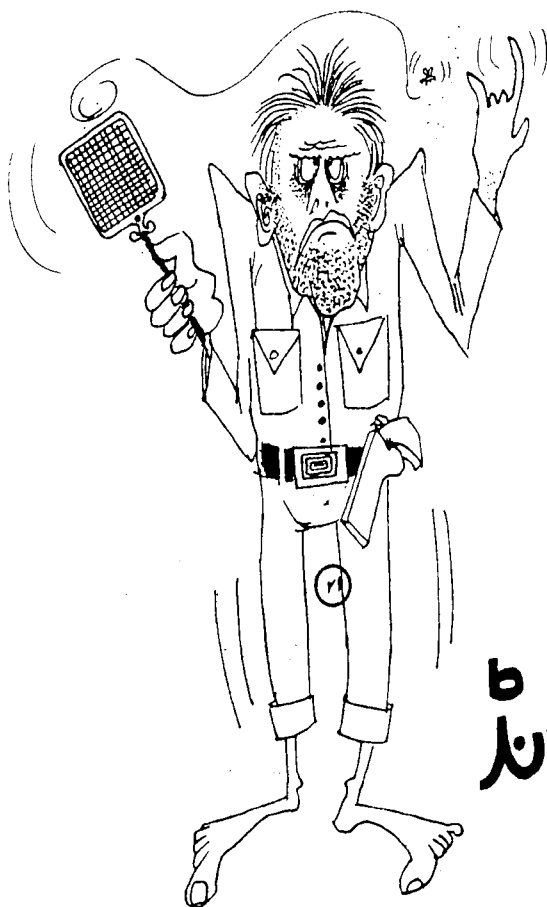
ٹیمز فانڈ

زیرو زیرو زیرو ایکس زیرو زیرو ایکس زیرو ایکس

میں نے لکھنا

کیسے شروع کیا؟

اب
کدھر
جاؤں
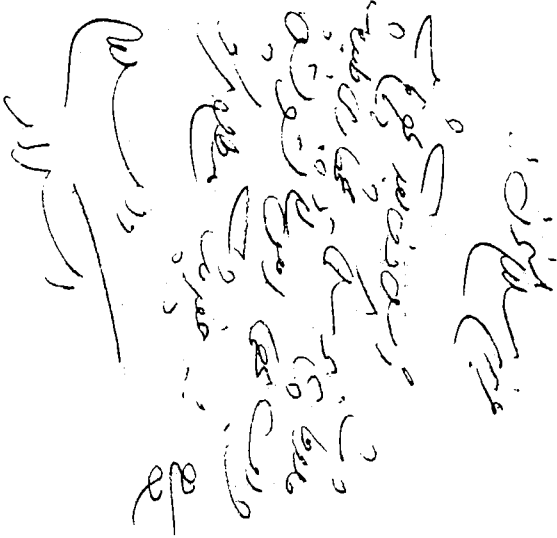
چراغ الہ دین ڈائجسٹ

نامے میرے نام

PAKISTAN پاکستان
2 PAISA POSTAGE
PAKISTAN پاکستان
5 PAISA POSTAGE
SEP 61

پتہ

جناب مشتاق احمد قریشی
5A, 2/8 ناظم آباد
کراچی 18

مشتاق احمد قریشی، مدیر، نئے افق

یہ جان کر کہ آپ ابن صفی پر سپیشل نمبر نکالنے جا رہے ہیں مجھے بڑی خوشی ہوئی کیونکہ میری نظر میں ابن صفی کو اردو ادب میں ابھی تک وہ مقام حاصل نہیں ہوا جو کہ ان کو ملنا چاہئے یا یوں کہیں کہ اردو نقادوں نے ان کی اہمیت نہیں پہچانی لیکن شاید اس پر زیادہ افسوس بھی نہیں کرنا چاہئے کیونکہ آخر کار نقاد ابن صفی کا کیا بگاڑ سکیں۔ سب لوگ تو ابن صفی کو جانتے ہیں اور شوق سے پڑھتے رہتے ہیں۔

ریلائٹ کا پربت صفحہ ۱۱۳ پر ابن صفی خود فرماتے ہیں کہ

"اس کی پرواہ نہ کرو کہ لوگ تمہیں کیا سمجھتے ہیں ہمیشہ اس پر نظر رکھو کہ تم کیا ہو"

ہم بھی پرواہ نہیں کریں گے کہ نقادوں نے ابن صفی کو نہیں پہچانا۔ اس پر نظر رکھیں گے کہ وہ کیسا ہیں۔

آپ کا

مین قیس
استاد زبان و ادب اردو
جامعہ اوسلو، ناروے

ایک خط
فین تھیسن

استاد زبان وادب اردو

جامعہ اوسلو، ناروے

کا خط مدیر نئے افق مشتاق احمد قریشی کے نام

مشتاق احمد قریشی، مدیر نئے افق:

یہ جان کر کہ آپ ابن صفی پر اسپیشل نمبر نکالنے جا رہے ہیں، مجھے بڑی خوشی ہوئی کیونکہ میری نظر میں ابن صفی کو اردو ادب میں ابھی تک وہ مقام حاصل نہیں ہوا جو کہ ان کو ملنا چاہیے یا یوں کہیں کہ اردو منقدوں نے ان کی اہمیت نہیں پہچانی، شاید اس پر زیادہ افسوس بھی نہیں کرنا چاہیے، کیونکہ آخر کار منقدین ابن صفی کا کیا بگاڑ سکتے ہیں۔ سب لوگ تو ابن صفی کو جانتے ہیں اور شوق سے پڑھتے رہتے ہیں۔

''رائی کا پربت'' میں صفحہ نمبر ۱۱۳ پر ابن صفی فرماتے ہیں کہ ''اس کی پروا نہ کرو کہ لوگ تمہیں کیا سمجھتے ہیں، ہمیشہ اس پر نظر رکھو کہ تم کیا ہو۔''

ہم بھی پروا نہیں کریں گے کہ منقدین نے ابن صفی کو نہیں پہچانا۔ اس پر نظر رکھیں گے کہ وہ کیا ہیں۔

آپ کا

فین تھیسن

(نیا رخ۔ اگست، ۱۹۸۸ء)

مصور صدیقی کا بنایا ہوا خاکہ انہوں نے ہندوستان
میں جاسوسی دنیا کے بیشتر سرورق بھی بنائے
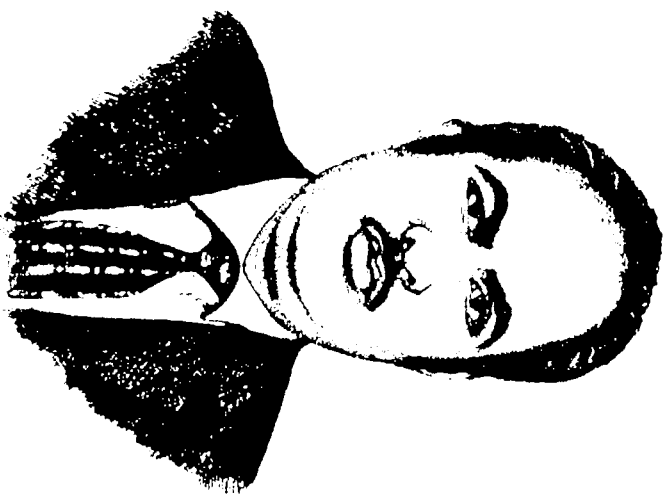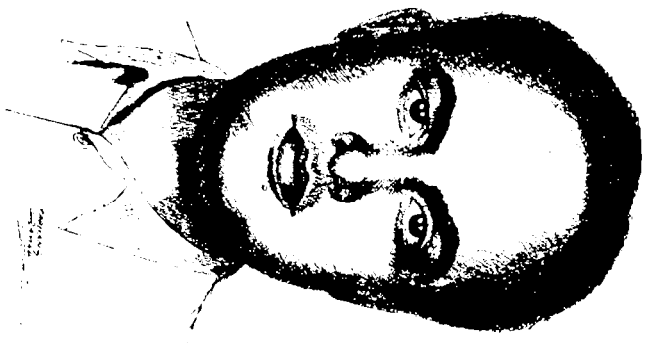
مصور فرینگ قمر کا بنایا ہوا خاکہ

مصور ولایت احمد کے بنائے ہوئے قلمی خاکے

مصور رؤف تارا کا بنایا ہوا قلمی خاکہ
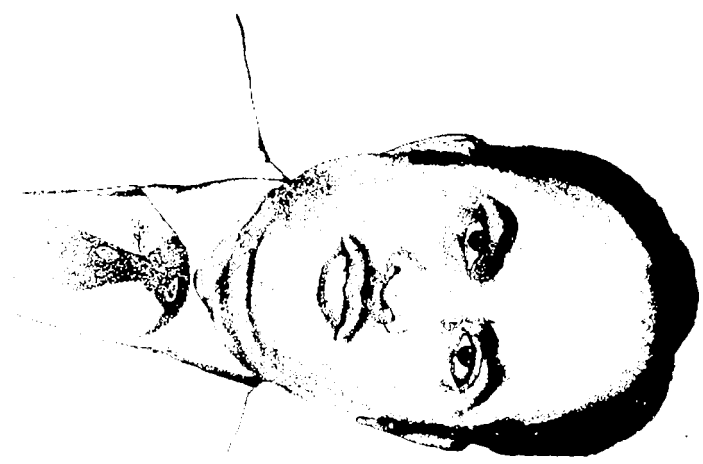
مصور مشیر صدیقی کا بنایا ہوا قلمی خاکہ

برق نامہ

غلطی میری ہی ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے مجھ ناچیز کو جس قرآنی کام پر لگا دیا ہے اس سے صرف نظر کرتے ہوئے جناب ابن صفی سے تعلق کے باعث میاں راشد اشرف کے کہنے میں آ کر میں ''یادش بخیر'' کے بکھیڑے میں پڑ گیا۔ اب یہ کتاب ''ابن صفی کون؟'' اس غلطی کے ازالے کے لیے ہی مرتب کی ہے۔ بس بہت ہو گیا میں ابن صفی صاحب کے تمام قارئین سے معذرت چاہتا ہوں اور اپنی ان تمام غلطیوں کی معافی بھی چاہتا ہوں۔ ان شاءاللہ آئندہ ایسی غلطی نہیں ہوگی۔ میں اپنے حقیقی، قلبی احساسات و جذبات کا اظہار اگست ۱۹۸۶ء کو نئے افق کے شمارے میں ''لذت زیست'' کے عنوان سے کر چکا ہوں۔ اس کا ایک ٹکڑا یہاں دوبارہ نقل کر رہا ہوں۔

''یہ صحیح ہے کہ محترم ابنِ صفی سے میرا تعلق ان کے قلم، ان کی تحریر کے حوالے سے ہی قائم ہوا لیکن جلد ہی میری عقیدت اور ان کی محبت ایک ایسے رشتے میں گندھ گئی جس کی مثال مشکل ہے۔ انہوں نے ہمیشہ مجھے بہت عزیز رکھا اور خوردی و بزرگی کے باوجود انہوں نے میری عزت کی۔ یہ ان کے مزاج کا خاصا بھی تھا کہ وہ بڑوں کا احترام اور چھوٹوں کی عزت کرتے تھے۔ یہ ان کی اعلیٰ ظرفی ہی تھی کہ انہوں نے ہمیشہ مجھے چھوٹے بھائی کی مانند سمجھا۔ میری ذہنی تربیت اور اخلاقی اقدار میں ان کا بڑا ہاتھ ہے۔ آج میں جو کچھ بھی ہوں انہی کی محبت و شفقت کے فیض کا نتیجہ ہے۔

(نئے افق اگست: ۱۹۸۶ء) اور یادش بخیر: صفحہ نمبر ۱۴۳

یادش بخیر کی اشاعت پر ابن صفی صاحب کے لائق صاحبزادے جناب احمد صفی صاحب کو میری تحریر پر شدید اعتراض ہے، جس کے ردعمل کے طور پر انہوں نے مجھے بذریعہ ای میل سرزنش کی میں نے ان کے والد محترم کی تربیت کے زیر اثر ہی ان سے بلا کسی حیل حجت کے اپنی دانستہ یا نادانستہ خطا کی معافی مانگ لی لیکن اس سے وہ مطمئن نہ ہو سکے ان کا کہنا کہ میں ان کے سوالات کی وضاحت کروں۔ میں ان کی ان کے والد محترم کی جو عزت قدر و منزلت کرتا ہوں اس کا یہی تقاضا ہے کہ میں کچھ نہ کہوں اور ان سے بھی تمام تر معذرت کے ہی گزارش کر رہا ہوں کہ وہ بھی اس سلسلے اور معاملے کو درگزر سے کام لیتے ہوئے معاف کر دیں۔

میں یہاں آپ کے اطمینان قلب کے لیے وہ تمام برقی مراسلت بھی شامل اشاعت کر رہا ہوں تا کہ ان کے حکم کی تعمیل بھی ہو سکے اور ان کو اطمینان بھی حاصل ہو سکے مجھے کسی اور کی خوشی یا ناراضی کی اتنی پرواہ نہیں جتنی جناب احمد صفی کی خوشی و اطمینان کی پرواہ و خیال ہے۔ وہ مجھے ابن صفی صاحب کی نسبت سے ہی بہت عزیز ہیں۔

مشتاق احمد قریشی

حرف آخر

یقیناً عزت و ذلت اور خیر اللہ تعالیٰ کے ہی ہاتھ میں ہے۔ میرے لیے یہ بات باعث اطمینان ہے کہ آپ میرے بارے میں منفی ہی سہی کچھ تو تحریر کر رہے ہیں۔ کم از کم آپ حسنِ تحریر کے ذریعہ ہی سہی مجھ گم نام کا نام

جناب ابن صفی صاحب کے ساتھ لے کر مجھے اردو تاریخ میں درج کردیں گے۔ جزاک اللہ

From: Ahmad Safi
Date: 2013/9/06
Subject: Re: Ibne Safi Kon Say Mutaliq
To: Mushtaq Ahmed

پس منظر:

مشتاق صاحب کی کتاب ''یادش بخیر'' مئی سن 2013ء میں شائع ہو چکی تھی۔ اور اس کی ایک کاپی لاہور میں ایک کرم فرما کے توسط سے مجھ تک پہنچ چکی تھی (یونکہ یہ لاہور ہی کے مکتبہ القریش سے شائع کرائی گئی تھی) اس کو پڑھا تو معلوم ہوا کہ مشتاق صاحب نے اغلاط سے بھرپور ایک نسخہ ترتیب دے دیا ہے اور اس میں جا بجا غلط بیانیاں بھی تھیں۔ ان اغلاط اور غلط بیانیوں کا ذکر آپ (راشد اشرف) اور محمد حنیف بھائی سے بھی ہوا اور ہم بہن بھائیون نے بھی اس پر آپس میں گفتگو کی۔ میں نے ان غلط بیانیوں کو مارک کر کے اس پر ایک مضمون لکھنا شروع کیا جس کا مقصد صرف اس کتاب میں دیے گئے ''حقائق'' کی اصل حقیقت کو بیان کرنا تھا تاکہ قارئین اور مستقبل کے محققین اس کو حوالہ نہ بنالیں۔ اس سے یہ بھی ثابت ہو جائے گا کہ نہ صرف اس میں غلط حقائق ہیں بلکہ غلط بیانیاں بھی ہیں اور اس کتاب میں درج کسی بات پر یقین نہیں کیا جاسکتا۔

12 مئی کو مشتاق صاحب نے دو احادیث ایس ایم ایس میں بھیجیں جیسا کہ وہ اکثر ماس میلنگ میں بھیجتے ہیں یہ جانے بغیر کہ یہ کس کس کو جا رہی ہے۔ ترمذی کی حدیث کا متن یہ تھا۔ ''سچ کو لازم پکڑو بے شک سچ نیکی کا راستہ دکھاتا ہے اور نیکی جنت کی طرف لے جاتی ہے اور آدمی برابر سچ بولتا رہتا اور ارادہ کرتا رہتا ہے حتیٰ کہ اللہ کے ہاں سچا لکھ دیا جاتا ہے۔ جھوٹ سے اجتناب کرو بے شک جھوٹ گناہ کا راستہ دکھاتا ہے اور گناہ جہنم کی طرف لے جاتا ہے اور آدمی مسلسل جھوٹ بولتا رہتا ہے اور ارادہ کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ اللہ کے ہاں جھوٹا لکھ دیا جاتا ہے۔'' دوسری حدیث کا متن یہ تھا'' جب بندہ جھوٹ بولتا ہے تو فرشتے اس کی بو کی وجہ سے اس آدمی سے ایک میل دور چلے جاتے ہیں۔ (اس ٹیکسٹ میسیج کی تصویر میرے فون سے لی گئی منسلک ہے)

میں نے یہ میسیج پڑھا تو بے اختیار مشتاق صاحب کو جواب دیا'' کاش اس حدیث کا اطلاق آپ اپنی حالیہ مطبوعہ کتاب پر بھی کرتے۔'' میرا واضح اشارہ ''یادش بخیر'' کی طرف تھا۔

اس میسیج کو پڑھتے ہی مشتاق صاحب نے فوراً فون کیا۔ پھر ہم نے گھنٹہ بھر سے زیادہ گفتگو کی۔ مشتاق صاحب نے سب سے پہلے تو دل آزاری کرنے کی معذرت چاہی اور پھر جاننا چاہا کہ ہمیں کیا برا لگ گیا۔ میرے نکات کا ان کے پاس کچھ واضح جواب نہ تھا۔ جس بات پر ہم سب کو سب سے زیادہ غصہ تھا وہ مشتاق صاحب کا ایثار بھائی جان مرحوم کے لیے یہ کہنا تھا کہ وہ خود ابن صفی میگزین نکالنا چاہتے تھے اس لیے مشتاق صاحب سے تعلقات توڑ لیے۔ اس کے علاوہ وہ مُصر تھے کہ انہوں نے ابن صفی میگزین کی ڈیکلیریشن کے کاغذات بھائی جان کو دے دیے تھے۔ لیکن چونکہ ایسی کوئی دستاویز بھائی جان یا ابو کے کاغذات میں کبھی نہیں

ملی لہٰذا اس پر یقین نہیں کیا جا سکتا تھا۔ تعلقات توڑنے کی وجوہات دوسری تھیں جن کا ذکر مشتاق صاحب گول کر گئے تھے۔ بہر حال اسی دن مشتاق صاحب نے ایس ایم ایس کے ذریعے بھی معافی نامہ لکھا جس کی کاپی بھی منسلک ہے۔

پھر مشتاق صاحب نے دو دستاویزات کی رنگین نقول مجھے ای میل میں بھیجیں، جس کا مطلب یہ تھا کہ یہ دستاویزات ان ہی کے پاس موجود تھیں۔ یہ ایک فارم تھا اور ایک خط تھا جو کسی حوالے کے بغیر ڈیکلیریشن اتھارٹی کے نام لیٹر ہیڈ پر ڈیکلیریشن منتقلی کی درخواست کے طور پر لکھا گیا۔ یہ کوئی لیگل کاغذ نہ تھا۔ اس پر میں نے ایک مفصل ای میل مشتاق صاحب کو لکھی جس کا جواب نہیں دیا گیا۔ البتہ فون پر دوبارہ بات کی گئی جس کا کوئی ریکارڈ نہیں ہے اور کوئی شافی جواب استفسارات کا نہ دیا گیا۔

جب نئی کتاب ''ابن صفی کون؟'' کے شائع کرنے کا ارادہ کیا تو مشتاق صاحب نے ای میل کیا اور کہلوایا کہ ہمیں اگر کوئی وضاحت کرنی ہو تو لکھ دیں وہ چھاپ دیں گے۔ میرا اس پر جواب یہ تھا کہ وضاحت کی ضرورت ہمیں نہیں مشتاق صاحب کو ہے۔ ان کے پاس میری ای میل موجود ہے (جس کا میں نے اوپر ذکر کیا) اسے من وعن شائع کر دیں۔ کتاب مذکور کے پہلے ورژن میں اسے شامل نہیں کیا گیا۔ مگر چونکہ اس کا مسودہ مجھ تک پہنچ چکا تھا اور میں نے اس میں بھی کچھ سوال اٹھائے تو مشتاق صاحب نے کتاب میں تبدیلیاں کیں اور اس ای میل کو چھاپنے کا فیصلہ بھی کر لیا۔

آخری بات جو میں کہنا چاہوں گا وہ یہ ہے کہ ابن صفی پر جس کا جی چاہے جیسی کتاب شائع کرے اور جو جی میں آئے لکھے سوائے ان تحریروں کے جن کے جملہ حقوق بحق مصنف اور ان کے لواحقین کے محفوظ ہیں۔ ہم نہ کسی کو روک سکتے ہیں اور نہ روکیں گے۔ البتہ یہ ہمارا حق محفوظ ہے کہ اگر کسی بھی کتاب میں حقائق کو غلط انداز میں یا توڑ مروڑ کر پیش کیا جائے تو ہم اس کا جواب دیں گے۔ اور سچ بات قارئین تک ضرور پہنچائیں گے تاکہ ریکارڈ درست رہے۔ جو ای میل شائع کی جا رہی ہے اس میں جس تصحیح مضمون کے لکھنے کا ذکر کیا گیا ہے وہ تیار ہے اور مناسب موقع اور فورم میں شائع کیا جائے گا۔

خیر اندیش

احمد صفی

لاہور، 6 ستمبر 2013

From: Ahmad Safi
Date: 2013/5/23
Subject: Re: Att Mr Ahmad Safi
To: Mushtaq Ahmed

جناب مشتاق صاحب، سلام مسنون:

منسلکہ فائیلوں کا بہت شکریہ مگر میں ان کا کیا کروں۔ آپ کے مطابق آپ نے یہ منسلکہ خط ایثار بھائی جان کو دے

دیا تھا۔ آج یہ پہلی بار دیکھ رہا ہوں کہ تمام خاندانی کاغذات جو میری تحویل میں ہیں ان میں یہ کہیں موجود نہیں۔

یہ اوریجنل خط جو بغیر کسی تاریخ کے اندراج کے آپ کے پاس ہے (بھائی جان کے پاس نہیں) اور اس کے ساتھ کسی وسیم الدین احمد صابری صاحب کے نام سی فارم۔ مجھے یقیناً پبلشنگ کے کام کا تجربہ نہیں ہے مگر آپ ہی بتائیے پاکستان کے کسی محکمہ میں کوئی بھی دستاویز/ ملکیت محض اس طرح کے خط اور کسی فارم کی منسلکہ کاپی کے ساتھ کسی اور کے نام پر تبدیل کی جاسکتی ہے......؟؟؟ ادارے کا کوئی فارم کوئی اور چیز درکار نہیں رہی ہوگی......؟؟؟ معاف کیجیے گا اس کاغذ کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔

بہر حال، بھائی جان مرحوم نے کبھی پبلشنگ کا کام نہیں کیا تھا اور نہ کر سکتے تھے وہ ایک پروفیشنل ڈاکٹر تھے اور اسی پیشے میں اپنی آخری سانس تک کام کرتے رہے۔

بات صرف اتنی ہے کہ آپ نے اپنے مضمون ''جو میں نے محسوس کیا'' میں لکھا: ''محترم ابن صفی کے بڑے صاحبزادے جناب ایثار احمد صفی جب اپنی ڈاکٹری کی تعلیم مکمل کر کے وطن واپس آئے تو انہوں نے جانے کیوں مجھے پابند کر دیا کہ میں آئندہ نہ تو ابن صفی کی کوئی تحریر اپنے جرائد میں شائع کروں اور نہ ہی کسی طرح سے ان کا نام استعمال کروں۔''

اب اس جانے کیوں کی آپ نے بالکل غلط وضاحت کی کہ وہ خود ابن صفی میگزین نکالنا چاہتے تھے۔ بھائی اس سے پہلے ایک لمبی کہانی ہے اسے آپ حذف کر گئے۔ سن 1980 سے 1993 تک آپ صدقات کی مد میں جو خطیر پانچ ہزار کی رقم ادا کرتے رہے 13 سال تک، صرف یہ پوچھا گیا تھا کہ اس میں کچھ اضافہ ہوسکتا ہے؟ آپ کا جواب ہمیشہ کی طرح یہی تھا کہ پرچے نقصان میں چل رہے ہیں۔ اور ہم تو خود انہیں بند کرنے والے ہیں۔ اور ناول کی دونوں رسالوں میں اشاعت سے بھی کچھ فائدہ نہیں ہو رہا۔ تو اس پر میرے اہل خاندان کا یہ خیال تھا کہ جب نقصان میں چل رہے ہیں تو پھر بند کر دیئے جائیں۔ آپ کی طرف سے دوٹوک جواب سن کر پھر یہی فیصلہ کیا گیا تھا کہ یہ کاروباری تعلق ختم ہی کر دیا جائے کیونکہ نہ تو اسکا آپ کو کوئی فائدہ ہو رہا تھا اور نہ ہی ابن صفی کے اہل خانہ کو۔ اسی لیے اسے آفیشل اور قانونی شکل دینے کے لیے اس بارے میں اشتہار بھی دے دیا گیا تھا تا کہ اگر کسی اور سے اس سلسلے میں بات کی جائے تو قانوناً درست ہو۔

آپ کی اس مضمون میں یکطرفہ سرگذشت کی وجہ سے یہ مضمون محض ابن صفی کے اہل خانہ کی بد دماغی کا اشتہار بن کر رہ گیا ہے اور آپ اپنی معصومیت میں نجانے کیوں کا سوال لیے کھڑے نظر آتے ہیں۔ خود سوچیے کون یقین کرسکتا ہے کہ نئے افق، نیا رخ اور آنچل کے بعد ابن صفی میگزین کی ڈیکلیریشن لے کر چاروں پرچوں کو شائع کرنا اگر نقصان دہ تھا تو یہ کام کیا ہی کیوں جا رہا تھا اور اب تک ماشاءاللہ جاری ہے۔ اس کے ثمرات بھی کوئی عقل کا نابینا ہی ہوگا جسے نظر نہ آ رہے ہوں۔ اور کیا لکھوں؟ بھائی جان کے بارے میں آپ نے لکھا۔ ''ان کی جوان موت کا آج بھی میرے سینے پر داغ ہے۔'' پڑھنے والوں کی آنکھیں یقیناً اس اظہار رنج پر نم ہو جائیں گی مگر بھائی جان کے لواحقین میں سے ایک ہونے کے باعث مجھے اس بات پر بہت غصہ آیا

ہے۔آپ ان کے انتقال پر اہل خانہ سے دو لمحے تعزیت کے لیے نہ آسکے جب سارا کراچی ہی گھر پر اُمڈ آیا تھا۔ دور دور سے لوگ پہنچ گئے تھے اور ان کے تو اپنے چاہنے والوں کا رش اتنا تھا کہ جنازہ گاہ نماز جمعہ کی طرح بھر گئی تھی۔ چلئے شائد آپ کسی وجہ سے نہ آپائے ہوں تو کیا فون، موبائیل یا کسی کی زبانی بھی تعزیتی کلمات نہ کہے جاسکتے تھے۔ یہ مت کہیے گا کہ آپ کے پاس ہمارا کونٹکٹ نہ تھا۔ سینکڑوں ایسے لوگ تھے جو ہمارے آپ کے مشترکہ جاننے والے تھے کسی سے بھی نمبر مل سکتا تھا۔ اس بات کو لوگوں نے ہماری والدہ کے انتقال پر بھی نوٹ کیا تھا۔ آپ کی طرف سے کبھی کوئی تعزیتی پیغام نہ آیا۔ اور مجھے علم نہیں کہ کسی پرچے میں بھی آپ نے دو لفظ لکھے ہوں؟؟؟ اگر ایسا ہے تو مجھے ضرور دکھلایئے گا۔ مگر ہم نے اس پر کبھی کچھ نہ کہا۔ یہ ہماری والدہ تھیں جنہوں نے آپ کی اہلیہ کے انتقال کا سن کر بھائی جان کو فوراً روانہ کیا تھا کہ خود کمزوری کے باعث نہ جاسکتی تھیں۔ آپ بھائی جان کے متعلق اس طرح نہ لکھتے تو شائد ہم بہن بھائیوں کو اتنا رنج نہ ہوتا مگر یہ تو مرے پر سو درّے والی مثل ہے۔

اب یہ ہے کہ اس ''نجانے کیوں'' کے اجمال کی تفصیل مجھ پر قرض ہوگئی ہے کیونکہ آپ نے ہمارے مرحوم بڑے بھائی پر الزام دھر کر انہیں قصوروار ٹھہرا دیا ہے۔ وہ تو اپنا دفاع نہیں کر سکتے مگر ان کے دیگر برادران موجود ہیں جو حقائق کو سامنے لے آئیں گے۔

آپ کی کتاب یادش بخیر کا نام غلط ہے کیونکہ اگر یہی آپ کی یادداشت ہے تو اس کی اصلاح کی شدید ضرورت ہے۔ کتاب میں بکھرے آپ کے مضامین میں جابجا غلط معلومات ہیں جن کو آسانی سے شواہد کے ساتھ غلط ثابت کیا جاسکتا ہے۔ ان کو میں الگ مضمون وار جمع کر رہا ہون تا کہ آپ کی تصحیح بھی ہو سکے اور عوام الناس کو بھی اندازہ ہو سکے کہ کتنی ہی باتیں ذاتی گفتگو کے مد میں ایسی درج کر دی گئی ہیں جن کا درست ہونا ناممکن ہے۔ اور اسی سے اس بات کا استدلال بھی ہوتا ہے کہ اس کتاب میں درج کی گئی کسی بھی معلومات پر بھروسہ نہیں کیا جاسکتا کیونکہ جب ایک بار اغلاط و غلط بیانی راہ پا جائیں تو کسی بھی متن کو بآسانی رد کیا جاسکتا ہے۔ ابو سے متعلق درج تمام باتیں آپ اور ان کے درمیان ہوئیں اور کوئی دوسرا اس میں شامل نہیں رہا۔ ع آدمی کوئی ہمارا دمِ تقریر نہ تھا! ان تمام باتوں کو بھی بغیر حوالہ تسلیم کرنا بے کار ہے۔ ان کے مندرجات کو بھی وقت اور حالات کی کسوٹی پر کسنے کے بعد بآسانی ملاوٹی ثابت کیا جاسکتا ہے۔ میں نے تو تمام پیپرس اور آپ کے پرچوں سے گفتگو کی تمام فائیلیں دکھوالیں کسی میں بھی آپ کو بخشی گئی شاگردی کی کوئی سند نہ مل سکی۔ ابو کے انتقال کے بعد سے یہ خود ساختہ اسناد شاگردی آپ کی تخلیقات کے اشتہاروں میں نمودار ہونی شروع ہوگئیں۔ آپ کا ورود تو سن ستر کی دہائی میں ہوا۔ اس سے قبل جتنا انٹر ایکشن فیملی کے ساتھ آپ نے لکھا ہے وہ محض پرانے واقعات سے واقفیت کی بنیاد پر ہے کیونکہ جب آپ زیادہ تفصیل میں جاتے ہیں (اور تفصیلی مکالمات 60 کی دہائی کے تحریر کرتے ہیں) تو اغلاط ابھر کر سامنے آجاتی ہیں۔ کتاب میں بغیر اجازت شریک کیا گیا کاپی رائٹ میٹیریئل جو جاسوسی دنیا میگزین ایڈیشن سے متعلق ہے اس کے علاوہ ہے۔ ان نایاب میگزینز کی

دریافت کے بعد ہمارا ان کے بارے میں کیا پلان ہے' آپ نے انہیں بغیر اجازت کتاب کا حصہ بنا دیا......؟
میرا خیال ہے مجھے مزید یہاں لکھنے کی ضرورت نہیں بلکہ میں ایک مبسوط مضمون میں ان سب باتوں کو جمع کر رہا ہوں تاکہ ریکارڈ درست رہے اور عوام الناس تک بھی تصویر کا دوسرا رخ تو پہنچے اور وہ جان سکیں کہ محض اپنے انداز فکر کے مطابق لکھی گئی اس کتاب سے جو تصویر ابن صفی کے اہل خانہ کی بنتی ہے اس کا رد ہو سکے۔

خیر اندیش

احمد صفی

From: Ahmad Safi
Date: 2013/6/24
Subject: Re:
To: Mushtaq Ahmed

محترم مشتاق صاحب' سلام مسنون:
راشد اشرف نے بھی کچھ دیر قبل فون کر کے آپ کا پیغام پہنچا دیا تھا۔
آپ کی تصنیف یادش بخیر واقعاتی اغلاط سے عبارت ہے جن کی نشاندہی کر چکا ہوں۔ صرف ابن صفی اور اہل خانہ سے متعلق اندراجات ہی غلط نہیں بلکہ دیگر کئی اور اندراجات دوسرے لوگوں سے متعلق بھی غلط ہیں اور میری معلومات کے مطابق ان میں سے کچھ اس سلسلے میں پہلے ہی آپ سے رابطے میں ہیں۔ نکتہ یہ ہے کہ اس کتاب میں جو باتیں ابن صفی سے منسوب کر کے لکھی گئی ہیں ان کا بھی کوئی حوالہ یا سند موجود نہیں اور کتاب کے دیگر اندراجات کی طرح کوئی بھی ادب کا طالبعلم یا محقق انہیں بآسانی مسترد کر سکتا ہے۔
میں وضاحتی مضمون نہیں لکھنا چاہتا اور نہ ہی مجھے اس کی ضرورت ہے۔ آپ کو ابن صفی کے اہل خانہ کی جانب سے لیے گئے اعتراضات کا علم ہے جو آپ سے براہ راست گفتگو میں آپ تک پہنچ چکے ہیں۔ آپ ان اعتراضات کا جواب دے دیجیے۔ میں نے جو ای میل آپ کو لکھی تھی وہ آپ کے پاس ہے آپ سے من و عن شائع کر دیجیے۔ صرف معذرت کر لینا کافی نہیں ہوتا کیونکہ اس سے یہ تاثر جاتا ہے کہ آپ نے تو سب کچھ درست اور مستند تحریر کیا ہے اگر ہمیں ناپسند ہے تو معذرت۔ جو نکات اُٹھائے گئے ہیں ان کا جواب دیجیے اور اگر جواب نہیں ہے تو ان کی نشاندہی کر کے معذرت کر لیجیے۔

والسلام

احمد صفی

حرف آخر

یقیناً عزت وذلت اور خیر اللہ تعالیٰ کے ہی ہاتھ میں ہے۔ میرے لیے یہ بات باعث اطمینان ہے کہ آپ میرے بارے میں منفی ہی سہی کچھ تو تحریر کر رہے ہیں۔ کم از کم آپ حسنِ تحریر کے ذریعہ ہی سہی مجھ گم نام کا نام جناب ابن صفی صاحب کے ساتھ تو آ جائے گا اردو تاریخ کا حصہ بنے رہے گا۔ جزاک اللہ (مشتاق احمد قریشی)

نہ مار پائے گی موت ہم کو کہ ہم کتابوں میں جی رہے ہیں

مشتاق احمد قریشی

ابن صفی کسی عام آدمی کا نام نہیں ہے ابن صفی ایک ایسے بلند قامت اردو ادب کے ہر فن مولا شخصیت کا نام ہے جس نے اردو ادب میں اپنے نام کی نہر خود اپنے قلم سے جاری کی ان کا فن ان سے شروع ہو کر ان پر ہی ختم ہوا ہے۔

انہوں نے اردو ادب میں ایسا سنگ میل نصب کیا ہے کہ جس نے اچھے اچھوں کو راہ سوجھا دی انہیں اپنے قلم کی حرمت کا بڑا شدید احساس تھا وہ اس بات کا خوب ادراک رکھتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی تمام مخلوقات میں سب سے پہلے قلم کی تخلیق فرمائی وہ قلم ہی تھا جس نے ربّ عظیم کے حکم سے تمام کائنات کی تقدیر لوح محفوظ پر رقم کی ابن صفی صاحب کو قلم کی قدر و قیمت کا پورا پورا احساس تھا ان کا کہنا تھا کہ جس طرح نشتر سے کوئی سرجن آپریشن کے وقت کام لیتا ہے اور اپنے مریض کا علاج کرتا ہے ایسے ہی قلم کے ذریعے لکھنے والا اپنے پڑھنے والوں کے ذہن اور قلب کا علاج کرسکتا ہے بیمار ذہنوں کا شافی علاج کرسکتا ہے اس کے لیے ضروری ہے کہ اپنے قلم سے اخلاص و دیانت کے ساتھ انصاف کرے اور قلم سے صحیح اور درست کام لینے کے لیے قلم اٹھانے والے کو خود دیانت دار اور مخلص ہونا چاہیے اور انسان اپنے آپ سے اپنے ہنر سے اس وقت ہی دیانت برت سکتا ہے جب اُس کی نظر میں اُس کی شخصیت میں کوئی کھوٹ نہ ہو اس کا فن چاہے جو بھی ہو اُس میں اُسے پوری طرح کامل ہونا چاہیے اور کسی بھی فن میں کامل ہونے کے لیے بڑے ریاض بڑی محنت و مشقت کی ضرورت پڑتی ہے خاص طور سے قلم کار کو جو اپنے قلم سے کسی کی رہنمائی، رہبری کا بیڑا اٹھانا چاہتا ہو اسے بہت زیادہ علم کی ضرورت ہوتی ہے اور علم کسی دکان پر نہیں ملتا کہ چند پیسے دیئے اور خرید لیا یوں کہنے والے کہتے ہیں کہ علم تو قدم قدم پر ہر طرف بکھرا پڑا ہے بس ذرا کھلی آنکھوں سے اپنے اردگرد کے ماحول کو دیکھنے اور سمجھنے کی ضرورت ہے علم صرف کتابوں میں خصوصاً نصابی کتابوں میں نہیں ملتا۔ علم کہتے ہیں کسی بھی چیز کے جاننے کو، دانش کو واقفیت کو، آگاہی کو، فن کو، جوہر کو، ان سب کو حاصل کرنے کے لیے انسان کو بڑا پاپڑ بیلنا پڑتا ہے پہلے حالات واقعات کو خود سمجھنا پڑتا ہے پھر کہیں جا کر کسی کو سمجھانے کے قابل ہوتا ہے۔

شاید یہی اُن کی سوچ و فکر تھی جس کی وجہ سے انہوں نے اپنے قلم کو پوری دیانت داری اور اخلاص سے فلاح و بھلائی کی راہ پر لگایا اور ایسے خوفناک ہیبت زدہ ماحول میں قلم اٹھایا جب کے ہر طرف قلم کار اور اہل قلم ہونے کے دعوے داروں نے لوگوں کے جذبات و احساسات میں آگ لگا رکھی تھی سونے پر سہاگہ یہ کہ اس آگ کو ٹھنڈا کرنے کے بجائے ہر لکھنے والا ہوا دے رہا تھا نا صرف وہ خود بددیانتی پر کمربستہ تھے بلکہ اپنے پڑھنے والوں کو بھی اپنے قلم کے ذریعے گمراہ کر رہے تھے شیطان کے آلہ کار بنے ہوئے تھے اپنے قلم کو لذت

کی غلاظت میں ڈبو کر پڑھنے والوں کے ذہنوں کو پراگندہ ہی نہیں کر رہے تھے اردو ادب کے نام پر دھبے لگا رہے تھے اور اپنے لگائے دھبوں کو مٹانے کے بجائے ان میں طرح طرح سے اضافہ کر رہے تھے اور پھر فخر سے سینہ پھلا پھلا کر ادب کی خدمت کے دعوے دار بھی بن رہے تھے۔ ایسے پرفتن ماحول میں جب ہر طرف گندگی غلاظت میں لپٹی تحریروں نے پڑھنے والوں کے دلوں کو ذہنوں کو مسموم کر رکھا تھا۔

تب ابن صفی نے اللہ کا نام لے کر اپنا قلم اٹھایا یوں کہا جائے کہ اس فحاشی و عریانی کی گندگی و غلاظت کے خلاف اپنے علم اور قلم کو بطور علم بلند کیا اپنے قلم کو اپنے ہنر سے اپنے علم و آ گاہی سے اردو ادب کی ہی نہیں بلکہ اردو داں طبقے کی راہ کے تمام کانٹے چن چن کر راہ کو ہموار کیا تمام پڑھنے والوں خصوصاً اردو پڑھنے والوں کے ذہن و نظر کی گندگی و غلاظت کو دھو ڈالا۔ ابن صفی ایک شخص کا نام نہیں ہے بلکہ ایک عہد کا نام ہے ایک عظیم ترین عہد کا نام جس نے اپنے عزم و ہمت سے اردو ادب کی تنگ نظری توڑ دی۔ اقربا پروری (اقربا پروری ان معنوں میں کہ ادب کے مخصوص لکھنے والے آپس کے ہی چند لوگوں کے لیے لکھتے تھے وہ خود پڑھتے خود ہی سمجھتے یا ان کے چند اہم نوا احباب واہ واہ کہتے' چاہے سامنے والے کی تحریر ان کے اپنے سر سے ہی کیوں نہ گزر رہی ہوتی) کا بھرپور مقابلہ کیا ہے بلکہ ادب کے سنگی تابوت کو بھی پاش پاش کیا ہے۔

ابن صفی نے اپنی تحریر کی ابتداء نہایت آسان اور رواں زبان میں کی وہ زبان جو عام معمولی پڑھے لکھے لوگ بھی بہ آسانی پڑھ سکتے اور سمجھ سکتے ہیں یہی وجہ تھی کہ ان کی ہر تحریر کو لوگ توجہ سے پڑھتے جو ان کے دل و دماغ میں اترتی چلی جاتی انہیں کہیں کسی قسم کی دشواری یا دقت کا سامنا نہیں ہوتا انہوں نے کبھی اپنی تحریر میں کوئی ایسا لفظ استعمال نہیں کیا جس کے معنی عام طور پر نہ سمجھ میں آتے ہوں یا وہ عام بول چال میں استعمال نہ ہوتا ہو۔

ابن صفی صاحب نے بہت سوچ سمجھ کر اس وقت کے ماحول کے خلاف بغاوت کا اعلان کیا' اس وقت جو روش چل رہی تھی لکھنے والے جس راہ پر لوگوں کو چلا رہے تھے' ابن صفی نے پڑھنے والوں کو اپنے قلم کے سحر سے اپنی راہ لگا لیا تھا ان کے قلم کی سچائی تھی ان کی دیانت و اخلاص تھا جس نے ان کے پڑھنے والوں کو ان کا گرویدہ بنا دیا اور بتدریج پڑھنے والوں کا ایک ہجوم ان کے گرد جمع ہوتا چلا گیا۔ جس نے ایک بار ان کی تحریر چاہے جس انداز میں بھی پڑھی وہ ان کی تحریر کا اسیر ہوتا چلا گیا پھر وہ ان کی تحریر کے سحر سے چاہنے کے باوجود بھی نکل نہیں سکا۔

ابن صفی صاحب کے مخالفین کوئی اور نہیں تھے وہی لوگ تھے جن کی روزی روٹی پر حرف آ گیا تھا' دراصل وہ ابن صفی کی مخالفت کر کے اپنے خیال میں اپنی بقا کی جنگ لڑ رہے تھے کیونکہ اس دور کے بڑے بڑے ناموروں کے بڑے بڑے چراغوں کی روشنی ابن صفی کے چراغ نے ماند کر دی تھی ابن صفی کے قلم کی روشنی سے ایک عالم منور ہو رہا تھا بلکہ ہوتا چلا جا رہا تھا' ان کے قلم کی روشنی نے کتنے ذہنوں کو منور کیا جانے کتنے لوگوں نے اس روشنی سے علم حاصل کیا جو اردو پڑھنا نہیں جانتے تھے انہوں نے بھی کوشش کر کے صرف اور صرف ابن صفی کی تحریر کی وجہ سے اردو پڑھنا سیکھی تھی' جبکہ دوسری طرف یہ عالم تھا کہ نام نہاد اردو ادب کے بیشتر لکھنے والے خود اپنے ساتھیوں کا لکھا صرف اس لیے نہیں پڑھتے تھے کہ وہ ان کے گروہ یا قبیلے کا لکھا ہوا نہیں ہوتا تھا اور اگر کسی کو اپنے

کسی مخالف میں کیڑے ہی نکالنے ہوتے تو وہ بھی سرسری سا دیکھتا تھا' پڑھتا پھر بھی نہیں تھا ایک طرف ادب اور جغاداری ادیبوں کا یہ حال تھا تو وہیں ابن صفی کے پڑھنے والوں کا یہ جنون بھی دیکھا کہ ان کے ایک ایک ناول کو اکثر لوگوں نے کئی کئی بار پڑھا اور ہر بار پوری طرح لطف اندوز ہوئے اور کئی ایسے ان کے دیوانے بھی ملے جنہوں نے ابن صفی کے ناولوں کو سو سو بار پڑھا جو انہیں کسی الہامی کتاب کی مانند از بر ہو گئے صفحہ نمبر سطر نمبر' سن اشاعت کے ساتھ کئی حیرت انگیز واقعات دیکھنے میں آئے کہ کسی صاحب نے ابن صفی صاحب کے کسی ناول کا کوئی ٹکڑا یا جملہ یا پیرا گراف پڑھا اور سننے والے نے اس کتاب کا نا صرف نام بتا دیا بلکہ ان جملوں کے جائے وقوع اور صفحہ نمبر تک بتا دیا۔ ایسا کسی بڑے سے بڑے ادیب کی تحریر کے ساتھ نہ دیکھا نہ سنا یقیناً ابن صفی صاحب کا قلم ایک معجزہ اثر قلم تھا' انہوں نے جو لکھا ان کے پڑھنے والوں نے اسے قبول کیا ہے۔

ابن صفی صاحب کا پہلا ناول جاسوسی دنیا کا اولین شمارہ دلیر مجرم تھا جسے لکھے ہوئے بلکہ شائع ہوئے اکسٹھ (۶۱) برس گزر چکے ہیں لیکن اس ناول کی تازگی اور توانائی اسی طرح برقرار ہے جس طرح پہلے دن تھی بلکہ اگر میں یہ کہوں کہ ان کی مقبولیت روز اول سے کہیں زیادہ اور مستحکم ہوتی چلی جا رہی ہے' وقت کے ظالم ہاتھوں نے جہاں اچھے اچھوں کو ملیامیٹ کر کے رکھ دیا ہے گمنامی کی تاریکیوں میں جا سوئے ہیں' وہیں اس ظالم اور جابر معاشرے میں ابن صفی صاحب کی تحریریں' یعنی ان کے تمام ہی ناول آج بھی اسی طرح سر بلند ہیں۔ ایک ایسے ماحول و معاشرے میں جب بچے بچے کے ہاتھ میں انٹرنیٹ کمپیوٹر کی سہولت میسر ہو' ایک انگلی کے اشارے سے دنیا کمپیوٹر اسکرین پر سمٹ آتی ہو' اب دنیا کی ہر خبر ہر لمحہ ہر طرف دوڑی دوڑی پھر رہی ہوتی ہے ایسے ماحول میں لوگوں کے پاس خصوصاً نوجوانوں کے پاس اتنا وقت نہیں ہوتا کہ وہ کچھ لکھا ہوا پڑھیں' یہی وجہ ہے کہ کتابوں کی اشاعت روز بروز کم ہوتی جا رہی ہے ایسے ماحول میں لوگوں میں نصف صدی قبل لکھے گئے ناولوں کی طلب یقیناً حیران کن ہے یہ ابن صفی کے قلم کا جوہر ان کے قلم کا ہی کمال ہے کہ انہوں نے نصف صدی پہلے جب لکھنا شروع کیا تو لوگوں کے مزاج کو اور آنے والے وقتوں کے تغیر و تبدل کو محسوس کرتے ہوئے دیر تک اور دور تک دیکھنے والی نظر اور فہم کو بروئے کار لا کر جو کچھ لکھا وہ آج بھی بڑے شوق و ذوق سے پڑھا جا رہا ہے ان کی تحریروں کو ہم آج ادب عالیہ میں شمار کریں یا نہ کریں لیکن ان تحریروں کو زندہ ادب میں ضرور شمار کریں گے۔

ابن صفی کی تحریروں کو ادب عالیہ کی تنقید کی ترازو میں تول کر دیکھیں کیا ان میں کوئی کمی ابن صفی کے پڑھنے والوں کو محسوس ہوتی ہے اور اردو ادب کے معروف نقاد و ادیب جناب ڈاکٹر سید عبداللہ نے کشاف تنقید اصلاحات میں ادب کے تین بنیادی مقاصد بیان کیے ہیں۔

(۱) جمالیاتی مسرت بہم پہنچانا

(۲) جمالیاتی مسرت بہم پہنچانے کے دوران اسی میں حیات و کائنات اور خود فرد کی ذات کے بارے میں ایسی آگہی بخشنا جس سے قلب و ذہن کو جلا ملے۔

(۳) قارئین کو کوئی خاص زاویہ نظر یا طرز عمل اختیار یا رد کرنے کی ترغیب دینا۔

ڈاکٹر سید عبداللہ کا ادب کے بارے میں یہ بھی کہنا ہے کہ

''ادب وہ فن لطیف ہے جن کے ذریعے ادیب جذبات و افکار کو اپنے خاص نفسیاتی و شخصی خصائص کے مطابق نہ صرف ظاہر کرتا ہے بلکہ الفاظ کے واسطے سے زندگی کے داخلی اور خارجی حقائق کی روشنی میں ان کی ترجمانی و تنقید بھی کرتا ہے اور اپنے تخیل اور قوتِ مخترعہ سے کام لے کر اظہار و بیان کے ایسے موثر پیرائے اختیار کرتا ہے جن سے سامع و قاری کا جذبہ و تخیل بھی تقریباً اسی طرح متاثر ہوتا ہے جس طرح خود ادیب کا اپنا تخیل اور جذبہ متاثر ہوا (اشارات تنقید)۔

ابن صفی صاحب جو خطے میں جنگ عظیم اول اور دوم کے بعد بڑھتی ہوئی مایوسی اور ذہنی طور پر زندگی سے فرار اور عالمی سطح پر معاشرے میں جنم لینے والی برائیوں جرائم، ظلم و تشدد کو شدت سے محسوس کر رہے تھے نے بہت غور و فکر سے برائیوں کے خلاف اور لوگوں میں قانون کے احترام کے جذبے کو ابھارنے کے کام کو ایک مہم کے طور پر اپنایا اور اپنے قلم سے اپنے پڑھنے والوں کے لیے سکھ کا سیدھا راستہ بنانے میں مصروف ہو گئے۔ تخریب سے تعمیر کے اس سفر میں انہوں نے واقعی ایک پاک صاف معاشرے کی تشکیل کے لیے اپنے قلم کو بڑے ہی لطیف پیرائے ادب کے دائرے میں رہتے ہوئے بڑے سلیقے و ہنر سے دلوں کو چھو لینے والے انداز کو اپنایا۔ ابن صفی صاحب کے کسی بھی ناول کی تحریر کو سامنے رکھ کر ادب کے اس مجوزہ پیمانے پر پرکھ سکتے ہیں۔

(۱) کیا ابن صفی صاحب نے اپنے کسی بھی ناول میں اپنے پڑھنے والوں کی جمالیاتی حس کو مسرت نہیں پہنچائی یا ان کے بے ساختہ جملوں نے لوگوں کو مسکرانے اور قہقہہ لگانے پر مجبور نہیں کیا، مسرت آخر کس چیز کا نام ہے لغوی معنوں میں مسرت خوشی، شادمانی، انبساط کے ہی ہیں جو ابن صفی کی ہر تحریر کے جملوں پر خوب کوٹ کوٹ کر بھری ہے ان کا کوئی ناول مسرت انبساط سے خالی نہیں ہے لیکن ادب کے سوداگر ادب کے حرافوں کی کسوٹی پر ابن صفی کا کھرا سونا بھی پورا نہیں اتارتے کیونکہ اس چراغ نے ان کی روشنی کو ماند جو کر دیا ہے۔

(۲) ادب کی دوسری اور اہم شق، جمالیاتی مسرت بہم پہنچانے کے دوران حیات و کائنات اور خود فرد کی ذات کے بارے میں ایسی آگہی بخشنا جس سے اس کے قلب و ذہن کو جلا ملے، ابن صفی صاحب نے جس لطیف انداز میں ادبی پیرایا اختیار کیا ہے وہ بڑے بڑے لکھنے والوں کے بس کی بات نہیں، ابن صفی نے جس جس طرح اپنے قارئین کو جمالیاتی مسرت پہنچائی ہے وہ ہر کسی کے بس کی بات نہیں، کیا ابن صفی کے کسی بھی ناول نے اپنے پڑھنے والوں کو ان کی جمالیات کو مسرت سے شادکام نہیں کیا، کیا ان کی تحریر میں جرم سے نفرت قانون سے محبت کا اہتمام نہیں کیا گیا، کیا ان کے کسی بھی ناول میں جرائم کے فروغ کی ترغیب دی گئی ہے کسی مجرم کو سرخرو ہوتا دکھایا گیا ہے۔ ان کی ہر تحریر میں فرد کی ذات کی ہی بات کی گئی ہے انہوں نے بڑے مستحکم انداز میں اپنے پڑھنے والوں کے قلب و ذہن کو نہ صرف جلا بخشی بلکہ انہیں اپنے قلم کے زور پر معاشرے میں پھیلی تاریکیوں سے نکال کر روشن راستہ پر لا کھڑا کیا ہے ان کے کسی ناول میں کہیں بھی قانون سے بغاوت اور انصاف و حق سے نفرت کا درس نہیں دیا گیا انہوں نے بہت کھل کر اپنے معاشرے کی اپنے

قارئین کے ذہنوں کی اصلاح کی ہے انہیں جلا بخشی ہے یہی وجہ ہے کہ اکسٹھ برس بعد بھی لوگ ان کی تحریروں کی تلاش میں سرگرداں پھر رہے ہیں اگر ابن صفی صاحب کی تحریر ادب میں شمار نہیں ہوسکتی تو پھر کسی کی کوئی تحریر ادب کے اس مجوزہ معیار پر پوری نہیں اترتی۔

(۳) ادب کے معیار کا تیسرا نقطہ یہ ہے کہ ''قارئین کو کوئی خاص زاویہ نظر یا طرزِ عمل اختیار کرنے کی ترغیب دینا۔

کیا ابن صفی صاحب نے اپنے ناولوں میں اپنے قارئین کو جرم سے نفرت اور قانون کے احترام کی ترغیب نہیں دی؟

ابن صفی کے تخلیق کردہ تمام کردار گو کہ فرضی ہیں لیکن کیا ان کے قارئین کا خیال بھی ان تمام ہی کرداروں کے بارے میں ایسا ہی ہے کہ وہ فرضی کرداروں والی فرضی کہانی پڑھ رہے ہیں ان کے قلم کا یہ کمال ہے کہ ان کی تحریر کا قاری خود کو ان کے قلم کے سحر میں اس طرح جکڑا ہوا پاتا ہے کہ وہ خود کو ان مقامات و مناظر میں ان کرداروں کے ساتھ موجود پاتا محسوس کرتا ہے اسے یہ یقین ہی نہیں ہوتا کہ وہ واقعات وہ کردار قطعی فرضی ہیں وہ انہیں اپنی ہی طرح جیتا جاگتا محسوس کرتا ہے اور ان کے ساتھ سانس لیتا ہے' ابن صفی اپنے ایک ناول مہلک شناسائی کے پیش رس میں لکھتے ہیں۔

''مستقبل سے مایوسی غلط فہمی کی پیداوار ہے جو آدمی کو جرائم کی طرف لے جاتی ہے' مستقبل سے مایوس ہوکر یا تو آدمی جرم کرتا ہے یا پھر کسی ایسے کرنل فریدی کی تلاش میں ذہنی سفر کرتا ہے جو قانون اور انصاف کے لیے بڑے سے بڑے چہرے پر مکا رسید کرسکے اور یہی تلاش ہیروازم کی کہانیوں کو جنم دیتی ہے۔''

ابن صفی صاحب نے اپنے تعلیمی دور کا ابتدائی حصہ ترقی پسند ادیبوں کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے میں گزارا تھا وہ ان کی ترقی پسندی کو خوب اچھی طرح سمجھتے اور جانتے تھے (اگر میں یوں کہوں کہ ابن صفی ترقی پسند ادیبوں کے گھر کے بھیدی تھے تو غلط نہ ہوگا اس کے بعد ہی ان سے علیحدگی اختیار کی تھی شاید یہی وجہ تھی کہ تمام ہی نام نہاد ترقی پسند ادیب انہیں اپنے لیے خطرہ سمجھتے تھے)۔ ابن صفی صاحب نے دل کھول کر سرمایہ داری اور فاشزم کے خلاف اپنے پیش رسوں میں اور ناول میں لکھا ہے وہ سوشلزم کو بھی انسانیت کی نجات کا ذریعہ نہیں سمجھتے تھے وہ اللہ کی حاکمیت کے قائل تھے وہ اپنے ایک پیش رس میں لکھتے ہیں۔

''میں تو اللہ کی ڈکٹیٹر شپ کا قائل ہوں' اس میں اس کی گنجائش نہیں ہوتی کہ جتنے پک کا نشہ ہوا ویسا ہی بیان داغ دیا' آپ بھی کسی ازم وزم میں پڑنے کے بجائے اسلام کو سمجھنے کی کوشش کیجیے' سارے ازم محض وقتی حالات کی پیداوار ہیں اور کسی ازم کی دشواری کسی زمانے میں دوسرے ازم کی پیدائش کا سبب بنتی رہتی ہے۔''

اسلام کے علاوہ کوئی ازم حرفِ آخر ہونے کا دعویٰ نہیں کرسکتا' اسلامی نظامِ حیات آج بھی قابل عمل ہے لیکن اس کے لیے انفرادی طور پر ایمان دار بننا پڑے گا اور یہ بے حد مشکل کام ہے۔

پس میرا سیاسی رجحان اللہ کی ڈکٹیٹر شپ کا قیام اور میرا فن سکھاتا ہے قانون کا احترام (پیش رس دھواں

نئی دیوار)۔

دراصل ابن صفی صاحب اللہ کی حاکمیت کے قائل تھے وہ خوب اچھی طرح جانتے تھے کہ انسان یا انسان کی حاکمیت دنیا کو تباہی کی طرف لے جاتی ہے انہوں نے اپنے کئی ناولوں میں اسی طرف اشارہ کیا ہے ابن صفی نے ہمیشہ واضح معاشرتی مقاصد کو پیش نظر رکھا لیکن مقصدیت کو اپنے قلم پر حاوی نہیں ہونے دیا' وہ انسانی نفسیات اور جبلتِ انسانی کو خوب اچھی طرح سمجھتے تھے۔

شاید یہی وجہ ہے کہ جناب خرم علی شفق نے اپنی کتاب ''سائیکومینیشن'' میں ایک جگہ ابن صفی صاحب کے بارے میں تحریر کیا ہے ''ان سے بہتر نثر شاید (مرزا غالب اور محمد حسین آزاد کو چھوڑ کر) اردو میں کسی اور نے نہیں لکھی اگر اقبال کی شاعری کو الہامی شاعری کہا جاتا ہے تو ابن صفی کی نثر کو الہامی نثر کہا جا سکتا ہے۔''

یقیناً خرم علی شفق نے بڑی اہم بات کہی ہے اردو نثر کو جس طرح کسی انجانے اور سوچے سمجھے منصوبے کے تحت مختلف زاویوں اور طریقوں سے مسخ کیا جاتا رہا ہے خصوصاً جنگ آزادی کے بعد سے انگریز نے بڑی سوچ وفکر کے ساتھ پہلے اردو کو مسلمانوں کی طرف منسوب کرنے کی سازش کی اور ہندوؤں کو ہندی کی طرف یہ کہہ کر راغب کیا کہ ہندی ہندوؤں کی اپنی زبان ہے اردو مسلمان مغلوں کی لائی اور پیدا کردہ زبان ہے کیونکہ اس کے پیچھے انگریز کا وہ خوف تھا کہ کہیں مسلمان پھر مجتمع ہو کر قوت حاصل نہ کرلیں کیونکہ برصغیر کا انگریز نے مغلوں سے اقتدار چھینا تھا اور وہ مسلمانوں کی تاریخ سے بھی بخوبی واقف تھا کیونکہ اسلام واحد مذہب ہے جس میں جہاد فرض ہے اور مسلمان جب جہاد کے لیے نکلتا ہے تو پلٹ کر گھر آنے کی نیت سے نہیں نکلتا بلکہ جامِ شہادت نوش کرنے کے لیے نکلتا ہے اس وجہ سے ہی وہ میدان کارزار میں بے جگر اور بہادری سے لڑتا ہے کیونکہ وہ تو میدان جنگ میں کودتا ہی شہادت کی نیت سے ہے اس لیے وہ بے جگر ہو کر پے در پے دشمنوں کو مارتا کاٹتا چلا جاتا ہے جبکہ دوسری تمام قوموں کا دوسرا مزاج ہوتا ہے وہ لڑنے میں بھی اپنی جان کی پروا کرنا نہیں بھولتے اور اپنے مفادات کا پورا پورا خیال رکھتے ہیں۔ کیونکہ وہ شہادت کے لیے نہیں ملازمت کے لیے لڑتے ہیں۔ انگریز نے مسلمانوں کی تاریخ کا بغور مطالعہ کیا تھا اس لیے ہی مسلمانوں کی قوت کو پارہ پارہ کرنے کے لیے اس نے لسانی اختلاف کا بیج بویا لیکن وہ اس میں پوری طرح کامیاب نہیں ہوسکا' مسلمانوں کو دبانے انہیں ختم کرنے کے تمام حربے آزمانے کے باوجود مسلمانوں کو خطے سے ختم یا کم نہیں کرسکا۔ مسلمانوں کے اجتماعات اور سیاست سے وہ ہمیشہ خوف زدہ رہا مسلمانوں اور اردو زبان کو دبانے ختم کرنے کا ہر حربہ آزماتا رہا' اس سلسلے میں ہی ادبی لوگوں اور اہل قلم کو چند سکوں کے عوض مختلف دھڑوں میں تقسیم کرایا کسی کو انجمن ترقی پسند مصنفین کا ٹائٹل دیا تو کسی کو پرولتاری ادب کا جھنڈا تھما دیا لیکن جسے اللہ رکھے اسے مار سکتا ہے کون۔ لکھنے والے جیسا بھی لکھ رہے تھے اور اسکولوں میں بھی کسی نہ کسی طرح اردو پڑھانے کا بندوبست کیا جا رہا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کا خاص مزاج بنایا ہے انہیں دشمن جتنا دباتا ہے وہ اتنے ہی زیادہ ابھرتے ہیں۔ اردو کے بگڑنے کی تاریخ دیکھی جائے تو اس کا نزول جنگ آزادی کے بعد سے ہی ہوا ہے لیکن ہر دور میں کوئی نہ کوئی اردو کا شیدائی ابھرا ہے اور اس نے پوری قوت و شدت سے اردو کے پرچم کو بلند کیا ہے۔ خرم علی شفق نے بڑی دور کی اور گہری

بات کی ہے۔ مرزا غالب اور محمد حسین آزاد کے دور کی اردو اور ان حضرات کا ذاتی اردو لہجہ الگ نمایاں ہے ان کے علاوہ باقی لوگ تو بہتے پانیوں کے ساتھ بہتے چلے گئے ہیں انہوں نے اردو لہجے اور اسلوب پر کوئی توجہ نہیں دی، یہی وجہ رہی تھی کہ تمام تر ادب بگھارنے والوں کا ادب اپنے دائروں تک محدود رہا، جس طرح سے غالب و اقبال کی شاعری آج بھی اسی طرح زندہ اور تر و تازہ ہے جبکہ اس طویل عرصے میں سیکڑوں نہیں ہزاروں لکھنے والوں نے لکھا ہے اور خوب لکھا ہے لیکن انہوں نے صرف اپنے نام و نمود کے لیے اپنی خدمت کے لیے ادب تخلیق کیا جبکہ ابن صفی صاحب نے اپنے قلم سے کئی طرح کے کام لیے ہیں بلکہ اردو کے لیے جہاد کیا ہے شاید اسی وجہ سے بابائے اردو مولوی عبد الحق صاحب کو یہ کہنا پڑا تھا کہ ''ابن صفی کا اردو پر بڑا احسان ہے'' ابن صفی صاحب کی نثر کو خرم علی شفق نے درست طور پر الہامی نثر کہا ہے یقیناً ان کی تحریر الہامی تحریر ہے۔

ابن صفی صاحب کا کوئی بھی ناول اٹھا کر دیکھ لیجیے خصوصاً جاسوسی دنیا کے ناول اس میں آپ کو ان کی مستقبل بینی کا اندازہ ہو جائے گا۔ وہ عہد حاضر میں مستقبل کی خبریں دیتے نظر آئیں گے۔ اپنی تحریروں میں اپنے کرداروں کی زبان سے بڑے فکر انگیز خیالات پیش کرتے نظر آتے ہیں۔ وہ پڑھنے والوں کی نفسیات سے خوب اچھی طرح واقف تھے وہ قاری کو قلم کے سحر میں جکڑنا جانتے تھے وہ بہت خوب صورتی سے طنز و مزاح کے چٹخارے کو بھی بڑی خوبی سے استعمال کرتے اور ادب کے دائرے سے کبھی نکلنے کی کوشش نہیں کرتے تھے ان کی تحریروں میں ادب کی چاشنی کے ساتھ فکر کی رنگا رنگی اپنے پورے اہتمام سے ملتی ہے وہ باتوں باتوں میں ہی بڑی پیچیدہ گتھیوں کو سلجھاتے چلے جاتے۔ بڑے بڑے نامور ادیبوں کی تحریر اٹھا کر دیکھ لیجیے کہ جنہیں قابلیت کا ہیضہ ہوتا ہے وہ کیسے بوجھل اور ثقیل اردو کے الفاظ و جملے استعمال کرتے ہیں جو عام آدمی کے سر سے گزر جاتے ہیں جسے غالباً وہ اپنی قابلیت کے اظہار کے لیے ضروری خیال کرتے ہیں۔

ابن صفی صاحب کی نمایاں خصوصیت یہ بھی ہے کہ علمی حوالوں کی جس قدر بہتات ان کے یہاں پائی جاتی ہے اور کہیں نہیں ملتی ان کے حوالوں میں ایک تنوع ہے جو کسی اور ناول نگار کو تصنیف میں نہیں ہو سکتا یہی وجہ ہے کہ خرم علی شفق کو ابن صفی کے بارے میں یوں لکھنا پڑا۔

''ابن صفی کی مثال نہ مغرب کے جدید ادب میں ہے نہ ہمارے روایتی ادب میں بلکہ وہ برصغیر کی ملت اسلامیہ کے لیے عزائم کی نمائندگی کرتے ہیں، لہٰذا انہیں ادبی تنقید کے کسی مروجہ پیمانے کی روشنی میں جانچنے کے بجائے اسی ملت کے مشترکہ آئیڈیلز کی روشنی میں جانچنا ہوگا۔ اس کام کے لیے وہ اخلاقی جرأت درکار ہے جس کی امید ہمارے نقادوں اور دانش وروں سے ذرا کم ہی ہے چنانچہ یہ کام عوام کو خود کرنا ہوگا اور اس کی طرف پہلا قدم یہی ہے کہ ہم ابن صفی کا موازنہ دوسرے ناول نگاروں سے کرنا چھوڑ دیں اور یہ بات اپنے دل و دماغ پر اچھی طرح نقش کر لیں کہ وہ جاسوسی ناول نگار سے بہت زیادہ کچھ اور بھی تھے۔

کچھ جنسی چاشنی کے رسیا لکھنے والوں اور پڑھنے والوں کا یہ بھی کہنا ہے کہ ابن صفی صاحب نے جنس پر نہیں لکھا، ہاں وہ کسی حد تک بالکل درست کہتے ہیں کیونکہ ان کا انداز دوسرے لکھنے والوں سے قطعی مختلف تھا وہ تو

فحاشی اور جنسیت کے خلاف میدان عمل میں آئے تھے پھر وہ کیسے جنسیت کے فروغ میں حصہ دار بنتے۔ وہ ایسی باتیں لطیف اشاروں میں کہہ جاتے تھے، ہاں انہوں نے کبھی منٹو، عصمت چغتائی اور واجدہ تبسم کی طرح لذت کے لیے نہیں لکھا، نہ ہی انہیں ایسا کرنے کی ضرورت تھی کیونکہ وہ خوب اچھی طرح جانتے تھے کہ قاری کو کس طرح مطمئن کیا جاسکتا ہے، ان کی خوب صورت تحریر کا ان کے ناول بھیانک آدمی سے ایک ٹکڑا۔ جس کی ٹکر کا کوئی دوسرا لکھنے والا میسر نہیں۔

"روشی ایک اینگلو برمیز عورت تھی، کبھی لڑکی بھی رہی ہوگی لیکن اب یہ بہت پرانی بات ہوچکی تھی یہ اس وقت کی بات ہے جب سنگاپور پر جاپانیوں نے بمباری کی تھی اور جدھر جس کے سینگ سمائے تھے بھاگ نکلا تھا۔ روشی چودہ سال کی ایک لڑکی تھی، اس کا باپ سنگاپور کا ایک بہت بڑا تاجر تھا لیکن بڑے تاجر کی بیٹی ہونے کا یہ مطلب تو نہیں کہ روشی تین دن کے فاقے کے بعد ایک کپ چائے کے عوض لڑکی سے عورت نہ بن جاتی، ہوسکتا ہے اس کے باپ کو ایک کپ چائے بھی میسر نہ آئی ہو کیونکہ اس میں لڑکی سے عورت بننے کی صلاحیت تو تھی نہیں۔"

ابن صفی کے ناول بھیانک آدمی کے اس ٹکڑے کو اردو کے معروف نقاد ڈاکٹر ابوالخیر کشفی نے منتخب کیا اور اس کے بارے میں لکھا کہ اردو ادب کی ایک جاندار اور خوب صورت ترین تحریر جس میں سمندر کو کوزے میں بند کردیا گیا ہے۔

اگر اس منظر کو منٹو یا واجدہ تبسم یا عصمت چغتائی لکھتی تو کیا ایک مختصر سے جملے "روشی تین دن کے فاقے کے بعد ایک کپ چائے کے عوض لڑکی سے عورت نہ بن جاتی" کی طرح لکھ سکتے تھے ان کی تحریر کا ایک کمال واقعات نگاری، منظر نگاری اور مکالمہ نگاری ہے۔ جس میں انہیں غیر معمولی ملکہ حاصل تھا۔ وہ فحش نگاری یا زبان کے چٹخارے کو غیر اخلاقی اور گری ہوئی حرکت سمجھتے تھے۔ میں نے جب کبھی ان سے اس قسم کے چٹخارے کی بات کی تو انہوں نے ہمیشہ مسکرا کر کہا "میاں تمہیں تو معلوم ہے کہ میری تحریر میں میرے ابا میاں بھی شامل ہوتے ہیں، کیوں مجھے پٹوانا چاہتے ہو" اور یہ حقیقت ہے کہ ابن صفی نے ہمیشہ یہ خیال رکھا کہ ان کی کوئی بھی تحریر باپ بیٹے کے درمیان یا باپ بیٹی کے درمیان کسی حجاب کسی خوف کا باعث نہ بنے، کہنے کو تو وہ کہتے تھے کہ میری تحریر میں ابا میاں بھی شامل ہیں لیکن وہ جس عزم کے ساتھ جس چیلنج کا سامنا کرنے نکلے تھے یہ اس کا بھی تقاضا تھا کہ ان کی تحریر ہر قسم کی عریانی فحاشی سے پاک صاف ہو اور پڑھنے والے کے لیے لذت کے بجائے جمالیاتی مسرت کا باعث ہے۔

ابن صفی صاحب کو ہم سے جدا ہوئے تینتیس (۳۳) برس گزر چکے ہیں لیکن اس طویل عرصے میں کہیں سے کوئی ایسا لکھنے والا نمودار نہیں ہوسکا جو ان کی جگہ لے سکتا۔ ابن صفی صاحب کے جانے کے بعد اردو اسلوب میں جو خلاء پیدا ہوا ہے وہ شاید کبھی پُر نہ ہوسکے۔

ورق ورق سوزنِ قلم سے قبائے جاں سی رہے ہیں
نہ مار پائے گی موت ہم کو ہم کتابوں میں جی رہے ہیں
(حنیف نقوی)

ابنِ صفی

مسیح الحسن رضوی (لکھنو)

میں ان سطور کی ابتدا ہی میں نہایت صفائی سے یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ جاسوسی ادب سے مجھے کوئی خاص تعلق یا دلچسپی نہیں رہی ہے۔ نوجوانی میں ضرور کچھ جاسوسی قسم کی چیزیں پڑھی تھیں لیکن اب وہ امتداد زمانہ کے ہاتھوں ذہن سے فراموش ہو چکی ہیں۔ اس لیے اس موضوع پر زیادہ کہنے کا حق نہیں رکھتا۔

ملک کی آزادی کے بعد ترقی پسند ادب کے ساتھ جاسوسی ادب کا ایک سیلاب سا آ گیا، اردو میں بھی اور ہندی میں بھی جسے قارئین نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اس زمانے میں ایک سکہ رائج الوقت سامنے آیا۔ ابن صفی ماہنامہ جاسوسی دنیا کا خالق جو دیکھتے ہی دیکھتے پڑھنے والوں کے ذہنوں پر چھاتا چلا گیا۔ ایک کے بعد ایک ناول جس نے پڑھنے والوں کے ایک بڑے گروہ کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ جاسوسی ادب کے قارئین بے چینی سے جاسوسی دنیا کا انتظار کرتے اور جب پرچہ بازار میں آتا تو وہ ہاتھوں ہاتھ بک جاتا، نہایت وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ ایک رسالہ کو کتنے ہی آدمی بار بار پڑھتے اور ان کی طبیعت سیر نہ ہوتی وہ دم بخود از مبہوت ہو کر رہ جاتے۔

ابن صفی کے کردار ہی ایسے جاندار تھے کہ لوگ ان سے ایک بار متعارف ہونے کے بعد کبھی نہ بھول پاتے۔ جاسوسی ادب کا کون سا پڑھنے والا ایسا ہوگا کہ جو عمران، فریدی اور قہقہہ زار قاسم سے دوستی کرنے کے بعد انہیں بھول جاتا ہو۔ ابن صفی کے قلم میں وہ سادگی تھی کہ اچھے سے اچھا نثر نگار اس کی پیروی کرنے سے معذور تھا۔ وہ چھوٹے چھوٹے جملوں کے بین السطور بہت کچھ کہہ جانے کے فن سے واقف تھا۔ اس کے ناولوں میں خوبصورت و چسم قسم کی ہیروئن آتی تھی، قاری کو گمان رہتا تھا کہ عمران یا حمید اب پھسلا کہ اب پھسلا لیکن وہ ان کی امیدوں پر نہایت چابکدستی سے پانی پھیر دیتا اور اس طرح اپنے کرداروں کو گھٹیا (Cheep) بنانے سے بچا لے جاتا اور اس کا پڑھنے والا اس ہوشیاری اور فنکاری پر عش عش کر اٹھتا۔ جہاں تک میری اپنی رائے ہے کہ بہت کم ناول نگاروں نے اس خوبصورتی سے مرد کو عورت کی عیاری سے بچانے اور اپنا کام ہنرمندی سے نکالنے کے اس حربہ کو استعمال کیا ہوگا، ابن صفی جہاں تک ممکن ہوتا سیکس اور تشدد سے بچتا تھا۔

شاید یہاں کہا جائے کہ تفریحی ادب میں اس طرح کی سچویشن پیدا کرنا قاری پر ستم ڈھانے کے مترادف ہے لیکن اگر ناول نگار اپنے کرداروں کو اس صورت حال سے بچانے کے لیے دوسرے تفریحی سامان مہیا کر دیتا ہے تو یہ کوئی بڑی خامی نہیں ہے۔ خامی تو تب ہوتی ہے جب ہیروئن ایک روایتی انداز میں سپر ڈال کر ہیرو پر اپنا سب کچھ نچھاور کرنے کے لیے تیار ہو جاتی یا دوسرے الفاظ میں اس کو اس طرح کہا جاتا ہے کہ اس کی قلب ماہیت ہو جاتی ہے لیکن صد آفریں ابن صفی کے قلم کو اس نے ایسی مصنوعی صورت حال کہیں بھی پیدا نہیں ہونے دی کیونکہ اس طرح کی قلب ماہیت فنی کمزوری ہوتی ہے اور یہ باتیں پردہ فلم پر ہی زیب دیتی ہیں۔

ابن صفی اس عہد کا ایک بڑا جاسوسی ناول نگار تھا اس نے کم وبیش تین سو ناول لکھے اور قارئین کی تفریح کو ہر ناول میں ملحوظ رکھا۔ وہ کوئی مصلح قسم کا ادیب نہیں تھا اس لیے سماجی برائیوں کا حل تلاش کرنا اس کے یہاں بے سود ہے لیکن اسی کے ساتھ اس کا یہ کارنامہ بھی قابل ذکر ہے کہ اس کے ناولوں کی بدولت سیکڑوں آدمیوں نے اردو سیکھی، یہ اتنی بڑی خدمت ہے جو ہمارے ملک کا بڑے سے بڑا ادیب انجام نہیں دے سکا۔

ابن صفی کو میں نے دیکھا نہیں تھا صرف نام سنا تھا۔ ان کے ناول بھی نہیں پڑھے تھے لیکن جب ۱۹۷۵ء میں میرا عباس حسینی اور شکیل جمالی صاحبان سے تعلق ہوا تو میں نے ان کے بارے میں بہت کچھ سنا اور تب ایک ایسے انسان کی شبیہہ میرے ذہن میں بن گئی جو بے حد شریف' بااخلاق' تعلیم یافتہ اور نستعلیق تھا۔ وہ اپنے دوستوں پر جان چھڑکنے والا تھا ان کے لیے نقصان بھی اٹھا سکتا تھا لیکن جو وعدہ کر لیتا تھا اسے پورا کرتا تھا' بھلا بتائیے تو سہی پورے چونتیس برس ایک ہی پبلشر سے وابستہ رہنا کوئی معمولی کارنامہ نہیں ہے جبکہ اس کے سر پر شہرت کا تاج بھی سجا دیا گیا تھا۔ وہ برصغیر کا واحد اور ممتاز جاسوسی ناول نگار تھا لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ابن صفی کی شخصیت کی تعمیر میں ادارہ نکہت کا بہت بڑا ہاتھ تھا ورنہ یہ ذہین اور باصلاحیت انسان ادب کی دنیا میں کچھ بھی ہو سکتا تھا لیکن ابن صفی نے ادارہ نکہت سے تجارتی رشتہ نہ رکھا بلکہ ایک قلبی رشتہ تھا جسے انہوں نے زندگی کے آخری لمحوں تک بخوبی نبھایا۔ یہ بھی ان کے کردار کی عظمت کی دلیل ہے۔

آج ابن صفی کا قلم ہمیشہ کے لیے خاموش ہو چکا ہے۔ اسے جو کچھ لکھنا تھا وہ لکھ کر موت کی آغوش میں سو گیا لیکن یہ کہنا کہ کوئی خلا پر نہیں ہو سکتا ایک رسمی سی بات ہے زندگی کا کارواں کسی منزل پر نہیں رکتا وہ رواں دواں بڑھا چلا جاتا ہے اس رواں دواں قافلے میں جو لوگ شریک ہوتے ہیں وہ پچھلوں کی روایت کو آگے بڑھاتے ہیں اس لیے مجھے یقین ہے کہ ابن صفی کا قلم خاموش نہیں ہوا ہے اس نے تو بس یہ کیا ہے کہ یہ قلم دوسروں کے ہاتھ میں دے کر اپنا فرض ادا کر دیا ہے وہ اپنے کردار ابلیسٹو کی طرح نظروں سے اوجھل ہو گیا ہے لیکن اس کے کردار اس سماج میں یادوں کی طرح چاروں طرف بکھرے ہوئے ہیں۔ وہ اسمگلنگ بھی کرتے ہیں' جرائم بھی کرتے ہیں اور پولیس کو چکر بھی دیتے ہیں۔ اب یہ فرض ان قلم کاروں کا ہے جو ابن صفی کی روایت کو آگے بڑھانا چاہتے ہیں کہ ان کے قلم کو اور نوک دار بنا کر سماج کی ان دکھتی رگوں میں نشتر لگائیں۔

نئی نسل کا فرض یہیں ختم نہیں ہو جاتا کہ وہ ابن صفی کے قلم کو اپنے ہاتھ میں لے کر اس کی تقلید میں لکھنا شروع کر دیں، یہ کام تو ہر کوئی کر سکتا ہے' دراصل ان کے کرنے کا جو کام ہے وہ یہ ہے کہ وہ ابن صفی کی طرح سماجی رشتوں کے پھیلاؤ اس کی بڑھتی ہوئی پیچیدگیوں اور اس کی بڑھتی ہوئی سادیت کو سمجھیں اور اس کے انداز کو اپنا کر جاسوسی ادب کو مالا مال کرنے کی سعی کریں۔ یہ کام آسان نہیں ہے لیکن اگر ابن صفی کی تصنیفات کو دوسرے عالمی ادب کے جاسوسی ادب کے پس منظر میں پڑھا جائے گا تو یہ منزل آسان ہو جائے گی۔ ابن صفی کا کارنامہ یہی نہیں تھا کہ وہ ہر ماہ ایک جاسوسی ناول لکھتا تھا۔ وہ بنیادی طور پر ایک تخلیقی فنکار تھا۔ وہ ایک بلند درجے کا فن کار بھی تھا۔ مزاح نگار بھی تھا اور افسانہ نگار بھی تھا۔ انہی سب خصوصیات نے اسے اس مقام پر

پہنچادیا تھا جہاں ہر شخص اسے خراج عقیدت پیش کر رہا ہے لیکن اس کو بہترین خراج عقیدت پیش کرنے کا طریقہ یہی ہے کہ اس کے کام کو آگے بڑھایا جائے' معلوم نہیں اس کے ذہن میں ابھی کتنے کردار جنم لینے کی تیاریاں کر رہے تھے' اگر یہ کردار اس کی موجودہ تخلیقات کی روشنی میں کوئی پیش کر سکے تو ابن صفی کو سب سے بڑا خراج عقیدت یہی ہوگا۔

ہم ادیبوں سے مایوس نہیں ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ ابن صفی کے چراغ سے دوسرے چراغ روشن ہوں گے۔ تیز اور تیز جن کی روشنی سے آنکھیں خیرہ ہو جائیں گی اور جاسوسی ادب کا دامن مالا مال ہو جائے گا۔

ہمارے ناقدین نے اب تک ادب کی اس صنف کو درخور اعتنا نہیں سمجھا تھا لیکن اب وقت آ گیا ہے کہ سنجیدگی سے اس بات پر غور کیا جائے کہ آخر کیوں لاکھوں لوگ ابن صفی کے ناول نہایت پابندی اور دلچسپی سے پڑھ کر اپنا وقت اور پیسہ برباد کرتے ہیں (ان لاکھوں لوگوں میں ہمارے ناقدین حضرات بھی شامل ہیں) میرے علم میں ابھی تک پورے برصغیر میں کوئی ایسا مصنف نہیں گزرا ہے جس نے اپنی تخلیقات سے اپنی ہی زندگی میں پوری تین نسلوں کو یکساں طور پر متاثر کیا ہو! یہ بات سرسری طور پر ٹال دینے کی نہیں ہے' اگر آپ عوام کا احترام کرتے ہیں تو اس سوال کا جواب تلاش کرنا ہوگا۔ ابن صفی کی موت نے اور اس پر ہونے والے زبردست سوگ نے یہ سوال مثبت طریقے سے ہمارے سامنے لا کھڑا کیا ہے' انڈر ورلڈ کو سمجھنا اور سمجھانا آج کے نراجی مزاج کی بہت بڑی خدمت ہے۔

دنیائے اسرار کا شہنشاہ ابن صفی

مجاہد لکھنوی، معروف و سینئر ناول نگار

جستجو، تجسس، معلومات حاصل کرنے کی خواہش" یہ وہ فطری جذبہ ہے جو ہر انسان اپنے ساتھ لے کر پیدا ہوتا ہے اور اسے اشرف المخلوقات بناتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمارے دل میں اس جذبے کو خلق نہ کرتا تو ہم بھی ایک پتھر کی طرح جہاں رکھ دیے جاتے وہیں پڑے رہتے۔ یہ صرف تجسس کا جذبہ ہی ہے جو انسان کو جدوجہد پر آمادہ کرتا ہے۔ اس کی دلیل اور ثبوت قرآن پاک میں بھی موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

"جب تم کو تمہاری ماؤں کے پیٹ سے نکالا گیا (تو اس وقت) تم کچھ بھی نہیں جانتے تھے۔ (ترجمہ)

جہالت اور لاعلمی کی اس سند کے بعد اگر انسان اپنی زندگی میں کچھ علم حاصل کرتا ہے کسی درجہ پر فائز ہو جاتا ہے بلکہ اس قابل ہو جاتا ہے کہ وہ دوسروں کو تعلیم دینے لگے تو اس کے پیچھے صرف اور صرف ایک ہی جذبہ کارفرما ہوتا ہے۔ تجسس، اور جستجو کا جذبہ۔

جاسوسی کا لفظ فی زمانہ جرم اور قتل و غارت گری تک محدود ہو کر رہ گیا ہے۔ کسی مجرم کی تلاش کو جاسوسی کہا جاتا ہے۔ چھپ کر دوسروں کی ٹوہ لگانے کے مذموم فعل کو بھی جاسوسی تسلیم کیا گیا ہے۔ جب کہ اس لفظ کے معنی بہت وسیع ہیں۔ عربی زبان میں جو الفاظ نبض اور چھاتی کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں۔ صرف اس لیے کہ انسانی جسم میں یہی دو مقام ہیں جہاں سے پورے نظام جسمانی کی کیفیت کا پتہ چلتا ہے۔ قدیم دور سے آج تک ہر طبیب، وید، ڈاکٹر، حکیم، مرض کی تشخیص انہی دو مقامات سے کرتا ہے اگر ہم ان کے اس عمل کو بھی جاسوسی کہیں تو غلط نہ ہوگا۔

"جاسوسی" کے جذبے کا ارتقاء انسان کے ادراک اور عقل و فہم کے مطابق ہوتا رہتا ہے، دنیا میں آنے کے بعد سب سے پہلے وہ کان میں آنے والی آوازوں کی جستجو کرتا ہے، انہیں پہچاننے اور سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ (اسی لیے ہم بچے کی پیدائش کے بعد سب سے پہلے اسے اذان سناتے ہیں) پھر تجسس کے اس عمل میں کانوں کے ساتھ ساتھ آنکھیں بھی شامل ہو جاتی ہیں، آواز کو سن کر اور پہچان کر نگاہوں کا اس آواز کی طرف مڑنا اس بات کا ثبوت ہے کہ صرف سن لینے سے اس کے جذبے کی تسکین نہیں ہوئی۔ یہ جاسوسی کی دوسری منزل ہوتی ہے، اس کے بعد لمس کا دور آتا ہے اور بچہ جبکہ وہ چلنے پھرنے بلکہ رینگنے کے قابل بھی نہیں ہوتا مختلف لوگوں اور چیزوں کی طرف ہمکنا شروع کرتا ہے۔ اسی طرح جب وہ گفتگو کرنے کے قابل ہو جاتا ہے تو صرف سن لینے، دیکھ لینے اور ہاتھوں سے محسوس کر لینے کے عمل سے بھی اس کی تسکیم نہیں ہوتی۔ اب وہ سوالات کی بوچھاڑ کر دیتا ہے۔ ماں، باپ یا جو افراد بھی اس کے قریب ہوتے ہیں، ان سے وہ ہر قسم کی معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے، اس طرح اگر ہم انسان کو پیدائشی جاسوس کہیں تو غلط نہ ہوگا۔

ان مثالوں کا مقصد صرف یہ ثابت کرنا ہے کہ جاسوسی کو کوئی برا فعل قرار دینا یا اس عمل کو صرف ''جرم'' کے لیے مخصوص کر دینا غلط ہے ہر قسم کے تحقیقی عمل کو وہ فلمی ہو یا ادبی' تاریخی ہو یا مذہبی جاسوسی قرار دیا جا سکتا ہے۔ لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ اتنی واضح دلیلوں کے بعد بھی اردو ادب کی عظیم اور قد آور شخصیتوں نے جاسوسی کہانیوں کو ادبی تخلیقات میں شمار نہیں کیا مستند و معتبر نقادوں نے اگر کہیں اردو تحریر و تصنیف کی ان نگارشات کا ذکر کیا بھی تو ایک جداگانہ فن کی حیثیت سے کیا اور یہ فاصلہ جاسوسی کہانیاں لکھنے والے اہل قلم کے ساتھ بھی برقرار رکھا گیا جسے ایک انوکھے قسم کے تعصب کے علاوہ اور کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

لیکن ''جاسوسی ادب'' کے بادشاہ' شہرت دوام کے مالک ایشیا کے عظیم مصنف جناب ابن صفی نے صرف اپنی تحریروں کے ذریعے یہ ثابت کر دیا کہ وہ ادب جو ایک مخصوص حلقے میں محدود ہے اور صرف کتابوں میں بند ہے مقبولیت کا حامل نہیں ہوتا بلکہ لازوال تحریریں وہ ہوتی ہیں جنہیں عوام کی اکثریت پڑھتی ہے۔

گزشتہ اڑتیس سال کے عرصے میں ہر ناقد نے دیکھ لیا کہ...... ابن صفی کی جاسوسی کہانیاں کس قدر ان کی زندگی میں ذوق و شوق سے پڑھی جاتی تھیں اسی طرح ان کے بعد بھی مقبول ہیں۔ ابن صفی کو پڑھنے والوں کی بہت بڑی تعداد ایسی بھی ہے جو ان کی کتابیں بار بار پڑھتی رہی ہے جبکہ اس عرصے میں قارئین کی کئی صفیں نسلوں کی صورت میں تبدیل ہو گئیں مگر ابن صفی جہاں تھے آج بھی وہیں موجود ہیں۔

دوسری جنگ عظیم سے قبل طویل ناول پڑھے جاتے تھے پھر جنگ کے دوران جب لوگوں کے ذہن افراتفری کا شکار ہوئے اور اقتصادی و معاشرتی انقلاب نے لوگوں کو زیادہ مصروف اور عدیم الفرصت کر دیا تو افسانوں کے مجموعے پڑھنے کا زور بڑھ گیا۔ اسی دوران ابن صفی اپنی جاسوسی دنیا کے ساتھ منظر عام پر آئے۔ جاسوسی دنیا طویل ناول اور مختصر افسانے کی درمیانی شکل تھی جسے قارئین نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اس کے بعد ڈائجسٹوں کا دور شروع ہوا' جو اب تک جاری ہے۔ گزشتہ بیس سال کے عرصے میں پاکستان میں لاتعداد ڈائجسٹ شائع ہو چکے ہیں اور ہو رہے ہیں جس میں ہر قسم کا مواد شائع ہوتا رہتا ہے۔ ناشر حضرات اور مصنفین نے ہر نیا تجربہ کر کے دیکھ لیا یہ الگ بات ہے کہ ان میں سے بعض نے اپنا ایک الگ مقام حاصل کر لیا لیکن ابن صفی کا مقام آج بھی برقرار اور جداگانہ ہے۔

یہی صورت قارئین کی ہے۔ گزشتہ اڑتیس سال میں دو نئی نسلیں پیدا ہو کر جوان ہو چکی ہیں جن میں دوسری نسل نے تو صرف ابن صفی کا نام سنا ہے نہ انہیں دیکھا' نہ ان سے ملی پھر بھی یہ نوجوان ان کی تحریروں کے اس طرح دلدادہ ہیں جیسے وہ ان کے اپنے دور کے مصنف ہیں۔ یہ نئی نسل بھی ان کی تحریروں کی اتنی ہی شیدائی ہے جتنا کہ ان کے بزرگ تھے۔

بات کچھ بے تعلق سی ہے مگر یہاں اس کا ذکر غیر مناسب نہ ہوگا کہ بھارت میں ایک فلم 'مغل اعظم' بنی تھی۔ اس فلم کی تکمیل میں پورے دس سال صرف ہو گئے' جب فلم مکمل ہو کر نمائش کے لیے تیار ہو گئی تو ڈائریکٹر کے آصف نے مغل اعظم کے موسیقار نوشاد سے کہا کہ اس فلم کے گیت برسوں پہلے ریکارڈ ہوئے

تھے۔اس عرصے میں موسیقی کا انداز بدل چکا ہے اگر آپ چاہیں تو فلم کے گیتوں کو نئے انداز پر دوبارہ ریکارڈ کرلیں۔اس کے جواب میں موسیقار نوشاد نے کہا کہ اگر آپ اس فلم کو مزید دس سال بعد ریلیز کریں تب بھی ان گیتوں کی مقبولیت میں کوئی فرق نہ آئے گا۔

یہ تھی ایک حقیقی فنکار کی پراعتمادی اور یہی بات ہم ابن صفی کے لیے بھی کہہ سکتے ہیں کہ انہوں نے جو کچھ لکھا اس عزم اور اعتماد کے ساتھ لکھا ہے کہ انقلاب آتے رہیں، زمانے بدلتے رہیں مگر ان کی تحریروں کی مقبولیت میں کوئی فرق نہ آئے گا نسل در نسل لوگ انہیں پڑھتے رہیں گے۔

کسی ستون کی مضبوطی اور استحکام کا ذکر ہو تو ان طوفانوں کی بات بھی کرنی پڑتی ہے جو اسے گرانے کے لیے ٹکریں مارتے رہے ہوں۔خود ابن صفی اور ان کی تحریروں کو بھی ایک ایسے دور سے گزرنا پڑا بلکہ واضح الفاظ میں کیوں نہ کہوں کہ اپنی زندگی میں انہیں لاتعداد دشمنوں سے مقابلہ کرنا پڑا، یعنی بقول شیخ سعدی ''بود ہم پیشہ با ہم پیشہ دشمن''

ابن صفی کے خلاف یہ سازش یہ دشمنی مختلف شکلوں میں سامنے آتی رہی جب تک ابن صفی پاکستان نہیں آئے تھے اور اس وقت پاک و ہند کے درمیان کتب و رسائل کی ترسیل کا کوئی معقول انتظام بھی نہیں تھا۔اس صورت حال سے فائدہ اٹھا کر چند چھوٹے موٹے ناشروں نے دو طریقوں پر ان کی شہرت و مقبولیت سے فائدہ اٹھایا۔ایک تو ان کی کتابیں ناجائز طور پر چھاپ کر دولت کمائی دوسرے ان لوگوں نے جن کے وسائل اتنے نہیں تھے کہ ابن صفی کی ہندوستان میں شائع ہونے والی تازہ ترین تصنیف جلد سے جلد حاصل کرسکیں، انہوں نے مختلف اہل قلم سے مسودے لکھوا کر ابن صفی کے نام سے شائع کردیئے......بھیڑ چال کے تحت یہ فراڈ بیک وقت کئی افراد کرنے لگے......ادھر نام سے دھوکا کھا کر قارئین کتاب تو خرید لیتے تھے لیکن جب تحریر پڑھتے تھے تو خود بخود سمجھ لیتے تھے کہ۔

کوئی معشوق ہے اس پردہ زنگاری میں

بار بار دھوکے کھانے کے بعد بالآخر قارئین بھی محتاط ہوگئے، انہوں نے ہر وہ کتاب خریدنا چھوڑ دی جس پر ابن صفی کا نام بحیثیت مصنف درج ہوتا تھا بلکہ اب وہ پہلے اصلی اور نقلی کی چھان بین کرتے تھے۔اس منزل پر پہنچ کر ناشر کو ناکامی ہوئی اور انہوں نے اسی میں خیریت سمجھی کہ خود کو بے نقاب کردیں۔ابن صفی کے نام سے ملتے جلتے وہ نام جو قارئین کو دھوکا دینے کے لیے شائع کیا کرتے تھے اب اپنی کتاب پر پوری وضاحت کے ساتھ درج کرنے لگے۔

ناشروں کی اس کارروائی سے دو نتیجے نکلے، ایک تخریبی اور دوسرا تعمیری، تخریبی عمل تو یہ تھا کہ فرضی مصنفوں سے کہانیاں لکھوا کر اور انہیں ابن صفی یا ان کے ملتے جلتے ناموں سے شائع کرکے لوگوں کو دھوکا دیا گیا اور ناجائز طور پر ان کی جیبیں خالی کرائی گئیں جس کو کسی نے بھی پسند نہیں کیا، نہ پڑھنے والے مطمئن ہوئے اور نہ ایماندار، سنجیدہ اور معتبر ناشران نے اس طریقے کو سراہا بلکہ جو لوگ یہ کاروبار کررہے تھے انہیں نشر و اشاعت

کے پیشے کے لیے ایک زہر قرار دیا گیا۔

دوسرا اور تعمیری نتیجہ جو سامنے آیا وہ یہ تھا کہ ابن صفی یا اس سے ملتے جلتے فرضی ناموں سے لکھنے والے نوعمر مصنفوں کی بھیڑ میں کئی ایسے بھی ابھر کر سامنے آئے جو ابن صفی تو نہ بن سکے مگر اپنی تحریر کے منفرد انداز کا ایک جداگانہ تاثر قارئین کے ذہن پر چھوڑنے میں ضرور کامیاب ہو گئے پھر جب وہ اپنے اصلی یا نقلی نام کے ساتھ اپنی تحریریں لے کر سامنے آئے تو ان کے پڑھنے والوں نے انہیں بخوشی قبول کر لیا' اس طرح جاسوسی ادب کے تخلیق کاروں میں ایک اچھا اضافہ ہوا جس کا کریڈٹ بھی بالواسطہ ہی سہی مگر ابن صفی کو ہی جاتا ہے۔

لیکن وہی سوال پھر ذہن میں ابھرتا ہے کہ اتنی شہرت' مقبولیت اور تحریروں کی اس بہتات کے باوجود ابن صفی کو اردو کا ادیب کیوں نہیں تسلیم کیا گیا اور ان کی نگارشات کو اردو ادب کا ایک حصہ کیوں نہیں مانا گیا؟ شاید اس لیے کہ ابتدا سے ہی...... جاسوسی تحریروں کو ''درآمدی مواد'' قرار دیا گیا ہے اور اس درآمد کا سہرا منشی تیرتھ رام فیروز پوری کے سر بندھتا ہے جنہوں نے انگریزی جاسوسی ناولوں کے لاتعداد اردو ترجمے کیے۔ آج سے تقریباً پینتالیس سال قابل تصانیف کی تعداد کے اعتبار سے مولانا صادق حسین سردھنوی کے بعد تیرتھ رام فیروز پوری کا ہی نام آتا تھا' اور شاید آج بھی یہ ترتیب اپنے مقام پر قائم ہے۔

لیکن یہ خیال غلط ہے کہ جاسوسی لٹریچر انگریزوں کا عطیہ ہے اس سے پہلے مشہور زمانہ کتاب ''طلسم ہوشربا'' جو سات ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے رجب علی سرور کی ''فسانہ عجائب'' ہمارے اردو ادب میں موجود تھیں' اس کے بعد شہباز اور بہرام کے نام سے وابستہ لاتعداد جاسوسی ناول بھی ملتے ہیں' یہ سب کتابیں ہماری اپنی تصنیفات تھیں جن کا انگریزی جاسوسی ادب سے کوئی واسطہ نہ تھا۔

پھر بیسویں صدی کے چوتھے عشرہ میں ایک اور صاحب قلم ہمارے سامنے آتا ہے جس نے جاسوسی ادب میں کچھ نئے افسانے لکھے۔ یہ خان محبوب طرزی ہیں جن کا شمار اپنے وقت کے باکمال ادیبوں میں ہوتا ہے۔ طرزی نے ایک سو سے زیادہ ناول لکھے ہیں۔

طرزی اور ابن صفی کے درمیان ایک قدر مشترک رہی ہے' طرزی ترجمہ کرنے کو اہل قلم کی کمزوری کہتے تھے۔ وہ طبع زاد تصنیف کے قائل تھے' آزاد ترجمہ کو بھی وہ بیساکھی پر چلنا کہتے تھے۔ ابن صفی بھی اسی راہ پر گامزن تھے۔ انہوں نے جو کچھ پیش کیا خود اپنے ذہن سے تخلیق کیا۔ طرزی کا انتقال ۱۹۵۹ء یا ۱۹۶۰ء میں ہوا' اس وقت ابن صفی دنیائے تجسس پر چھا چکے تھے بلکہ یہ کہا جائے تو غلط نہ ہو گا کہ جاسوسی ادب میں ان کا طوطی بول رہا تھا۔

یہ اس دور کی بات ہے جب لکھنؤ سے شائع ہونے والے پندرہ روزہ اخبار ''سرپنچ'' کے مدیر شوکت تھانوی کے پاکستان چلے آنے کے بعد خان محبوب طرزی مقرر ہوئے تھے اور میں ان کے ساتھ اسسٹنٹ ایڈیٹر کا کام کرتا تھا' دفتر کے اوقات کے علاوہ شام کو واپس آتے ہوئے بھی کچھ فاصلے تک ہم دونوں کا ساتھ رہتا تھا اور کبھی کبھی کچھ دیر ہوٹل میں چائے پینے کے دوران بھی ہماری گفتگو جاری رہتی تھی۔ مجھے یاد ہے کہ کئی بار ہماری گفتگو کا

موضوع ابن صفی اور ان کی تحریریں رہتی تھیں۔طرزی اپنی عدیم الفرصتی کی بنا پر ابن صفی کی ایک آدھ تصنیف کا ہی مطالعہ کر سکے تھے جس کے بعد انہوں نے درج ذیل تبصرہ کیا تھا جس کا ایک ایک لفظ آج بھی میرے ذہن پر نقش ہے۔

''اگر اس شخص کو شہرت و مقبولیت کا بخار نہ چڑھا تو یہ کچھ کر جائے گا۔ یہ اپنے کرداروں پر بڑی مضبوط گرفت رکھتا ہے اور انہیں کہانی کے ساتھ آگے بڑھاتا ہے لیکن وقت ایسے جینئس لوگوں کا ساتھ کبھی نہیں دیتا۔''

طرزی صاحب کی پیش گوئی حرف بحرف درست ثابت ہوئی ابن صفی کو شہرت و مقبولیت ایسی حاصل ہوئی کہ دنیا دیکھتی رہ گئی لیکن وہ غرور و تکبر کا شکار نہیں ہوئے اور نہ ہی انہوں نے اپنی صلاحیتوں کو بیئرر چیک کی طرح کیش کرا کے دولت سمیٹنے کی کوشش کی اور طرزی کی آخری بات کہ اردو ادب کے ناخداؤں نے ابن صفی کو وہ مقام نہیں دیا جو ان کا حق تھا' سچ ثابت ہوئی۔

ابن صفی کے ہم عصر جاسوسی کہانیاں لکھنے والوں میں یوں تو بہت سے لوگ ہیں لیکن میری یادداشت میں صرف تین صاحبان قلم ایسے تھے جنہوں نے مسلسل لکھا اور جاسوسی ادب میں کچھ اضافے بھی کیے۔ یہ اکرم الہ آبادی' عارف مارہروی اور اظہار اثر ہیں۔ان تینوں میں اکرم الہ آبادی زیادہ پرانے اور مقبول تھے جنہوں نے خاصے عرصے تک قارئین کو اس فیصلے سے مجبور رکھا کہ وہ ابن صفی اور اکرم الہ آبادی میں سے کس کو افضل قرار دیں لیکن بالآخر ابن صفی نے یہ معرکہ سر کر لیا۔

اسی دوران انگریزی ناولوں کے ترجمے کا زور پھر بڑھ گیا۔اب یہ ایک نئے رنگ کے ساتھ منظر عام پر آئے تھے۔حیدر آباد (دکن) کے مظہر الحق علوی نے ڈراکولا' سونا سمندر' رات کا کالا کفن وغیرہ لکھ کر قارئین کو ایک نیا ذائقہ چکھایا۔ یہ ناول اپنی ہیبت ناکی کی وجہ سے خاصے مقبول ہوئے اور جاسوسی ناولیں پڑھنے والوں کا رجحان بدلنے کے لیے بہت کافی تھے۔ایک بڑی تعداد نے عام جاسوسی ناول چھوڑ کر یہ ترجمے پڑھنا شروع کر دیئے مگر واحد' ابن صفی وہ ہستی تھے جو اس طوفان سے بھی متاثر نہ ہو سکے۔ان کا قاری ہر تجربہ کرنے کے بعد پھر انہی کے پاس پہنچ گیا۔

ابن صفی کے خلاف آخری یلغار پاکستانی ڈائجسٹوں میں شائع ہونے والی وہ طویل کہانیاں تھیں جن کی بنیاد ہندو میتھالوجی اور دیومالائی پس منظر تھا۔اس راہ سے قارئین کو دو ذائقے پیش کیے گئے۔ان کہانیوں میں حیران کن واقعات بھی تھے اور سیکس کے چٹخارے بھی۔لوگوں کا خیال تھا کہ چونکہ یہ دوسری لذت ابن صفی کی کہانیوں میں تقریباً مفقود ہوتی ہے'اس لیے قارئین انہیں بھول کر دیومالائی کہانیوں کی طرف راغب ہو جائیں گے۔

لیکن ایسا سوچنے والے یہ بات بھول گئے کہ ایک دھماکے کی آواز ایک لمحے کے لیے ضرور اپنی طرف متوجہ کرتی ہے پھر چند ثانیے کے اندر جب اس کا ذہن اس نتیجے تک پہنچ جاتا ہے کہ یہ آواز ایک پٹاخے کی تھی تو وہ فوراً ہی دھماکے کو فراموش کر دیتا ہے۔ویسے ہی سیکس ایک وقتی لمحاتی تصوراتی جوش سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔

ابن صفی کی ہر تحریر زندگی کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔اس کا ہر کردار ہمارا اپنا ساتھی محسوس ہوتا ہے جس کے

لیے ہندو میتھالوجی کی طرح تصور کی ضرورت ہی نہیں پڑتی نہ کہانی کے کرداروں کے ساتھ دینے کے لیے کسی ذہنی سفر کی حاجت ہوتی ہے' ان کا تحریر کردہ ہر واقعہ ہماری اپنی زندگی کی عکاسی کرتا ہے۔ اسی لیے ابن صفی کا قاری ہر دوسری تحریر کو سونگھ کر چھوڑ دیتا ہے۔ اس لیے کہ اچھے ذائقہ کے لیے تازگی بھی ایک شرط ہوتی ہے اور یہ تازگی یہ مہک پڑھنے والوں کو صرف ابن صفی کی تحریروں میں ملتی ہے۔

دل تو چاہتا ہے کہ ابن صفی کی ہر تحریر پر الگ الگ تبصرہ کروں ہر کہانی کی تفصیل پیش کروں' اس کی خصوصیات گنواؤں مگر میں اس منزل سے جان بوجھ کر خاموشی کے ساتھ گزر رہا ہوں۔ اس لیے کہ یہ تفصیلات تو ابن صفی کے ہر قاری کے ذہن پر پہلے ہی نقش ہیں۔ میرے چند الفاظ اس میں کسی اضافہ کا باعث نہ ہوں گے پھر مشہور کہاوت ہے کہ:

مشک آنست کہ خود ہوید' نہ کہ عطار بگوید

مشک وہی ہے جو خود خوشبو دے' یہ نہیں کہ عطار اس کا تعارف کرائے۔

اپنی کہانیوں کی ابتدا میں ابن صفی نے جو پیش رس تحریر کیے وہ اپنا علیحدہ مقام رکھتے ہیں۔ ان مختصر تحریروں میں انہوں نے بہت کچھ کہا ہے' بہت سے عقدے کھولے ہیں۔ اشاروں کنایوں میں بڑے بڑے مسائل حل کیے ہیں۔ میرا دعویٰ ہے کہ اگر "پیش رس" کی ان تحریروں کو مجتمع کر کے کتابی شکل میں شائع کر دیا جائے تو آج کی تصنیفات میں اس کتاب کو وہی حیثیت حاصل ہوگی جو ایک سو سال پہلے کے دوور میں غالب کی اردوئے معلےٰ کو دی گئی تھی۔

ابن صفی رخصت ہو گئے لیکن اپنے پیچھے بہت کچھ چھوڑ گئے۔ عام طور پر لوگ مال و دولت جائیداد اور اولادیں چھوڑتے ہیں' لیکن...... ابن صفی تو پوری ایک دنیا چھوڑ گئے ہیں۔ اپنی ساری زندگی کا نچوڑ' اپنی ذہنی کاوشوں کا انبار اور اس کے ساتھ اپنے لاتعداد پرستار' مجھے یقین ہے کہ یہ سب انمٹ اور لافانی ہیں۔ اور اس کے ساتھ ابن صفی بھی ہمیشہ ہمیشہ زندہ رہیں گے۔

یہ ابن صفی کی خوش قسمتی تھی کہ انہیں اپنے لاتعداد مدح خواہوں کے ساتھ ساتھ ایک قدردان' وفا شعار اور لائق شاگرد بھی مل گیا اور ابن صفی کی جوہر شناس نگاہوں نے اسے پہچان بھی لیا' اگر ابن صفی اس پر خلوص انسان پر اعتماد نہ کرتے تو ان کی تحریروں کے خزانے کا بھی وہی انجام ہوتا جو استاد قمر جلالوی کے کلام کا ہونے والا تھا اور پھر شاید ہم ان کی ایک ایک تحریر کو ہمیشہ ہمیشہ ترستے رہتے۔ مشتاق احمد قریشی کو اس سلسلہ میں جس قدر سراہا جائے کم ہے کہ انہوں نے ابن صفی کی تحریر کردہ ایک ایک سطر کو محفوظ کر لیا اور انتہائی سلیقہ کے ساتھ ان کے پرستاوں کی خدمت میں ماہ بماہ پیش کرتے رہتے ہیں ورنہ بصورتِ دیگر ہمارے درمیان مردہ خوروں کی تعداد بھی کچھ کم نہ تھی۔

(نیا رخ۔۱۹۸۶ء)

ابن صفی

مشتاق احمد قریشی

ابن صفی کا قول ہے۔

''آدمی میں جب تک قانون کے احترام کا سلیقہ نہیں پیدا ہوگا' تب تک سڑکوں پر خون بہتا رہے گا' دنگا فساد ہوتا رہے گا۔ میرا مشن ہے کہ آدمی قانون کا احترام کرنا سیکھے۔ اس لیے میں نے جاسوسی ناول لکھنے کی راہ منتخب کی ہے تا کہ تھکے ہارے ذہنوں کو تفریح بھی مہیا کرتا رہوں اور انہیں قانون کا احترام کرنا بھی سکھاتا رہوں۔ فریدی میرا آئیڈیل کردار ہے جو خود بھی قانون کا احترام کرتا ہے اور دوسروں سے قانون کا احترام کرنے کے لیے اپنی زندگی تک داؤ پر لگا دیتا ہے۔

''میری دانست میں اس مشن کی کامیابی کے لیے جاسوسی ناول کا سہارا نا کافی ہے اس کے لیے ملکی قانون کی تعلیم کا انتظام عوامی پیمانے پر ہونا چاہیے۔ ہمارے ماہرین تعلیم اس پر دھیان دیں۔ یہ بے حد ضروری ہے کہ ایسا نصاب وضع کیا جائے جس سے ابتدائی مدارج ہی میں قانون کی تعلیم شروع ہو سکے۔

''جب قانون سے لاعلمی قانون شکنی پر سزا سے نہیں بچا سکتی تو پھر ہر آدمی کا یہ حق ٹھہرتا ہے کہ اسے کلی طور پر قوانین سے آگاہی حاصل ہو۔''

یہ ہے وہ گفتگو جو محترم ابن صفی سے میری تیسری ملاقات پر ہوئی کیونکہ میں نے سوال کیا۔ ''آپ صرف جاسوسی ناول ہی کیوں لکھتے ہیں؟ آخر آپ جاسوسی ناول تک کیوں محدود ہو گئے ہیں؟''

''تم سے یہ کس نے کہہ دیا کہ میں صرف جاسوسی ناول ہی لکھتا ہوں اور اس کے علاوہ کچھ بھی نہیں لکھ سکتا؟ میں نے لکھنے کی ابتدا افسانے سے کی جو خالص رومانی افسانہ تھا اس افسانے کو عادل رشید صاحب نے اپنے ہفت روزہ جریدے ''شاہد'' بمبئی سے شائع کیا تھا۔ عادل رشید صاحب نے اس پر بڑا زبردست نوٹ لکھا تھا۔ ''نتیجہ فکر' مصور جذبات' حضرت اسرار ناروی'' اس کے بعد تواتر سے میری کہانیاں ہفت روزہ ''شاہد'' بمبئی میں شائع ہوتی رہیں اور میٹرک تک پہنچتے پہنچتے میں باقاعدہ مشاعروں میں بھی شریک ہونے لگا تھا۔ ۴۷ء میں تقسیم ہند کے وقت جو کچھ ہوا اس نے میری پوری شخصیت کو تہ و بالا کر دیا۔ میں اس وقت بی اے کے پہلے سال میں تھا۔ اس دور کے ذہنی بھونچال نے کافی عرصے تک میرے ذہن کو پراگندہ اور منتشر رکھا پھر ۴۸ء کے آخر میں دوستوں کی تحریک پر ماہنامہ ''نکہت'' الہ آباد کے لیے طغرل فرغان کے نام سے طنزیات اور افسانوں کا سلسلہ شروع کیا۔ کچھ پیروڈیز بھی لکھیں۔ ۵۲ء میں جاسوسی ناولوں کا سلسلہ شروع ہوا تو ایک بزرگ ادیب (جن کا نام لینا مناسب نہیں) کا خیال تھا کہ اردو میں صرف جنسی کہانیاں ہی پڑھی جا سکتی ہیں اور اس دور میں واقعی جنسی کہانیاں ہی لکھی جاتی تھیں جنسی اور فحش کہانیوں کا ایک سیلاب آیا ہوا تھا۔ میں نے ان کی اس بات

سے اتفاق نہیں کیا اور اس سلسلے میں مسلسل ذہن پر زور دیتا رہا۔ اس دور میں منشی تیرتھ رام فیروز پوری کے تراجم کافی ذوق وشوق سے پڑھے جاتے تھے یا پھر دو تین ناول ظفر عمر صاحب کے شائع ہوئے تھے۔ وہ بھی ان کے اپنے لکھے ہوئے نہیں تھے بلکہ انہوں نے مارس لیبلا نک کے ناولوں کو مشرف بہ اسلام کیا تھا۔ افسوس کہ انہوں نے اس بات کا اعتراف نہیں کیا۔ جاسوسی ناول میرے لیے بالکل نئی چیز تھی اس لیے پہلی بار مجھے بھی انگریزی ہی کی طرف رجوع کرنا پڑا۔ وکٹر گن کے ناول ''آئرن سائیڈز لون اینڈ'' سے میں نے اپنا پہلا ناول 'دلیر مجرم' ماخوذ کیا۔ البتہ اس ناول کے کردار فریدی' حمید میری اپنی اختراع ہیں۔''

محترم ابن صفی نے میری طرف دیکھتے ہوئے بڑی گہری مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ''مشتاق میاں! جیسا کہ تمہارا خیال ہے اور بعض لوگ بھی کہتے ہیں کہ مجھے مقصدی ادب پیش کرنا چاہیے تو میرا خیال ہے کہ تفریح بجائے خود ایک مقصد ہے۔ تھکے ہوئے ذہنوں کے لیے تھوڑی سی تفریح مہیا کر دینا' اگر کسی کے بس میں ہو تو یہ بھی ایک مقدس فریضہ ہے۔ اس اعتبار سے میری کہانیاں مقصدیت سے دور نہیں ہوتیں۔ کچھ لوگ ذہنی فرار کی بات کرتے ہیں۔ ان لوگوں کو شاید معلوم نہیں کہ فرار ہی بنیادی طور پر مزید تعمیر کا باعث بنتا ہے۔ یکسانیت سے فرار انسانی طبیعت کا خاصا ہے۔ جب آرٹ اور ادب کے علمبردار مجھ سے کہتے ہیں کہ میں ادب کی خدمت کروں تو مجھے بڑی ہنسی آتی ہے۔ تم ہی بتاؤ مشتاق میاں کیا میں جھک مار رہا ہوں؟ حیات وکائنات کا کون سا ایسا مسئلہ ہے جسے میں نے اپنی کسی نہ کسی کتاب میں نہ چھیڑا ہو۔ بس میرا طریقہ کار ہمیشہ عام روش سے الگ تھلگ رہا ہے۔ میں بہت اونچی بات کہہ کر محض چند لوگوں تک محدود ہونے کا قائل نہیں ہوں۔ دوسرے لوگ جو اعلا وارفع ادب تخلیق کر رہے ہیں' وہ ادب کتنے ہاتھوں تک پہنچتا ہے اور انفرادی اجتماعی زندگی میں کیا انقلاب لاتا ہے؟ افسانوی ادب خواہ وہ کسی بھی پائے کا ہو اس کا مقصد محض ذہنی فرار اور کسی نہ کسی معیار کی تفریح ہی فراہم کرنا ہوتا ہے لیکن اس سے گنے چنے ہی لوگ محظوظ ہوتے ہیں۔ وہ اعلیٰ ترین ادب ایک بہت بڑے طبقے کے لیے بے معنی ہے۔ میں ان گنے چنے لوگوں کے لیے ہی کیوں لکھوں؟ میں وہ انداز کیوں نہ اپناؤں جسے زیادہ لوگ پسند کرتے ہوں اور کچھ اونچی باتیں اسی بہانے عوام تک پہنچا دوں۔ میں نے آفاقیت کے گیت گائے ہیں' عالمی بھائی چارے کی باتیں کی ہیں۔ اور اسی طرح بہت ہی بھیانک قسم کے ذہنی ادوار سے گزرتا ہوا میں یہاں تک پہنچا ہوں پھر میں مطمئن ہوں کہ جو کچھ لکھتا ہوں' وہ پورے اعتماد اور یقین کے ساتھ لکھتا ہوں' مجھے یہ بھی علم ہے کہ اونچا ادب تخلیق کرنے والے تمام احباب جو مجھ پر شدید نکتہ چینی کرتے ہیں' وہ بھی مجھے بڑی پابندی سے پڑھتے ہیں۔'' اتنا کہہ کر ابن صفی صاحب شدید جذباتی ہو گئے اور انہوں نے ایک طویل ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے بڑی تلخ سی مسکراہٹ کے ساتھ مزید کہا۔

''مشتاق میاں! تمہیں تو خوب معلوم ہے کہ ادب کے یہ چوہدری میرے خلاف کیسے کیسے محاذ بناتے ہیں اور میاں! یہ انسانی فطرت ہے کہ جب تمہارے مکان کے برابر والا اپنا دو منزلہ کھڑا کرنے لگتا ہے تو تمہارے دل میں ایک ہوک سی اٹھتی ہے کہ یہ دو منزلہ کیوں بنا رہا ہے؟ اگر تم وسیع نظر کے مالک ہو تو بڑی حسرت سے اس دو منزلہ پر

نظر ڈال کر ایک طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ دل مسوس کر رہ جاؤ گے ورنہ پڑوس کے مکین پر نکتہ چینی شروع کردو گے۔
تم خود یہ کوشش کیوں نہیں کرتے کہ اس سے پہلے ہی تمہارا دومنزلہ بن جائے؟ خیر میاں، چھوڑو ان باتوں کو۔ ہاں تو تم کہہ رہے تھے کہ ہماری قوم مردہ پرست ہے۔ کسی بھی فنکار کی قدر اس کی زندگی میں نہیں کی گئی جب کوئی مرجاتا ہے تو بڑا واویلا کرتے ہیں۔ مرنے والے کے اعزاز میں بڑے بڑے بت بناتے ہیں...... لیکن میرے ساتھ شاید ایسا بھی نہ ہو...... کیونکہ میں تو ان بت تراشوں سے بھی مل کر نہیں بیٹھا تمہیں تو معلوم ہی ہے کہ میں گوشہ نشین ہوں اور ہمیشہ گوشہ نشین ہی رہوں گا۔ شاید بعد مرگ بھی ایسا ہی ہو۔ میں نے کبھی شہرت اور نام ونمود کی پروا نہیں کی۔ میں ہمیشہ ہی ان چیزوں سے بھاگا ہوں۔ اب یہ جو کچھ مقبولیت ہے، یہ قدرت کی دین ہے میری اپنی کوشش کا اس میں کوئی دخل نہیں۔ میاں تم نے پھر مقصدیت کی بات کی ہے تو میں پھر وہی بات کہوں گا، جو کچھ دیر پہلے کہی تھی۔ تفریح بجائے خود ایک مقصد ہے، تھکے ہوئے ذہنوں کو تھوڑی سی تفریح مہیا کردینا، اگر آپ کے بس میں ہو تو میں اسے بھی ایک مقدس فریضہ سمجھتا ہوں اور یہی مقصد میری کہانیوں میں پیش پیش ہے۔
''یہ جو تم ادب عالیہ کی بات کرتے ہو تو بھائی میرے، میں نہ تو ادب عالیہ کو افورڈ کرسکتا ہوں اور نہ ہی ادب عالیہ مجھے افورڈ کرے گا۔ تم نے ادب تخلیق کرنے والوں کو دیکھا ہے؟ کیا حلیہ ہوتا ہے ان کا؟ کیا مجھے بھی ویسا ہی دیکھنا چاہتے ہو؟ جب وہ ادب کا شہ پارہ تخلیق کرکے ادب کے ٹھیکیداروں کو دیتے ہیں تو وہ ادب کے ٹھیکے دار انہیں اس کا کیا معاوضہ دیتے ہیں؟ بس اپنے پرچے میں چند تعارفی جملے جس طرح نمایاں کرسکتے ہیں کردیتے ہیں اور بس، صرف تعارفی لفظوں اور ستائشی جملوں سے نہ تو اس ادیب کا پیٹ بھرتا ہے اور نہ ہی اس کے بال بچوں کا...... اگر بھر سکتا ہو تو مجھے بتادیں، میں پھر وہی سب کچھ لکھ ڈالوں گا، کیا تم پسند کرو گے کہ میں بقول لوگوں کے اور تمہارے بلند پایہ ادب تخلیق کرکے کسی نامور ادبی پرچے میں چھپ کر اس کی کاپی اپنی جیب سے خرید کر یا اس کی کاپی خریدنے کے لیے تم سے پیسے لینے آؤں گا اور کہوں، یار! کئی روز سے میں نے چائے یا سگریٹ کی شکل تک نہیں دیکھی، تم یا کوئی اور دوست کب تک لفٹ دو گے؟ دو ایک بار میں ہی کنی کاٹ جاؤ گے، کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟
''میاں تم جو یہ ابن صفی صاحب، ابن صفی صاحب کہتے رہتے ہو۔ وہ صرف اس وجہ سے ہے کہ میں تمہارے حساب سے ادب عالیہ نہیں لکھ رہا ہوں لیکن میرے خیال سے جو کچھ بھی لکھ رہا ہوں، وہ بہترین ادب ہے کہ اسے چھوٹے بڑے سب ہی پڑھتے ہیں اور پسند کرتے ہیں۔ کیا تم کسی بھی بڑے مصنف (جسے تم بڑا مانتے ہو) کی مثال دے سکتے ہو کہ ہندوپاک میں وہ اتنی بڑی تعداد میں چھپتا ہو، بے شک اس کا نام ضرور بڑا ہوگا لیکن اس کی ریڈر شپ اتنی بڑی نہیں ہوگی۔ کہو کیا کہتے ہو تم؟ تم تو خود بھی پبلشر ہو، کافی کتابیں اب تک چھپا چکے ہو۔ کتنی کتابیں بیچ لیتے ہو، مجھے معلوم ہے، میری کتاب کتنی چھپتی ہے۔ ہندوپاکستان میں تقریباً ڈیڑھ پونے دو لاکھ کی تعداد میں مختلف زبانوں میں چھپتی ہے۔ بولو اب کیوں خاموش ہو؟''
اس وقت میرے پاس ایک جھینپی جھینپی مسکراہٹ کے سوا کوئی جواب نہ تھا۔

پھر خود ہی بولے۔ ''تم نے کہا تھا کہ لوگوں کی ذاتی لائبریری میں آپ کی کتابیں نہیں ہوتیں جب کہ عام لائبریریوں میں جو کتاب سب سے زیادہ کرائے پر چلتی ہے وہ میری ہی کتاب ہے...... اور ہاں ابھی تم نے ہی تو بتایا ہے کہ میری کتابیں لوگ بلیک میں فروخت کرتے ہیں۔ اب تم ہی بتاؤ کیا اردو زبان میں کوئی ناول اس قدر تیزی سے فروخت ہوتا ہے کہ لوگ خریدنے کے لیے بے چین ہو کر فروخت کرنے والوں کا ہر مطالبہ تسلیم کر لیں۔ مشتاق میاں! کسی بھی لکھنے والے کا حوصلہ بلند کرنے کے لیے یہ بہت بڑی بات ہے۔ پھر تم ہی کہو کہ وہ ادب جو نانِ شبینہ کو ترسائے بڑا ہے یا وہ ادب جس سے نہ صرف میری، میرے پبلشر کی بلکہ بہت سے بک اسٹال والوں کی روٹیوں کا خرچہ نکلتا ہے؟ خیر، تم میری یہ بات نوٹ کر لو ایک وقت آئے گا کہ لوگ اسی ''سب کچھ'' کو ادب تسلیم کریں گے اور جب ادب کے یہ چوہدری اپنے خول سے باہر آئیں گے تب تم دیکھنا کہ کیسا چولا بدلتے ہیں۔''

آہ! آج محترم ابن صفی ہم میں موجود نہیں ہیں، صرف ان کی باتیں اور ان کی یادیں ہی رہ گئی ہیں بے شک وہ بہت بڑے انسان، بہت بڑے مصنف، بڑے شاعر، بڑے ادیب اور دانشور تھے۔ یہ میری عزت افزائی تھی کہ مجھ سا کم علم اور بے مایہ شخص ان کے اتنے قریب رہا اور انہوں نے ہمیشہ میری حوصلہ افزائی کی۔ ان ہی کے حکم پر میں نے ''نئے افق'' کا اجرا کیا، جس میں وہ مرتے دم تک لکھتے رہے اور اپنی زندگی کے آخری دنوں میں انہوں نے ایک نئے پرچے ''نیا رخ'' کی داغ بیل ڈالی جس کے تین شمارے ہر لحاظ سے مکمل ہو گئے۔ جب ''نیا رخ'' کے تین شمارے مکمل ہو گئے تب انہوں نے اجازت دی کہ اب اس کی پبلسٹی کر لو۔ اب تمام کام تمہارے قابو میں ہے۔ اب تم مزید کسی تاخیر کے اس پرچے کو میرے پڑھنے والوں کے سامنے لا سکتے ہو۔ مجھے اندازہ ہو گیا کہ تم دونوں پرچوں کو وقت کی پابندی کے ساتھ نکال سکتے ہو۔ ''نیا رخ'' کے سلسلے میں انہوں نے شکرال کے پس منظر میں ایک ناول ''شمال کا فتنہ'' مکمل کر دیا تھا اور کہا تھا کہ اگرچہ میری بیماری اجازت نہیں دیتی لیکن میں کسی وعدے کی عدم تکمیل کا بوجھ اپنے سینے پر لے کر نہیں جانا چاہتا۔ میں نے بارہا کہا کہ اپنے ذہن کو آرام کرنے دیں۔ آپ کو آرام کی شدید ضرورت ہے، زندگی نے وفا کی تو انشاءاللہ وعدے پورے ہوتے رہیں گے لیکن انہوں نے میری ایک نہ مانی اور جیسا سوچا تھا ویسا ہی کیا۔ ناول کا مکمل مسودہ میرے ہاتھ میں دیتے ہوئے انہوں نے کہا۔ ''لو اب تم خود ہی اسے قسطوں میں تقسیم کرتے رہنا یا مکمل ناول کی شکل میں شائع کر دینا یا پھر جیسا تم مناسب سمجھو کر لینا۔''

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ملک عدم کے راہی کو اندازہ تھا کہ وہ کب اپنے سفر پر روانہ ہو جائے گا۔ اس سے پہلے انہوں نے اپنی پوری زندگی میں کبھی قبل از وقت لکھ کر میٹر کا ذخیرہ نہیں کیا ہمیشہ بروقت اور ضرورت کے مطابق ہی لکھا لیکن ''نیا رخ'' کے سلسلے میں جذباتی ہو کر انہوں نے اپنی زندگی کا یہ معمول بھی بدل دیا تھا۔ ''نیا رخ'' اور ''نئے افق'' دونوں پرچے ایک مشن کی حیثیت سے پہلے محترم ابن صفی کے پیش نظر تھے، اب یہ مشن میرے سامنے ہے جسے اپنی تمام تر توانائیوں کے ساتھ بالکل ویسا ہی، جیسا کہ صاحب موصوف چاہتے تھے، جاری رکھوں گا۔ انشاءاللہ۔

(نئے افق، ستمبر ۱۹۸۰ء)

لاثانی کرداروں کا خالق

<u>نظام الدین کڑیہ</u>

آج سے تیرہ برس پہلے ۱۹۶۷ء سے میں نے ابن صفی کو پڑھنا شروع کیا تھا۔ اس وقت میری عمر کوئی سولہ برس کی تھی۔ سب سے پہلا ناول ابن صفی کا جو میں نے پڑھا وہ تھا ''بیباکوں کی تلاش'' اس کے بعد ''دیو پیکر درندہ' شوگو بینک' تابوت میں چیخ' اور فضائی ہنگامہ' پھر تو ابن صفی کے ناولوں کی جیسے لت پڑ گئی ہو' آج تک برابر پڑھتا آرہا ہوں' گھر گھر سے مانگ کر اور بعد میں نکہت پبلیکیشنز الہ آباد سے منگوا منگوا کر پرانے ناول تک پڑھ ڈالے۔ اسی درمیان ابن صفی کے علاوہ کرشن چندر' منٹو' عصمت چغتائی اور بیدی وغیرہ کو بھی پڑھتا رہا مگر جو لطف اور جو دلچسپی ابن صفی کی نثر میں پائی وہ سوائے سعادت حسن منٹو کی چند تحریروں کے اور کہیں نظر نہ آئی۔ ابن صفی کے قلم سے نکلا ہوا ہر ہر جملہ میری دلچسپی کا باعث بنتا گیا اور ان کی تحریروں سے اس قدر لگاؤ بڑھ گیا کہ میں دل ہی دل میں بہت ڈرنے لگا کہ اگر خدانخواستہ ابن صفی کو کچھ ہو جائے تو پھر کس کو پڑھوں گا؟ متواتر تیرہ سال سے برابر یہ دعا کرتا چلا آرہا تھا کہ خدا مجھ سے پہلے ابن صفی کو نہ اٹھائے مگر افسوس کہ میری یہ دعا قبول نہ ہوئی اور وہ سانحہ ۲۶ جولائی ۱۹۸۰ء کو بالآخر ہو کر ہی رہا جس کا دھڑکا ۱۹۶۷ء سے برابر لگا تھا اور اب تو ایسا لگ رہا ہے کہ قلب وذہن کے بیشتر آئینے یکایک تاریک ہو گئے ہیں۔ جیسے زندگی کا کوئی بڑا مقصد ضائع ہو گیا ہے۔

ابن صفی کی موت پر ان کی کہانیوں کی مستقل فضائیں بھی مغموم و سوگوار سی لگتی ہیں۔ عمران کے قہقہہ بار فلیٹ پر اداسی چھائی ہوئی ہے...... صفدر' جولیانا' خاور' نعمانی' چوہان' ظفر' جمن' سلیمان' جوزف اور یہاں تک کہ خود عمران جس نے کبھی مایوس ہونا نہ سیکھا تھا' سب کے سب غم واندوہ میں ڈوبی ہوئی اداس تصویریں بنے بیٹھے ہیں۔ کرنل فریدی کی کوٹھی پر بھی سوگوار فضا طاری ہے کیپٹن حمید واقعی مغموم ہو گیا ہے اور اپنے خالی پائپ کو گھور رہا ہے اور کرنل فریدی...... وہ فریدی جس نے کبھی حمید کے اس اظہار خیال پر کہ اب آپ بوڑھے ہو گئے ہیں۔ کہا تھا...... ''لغو خیال ہے میں کبھی بوڑھا نہیں ہو سکتا'' جس کی ڈکشنری میں مایوسی اور ناکامی جیسے الفاظ نہیں ملتے وہ فریدی بھی آج افسردگی کے عالم میں اپنے بجھے ہوئے سگار کو یوں تک رہا ہے جیسے سگار کی آگ نہ ہو بلکہ ایک تابناک اور بھڑکتا ہوا شعلہ ہو جو یکا یک سرد ہو گیا ہے۔ غم انگیز پرچھائیوں نے فریدی کے چہرے کو جھرا دیا ہے۔

پہلی بار اس کے چہرے پر مایوسی کے آثار نظر آئے ہیں اور اس اندوہناک خیال سے اور زیادہ وحشت ہوتی ہے کہ اب کون آئے گا جو ان کے کرداروں میں روح پھونک سکے گا۔ ان میں جان ڈال کر فریدی کو واقعی فریدی اور عمران کو واقعی عمران بنا کر پیش کر سکے گا۔ ابن صفی کے یہ دو مستقل کردار ایسے پیچیدہ' پہلودار اور ہمہ گیر ہیں کہ جن کو صحیح معنوں میں صرف ابن صفی ہی بھرپور زندگی دے سکتے تھے۔ اب ایسا کوئی ابن صفی شاید ہی پیدا ہو سکے۔

کہانیاں چاہے کسی بھی قسم کی ہوں ان کا بہترین وصف اور سب سے بڑا جزو کردار نگاری ہے۔ اعلیٰ ادب کے رہنماؤں کو یہ پتا ہی نہیں کہ ۲۶ جولائی کو کس پائے کا کردار نگار ان کے درمیان سے اٹھ گیا۔ ادب کے ان "رہنماؤں" کے نزدیک جاسوسی یا سری یا مہماتی ادب تیسرے درجے کا ادب ہے۔ جاسوسی ادب تیسرے درجے کا ہے یا چوتھے درجے کا' اس بحث سے قطع نظر اگر ابن صفی کی تحریروں پر نظر ڈالی جائے تو وہاں منفرد اسلوب میں ڈھلی ہوئی بے ساختہ اور نرالی شان رکھنے والی نثر نظر آئے گی۔ ان کا اسلوب اتنا شگفتہ پر کیف اور اس قدر سحر طراز ہے جس کی مثال نہیں ملتی۔

ابن صفی دراصل ادب کے رہنماؤں کے لیے ایک مستقل چیلنج تھے۔ ان کے قلم میں اتنی طاقت تھی کہ وہ اس تیسرے درجے کے ادب سے ہٹ کر اعلیٰ درجے کا ادب بھی تخلیق کرتے مگر اس کے برعکس اعلیٰ ادب کے رہنماؤں میں اتنی قوت نہیں کہ وہ ابن صفی جیسی مہارت کے ساتھ طبع آزمائی کرتے۔

اردو والوں کی نظروں میں جرم وسزا کی کوئی وقعت ہی نہیں' یہ لوگ نہیں جانتے کہ جرائم کس طرح سماج کو گندہ کرتے ہیں' جرائم اور سماج کی مثال آندھی اور جھونپڑیوں کی مثال ہے' ازل ہی سے جرائم انسانی زندگی اور سماج پر آندھیوں کی طرح جھپٹتے آئے ان کے تدارک کے لیے جرم وسزا سے متعلق اچھے سے اچھا ادب پیدا کرنا ادیبوں کا فرض ہے۔ اسے تیسرے درجے کا مردود ادب قرار دے کر اس کی طرف سے آنکھیں بند کر لینا یقیناً ناانصافی ہے اور کچھ نہیں (یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ صرف جرم وسزا ہی سے متعلق ادب پیدا کیا جائے' کہنے کا مطلب صرف یہ ہے کہ زندگی بڑی ہی وسیع لچکدار اور رنگا رنگ ہے۔ جرم وسزا بھی انسانی زندگی ہی کا ایک حصہ ہے) سب سے زیادہ مزیدار تو یہ بات ہے کہ ادب کے انہی "رہنماؤں" میں سے کئی ایک کو اکثر جاسوسی دنیا میں ابن صفی کی تصنیفات کو بڑے ذوق وشوق کے ساتھ چوری چھپے پڑھتے ہوئے دیکھا گیا ہے اور ان کی اپنی تحریروں میں بھی ابن صفی کا سا انداز اختیار کرنے کی کوشش کارفرما نظر آتی ہے۔

ایک طرح سے دیکھیے تو یہ بات ہی سرے سے غلط نظر آتی ہے کہ ابن صفی صرف جاسوسی ناول نگار تھے۔ وہ ایک بلند پایہ شاعر اور ایک کامیاب طنز ومزاح نگار بھی تھے۔ ان کی ایک اصل اور مستقل خصوصیت کو اردو والوں نے بھلا رکھا ہے۔ اگر وہ صرف جاسوسی ناول نگار ہوتے اور طنز کی کاٹ اور مزاح کی پھلجھڑیوں سے ان کی کہانیاں خالی ہوتیں تو یہ ناممکن تھا کہ اتنی ڈھیر ساری کہانیوں کی تخلیق کے بعد بھی ان کی کہانیوں میں وہی دلچسپی اور وہی نیا پن پایا جاتا جو شروع ہی سے ان کا وتیرہ رہا ہے۔ ان کی کہانی میں نیا پن ہوتا ہے جو ان کو اس قدر ہر دلعزیز بناتا گیا کہ ان کی کتابیں خریدنے کے لیے دکانوں پر بھیڑ لگ جایا کرتی تھی' اور دکان داروں کو باضابطہ طور پر کیو سسٹم (لائن لگانے کے اصول) کے مطابق کتابیں بیچنی پڑتی تھیں۔

ابن صفی کے کرداروں نے پژمردہ اور بوجھل ذہنوں کو اپنی مسکراہٹوں کی قندیلوں سے روشن کیا ہے۔ مردہ جسموں کو طاقت ور بنایا ہے اور مردہ دلوں کو قہقہے لگانے پر مجبور کیا ہے۔ کرنل فریدی جیسا ذہین' بے حد پھرتیلا طاقت ور کردار جہاں قاری کے دل ودماغ میں بے پناہ روشنیاں پھیلاتا ہے وہاں وہ کمزور بازوؤں میں بھی

گرم اور زندگی کی امنگوں سے بھرپور خون دوڑا دیتا ہے اور کسی بے حد مسخرے قاری کو بھی سنجیدگی کی لذت سے آشنا کراتا ہے۔

حمید جیسے رومان پرست اور قاسم جیسے دیبل' احمق اور عقل سے پیدل کرداروں کی وجہ سے یکسانیت کا احساس ہونے نہیں پاتا اوران کرداروں کی نت نئی مضحکہ خیز حرکتیں مردہ سے مردہ دلوں کو بھی بے تحاشا دل کھول کر ہنسنے پر مجبور کرتی ہیں اور سنجیدہ ترین آدمی کے لبوں پر بھی تبسم کی کلیاں کھل جاتی ہیں۔ پھر یہ متضاد خصوصیات بیک وقت عمران کے کردار میں نظر آتی ہیں۔ (عمران کی مکمل' ہمہ گیر اور بھرپور شخصیت کے جائزے کے لیے بہرحال ایک الگ ہی مضمون درکار ہوگا۔) اور پھر عمران ہی کی شخصیت سے ملتے جلتے مگر یکسر الگ دو اور کردار ظفر اور جمن کی تخلیق ابن صفی کی کردار نگاری کی معراج ہے۔ عمران کی پہلودار شخصیت میں مزاح اس کا سب سے بڑا وصف ہے' جمن بھی اسی مزاح کی نمائندگی کرتا نظر آتا ہے لیکن اس کے اور عمران کے مزاح میں زمین وآسمان کا فرق نمایاں طور پر محسوس کیا جاسکتا ہے۔ عمران کے مزاح کے وقت بھی اس کی شخصیت کو ایک بامعنی اور بامقصد سنجیدگی گھیرے رہتی ہے جبکہ جمن کا کردار مزاح پر اتر آتا ہے تو اس میں صرف مزاح نظر آتا ہے اور اسی طرح کیپٹن حمید کا انداز ان دونوں ہی سے جداگانہ ہے۔ اس کے مزاح میں اس کی ذہانت بھی کروٹیں لیتی رہتی ہے اور عجیب عجیب فتنے جگاتی ہے۔ عمران' حمید اور جمن اپنی اپنی جگہ اتنے بھرپور اور جاندار نظر آتے ہیں کہ بے اختیار ان سے بغلگیر ہونے کو جی چاہتا ہے' ابن صفی کے مستقل کرداروں میں جمن بہت بعد کا کردار ہے' لیکن بے حد جاندار ہے۔ فریدی یا عمران حمید یا قاسم ہی کی طرح جمن بھی اردو ادب کا ایک لاثانی کردار ہے۔ گزشتہ دہائی کے غالباً درمیانی حصے کی بعض کہانیوں میں جبکہ عمران دنیا کے مختلف جزیروں میں مہمیں سر کرتا نظر آتا ہے جوزف جیسا ہمیشہ شراب کے نشے میں دھت رہنے والا کردار بھی کوئلے کی کان میں ہیرے کی مانند چمکنے لگتا ہے اور یہ چمک اس نے عمران ہی کے کردار سے مستعار لی ہے' فریدی اور عمران کے کردار دو ایسے کردار ہیں کہ جنہوں نے کئی منفی رجحانات کے حامل ذہنوں کو مثبت اور صحیح راستوں کی طرف مائل کیا ہے۔

ابن صفی کی تحریروں کو صرف جاسوسی ادب کہہ کر محدود کردینا سراسر ناانصافی ہے۔ ایک باشعور اور انصاف پسند قاری یہ بات قبول نہیں کرسکتا' ابن صفی کا ادب تو بے حد جاندار اور متحرک ادب ہے۔ ''بیباکوں کی تلاش'' میں گھریلو ماحول اور جدید دور کی عورت کی نمائندہ صبیحہ کا کردار' ''بھیانک جزیرہ'' کی قدم قدم پر پیش آنے والی مہمات اور ''شعلے سیریز'' کے دلچسپ اسرار اور اس کی خانم اور ڈاکٹر سلمان اور اس کی بہن' اور ان سب سے بڑھ کر عمران اور سنگ ہی کا ایک دوسرے کا دشمن ہوتے ہوئے چچا بھتیجا کہلانا۔ عمران اور تھریسیا کی جنگ اور تھریسیا کا عمران سے عشق اور وہ لاتعداد عارضی کردار جو ایک لمبے عرصے تک ذہنوں پر اپنے نقش چھوڑ جاتے ہیں' سب ہی شامل ہیں۔ سچ بات تو یہ ہے کہ اردو ادب میں ابن صفی جیسا کردار نگار کوئی دوسرا نظر نہیں آتا' ان کے خلاق ذہن نے ایسے ایسے کردار تراشے ہیں اور پیچیدہ سے پیچیدہ کرداروں کو زندگی بخشی ہے کہ عقل حیران

رہ جاتی ہے۔ ابن صفی بذات خود آدمی تھے کہ زندگی سے بھرپور کرداروں کو ڈھالنے کی مشین۔
ابن صفی کا ہر ناول ایک دوسرے کی کڑی معلوم ہوتا ہے مگر کہیں بھی یکسانیت کا شائبہ تک نہیں پایا جاتا۔ ایسا لگتا ہے کہ انہوں نے ایک مکمل پلان سامنے رکھ کر ناول لکھنا شروع کیا تھا اپنے پہلے ناول "دلیر مجرم" سے لے کر آج تک ان کا ذہن وشعور برابر ارتقاء کی منزلیں طے کرتا رہا ہے۔ یہاں تک کہ پچھلی دہائی کے بہت سے ناولوں میں وہ فریدی یا عمران وغیرہ کے مکالموں کے ذریعے ایک حیات نو کا پیغام صاف طور پر دیتے نظر آتے ہیں۔ ان کے ادب میں عموماً تین طرح کی کہانیاں نظر آتی ہیں۔ جاسوسی، جس میں فریدی اور عمران کے کئی ناول شامل کیے جا سکتے ہیں جیسے دلیر مجرم، خوف ناک جنگل، خطرناک بوڑھا، مصنوعی ناک، اشاروں کے شکار، اور آتشی بادل، وغیرہ۔ دوسرے مہماتی ناول جن کے نام گنوانے کے لیے ان کے ناولوں کی پوری فہرست کو سامنے رکھنا پڑے گا، بہرحال ان مہماتی ناولوں میں بھیانک جزیرہ خونی بگولے، زمین کے بادل، درندوں کی بستی، شعلے سیریز کے جاری ناول، اور فضائی ہنگامہ، جیسے کئی ایک ناول بھلائے نہیں جا سکتے، تیسرے وہ ناول جن میں بیک وقت سراغ رسانی، مہم جوئی اور مزاح پایا جاتا ہے۔ اس تیسری قسم کے ناولوں میں بھی بہت سارے نام گنوائے جا سکتے ہیں۔ مثلاً عمران کا اغوا، سے لے کر ظلمات کا دیوتا، تک کے بوغا سیریز، خونی ریشے، تیسری ناگن، ریگم بالا، دیو پیکر درندہ، شوگر بینک، تباہی کا خواب، مہلک شناسائی، اور اسی قسم کے بہت سے ناول گزشتہ دس پندرہ برس کے ناولوں میں طنز کو ابن صفی نے اپنے ایک خاص ڈھنگ سے اپنایا ہے، اور خاص طور سے عالمی سیاسیات پر اور موجودہ دور کے حالات زندگی پر مختلف انداز میں طنز کرتے نظر آرہے تھے۔
اردو ادب میں ابن صفی کی اہمیت کا اردو والوں کو کچھ اندازہ نہیں ہے۔ آئندہ چند برسوں میں شاید ہو جائے، جب مغربی مصنفین جیسے frehesisk اور alistair maelean`chandlesleu deighton forsyth کی ٹکر کا کوئی مصنف جاسوسی یا مہماتی ادب کا پیدا کرنے والا نہ ہوا تو اندازہ ہوگا کہ ابن صفی کی قبل از وقت موت اردو والوں کے لیے کتنا بڑا نقصان تھی۔ انگریزی اور اردو جاسوسی ادب کے درمیان جو طویل فاصلہ تھا اسے ابن صفی کی کہانیوں نے بہت بڑی حد تک کم کر دیا ہے۔ اردو میں جاسوسی ادب کی طرف ابن صفی نے بہت سوچ سمجھ کر قدم اٹھایا تھا۔ اس طرح کے ادب کی وقعت مغربی دنیا میں تیسویں اور چالیسویں دہائی ہی میں کم ہو گئی تھی لیکن ہندوستان میں پچاس یا اس سے پہلے کی دہائیوں میں بھی اس قسم کے ادب کے آثار نہ ہونے کے برابر تھے۔ ۱۹۵۲ء سے ابن صفی نے اس میدان میں طبع آزمائی کرنی شروع کی تھی اور اپنے زبردست تخیل کی مدد سے انہوں نے اردو ادب کے اس اجڑے باغ کو کچھ اس طرح سے ہرا بھرا کر دیا کہ دنیا دیکھتی رہ گئی، ان کی کہانیاں لازوال ہیں کیونکہ کسی بھی مصنف کو ہم بار بار نہیں پڑھ سکتے۔ بار بار تو کیا کسی بھی ایک ہی مصنف کی کہانیاں مسلسل پڑھنے سے بھی آدمی بہت جلد اکتا جاتا ہے لیکن ابن صفی کی تخلیقات میں یہ بات نہیں پائی جاتی، آپ انہیں ہفتوں کیا مہینوں اور برسوں پڑھتے رہیے اکتاہٹ یا بوریت کا شائبہ تک محسوس نہیں ہوتا بلکہ ایک ہی کہانی کو سال میں ایک دفعہ کئی بار پڑھنے کے باوجود بھی تسکین نہیں ہوتی اور ہر بار

کچھ نہ کچھ نئی باتیں منکشف ہوتی رہتی ہیں۔ ابن صفی کے لازوال تخیل نے ایک دو نہیں بلکہ پورے اٹھائیس سال تک اردو ادب کو جاسوسی اور مہماتی کہانیوں سے نوازا ہے۔ آج جس قدر بھی سرمایہ جاسوسی اور مہماتی ادب کا اردو میں نظر آتا ہے' اس کا نوے فیصد سے زائد حصہ انہی کے تخیل کا مرہون منت ہے' ان کے تخیل کی بیکراں وسعتوں کا اندازہ لگانے کے لیے ان کی کہانیاں پڑھنا چاہیے' صرف الفاظ کی مدد سے ان وسعتوں کو نہیں ناپا جاسکتا' ان کے تخیل کی انہی وسعتوں میں اڑنے کی بہتوں نے کوشش کی لیکن بہت جلد کانپتے اتر آئے اور خود ابن صفی کی نقالی میں ان کے کرداروں کی مٹی پلید کرتے رہے۔ خود سے ایک نیا رنگ نہ جما سکے۔ نیا رنگ تو کیا جماتے' ایڑی چوٹی کا زور لگانے پر بھی خود ابن صفی جیسا انداز نہ پیدا کر سکے۔

حیرت اس بات پر ہوتی ہے کہ اس قسم کی نقالی کرنے والے بھی بہت کچھ کما کھاتے ہیں۔ اسی ایک بات سے ابن صفی اور ان کے کرداروں کی مقبولیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ ابن صفی کو بلاشبہ بے مثال اور جینئس کہا جاسکتا ہے۔ ابن صفی کی موت کی وجہ سے خوب صورت نثر اور حسین و دلنواز اسلوب ڈھالنے والا قلم اب خاموش ہے' لیکن جو کردار انہوں نے اردو ادب کو دیے ہیں' انہیں کبھی موت نہیں آسکتی' وہ سب کے سب ان کی لازوال کہانیوں میں چلتے پھرتے لڑتے' بھڑتے' مہمیں سر کرتے اور اردو پڑھنے والوں کے لیے خون گرم رکھنے کا بہانہ بنتے نظر آتے ہیں۔ اپنے انہی کرداروں کے ذریعے گویا خود...... ابن صفی نے بھی تا قیامت زندہ رہنے کا اہتمام کر لیا ہے۔ ہم انہیں ہمیشہ یاد رکھیں گے ان کے پیدا کردہ ادب کی وقعت کا اندازہ آج نہیں تو کل بہت جلد اردو دنیا کو ہو جائے گا۔

ابنِ صفی اور پیش رس

اسماء خان

''مجھ سے اکثر فرمائش کی جاتی ہے کہ پیش رس میں کتابوں کے متعلق لکھنے کی بجائے پڑھنے والوں سے باتیں کیا کروں کیونکہ کتابیں تو بہر حال پڑھی ہی جاتی ہیں اور پڑھنے والا خود ہی کتابوں کے متعلق اچھی یا بری رائے قائم کر لیتا ہے۔''

جی ہاں ابن صفی کے پیش رس کے صفحات دراصل ان کی قارئین سے گفتگو کے لیے مخصوص تھے عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ جب بھی کوئی کتاب لکھی جاتی ہے مصنف اپنی کتاب کا خلاصہ یا اپنی رائے پیش رس میں بیان کر دیتا ہے۔ اس کے علاوہ بعض مصنف کسی دوسرے معروف ادیب سے اپنی کتاب کا پیش رس لکھوا لیتے ہیں۔ اس کے برعکس ابن صفی کے پیش رس قارئین سے ان کے تعلق کو ظاہر کرتے ہیں۔

ناولوں کی طرح ان کے پیش رس بھی اعلیٰ پائے کے مزاح کی جھلک ملتی ہے۔ ''علامہ دہشت ناک'' کے پیش رس میں لکھتے ہیں۔

''کوئی صاحب میری دیوار پر ''طلباء کسان اور مزدور'' کو متحد رہنے کی دعوت دیے گئے ہیں سمجھ میں نہیں آتا کہاں تلاش کروں، طلباء تو خیر بس اسٹاپوں پر ڈھیروں مل جاتے ہیں لیکن مزدور اپنے دھندوں سے لگے ہوئے ہیں۔ رہے کسان تو شہر میں ان سے ملاقات نہیں ہو سکتی۔ ایک دن ایک مزدور کے آگے ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا۔ بھائی متحد ہو جاؤ۔ بولے متحد کیا ہوتا ہے۔ میں نے کہا میل جول، حیرت سے فرمایا..... بائی ام نے کس کا گردن کاٹا ہے کہ میل جول کرے۔ طلباء سے کچھ کہنے کی ہمت نہیں پڑتی کہ تالیاں پیٹ دیں گے۔ بہر حال ایک ایک سے پوچھتا رہا ہوں۔ کہ ان کا اتحاد کس طرح کراؤں۔''

اپنے کرداروں کو اس طرح سے پیش کرنا کہ وہ قاری کے ذہن میں ایک جیتے جاگتے انسان کا تاثر چھوڑے اور پڑھنے والا اسے اپنے درمیان محسوس کرے کسی مصنف کی کامیابی کا ثبوت ہے۔ ابن صفی کے کردار ایسے ہی ہیں کہ پڑھنے والا انہیں اپنے درمیان محسوس کرتا ہے۔ بڑوں کے علاوہ بچے بھی ان کرداروں کے متعلق ان کے مخصوص حلیے کے متعلق باتیں کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ ''جنگل منگل'' کے پیش رس میں لکھتے ہیں۔ ''میری سنک اس طرح لکھنا ہے کہ کردار جیتے جاگتے محسوس ہوں اور پڑھنے والا ان سے اس درجہ قربت محسوس کرے کہ وہ زیادہ تر ان کی گفتگو کا موضوع بنے رہیں۔''

ایک جگہ لکھتے ہیں کہ

''میری کتابیں بعض حضرات کو اس لیے پسند نہیں آتیں کہ اکثر ان میں ''ڈھول دھپا'' نہیں ہوتا۔ میں اس کے بجائے دوسرے زاویوں سے کہانی کی دلچسپی برقرار رکھنے کی کوشش کرتا ہوں اور بحمد اللہ اس پر مطمئن ہوں

اگر آپ لوگ میری کسی کتاب پر تالیاں نہیں پیٹ سکے تو اس کو مکمل طور پر ''بورنگ'' قرار دینا بھی آپ کے بس سے باہر ہے۔ تقریباً ایک سو بائیس کتابیں لکھ چکا ہوں آپ ایسی دو کتابوں کے ہی نام بتا دیں جن کے پیش کرنے کے انداز میں آپ کو یکسانیت ملتی ہو۔''

ابن صفی کے اکثر ناولوں کی دوسرے ادیبوں نے نقل کی ہے ان کے کرداروں اور پلاٹوں پر لوگوں نے ان کے نام سے کتابیں لکھیں لیکن بہت کم ان لوگوں پر قانونی چارہ جوئی کی گئی۔ ''پاگل کتے'' کے پیش لفظ میں لکھا گیا!

''غیر قانونی طور پر چھاپنے والوں کے خلاف کارروائی تو یقیناً کرتا ہوں لیکن نیک نیت نقالوں سے مل کر بہت خوشی ہوتی ہے کیونکہ جانتا ہوں کہ ان میں سے اکثر آگے چل کر اپنے لئے نئی نئی راہیں نکالیں گے نقالی بری چیز نہیں ہے چراغ سے ہی چراغ جلتے ہیں۔ انکل یا ڈیڈی ہی کی نقل کرتے کرتے ایک دن خود بھی انکل یا ڈیڈی بن جاتے ہیں، اور دیکھنے والے کہتے ہیں کہ بیٹا باپ سے بھی اونچا نکلا یہ اسی وقت ممکن ہے جب نقالیاں کی نقل انہیں دوسری سمت لے جائیں اگر وہ زندگی بھر کسی نہ کسی کی نقل کرتے رہے تو ان کا اپنا کوئی مقام نہ ہوگا۔ ہر لکھنے والا نقالی کے دوور سے گزرتا ہے۔''

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ قارئین اپنے خطوط پر تبصرے کے شوق میں دلچسپ خط لکھتے ہیں جن کے ابن صفی اکثر جواب لکھتے ایک ایسے ہی خط کے جواب میں لکھتے ہیں۔

''ایک صاحب نے ''کالی کہکشاں'' پڑھ کر مشورہ دیا تھا کہ آموں کی آڑھت کرلوں، سوا دو روپے کی کتاب میں تو اتنے نخرے کرتے ہیں بارہ روپے سیر آم کیا خریدیں گے۔ مجھ سے آپ اور اگر کسی آم میں ریشہ نکل گیا تو گٹھلی لے کر دوڑیں آئیں گے! ویسے مصنف بن جانا سب سے زیادہ آسان کام ہے اس لیے مجھے آموں اور گٹھلیوں کے چکر میں نہ ڈالیں، آم فروشی کے لیے ٹھیلا لگانا پڑتا ہے، پھیری لگانی پڑتی ہے، کتاب لکھنے میں یہ بھی نہیں کرنا پڑتا۔ بس کاغذ اور قلم لے کر بیٹھ جائیں کاتب نے کتابت کی، مشینوں نے چھاپ دیا، دفتری خانے میں جلد بندی ہوئی اور وہیں سے کتب فروش اٹھا کر لے گئے بیٹھے بیٹھے تھکا تو لیٹ گیا ایسے نیند آ گئی تو دیکھا کہ مغز ناک کے راستے بہا جا رہا ہے اور پڑھنے والے کہہ رہے ہیں کہ کیسا گندا ہے کہ ناک بھی صاف نہیں کرتا بہر حال مجھے مصنف ہی رہنے دیں۔ آپ جیسے قدر دانوں نے منہ موڑا تو ردی فروشی کر کے پیٹ پال لوں گا۔ میں کسی ایک عدد ''ایم اے ایل ایل بی'' کے لیے نہیں لکھتا بلکہ مزدوروں سے لے کر پروفیسروں تک کے دل بہلانے پڑتے ہیں۔''

ابن صفی کے پیش رس میں ہمیں ان کی کتابوں کی طرح مزاح، سادگی، خوبصورتی ملتی ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ اپنے قاری کے سامنے موجود ہوں۔ آج بھی لوگ ان کی کتابوں کے ساتھ ساتھ پیش رس کو پڑھنا نہیں بھولتے کیونکہ اس کا اپنا ایک الگ انداز ہے۔ جو انہیں دوسرے ادیبوں سے الگ کرتا ہے۔

ابنِ صفی

افضال احمد

مرحوم ابن صفی غالباً برصغیر کے مقبول ترین ناول نگار تھے چونکہ ان کے ناول جاسوسی ہوا کرتے تھے اور جاسوسی تحریروں کو ابھی تک کہیں سنجیدہ ادب کا حصہ نہیں سمجھا جاتا۔ اس لیے ہم بھی مرحوم کی ادبی حیثیت پر محاکمہ نہیں کریں گے لیکن جیسا کہ کئی بار خود انہوں نے ہی خیال ظاہر کیا کہ یہ کیا کم ہے کہ لاکھوں پڑھنے والوں کو انہوں نے صحت مند تفریح مہیا کی اور ایک دو بار نہیں سالہا سال تک۔

ہم ان کی اس خودشناس رائے سے اتفاق کرتے ہیں کہ ان کی فراہم کردہ تفریح بشاشت آگیں اور غم سوز ہونے کے ساتھ ساتھ صحت مند بھی ہیں۔

ایک طرف تو یہ ملاحظہ فرمایئے کہ گو ان کے ناولوں میں خوب صورت عورتوں کی بھی کمی نہیں لیکن ناولوں کے جملہ ہیرو چاہے وہ فریدی ہوں، حمید کہ عمران جنسی بے راہ روی سے کوسوں دور ہیں۔ اب آپ تو جانتے ہی ہیں کہ ایک پڑھنے والا خصوصاً کچی عمر کا پڑھنے والا عموماً اپنے آپ کو ناول کے مرکزی کرداروں سے وابستہ کر لیتا ہے اور غیر شعوری طور پر ان کے روپ میں اپنے آپ کو دیکھنا چاہتا ہے۔ ان کے دکھ سکھ اس کے اپنے ہوتے ہیں۔ ان کے مسائل ان کی کامرانیاں بھی پھر اس کی اپنی ہی ہوتی ہیں۔ اس لیے یہاں سے وہاں تک پھیلی ہوئی فحش نگاری کے اس دور میں لوگوں کو چند نیکو کاروں سے وابستہ کر دینا ابن صفی کی وہ صحت مندانہ خدمت ہے، جس کی جزا ثواب آخرت بھی ہو سکتی ہے۔

فریدی تو خیر ایسا عجوبہ روزگار مرد ہے کہ بقول حمید اس کے مرد ہونے پر شبہ کرنے کو جی چاہتا ہے مگر اس کی کمی میاں حمید پوری کر دیتے ہیں۔ ہر جوان عورت ان کے لیے خوب صورت ہے، اور ہر خوبصورت عورت پر فوراً سے پیشتر عاشق ہو جانا اپنا پہلا اور اضافی فرض جانتے ہیں۔ یہ وہ کیفیت ہے جو عموماً ابن صفی کے لاکھوں نوجوان قارئین کی ہوتی ہے۔ مگر دوسری طرف یہ بھی ہے کہ دراصل حمید صاحب حیادار بھی ہیں ان کی ساری عشق عاشقی صرف زبانی جمع خرچ ہے۔ حد شرعی تو دور کی بات ہے یہ تو کبھی حد شرافت سے بھی تجاوز کرتے نظر نہیں آتے، اب جو کچھ مزاج ان کی رنگین مزاجی کے سبب ان کو اپنا آدرش بنائیں گے وہ پھر انہی کی طرح رند پاکباز بھی نظر آئیں گے۔

اب رہا عمران تو وہ کہہ سن کر عورتوں کے نام سے لرزہ براندام رہتا ہے۔ پھر یہ کسی طرح کا قطرہ حرام بھی حلق سے اتارنے کو تیار نہیں۔

عمران کے ساتھیوں میں بھی کوئی کج روی نظر نہیں آتی۔

اس سلسلے میں کسی کا یہ قول بھی یاد رکھیے کہ شرافت اس میں نہیں کہ آپ کو جنس مخالف کا خیال ہی نہ آئے، اس

طرح کے جنسی خیال کا نہ آنا تو کسی مرض کی دلیل ہے۔ شرافت اس میں ہے کہ اس نیک خیال کی آپ کسی کو ہوا بھی نہ لگنے دیں۔ اپنے آپ کو بھی نہیں۔

غالباً یہ اصول اسلام کے اس اصول سے وضع کیا گیا ہے کہ کراماً کاتبین آپ کے صرف برے اعمال کو آپ کے نامہ اعمال میں لکھتے ہیں۔ آپ کے برے خیالات کو نہیں اور نیک اعمال کی طرح نیک خیالات کا بھی ثواب ہے۔

غور کریں تو آپ کو ابن صفی کے تمام کرداروں میں ایک خاص بات اور نظر آئے گی اور وہ یہ کہ ان میں سے غالباً سب کے سب عام قامت انسانی سے ذرا بڑھ کر ہی ہیں۔ ذہین ہیں تو ایسے کہ روئے زمین پر ان کا جواب نہیں، ان میں سے ہر ایک اپنی جگہ ایک قیامت ہے۔ ایک فتنہ وہ عمران و حمید ہوں کہ فریدی لیونارڈ، سنگ ہی ہو کہ تھریسیا بمبل بی، یہ سب ذہانت میں عام انسانوں سے سوا ہیں۔

اور اب اگر نیک ہیں تو پھر یہ فریدی، حمید و عمران ہیں۔ برے ہیں تو وہ بھی نہایت بلند قامت ہیں، سنگ ہی اور تھریسیا بمبل بی اس شیطانی مخلوق کی علامتیں ہیں۔ یہ کھٹکتے ہیں، ہر چند گوبر میں لپٹے ہوئے ہیں لیکن نہایت سنہری پروں والے ہیں۔ ان دو اقسام کے دیو قامت لوگوں کے درمیان چراغ مصطفوی اور شرار بولہبی کی ازلی آویزش جاری رہتی ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابن صفی نے یہ نکتہ کلاسیکی تھیٹر سے لیا۔ یونانی کلاسیکی کھیلوں میں کردار اگر دیومالائی نہیں بھی ہوتے تو بھی دیوقامت ضرور رکھے جاتے تھے تاکہ ناظرین پر بھرپور تاثر چھوڑ سکیں۔ ان کے کارنامے بھی عظیم دکھائے جاتے تھے اور ان کے گناہ بھی عظیم ہوتے تھے۔ پھر اسی لیے ان کے عذاب بھی عظیم ہوا کرتے تھے۔

اس کے علاوہ قدیم سنسکرت ناٹک کا بھی ایک اٹل اصول تھا کہ ناٹک اور نائکہ کم سے کم عام انسانی قد سے ضرور طویل تر ہوں تاکہ ایک طرف تو وہ پنڈال میں پیچھے کھڑے ہوؤں کو بھی نظر آ سکیں اور پھر ان عظیم کرداروں کی بھرپور اور کھبتی ہوئی نمائندگی بھی کماحقہ کر سکیں۔

یہ کردار بلند آہنگ اور بلند آواز بھی ہوتے تھے۔

کچھ یہی خوبیاں ہم کو ابن صفی کے کرداروں میں نظر آتی ہیں۔ یہ کردار عام انسانوں سے ملتے جلتے ہونے کے باوجود انسانوں کے مقابلے زیادہ بلند و بالا اور بلند آہنگ ہیں۔

اصل میں ابن صفی، اپنے جی میں ایک خواب دیکھنے والے آدرش وادی تھے۔ اسی لیے ان کے کردار مثال کم اور مثالیے زیادہ تھے غالباً ان کرداروں میں خود ان کی ذاتی تمناؤں، غیر شعوری آراء کا بھی دخل ہے، ایک طرف ان کا بلانوش مگر عام طور سے بدماغ جوزف ہے یہ بھی ایک مثالیہ ہے۔ اگر ریاض خیرآبادی جو ایسے رند مست خرام تھے کہ نہ پئیں اور جھومتے جائیں تو جوزف وفا کا وہ پہاڑ ہے کہ پیے اور کبھی نہ جھومے۔

غالباً یہ کردار ابن صفی نے ہماری پرانی کہانیوں میں پلنے والے کسی انگوٹھی یا چراغ کے جن اور الف لیلوی بغداد کے کسی غلام کو ملا جلا کر بنالیا تھا۔ جوزف بھی سیاہ فام ہے اور جو عمران کا غلام بھی ہے۔ زرخرید نہیں تو قطعی

زرخریدوں جیسا وفادار مگر جناتی خاصیتوں والا اور کارگزار۔

ابنِ صفی پر ہمارے الف لیلوی ادب کی اور بھی گہری چھاپ ہے۔ عجیب طلسمات پیدا کرتے ہیں لیکن چونکہ یہ طلسمات بیسویں صدی کے ہیں تو ان پر سائنس فکشن ہونے کا دھوکا ہوتا ہے۔ ان کا زیرولینڈ والا مرغ اس کی ایک عمدہ مثال ہے۔

خود علی عمران کو لے لیجیے، حرکات وعادات، چالاکی اور استادی ہی میں نہیں، نام میں بھی داستانِ امیر حمزہ کے عمرو بن عیار کی یاد دلاتا ہے۔ ویسے بھی لوگ کہتے ہیں کہ آج کے ناول کا جاسوس دراصل عمرو عیار ہی کا جدید ایڈیشن ہے۔

عمرو عیار ہی کی طرح عمران بھی ہر لحہ جاگتی اور ہنستی ہوئی ذہانت کا مالک ہے اور اسی کی طرح اس کے پاس بھی سامان امدادی کی کوئی کمی نہیں بلکہ وہ عیار تو ایک زنبیل کا بھی محتاج تھا۔ یہاں یہ خیال عام ہے کہ عمران کی جیب سے بھی اس کے کام کی چیز نکل آتی ہے...... اور سامنے پڑا، پتھر بھی اس کا ایک جادو ہے۔ خود ابن صفی نے بعض ناولوں کے بعض کرداروں سے اس خیال کا اظہار کرایا ہے۔

ویسے ان کے کرداروں میں جو کردار سب سے کم اور زیادہ سے زیادہ روبوٹ ہے یعنی فریدی اس کا لباس ہی شاید عمرو عیار کی زنبیل ہے کہ جس میں سے وہ ناول کے آخر میں بغیر کسی جی لگتی تمہید کیے مجرم نکال کر میز پر رکھ دیتا ہے۔

ابن صفی کے تمام ناولوں میں چند باتیں بطور موج در موج روح رواں نظر آتی ہیں۔ ان میں سب سے پہلی تو ان کے ناولوں کے کرداروں کے رویے میں ملتی ہے، یعنی انسان کو کسی حال میں بھی شکست خوردہ نہیں ہونا چاہیے۔ محنت، ذہانت اور استقامت سے رہنا چاہیے۔ اللہ ضرور مدد کرے گا۔ ان کا یہ پیغام ان کے پڑھنے والوں، بالخصوص نوجوانوں میں ایک ضروری جواں ہمتی پیدا کرتا ہے، یہ بڑا احسان ہے۔

دوسری بات جو ابن صفی کے ہاں ہے وہ ہے جذبہ حب الوطنی وہ اپنے پڑھنے والوں کو نہ صرف وطن کے تحفظ کی ضرورت کا احساس دلاتے ہیں بلکہ اس سلسلے میں ان خطرات کی طرف بھی اشارہ کرتے ہیں جو ملک کو لاحق ہیں۔ یہ نہایت سرمایہ دار، بدعنوان بڑے بڑے بدنیت، اسمگلر اور بدارادہ غیر ملکی جاسوس، ان کے بعض جاسوسوں کے نام مثلاً رابرٹ وغیرہ سے ان کی سامراجی قومیت کا بھی پتا چلتا ہے۔ ان کے ناول پڑھ کر نہ صرف حب الوطنی میں اضافہ ہوتا ہے بلکہ سامراجی طاقتوں کی بھی نشاندہی ہو جاتی ہے اور اسطرح پڑھنے والے کا سیاسی اور بین الاقوامی شعور بڑھتا ہے۔

ان کے ایک حالیہ ناول میں عمران نے ایک بڑی طاقت سے ایٹمی ری ایکٹر کی مخالفت بند کرا دینے کی تمنا کی تھی، کم وبیش طاقت کے بل پر۔

ابن صفی اردو زبان میں بلکہ برصغیر کی کسی بھی زبان میں وہ پہلے مصنف یا ناول نگار ہیں جو عوامی سطح پر مقبول عام ہوئے۔ یہ بات صرف امریکا میں دیکھی گئی تھی یہ روایت انہیں کے دم سے ہمارے یہاں بھی قائم ہوئی۔

مگر سوال یہ ہے کہ آخر ابن صفی میں وہ کون سی بات تھی کہ وہ یک لخت اتنے مقبول ہو گئے۔

ان سے پہلے بھی جاسوسی ناول نگار تھے، ان کے بعد بھی آئے مگر ان کا سا استقبال کسی کا نہ ہوا۔

تو غالباً اس میں ان کی جاسوسی سے زیادہ ان کے طرزِ تحریر کا بڑا دخل تھا۔ چاشنی والی اور اچھی خاصی زبان مگر بے حد رواں اور عام فہم ہے پھر اس میں لفاظی اور حاشیہ آرائی کم، رفتارِ واقعات اور ارتقائے قصہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا، پھر کردار ایسے پیارے کہ جی چاہے کہ کاش ہم ہوں، جوان، سجیلے اور خوب صورت، پھر ہر قدم کامیاب۔

اس کے علاوہ ہم میں سے عام لوگوں نے کاہے کو اونچی قسم کے شبینہ طعام گاہیں دیکھی تھیں۔ چنانچہ جب ہم حمید یا عمران کے ساتھ کسی ٹپ ٹاپ نائٹ کلب یا کیفے میں خود بھی چلے جاتے ہیں تو ابن صفی کے بہت ممنون ہوتے ہیں۔

پھر ناموں کی ندرت بھی دیکھئے، ٹپ ٹاپ نائٹ کلب، آرلکچنو، شکرال، تارجام، ابن صفی کی بنائی دنیا ہماری دنیا سے اتنی ملتی جلتی ہے کہ مارے اجنبیت کے ہمارا دم نہیں گھٹتا ہے، مگر اتنی انوکھی بھی ہے کہ جب وہاں جا پہنچتے ہیں تو اپنے شہروں اور قصبے کی دھول، شور اور بھاگ دوڑ سے ایک پناہ میں پہنچ جاتے ہیں۔ جہاں ہر لمحے منظر بدلتا بھی رہتا ہے۔

ابن صفی کی آرزو نگاہی کی انتہا وہ زیرو لینڈ ہے جو امیر حمزہ کی داستان کے طلسمات سے کسی طور کم نہیں۔ وہی اس کی جادو منظری اور وہی اس کی نایابی، مگر ابن صفی یہ بھی جانتے تھے کہ یہ تمناؤں کا زیرو لینڈ بھی، اہل ہوس ہی کی تمنا ہے جس کے جلوے دکھا دکھا کر خلق خدا کو ورغلایا جا رہا ہے۔

(نیا رخ، اگست ۱۹۸۱ء)

امر فنکار

تنویر عادل

جو لوگ کسی کے محبوب ہوتے ہیں، وہ کبھی نہیں مر سکتے، وہ تو دلوں میں زندہ رہتے ہیں۔ محبت انہیں زندہ رکھتی ہے اس ساری زندگی میں انسان کسی کو بے طرح چاہتا ہے، کچھ تعلق کچھ ناتے ان کے بھی ہوتے ہیں۔ یہ کڑا سفر جو گرم دھوپ میں بے قرار ہے، محبت کی ٹھنڈک سے شانت بھی ہو جاتا ہے، کچھ لوگ اس دنیا میں چاہے جانے کے لیے ہی آتے ہیں۔ ایک جگ انہیں چاہتا ہے، سراہتا ہے، آبِ حیات نہ پی کر بھی امر ہو جانے والے یہ عظیم انسان ان گنت لازوال اور نادر شاہکاروں کے خالق حضرت اسرار ابن صفی ہیں۔

ایک جگ انہیں ابن صفی کے نام سے جانتا ہے، مانتا ہے، وہ ہزاروں نہیں لاکھوں، کروڑوں افراد کے پسندیدہ ادیب ہیں۔ ایک لافانی ادیب، مادہ پرست دنیا میں آنے والا سچا شخص جو کھرا ہے، کھری بات کہتا ہے، عظیم تر ابن صفی کے قلم کا ایک ایک حرف انسان کی عظمت کا ثبوت ہے۔ ابن صفی ایک حساس قلمکار جنہوں نے ہمیشہ اپنے اردگرد کی باتیں کیں...... زمین کی کوکھ سے شاہکار تراشے، انہیں آسمان کے تارے توڑ کر لانا کبھی گوارا نہ ہوا، آسمان ادب پر ان کا مقام روشن، روشن آفتاب ہے، ان کا نام اردو ادب میں "محسن اردو" کی حیثیت سے ہمیشہ جگمگاتا رہے گا۔ ان کی ہر تحریر ایک روشن تصویر ہے۔ ایک منور تحریر ہے۔ عظیم تر ابن صفی ادب کے ستونوں میں آئے تو وہ اسرار و سرور کے ایسے گلستان بسا گئے جس کے ہر پھول کی خوشبو نرالی، مدھر، انوکھی، من موہنی، اور مسحور کن ہے۔ یہ انمول خوشبو کہیں اور نہیں ملتی۔ ایک ایسی دنیا جہاں ہر قسم کی دلچسپی طبع کا سامان ہے، یہاں بھانت بھانت کے کردار و استعارے ملتے ہیں جو ہمیں اپنی دنیا کے معلوم ہوتے ہیں، یہاں پتھر کی طرح سخت فریدی بھی ہے جس سے ایک معصوم بچے کی موت برداشت نہیں ہوتی لیکن وطن کے غداروں، مجرموں کی گردنیں توڑنے سے سرور حاصل ہوتا ہے، یہاں عمران کی فتنہ پردازیاں ہیں، حمید کی شوخیاں ہیں، قاسم کی جولانیاں ہیں، سلیمان کی لن ترانیاں ہیں، ایکس ٹو کی پرکشش، مبہم اور پراسرار شخصیت ہے۔ غرض ہمہ پہلو احساسات اور تخیلات کی پرچھائیاں جو ہمیں اپنے ساتھ کھینچ لیتی ہیں۔

عظیم تر ابن صفی کی عظمت سے انکار کرنا حقیقت سے منہ چرانا ہے۔ یہ کام ہم معمولی کیڑوں مکوڑوں کے لیے چھوڑ دیتے ہیں کیونکہ ہمارے ادبی ناقدین جن کے سر تکبر سے تنے ہوئے ہوتے ہیں اور جن کے پاس جھوٹی شان کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ ہم تو یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ ادب ہے کیا، ادب کہتے کس کو ہیں، ایسی کون سی کسوٹی ہے جس پر وہ ادب اور ادیب کی عظمت اور قدر و منزلت پرکھتے ہیں۔ ادب کیا ہے، ادیب کسے کہتے ہیں؟ یہ بڑا ٹیڑھا سوال ہے۔ میں کوئی کم ظرف نقاد تو ہوں نہیں کہ چند اونچی باتوں (اونچی باتیں شاید انہیں کہتے ہیں جو انسانی ذہن سے اوپر کی ہوتی ہیں) کو تسلیم کر کے سر دھنوں، اردو زبان کی ابتدا سے اب تک بڑے

بڑے جغادری ادیب ہوئے جنہوں نے ادب سے کشتی لڑی اور پٹھے پر ہاتھ ہی نہیں رکھنے دیتے تھے۔ یہ وہ ادیب ہیں جو ہمہ وقت کان پر پنسل رکھے اپنے جغادری ہونے کی تشہیر کیا کرتے لیکن ان کی تشہیر بھی پڑھنے والوں میں ان کے ہمنوا نہ پیدا کر سکی۔

اگر ادب کا اچھا ہونا اس کی اشاعت سے طے ہو سکتا ہے تو اس پورے پاک و ہند میں وہ کون ہے جس کی کتابوں کی اشاعت عظیم تر ابن صفی سے زیادہ ہے۔ ابن صفی کی ہر کتاب لاکھوں کی تعداد میں ہند و پاکستان میں چھپتی تھی اور پھر جلد ہی دوسرا ایڈیشن نکالنا پڑتا تھا۔

اگر فن کار کی عظمت پڑھنے والوں کے گرویدہ پن میں پوشیدہ ہے تو ابن صفی سے زیادہ کس نے پڑھنے والوں کو بے تحاشا متاثر کیا ہے۔ آخر اس کتاب کا نام کیا ہے جو بار بار پڑھی جا سکے اور بار بار پڑھ کر بھی قاری کو نیا لطف آئے۔ آپ ابن صفی کی کوئی بھی کتاب جتنی بار بھی پڑھیں گے ایک نیا تاثر لیے اٹھیں گے۔ پڑھنے والے بار بار انہیں پڑھتے' اتنی بار کہ بعض تحریریں بعض جملے انہیں از بر ہو جاتے۔ جن کا تذکرہ وہ ابن صفی صاحب سے خط کے ذریعے کرتے اور اس عظیم انسان کو کتابیں کھنگالنی پڑتیں کہ فلاں بات انہوں نے کہاں لکھی تھی۔

ابن صفی کی جگہ اردو زبان کی کلاسکس میں آتی ہے...... داستان امیر حمزہ اور طلسم ہوشربا کے بعد تیسری لازوال شے ابن صفی کے ناول ہیں جنہوں نے اپنی زندگی ہی میں تین نسلوں کو متاثر کیا۔ زبان و بیان کی شیرینی اور احساسات کا گھیراؤ ایک ایسا طلسم پیدا کرتا ہے جو ہمیں جکڑے رکھتا ہے اور انسانی ذہن اس طلسم سے نکل نہیں پاتا۔ اگر بڑا ادیب وہ ہے جس نے لکھنے کے ساتھ ساتھ زبان کو سنوارنے کا کام بھی کیا' زبان کو فروغ دیا تو بتایئے ابن صفی کے علاوہ' وہ کون سا نام ہے' اگر ادیب کے فن کی شناخت اس کے پڑھنے والے ہیں تو بتایئے للہ جواب دیجیے کہ ساری دنیا میں وہ کون سا ادیب ہے جس کی کتابوں میں قارئین زبان سیکھنے پر مجبور ہوئے۔

ابن صفی نے اپنی تحریروں کے ذریعے بداخلاقیوں کو ختم کیا اور اخلاقیات کی تدریس کی انہوں نے حوا کی بیٹی کو عریاں کرنے کی بجائے احترام اور تقدیس کی چادر میں اس کے سراپا کو لپیٹا' حالانکہ ان کے کئی ناول جنسی مریضوں کے متعلق ہیں لیکن انہوں نے کہیں بھی فحش منظر کشی کر کے قاری کے ذہن کو پراگندہ نہ کیا۔ یعنی جب دوسرے فحاشی اور تلذذ کی بھرمار کر کے قاری کے ذہن میں سانپ کے بل بنا رہے تھے۔ اس وقت ابن صفی ان ذہنوں کو نئی راہیں بتا رہے تھے۔ وہ بے راہ روی سے دور کر رہے تھے۔ جنسی ہیجان کو فنا کرنے کی کوششوں میں تھے' دین کا احترام سکھا رہے تھے جبکہ دوسروں نے دین کو بھی ثانوی حیثیت دے رکھی تھی۔ ابن صفی کے تمام ناول مذہب کے احترام سے مالا مال ہیں۔ اس ادیب کا کیا نام ہے جس نے اخلاقی اور مذہبی اقدار کو فروغ دیا' جس نے انسانیت کو دنیا کے تمام رشتوں سے بالاتر جانا۔ وہ کون سا ادیب ہے جو ہر مکتب فکر سے تعلق رکھنے والوں کے لیے قابل قبول ہے جسے ہر عمر اور شعور والا پڑھتا ہے...... ابن صفی صاحب نے

ہمیشہ اسلام کی بات کی وہ اسلام کے سچے نام لیوا تھے۔ اسلام کی عظیم اخلاقی تعلیم کے پیروکار تھے۔ انہوں نے ملکی خرابیوں' سماجی واخلاقی اور معاشرتی برائیوں کے خلاف ہمیشہ جہاد کیا۔ ان کا ہر ناول اخلاقیات کے درس دیتا ہے' انہوں نے کبھی...... بے راہ روؤں کی حوصلہ افزائی نہیں کی' پھر دشمنوں کا شہر تو مکمل طور پر اخلاقی ناول ہے۔ ان کا کردار نادر جذباتی ونفسیاتی کشمکش کی اعلیٰ مثال' اس ناول میں ہمیں یہ تاثر ملتا ہے کہ سیرت النبی کتنی پراثر اور تیز اثر ہے۔ نادر لمحے کے ہزارویں حصے میں تائب ہو گیا' برائیوں سے' یہ اس بات کی دلیل ہے کہ انسان میں متاثر ہو جانے کی صلاحیت ہے اور ہر شخص پر ایک وقت یہ لمحہ بھی آتا ہے۔ نادر جیسا ننگ انسانیت جو قتل کو بچوں کا کھیل سمجھتا تھا ایک واعظ کے منہ سے یہ پیارے اور عظمت آفرین الفاظ سن کر مسحور ہوتا چلا گیا۔

''اور جب وہ فاتح کی حیثیت سے مکے میں داخل ہوئے تو انہوں نے ان لوگوں سے انتقام نہیں لیا' جوان پر اوجھڑیاں پھینکتے تھے۔ ان کی راہ میں کانٹے بچھاتے تھے' ان پر پتھر پھینکتے تھے۔ ان تمام لوگوں کے لیے کھلی ہوئی معافی تھی' جنہوں نے انہیں ہجرت پر مجبور کیا تھا۔''

پھر اس نے سنا کہ رسول کریمؐ نے اس عورت سے بھی انتقام نہیں لیا تھا جس نے ان کے چچا کا جگر تک چباڈالا تھا اور اس نے سنا کہ طائف والوں نے پتھر مار مار کر رسول کریم کا سارا جسم لہولہان کر دیا تھا لیکن اس حال میں بھی دنیا کے سب سے بڑے انسان نے ان کی بہتری کے لیے ہی دعائیں مانگی تھیں۔ نادر کی زندگی میں انقلاب کا بانی ایک پیشہ ور واعظ بن گیا۔ وہ واعظ آئے دن گراموفون کے ریکارڈ کی طرح اپنی تقریریں دہراتا تھا' تاہم یہ تو وہ حالات تھے جو اس نے سنے' دنیا کے سب سے بڑے عظیم ترین انسان کے حالات زندگی کے چند واقعات' اس سے ابن صفی کے قلم کی عظمت پر یقین مستحکم سے مستحکم تر ہوتا چلا جاتا ہے۔

اور پھر وہ وقت جب قیام پاکستان کے ہنگامے...... عروج پر تھے مسلمانان ہندو پاک جذباتی دور کشمکش سے گزر رہے تھے اردو کا قلع قمع کیا جا رہا تھا۔ ہند میں اردو کو مسلمانوں کی زبان کہہ کر ٹھکرایا جا رہا تھا۔ اردو کی کوکھ سے فحش اور جنسی کہانیاں جنم لے رہی تھیں۔ ترقی پسندی کی آڑ لیتے ہوئے قوم کو بازار حسن اور شراب خانوں میں گھسیٹا جا رہا تھا۔ حالانکہ عورت کو ننگا کر دینا گھٹیا پن تو ہو سکتا ہے ترقی نہیں' یہ ابن صفی تھے جنہوں نے آزادی کے بعد پیدا ہو جانے والے کرب' مایوسی' محرومی اور خوف سے ہر نسل کو ذہنی آلودگیوں سے بچایا۔ بازار حسن اور شراب خانوں سے باز رکھا۔ ان کی کتابیں مایوس دلوں میں حوصلوں کے گلاب کھلا رہی تھیں۔ تنہائی کے ساتھی مونس اور غمگسار ابن صفی ہی تھے ورنہ اس خون آلود فضا نے تو سب کو سہمایا ہوا تھا۔

اگر سچا ادب وہ ہے جو ہمیشہ زندہ رہے تو بتایئے وہ کون سا ادیب ہے جو ہر دور میں قابل قبول رہا' جسے ہر عمر' ہر شعور کے افراد نے پسند کیا۔ سدا زندہ رہ جانے والا ادب ابن صفی کی تحریریں ہیں اور ابن صفی ہمیشہ زندہ رہ جانے والے ادیب! معمولی کیڑوں مکوڑوں کے بیچ زندہ رہنا اور ہے اور کروڑوں عوام کی دھڑکنوں میں زندہ رہنا اور چند ادبی ٹھیکیداروں کی رائے اور ہے اور کروڑوں عام پڑھنے والوں کی اور......

ابن صفی کے ناول یقیناً وقت گزاری کے لیے ہی شروع کیے جاتے ہیں اور ان کا مشن جیسا کہ انہوں نے

خود فرمایا تھا۔

''میرا مشن ہے آدمی قانون کا احترام کرے۔'' لیکن ان کا دوسرا مقصد تفریح ہے ایک شخص شام کو تھکا ہارا دن بھر کی کدورتوں، مشکلوں اور مسئلوں سے الجھتا ہوا گھر کو آئے تو اسے تفریح کی ضرورت ہوتی ہے وہ چاہتا ہے کوئی اسے ذہنی سکون فراہم کرے، دماغ کی پریشانیاں بھلادے۔ دنیا کی مشکلات سے اسے دور لے جائے۔

ہم ابن صفی کے ناول تفریح کے لیے ہی پڑھتے ہیں لیکن ان کتابوں میں زندگی کے حقیقی اور مختلف پہلو سامنے آتے ہیں۔ ملکی، قومی معاملات انہوں نے ہمارے سامنے اس طرح رکھے ہیں کہ جو ہم کو سوچنے پر مجبور کرتے ہیں، ان کے ناول انسانی رشتوں کے روابط کی منظر کشی کرتے ہیں تو کہیں ناتے ٹوٹتے دکھائی دیتے ہیں۔ انسانی زندگی کی تمام الجھنیں اور مسائل انہوں نے عیاں کیے ہیں۔ محبتیں، نفرتیں، دوستی، دشمنی، لڑائی جھگڑے، میل جول، یہ سب بے تحاشا ملیں گے، ان کے ناول میں۔ کوئی فرد ایسا ہے جو باعث تقلید ہے تو ان کے برے کرداروں سے حقیقی نفرت محسوس ہوتی ہے۔ یہ ان کی عظمت کا ثبوت ہے، ان میں بڑی طاقتوں کی ریشہ دوانیاں بھی ہیں اور ان کے کرتوت بھی جو آج ہمارے سامنے ہے۔ ہر سچا ادیب آنے والے وقت کا...... پیش گو ہوتا ہے، وہ ہمیشہ سچائی، انسانیت، آدمیت اور محبتوں کا احترام کرتا ہے۔ انہوں نے وطن سے محبت کا درس دیا۔ ان کے ناولوں سے ہمیں تقویت پہنچتی ہے کہ حب الوطنی اور جذبہ ایمانی پیدا ہوتا ہے، آج وطن عزیز کو جو حالات درپیش ہیں، وہ سب کے سامنے ہیں۔ تقاضا تو ان حالات کے پیش نظر یہ ہے کہ ہم آپس کی نفرتوں سے بالاتر ہو کر صرف اور صرف وطن کا سوچیں لیکن اب تو ہر کوئی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بنائے بیٹھا ہے، رنگ ونسل اور زبان وذات کی بات تو سب کرتے ہیں، انسانیت واسلام کو بھلا بیٹھے ہیں اور اپنے برے حال پر نادم بھی نہیں ہیں۔ ابن صفی صاحب ہمیشہ ہر قسم کے متعصبانہ خیالات سے نفرت کرتے رہے۔ انہوں نے ایک جگہ تحریر فرمایا ہے۔

''اسی کہانی میں آپ کو ایسے مجرم بھی ملیں گے جو اپنے جرائم کو جرائم نہیں کہتے، ملک وقوم کی شہ رگ پر نشتر زنی بھی کرتے ہیں اور نیک نام بھی بنے رہتے ہیں، بڑے آدمی کہلاتے ہیں۔''

پھر ایک دوسری جگہ رقمطراز ہیں۔

''آپ اچھے ہوں یا برے، جس گھر میں آپ بیٹھے ہیں، اس کے درودیوار کی حفاظت آپ پر واجب ولازم ہے جس طرح بھی ممکن ہو اس کی حفاظت کیجیے، آنکھیں کھلی رکھیے کہ کہیں آپ نادانستگی ہی میں تو اس گھر کی تباہی کا باعث نہیں بن رہے، صوبائی عصبیت، فرقہ وارانہ منافرت اور دشمنوں کے فراڈ سے بچنے کا سلیقہ تو آپ میں ہونا ہی چاہیے۔ وطن عزیز کے مشرقی حصے میں ابھی جو کچھ ہو چکا ہے اس کا اعادہ اور کہیں نہ ہونے پائے۔ یقین کیجیے اگر ہم چوکس رہیں تو بیرونی دشمنوں کے سارے حربے کند ہو کر رہ جائیں گے۔'' (بزدل سورما)

یہ وہ بدترین دور تھا جب پاکستان کا آدھا حصہ کاٹ ڈالا گیا تھا اور یقین کرنے کو جی نہیں چاہتا کہ یہ ہمارے اپنے ہی تھے جنہوں نے اقتدار کی خاطر ملک بیچ دیا تھا ''پہاڑوں کے پیچھے'' پیشرس میں وہ یوں مخاطب ہوتے ہیں۔

"یہ بھی درست ہے کہ حالات ہی سے مجبور ہو کر آدمی ایسے قدم اٹھاتا ہے لیکن یہ بھی میرے مشاہدے میں نہیں آیا کہ کسی نے اپنے اس پیر کو کاٹ کر پھینک دیا ہو جس کی وجہ سے ٹھوکر کھائی ہو......"

ایسی تمام تحریروں میں انہوں نے وطن سے محبت کا درس دیا ہے' انہوں نے بڑی طاقتوں کی سازشیں بھی عیاں کیں کہ کہیں کوئی بڑی طاقت اپنے بڑے پن کو منوانے کے لیے چھوٹے ملکوں کو آپس میں لڑواتی ہے تا کہ اپنا حلقہ اثر بڑھایا جاسکے اور ہتھیار بھی فروخت کیے جاسکیں۔ پوری دنیا کو جہنم بنایا جاسکے...... یہ بغاوتیں کرواتے ہیں۔ بغاوت کرنے والوں کو امداد دیتے نظر آتے ہیں' کہیں مہلک وبائیں پھیلائی جاتی ہیں تا کہ یہ دوائیں سپلائی کر کے ہمدردیاں حاصل کریں اور چوہدری بن بیٹھیں۔ ابن صفی نے اپنے ناولوں میں اسی قسم کے مسائل بتائے ہیں جو ہمارے شعور کو بیدار کرتے ہیں پھر انہوں نے اندرونی خلفشار کا بھی تذکرہ کیا کہ جو کچھ مشرقی پاکستان میں ہوا وہ اب نہ ہو۔ آج کے حالاتِ سندھ کیا بالکل مشرقی پاکستان جیسے نہیں ہو رہے' انہوں نے ہر قسم کی عصبیت سے دوری کا درس دیا ہے۔

"ہلاکو اینڈ کو" کے پیشرس میں وہ یوں نصیحت کرتے ہیں۔

"ہر وقت چوکنے رہیے کہ کہیں آپ خود ہی غیر شعوری طور پر دشمن کے آلہ کار تو نہیں بن رہے' کسی افواہ کو دوسروں تک پہنچانے والا نادانستگی میں دشمن کی مدد کرتا ہے۔ اس وقت قومی یک جہتی کی حفاظت کرنا ہی ملک وقوم کی سب سے بڑی خدمت ہوگی۔ ایسی افواہوں کو اپنی ذات سے آگے نہ بڑھنے دیجیے جس سے صوبائی تعصب یا فرقہ واریت کا زہر پھیلنے کا خدشہ ہو۔"

کیسے نادان ہیں وہ لوگ جو کہتے ہیں کہ جاسوسی ناول جرائم کے پھیلانے کا سبب ہوتے ہیں۔ حالانکہ ان کا موضوع تو جرم اور سزا ہے۔ کیا جرم وسزا زندگی کی تلخ حقیقت نہیں' کیا جرائم زمین کی چیزیں نہیں' ہمارا معاشرہ اور جرائم پیشہ افراد سے کب خالی رہا ہے' محلے کا ایک معمولی غنڈہ اور اقتدار کا بھوکا بہت بڑا اور بھیانک غنڈہ! ابن صفی نے تو ہمیں زندگی کے ٹھوس حقائق سے آگاہ کرنے کے لیے جرم وسزا کو علامت بنا کر پیش کیا۔ یہ تو پیالہ ہے جس میں انہوں نے ہمارے لیے آبِ حیات انڈیلا۔ رہی یہ بات کہ جاسوسی ناول جرائم کے فروغ کا ذریعہ ہیں اس کے لیے مہلک شناسائی کا پیشرس دیکھیے۔

"آج میں خدا کو حاضر وناظر جان کر آپ کو یہ اطلاع دے رہا ہوں کہ میں نے ہابیل قابیل والی ٹریجڈی سے پہلے کوئی جاسوسی ناول نہیں لکھا تھا لیکن کوا بیچارہ آج تک پشیمان ہے کہ اس نے حضرت آدم کو مٹی کھود کر دفن کر دینے کا فن کیوں سکھایا۔ کوے کا خیال ہے کہ اس کی اس غلطی کی بنا پر آج اولاد آدم آدمی ہی کو زندہ دفن کر دینے کے فن میں طاق ہوگئی ہے۔"

اوپر کی عبارت کا مفہوم مع سیاق وسباق سلیس اردو میں لکھیے اور اردو ادب کے ان چوہدریوں کو روانہ کر دیجیے جو یہ فرماتے ہیں کہ جرائم کی تعداد میں اضافہ ہونے کا سبب جاسوسی لٹریچر ہے۔ یقین کیجیے کہ وہ آپ کو لکھ بھیجیں کہ ہابیل اور قابیل والی ٹریجڈی غلط فہمی کی بنا پر ہوئی تھی۔ وہ دونوں سمجھتے تھے کہ اب کوئی

''سری عورت پیدا نہ ہوگی لیکن وہ کبھی یہ تسلیم نہیں کریں گے...... کہ سارے جرائم کسی نہ کسی غلط فہمی کی کوکھ سے
جنم لیتے ہیں۔

ابن صفی کوئی مبلغ یا سیاسی رہنما نہیں تھے لیکن ان کا مہان قلم اپنے ناولوں کے ذریعے ہمیشہ انسانی اقدار کی
عظمت' آدمیت کا احترام سکھاتا رہا۔ اعلیٰ قدروں کی بقاء کے لیے جدوجہد کرتا رہا ہے۔ بڑی طاقتوں کے
فاشزم' سیکولرازم یا سازشی ہتھکنڈوں کا تذکرہ یوں کرتے ہیں۔

''یہ فرنگی بھی عجیب ہوتے ہیں۔ ان کی ایک ٹولی زخم لگاتی ہے اور دوسری ٹولی زخموں پر مرہم رکھتی ہے۔ ان
کا نشان ایک دوسرے کو کاٹتی ہوئی دو سرخ لکیریں ہیں۔''

بڑی طاقتوں کی سازشیں بتاتے ہوئے وہ للکارتے ہیں۔ حکومتوں سے سرزد ہونے والے جرائم حکمت
عملی کہلاتے ہیں۔'' جنگ کے مہلک پہلوؤں کا تذکرہ انہوں نے یوں مسحور کن انداز میں کیا ہے۔''اگر میں
اس سڑک پر ناچنا شروع کردوں تو تم مجھے دیوانہ کہو گے جب کہ لاشوں پر ناچنے والے سورما کہلاتے
ہیں۔ انہیں اعزاز ملتے ہیں' ان کی چھاتیاں تمغوں سے سجائی جاتی ہیں۔''

سائنس کا جاہلانہ استعمال' ہمیں موت کے دہانے تک لے آیا ہے۔ اس پر ابن صفی یوں گویا ہوتے
ہیں۔''جب کوئی شخص پاگل ہو جاتا ہے تو اسے پاگل خانے میں کیوں بند کر دیتے ہیں اور جب کوئی قوم پاگل
ہو جاتی ہے تو ''طاقت ور'' کیوں کہلانے لگتی ہے۔''

عظیم تر ابن صفی نے طنز و مزاح کے میدان میں بھی گلاب کھلائے ہیں۔ جاسوسی ناول میں مزاح کی
شیرینی ان کی انفرادی خصوصیت ہے' ان کے لازوال کردار عمران' حمید' قاسم اور سلیمان مزاح اور طنز کی علامت
ہیں۔ قاسم جو عقل سے پیدل ہے' بے جوڑ شادی کا نادر نفسیاتی نمونہ جس کی بیوی بقول قاسم انگلی کے پور جتنی
ہے اور وہ خود ہاتھی۔ حمید اور قاسم کی شرارتیں' جھگڑے ناول میں مزاح کی چاشنی بکھیرتے ہیں۔ حمید' جس کی
ابتدا لڑکی انتہا لڑکی ہے۔ ہر مرتبہ ایک نیا معاشقہ یادوں کی بارات لیے آتا ہے۔ ہر لڑکی اسے حسین محسوس
ہوتی ہے۔ بقول حمید زندگی چاندی عورت کے سوا کچھ بھی نہیں۔'' یہاں عورتوں سے کوسوں دور بھاگنے والا علی
عمران بھی ہے۔ فن مزاح کا روشن ستارہ جس کی چمک سارے آسمان پر ہے۔ عمران جو کہتا ہے۔'' آدمی سنجیدہ
ہو کر کیا کرے جبکہ وہ جانتا ہے اسے ایک دن سنجیدگی سمیت دفن ہو جانا ہے۔

حماقت کا رواج اس کا مشن ہے لیکن جب وہ سنجیدہ ہوتا ہے تو اس کے ساتھی خوف سے دہل جاتے ہیں۔
عمران کا دوسرا روپ ایکس ٹو' ایک نادیدہ ہستی جس سے تمام ماتحت کانپتے ہیں جبکہ عمران کو چٹکیوں میں
اڑا دینے کی کوشش ہوتی ہے۔ یہ بھی شاید انسانی نفسیات ہے۔

ان کے یہاں طنز بہت کڑوا اور لطیف ملتا ہے۔ ان کا قلم ہر میدان میں بہت آگے ہے' ان کے طنز کی مثال
کہیں نہیں ملتی۔ ''شعلوں کا ناچ'' میں ایک مقام پر یوں گویا ہوئے ہیں۔

''تم خود سوچو' کیا اس کے بعد گوبر شاہی ''طاقت'' سے ٹکرا سکے گی...... اوہو...... تم گوبر شاہی پر ابھی تک

فس رہی ہو‘ میں جمہوریت کو گوبر شاہی کہتا ہوں کیونکہ تیور اس کے بھی شاہانہ ہوتے ہیں لیکن چونکہ حکومت کرنے والے باآسانی بیچے اور خریدے جاسکتے ہیں۔ اس لیے انہیں گوبر شاہی سے تشبیہہ دینا زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔“

بتایئے کہ یہ آج کی بات نہیں لگتی کیا ابن صفی نے آج کے حالات کی عکاسی نہیں کی؟ آج جو کچھ اپنے وطن عزیز میں ہورہا ہے۔ وہ یہ سب کچھ نہیں تو اور کیا ہے اقتدار کی کشتی ہورہی ہے‘ نیلام لگا ہے‘ گدھوں کی خرید وفروخت جاری ہے جس کے پاس مال زیادہ ہو وہ آئے اور ملک پر جس کا کوئی وارث نہیں قبضہ کرلے۔

ابن صفی کی تحریریں ان کی باتیں دلوں پر اثر کرتی ہیں۔ ان کی شاعری بھی بہت خوب ہے۔ تخیلات کا حسن‘ قلم کی پختگی...... خیال کی گرفت اور نادر الوجود تشبیہات ان کی شاعری کی جان ہیں۔ خیالات میں ندرت ہے‘ نزاکت ہے اور خیال کا حسن‘ خیال کا جمال شعری قالب میں نزاکت سے لطافت سے ڈھالنا فن کی معراج ہے۔

خیال تو شیشہ ہے ٹھیس لگی ٹوٹا۔ اس انتہائی نایاب شے کو حفاظت سے لفظوں میں لانا ابن صفی کی فن کاری ہے۔

ابن صفی نے آج کی باتیں بہت پہلے کہہ دیں۔ ابن صفی کا قلم اب خاموش ہو چکا ہے۔ یہ درست ہے کہ ہر انسان اس جہان فانی میں ایک مرتبہ آتا ہے‘ جو ویرانی ان کے جانے سے ہوئی ہے‘ وقت کی تند ہوا بھی اسے ہم سے دور نہیں لے جاسکتی۔ یہ خلاء کبھی پر نہیں ہوسکتا۔ تاہم زندگی کا قافلہ کبھی کہیں ٹھہر ا ہے اور نہ ٹھہرے گا۔ اس کارواں میں جو لوگ شریک ہوتے جاتے ہیں‘ وہ پچھلوں کی روایت آگے بڑھانے کی سعی کرتے ہیں۔ ابن صفی جاچکے ہیں لیکن اپنے پیچھے ایک منزل کے نشان چھوڑ گئے ہیں۔ اپنا فرض پورا کر گئے ہیں۔ ان کے کردار معاشرے میں پھیلے ہوئے ہیں...... جو برے بھی ہیں اچھے بھی۔ اب یہ فرض ان قلم کاروں کا ہے جو ابن صفی کی روایت کو آگے بڑھانا چاہتے ہیں‘ انہیں ابن صفی سے لکھنے کے ساتھ ساتھ یہ بھی سیکھنا چاہیے کہ انہوں نے یہ سب کس طرح لکھا؟ ابن صفی کی طرح سماج کے رشتوں اور ان کی پیچیدگیوں کو سمجھنا چاہیے۔

کشفی نامہ

ڈاکٹر سید ابوالخیر کشفی

بہت دنوں کی بات ہے، میری طالب علمی کے زمانے کی بات، میرے پاس ایک کتاب تھی، انگریزی میں نام تھا "ہندوستان کی عورتیں" باتصویر کتاب تھی۔ بعض قبائل کی خواتین بڑی حد تک بے لباس، ایک صوفی صاحب آئے، کتاب کھولی، ایسی ہی ایک تصویر سامنے آ گئی۔ قیس کی طرح لیلیٰ بھی تصویر کے پردے میں عریاں، اب صوفی صاحب کی نظر تصویر سے ہٹتی نہیں اور ہونٹوں پر مستقل "استغفر اللہ کا ورد"

بارہا مجھے خیال آیا کہ ابن صفی مرحوم کے ساتھ ہمارے ادبی پنڈتوں اور نقادوں کا یہی رویہ رہا ہے۔ ابن صفی کا نام کسی ادبی محفل میں آیا، ناک بھوں چڑھائی اور وہی "استغفر اللہ" میں نے کبھی ابن صفی کی کوئی کتاب دوسروں سے چھپا کر نہیں پڑھی، بلکہ کئی آدمیوں کو ابن صفی مرحوم کے مطالعے کی راہ پر لگا دیا۔ محمد حسن عسکری جیسا نقاد ہر ماہ ابن صفی کو پڑھتا تھا۔ اگر وقت پر کتاب نہ آتی تو وہ مجھ سے پوچھتے۔ "بھئی! آپ کے ابن صفی کہاں ہیں اس بار؟" یہی معاملہ سرشار صدیقی صاحب کے ساتھ ہوا۔ عسکری صاحب کو گلہ تھا کہ نثر نگاری کا فن ختم ہو رہا ہے۔ انہیں ابن صفی کے ہاں نثر نگاری کا ہنر نظر آیا۔ اگر صرف سری ادب کے شائق ہوتے تو اکرم الہ آبادی کو بھی پڑھتے۔

ابن صفی میگزین کے لیے ہر ماہ ایک صفحہ لکھنے کی ذمہ داری میں نے ان کے ایک احسان کے قرض کو ادا کرنے کے لیے قبول کی ہے۔ یہ قصہ میں اس سے پہلے لکھ چکا ہوں، کہ اپنی طالب علمی کے آخری عہد میں ان کے ناولوں کے مطالعہ سے میں اپنی بیماری اور تکلیف کو کس طرح بھول گیا۔

جی چاہتا ہے کہ تنقید اور نقادوں کے بارے میں دو ایک مزے کی باتیں آپ سے کرلوں۔ مغربی ممالک میں اہلِ کمال کے مجسمے سڑکوں، چوراہوں، بڑی عوامی عمارتوں میں نصب کیے جاتے ہیں۔ فوجی جرنیلوں، سیاست دانوں، سماجی کارکنوں، موسیقاروں، اداکاروں، ادیبوں اور شاعروں کے مجسمے مگر شاید ہی کسی نقاد کا کوئی مجسمہ کہیں نصب کیا گیا ہو۔ فن لینڈ کے ایک موسیقار جین سپیلکس کا قول ہے "نقادوں کو کوئی اہمیت نہ دو۔ آج تک کسی نقاد کا کوئی مجسمہ اس کے اعزاز میں نصب نہیں کیا گیا۔" امریکہ کے عظیم مصنف جان اسٹن بک نے ایک بار کہا تھا کہ "وقت ہی وہ نقاد ہے جس کے اپنے کوئی عزائم نہیں ہیں۔" نقاد اپنے زعم میں سمجھتا ہے کہ وہ مصنف کو دوام عطا کر رہا ہے۔ مصنف کو دوام اس کی تحریر عطا کرتی ہے۔

ابن صفی کی مقبولیت ان کی بڑائی کی ضمانت ہے۔ ڈاکٹر جانسن نے کہا تھا کہ لوگ یوں ہی کسی کے سر پر تاج نہیں رکھ دیتے (یاد رہے کہ شکسپیئر کے بعد انگلستان میں ڈاکٹر جانسن سے زیادہ حوالے کسی اور مصنف کے نہیں دیئے گئے) ابن صفی آپ کو یوں عزیز ہے کہ اس کے کردار حقیقی ہیں۔ زندگی سے زیادہ زندہ، مجنوں صاحب نے کہا تھا کہ فریدی کا کردار غیر حقیقی ہے۔ عام زندگی کے اعتبار سے یہ بات درست ہے، مگر لوگ ایک مثالی دنیا کے خواب دیکھتے ہیں یا کم سے کم کسی مثالی کردار کے خواب۔ فریدی محض ایک کردار نہیں ایسا ہی ایک خواب ہے، ملک دشمنوں کے خلاف فتح کا خواب، تعمیر کا خواب، مجرموں کی شکست کا خواب، اور ہم انفرادی طور پر نہ سہی، مل کر اس خواب کی تعبیر بن سکتے ہیں۔

(ابن صفی میگزین۔ جولائی، ۱۹۸۹ء)

ابن صفی

فخر الدین کیفی

ہوسکتا ہے کچھ اجارہ دار اسے مبالغہ سمجھیں لیکن حقیقت یہ ہی ہے کہ برصغیر میں ابن صفی سے زیادہ کسی بھی مصنف کو نہیں پڑھا گیا۔ بڑے سے بڑے مصنف کی کسی بھی کتاب کے شائد ہی دس ایڈیشن چھپے ہوں اور ہر ایڈیشن کی تعداد ہزار بھی ہو تو دس ہزار کی تعداد سے زیادہ قاری کسی بھی مصنف کے نہ ہونگے۔ جبکہ ابن صفی کی کتابیں پاکستان اور بھارت میں لاکھوں کی تعدا میں اردو میں اور ہندی میں بھی شائع ہوتی رہیں ہیں۔ ہر کتاب کو ایک سے زائد بار پڑھنے کا ذکر نہیں کیونکہ اگر ہم صرف اپنی مثال لیں تو شائد ہی ان کی کوئی ایسی کتاب ہوگی جسے ہم نے چھ سات بار سے کم پڑھا ہو۔ ہاں کچھ ایسی بھی ہیں جنہیں دس سے زائد بار پڑھ چکے ہیں۔ زیادہ بار پڑھنے کا ذکر اس لیے نہیں کرر ہے کہ اس سے ان کے پڑھنے والوں کی صحیح نشاندہی نہیں ہوسکتی ۔ہم کہنا یہ چاہ رہے ہیں کہ ان کی کتابیں لائبریریوں سے لیکر بھی پڑھی جاتی تھیں اور ایک ایک کتاب کتنے لوگوں نے پڑھی ہونگیں اس کا حساب یوں لگا لیجیے کہ جس زمانے میں کتاب کی قیمت ایک روپیہ ہوا کرتی تھی' اس وقت کرایہ صرف ایک آنا ہوتا تھا۔ اگر سولہ اشخاص سے کم اشخاص کرائے پر کتاب لیتے ہوں تو لائیبریری والے ابن صفی کی حیات میں ہی لائبریریاں بند کر چکے ہوتے۔ ایک روپے میں سولہ آنے ہوتے تھے تو منافع اس ہی صورت میں ہوسکتا تھا جب کرائے پر حاصل کرنے والوں کی تعداد سولہ سے زیادہ ہوتی۔ ابن صفی کی وجہ سے اکرم الہ بادی اور رومانی دنیا کی کتابیں بھی خوب پڑھی جاتی تھیں۔ اس ہی شوق نے لوگوں کو نسیم حجازی کے علاوہ دیگر مصنفین کی طرف بھی راغب کیا لیکن لائیبریریوں کا منافع ابن صفی کی کتابوں کا ہی مرہون منت تھا۔ جب ہم خود کتابیں خریدنے کے لائق ہوئے اور کتاب خریدنے کے لیے اسٹال پر جاتے تو پہلے دن عمران سیریز یا جاسوسی دنیا کی کتابوں کی تھپی کی تھپیاں ہر اسٹال پر نظر آتیں اور دو تین دن کے اندر اگر نہ خرید پاتے تو پھر لائیبریری سے استفادہ کرنا پڑتا جس کے ریٹ اس وقت تک چار آنے فی دن ہو چکے تھے۔ یہ ہم سب کچھ اس لیے لکھ رہے ہیں کہ شائد کچھ لوگوں کو یقین نہ آئے کہ قرۃ العین کے ''آگ کے دریا'' کو اتنے لوگوں نے نہیں پڑھا ہوگا جتنے لوگوں نے ''جہنم کا شعلہ'' پڑھا ہوگا۔ ممتاز مفتی کے ''علی پور کے ایلی'' کو کتنوں نے پڑھا ہوگا جبکہ ''زہریلا آدمی'' پڑھنے والوں کی تعداد لاکھوں میں ہے۔ یہ موازنہ کسی ادیب کے قد و کاٹھ کم کرنے کے لیے بخدا نہیں کہ ان کا مقام اتنا اونچا ہے کہ ہم جیسے ان پر تنقید کر ہی نہیں سکتے۔ ہم تو صرف یہ بتانا چاہ رہے ہیں کہ ابن صفی کو زیادہ لوگوں نے پڑھا ہے اور ایسا کون سا مسئلہ ہے جس پر ابن صفی نے بحث نہ کی ہو۔ سیاسی' معاشی' معاشرتی' جنسی' نفسیاتی' مذہبی' غرض ہر مسئلے کی نشاندہی ہی نہیں کی بلکہ ان مسئلوں کے پیدا ہونے کی وجوہات بھی بتائیں۔ اندرونی و بیرونی سازشوں کی نقاب کشائی ہی نہیں کی بلکہ عام لوگوں کو قانون

کی پاسداری کی ترغیب بھی دی۔ برائی کو برائی ہی بتایا اور بروں کو ہیرو نہیں بنایا۔ حقیقت پسند بننے کے لیے خلوت کو جلوت نہیں بنایا۔ ورنہ بڑے بڑے ادیبوں نے حقیقت بیانی کا سہارا لے کر وہ باتیں کھول کھول کر بیان کی ہیں جنہوں نے نوجوانوں کے ذہنوں کو پراگندہ کر دیا۔ کیا فائدہ ایسی حقائق نگاری کا جو ذہنی عیاشی کا سبب بنے۔ ایسے ہی نام نہاد ادیبوں نے ابن صفی کو انکا مقام نہیں دیا۔ لیکن جس طرح خوشبو کو دبایا نہیں جا سکتا اس ہی طرح آج کی دنیا ان کے فن سے آشنا ہو رہی ہے۔

ابن صفی نے بیرونی سازشوں سے بہت پہلے آگاہ کر دیا تھا۔ مثال کے طور پر ایک دو باتیں بتانا چاہیں گے۔ اپنے ناول وبائی ہیجان میں انہوں نے بتایا تھا کہ کس طرح دشمن مصنوعی بیماریاں پھیلاتے ہیں پھر ان کا علاج بھی بتا کر سرخرو ہوتے ہیں۔ کیا آج بھی ڈینگی بخار تو کبھی اینتھرکس کی صورت میں یہ وبائیں ہمارا مقدر نہیں بنی ہوئی ہیں۔ اینتھرکس کا شوشہ چھوڑا اور امریکی نائب صدر ڈک چینی کی کمپنی کی اینٹی بائیوٹک نے خوب دھوم مچائی۔ اربوں کا بزنس کیا۔ برڈ فلو کا ہوا کھڑا کیا اور لاکھوں مرغیوں کو تلف کروادیا۔ کبھی مونہہ اور کھر کی بیماریوں نے گائے بکریوں کو مصیبت میں ڈالدیا تو کبھی گوبھی کی کاشت تباہ کروادی۔ ہماری معیشت کو تباہ کرنے کے لیے کیا کچھ نہیں کرتے۔ دین سے متنفر کرنے کے لیے طالبان کو اس طرح پیش کرتے ہیں کہ عام مسلمان مولویوں کو اس کا ذمہ دار سمجھنے لگا ہے۔ شمال کا فتنہ اور پاگلوں کی انجمن میں ابن صفی نے ایسے ہی مسائل کی نشاندہی کی تھی۔

بھارت میں ابن صفی پر سیمینار ہو رہے ہیں۔ ان پر ریسرچ کی دعوت دی جا رہی ہے۔ مقالے لکھے جا رہے ہیں۔ لیکن ہمارے یہاں سرکاری طور پر کچھ نہیں ہو رہا۔ کسی یونیورسٹی کو توفیق نہیں کہ ابن صفی چیر ہی قائم کر دے۔ حکومت ستارۂ ہلال یا کسی نشان کا ہی اعلان کر دے۔ ۲۳ مارچ کو یقیناً میڈل بٹیں گے امید ہے اس بار میڈل بٹیں گے، ریوڑیاں نہیں بٹیں گی وہ بھی کسی اندھے کے ذریعے۔ اگر ایسا ہوا تو امید ہے بعد از مرگ انکی خدمات کا اعتراف کر لیا جائے۔

کچھ دن پہلے ایک مستند ادیبہ محترمہ زاہدہ حنا نے ایک کالم لکھ کر ابتدا کر دی تھی۔ جس سے ہمیں یہ پتہ چلا کہ ۱۹۷۰ میں آئی ایس آئی کی تشکیل کے موقع پر جناب ابن صفی نے کچھ لیکچرز دیئے تھے۔ شائد حساس ادارے کا معاملہ تھا اس لیے ابن صفی نے کبھی اپنی تحریروں کے ذریعے اظہار نہیں کیا۔ لیکن تیس سال سے زیادہ عرصہ گذر جانے کے بعد خفیہ ریکارڈز بھی ڈی کلاسیفائید ہو جاتے ہیں، اس ہی لیے محترمہ نے تذکرہ کر دیا۔ اب ہونا یہ چاہیے کے ان لیکچرز کی نقول یا ریکارڈنگ جو بھی مل سکے اسے شائع کروانے کا اہتمام کیا جائے۔ کیا ہی اچھا ہو کہ ان کی خدمات کا اعتراف آئی ایس آئی کی طرف سے بھی ہو جائے۔

ابن صفی کی ''ڈیڑھ متوالے'' سیریز۔ایک عمیق مطالعہ

راشد اشرف

فیض احمد فیض نے ایک مرتبہ اپنے ہم عصر ترقی پسند شاعر اور نثر نگاروں کے بارے میں پوچھے جانے والے سوال کے جواب میں کچھ اس قسم کی بات کہی تھی کہ '' بھئی! دکانیں تو سب نے ایک ساتھ لگائی تھیں۔کسی کی چلی اور کسی کی نہیں چلی۔''

۱۹۴۸ء میں جب ابن صفی المعروف اسرار احمد کے مشورے سے عباس حسینی نے ادارہ نکہت کی داغ بیل ڈالی تو جاسوسی ناول نگاری کے میدان میں ان کا بنیادی انحصار اول الذکر پر ہی تھا البتہ نکہت کلب کو ابن صفی کے علاوہ مزید کئی اشخاص کا قلمی تعاون بھی روز اول ہی سے حاصل رہا تھا۔مجاور حسین رضوی المعروف ابن سعید، شکیل جمالی کی کلیدی حیثیت تھی۔ بعدازاں ملک زادہ منظور احمد اور وامق جونپوری بھی خم ٹھونک کر نکہت سے وابستہ ہو گئے۔اپنی خودنوشت ''رقص شرر'' میں ملک زادہ منظور نے نکہت کلب کے زمانے کو یاد کیا ہے اور صدق دل سے یاد کیا ہے۔

ملک زادہ منظور، ادارہ نکہت کے قیام کے ابتدائی زمانے اور ابن صفی کے بارے میں لکھتے ہیں۔

''ابن صفی اس وقت صرف اسرار ناروی تھے۔نہ انہوں نے کوئی ناول لکھا تھا اور نہ ہی یہ توقع تھی کہ وہ ناول نگار ہوں گے۔انہوں نے نکہت میں اپنی ادبی زندگی کا آغاز اسرار ناروی کے نام سے کیا تھا۔ان کی کئی نظمیں اور غزلیں نکہت میں شائع ہوئی تھیں۔بعد میں انہوں نے نثر لکھنی شروع کر دی اور 'طغرل فرغان' کے نام سے کئی طنزیہ اور مزاحیہ خاکے تحریر کیے۔ان خاکوں میں مولانا محمد حسین آزاد کی آب حیات کی ایک پیروڈی بھی شامل تھی جو' آب وفات' کے نام سے نکہت میں شائع ہوئی۔'' (رقص شرر۔صفحہ نمبر ٦٦/ ٦٧)

سو نکہت سے ایک چراغ بمثل ابن صفی روشن ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے جاسوسی ناول نگاری کے میدان میں کئی دیگر ''دکانیں'' بھی کھلتی چلی گئیں۔اکرم الہ آبادی، اظہار اثر، مسعود جاوید، عارف مارہروی۔یہ الگ بات ہے کہ فیض کے درج بالا فقرے کے تناظر میں دیکھیے تو دکانوں پر دستیاب مال کے معیار اور تادیر زندہ رہ جانے والی تخلیقی قوت کے پیمانے پر ایک ہی دکاندار پورا اترا.....وہ جو سب پر تادم مرگ اور پھر بعد از مرگ حاوی رہا تھا.....دنیا اس کو ابن صفی کے قلمی نام سے جانتی ہے۔وہ آیا اور طلسم کی طرح ذہنوں پر چھا گیا۔مال کی مانگ ایسی کہ' آرڈر' پورے کرنا مشکل ہو گیا......اوور ٹائم کی نوبت آ گئی۔ایک مہینے میں چار چار ناول لکھے جاتے رہے اور مجال ہے کہ کوئی یہ کہہ سکے کہ کسی کہانی میں کوئی جھول دیکھا گیا ہے یا کوئی پلاٹ کمزور اور بھرتی کا پیش کیا ہو۔یہ بات ہے اس وقت کی جب ابن صفی عمران سیریز کے ناول نمبر ۴۲ یعنی ڈیڑھ متوالے تک نہیں پہنچے تھے۔ڈیڑھ متوالے جو زیر نظر مضمون کا محور ہے۔

ڈیڑھ متوالے محض ایک ناول نہیں ہے۔ اس یادگار تخلیق کے اردگرد کئی کہانیاں گھومتی ہیں۔ کئی کہانیاں، کئی حقیقتیں اس سے وابستہ ہیں۔ اس کے مصنف کی طویل المعیاد بیماری اور اس کی ذہنی حالت کا بڑا گہرا تعلق ہے اس ناول سے۔ آیئے کچھ تہیں کھولنے کی کوشش کرتے ہیں۔

ابن صفی ڈیڑھ متوالے سے قبل ایک مہینے میں چار ناول کی حیرت انگیز رفتار سے ناول نگاری میں مصروف تھے۔ مجال ہے کہ کسی بھی کہانی میں کوئی جھول دکھائی دیا ہو۔ ڈیڑھ متوالے ۲۱ نومبر ۱۹۶۳ کو شائع ہوا تھا۔ اس سے قبل کے جاسوسی دنیا کے ناول دھواں اٹھ رہا تھا، فرہاد ۵۹، زہریلا آدمی یا پرنس وحشی ہوں یا پھر عمران سیریز کی ظلمات کا دیوتا سیریز اور دلچسپ حادثہ و بے آواز سیارہ، پلاٹ کے اعتبار سے سب کے سب اچھوتی کہانیوں پر مشتمل تھے۔ واضح رہے کہ دلچسپ حادثہ سے شروع ہونے والی کہانی بے آواز سیارہ کے بعد ڈیڑھ متوالے پر تمام ہوئی تھی۔ دونوں ناولوں کے درمیان تین سال کا وقفہ حائل تھا۔ دلچسپ حادثہ نامی ناول ۵ جنوری ۱۹۶۰ کو منظر عام پر آیا تھا۔ ابن صفی ان دنوں جس رفتار سے لکھ رہے تھے، یہ اسی کڑی ذہنی محنت اور اس کے نتیجے میں پڑنے والے دباؤ کا حاصل تھا کہ وہ یک لخت شیزوفرینیا نامی بیماری کا شکار ہو گئے۔ اس ضمن میں فرزند ابن صفی، جناب احمد صفی کا یہ بیان ملاحظہ ہو۔

''اس بیماری میں ڈپریشن اور اختلاج بنیادی اثرات ہوتے ہیں۔ ایک ماہر نفسیات نے نیویارک میں اس موضوع پر دقیق گفتگو کرتے ہوئے بتایا کہ بہت سے تخلیق کار اس درجہ پر پہنچ جاتے ہیں کہ ان کے ذہن کی کارکردگی اس قدر بڑھ جاتی ہے کہ وہ بہت تیزی سے بہت عمدہ تخلیقات کے ڈھیر لگا دیتے ہیں (جیسا کہ ابنِ صفی کے قارئین نے دیکھا کہ ایک ایک مہینے میں چار چار ناول تیار ہو جایا کرتے تھے۔) اس درجہ پر پہنچنے کے بعد ذہن اچانک اپنے آپ کو بند کر لیتا ہے اور نہ صرف تخلیقی صلاحیتیں مفقود ہو جاتی ہیں بلکہ ایک مسلسل ڈپریشن اور اختلاجی کیفیت اس پر طاری ہو جاتی ہے جس کے زیرِ اثر وہ کچھ بھی کر گزر سکتا ہے۔ اس کی ایک مثال فاضل ڈاکٹر صاحب نے مصور وین گو (Van Gogh) کی دی، جس نے اسی بیماری کے زیرِ اثر اپنا کان کاٹ کر اپنی محبوبہ کو ارسال کر دیا تھا۔ انہی ماہر نفسیات کے مطابق جس طرح یہ بیماری آتی ہے اسی طرح اچانک پیچھا بھی چھوڑ سکتی ہے۔ اور ابنِ صفی کے ساتھ یہی ہوا۔ ۱۹۶۳ء میں حکیم اقبال حسین صاحب کے علاج کے دوران وہ اچانک نارمل ہو گئے۔''

جاسوسی دنیا کا ناول پرنس وحشی ۱۸ جون، ۱۹۶۰ کو شائع ہوا تھا۔ یہ بھی ایک عجیب اتفاق ہے کہ مذکورہ ناول کا آغاز بھی جاسوسی دنیا کے معروف کردار کرنل فریدی کی علالت ہی سے ہوتا ہے۔ وہ انتہائی درجے کے بخار میں مبتلا دکھایا گیا ہے اور ایک وقت پر اس کا نائب کیپٹن حمید اس کی دماغی حالت پر شبہ بھی کر بیٹھتا ہے۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ مذکورہ ناول کے آغاز میں ابن صفی نے ایک ایسی مختلف صورتحال پیش کی ہے جو ان کے بقیہ کسی ناول میں پیش نہیں کی گئی۔ کرنل فریدی اور کیپٹن حمید ملک کے سرحدی علاقے کی جانب سفر کر رہے ہوتے ہیں اور انہیں ایک فیکٹری کے ایک مخصوص کوارٹر کی تلاش ہوتی ہے۔ سردی شدید ہوتی ہے اور

نصف شب بھیگ چکی ہوتی ہے۔ وہ مطلوبہ کوارٹر کے پاس پہنچتے ہیں۔ اور اندر سے انہیں کسی شیر خوار بچے کے رونے کی آواز سنائی دیتی ہے۔ ابن صفی کی منظر نگاری دیکھئے۔

''لیکن کمرے کا منظر..... حمید کو ایسا محسوس ہوا کہ جیسے کسی نے اس کی گردن شانوں سے اکھاڑ کر کہیں دور پھینک دی ہو۔ خون میں لتھڑا ہوا بچہ اپنی انگلیاں چوس رہا تھا اور وہ لاش غالباً اس کی ماں ہی کی تھی۔ بستر خون سے تر تھا..... بیک وقت بچہ پھر چنگھاڑنے لگا۔ اس کی انگلیاں منہ سے نکل گئی تھیں..... حمید نے فریدی کی طرف دیکھا جو ساکت و صامت کھڑا بچے کو گھورے جا رہا تھا' پلکیں جھپکائے بغیر۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے اس کی آنکھیں پتھرا گئی ہوں۔''

کیپٹن حمید نے اس سے قبل کرنل فریدی کو بڑی بڑی قسمیں کھاتے کبھی نہ دیکھا تھا۔ ایک موقع پر وہ حمید سے کہتا ہے۔

''درندگی..... اوہ وہ ننھا سا بچہ..... اپنے اس بڑے خسارے سے ناواقف جس کے لیے وہ زندگی بھر روئے گا..... میرے معبود! کیا آدمی سے زیادہ وحشی جانور بھی تو نے پیدا کیے ہوں گے..... میں پھر قسم کھاتا ہوں..... ان میں سے ایک ایک کا سر کچل دوں گا..... وہ بچہ..... خدا کی قسم وہ تا زندگی میرے ذہن سے چمٹا رہے گا۔ مجھے سکون نہیں مل سکتا تاوقتیکہ انہیں صفحۂ ہستی سے نہ مٹا دوں۔ خدایا..... وہ اپنی ماں کا خون چوس رہا تھا''

پرنس وحشی نامی یہ ناول ہمیں یہ سوچنے پر مجبور کرتا ہے کہ کیا یہ پلاٹ' منظر نگاری اور ابن صفی کے قلم سے نکلی مذکورہ بالا سطور' ان کی اس بیماری (schizophrenia) کا پیش خیمہ تو نہیں تھے جس میں وہ محض کچھ ہی عرصے بعد مبتلا ہونے والے تھے؟

اسی طرح یہ بھی کیا محض ایک اتفاق ہی تھا ''دلچسپ حادثہ'' نامی ناول میں علی عمران کو ذہنی اضمحلال کا شکار دکھایا گیا ہے۔ ایک موقع پر ڈاکٹروں کی ایک ٹیم اس کا معائنہ کرتی ہے اور اس کی حالت کو غیر تسلی بخش قرار دیتی ہے۔ ناول کے اختتام پر عمران کے اپنے نائب بلیک زیرو سے یہ مکالمے ملاحظہ ہوں۔

''لیکن آپ کا معائنہ تو کئی اسپشلسٹوں نے کیا تھا۔ اور میری معلومات کے مطابق ان کا متفقہ فیصلہ یہی تھا کہ آپ اپنی یادداشت کھو بیٹھے ہیں۔'' بلیک زیرو نے کہا

''ترکیب نمبر پانچ''' عمران نے بائیں آنکھ دبائی۔ ''بس معائنے سے پہلے ایک چٹکی چڑھا لیتا تھا۔ میری اپنی دریافت ہے۔ ایک پودے کی پتیوں پر پایا جانے والا بھورے رنگ کا سفوف جو تقریباً دو گھنٹے کے لیے عارضی طور پر اعصابی اور ذہنی اختلال میں مبتلا کر دیتا ہے۔''

پرنس وحشی میں فریدی کا ہذیانی بخار ہو یا عمران کا ذہنی اضمحلال میں دانستہ مبتلا ہونے کے لیے کسی سفوف کا استعمال ان کرداروں کے معاملے میں اس قسم کی کوئی صورت حال ہمیں نہ تو ڈیڑھ متوالے سے قبل کے ناولوں میں ملتی ہے اور نہ ہی اس کے بعد۔

جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے' ۱۹۶۰ء میں ابن صفی کی بیماری کا آغاز ہوا تھا۔ یعنی پرنس وحشی اور دلچسپ حادثہ

کے سپرد قلم کیے جانے کے بعد۔ بیماری سے قبل کے ناولوں کے پیشرسوں میں ابن صفی اپنی خرابی صحت کا تذکرہ بھی کرتے رہے تھے۔ پرنس وحشی (۱۸جون ۱۹۶۰) کے پیشرس میں لکھتے ہیں۔

''زیرِ نظر کہانی کو میں نے ہر اعتبار سے دلچسپ بنانے کی کوشش کی ہے حالانکہ اس دوران میں علیل بھی رہا اور موسم کی سختیوں کا شکار بھی۔ آپ جانتے ہیں کہ گرمیوں میں مجھ پر بے تحاشا کاہلی طاری ہوتی ہے ...کتابیں لیٹ ہوتی ہیں...... بہرحال میں کوشش کررہا ہوں کہ عمران سیریز کا خاص نمبر ڈیڑھ متوالے لیٹ نہ ہونے پائے۔ دعا فرمایئے کہ آپ انتظار کی بوریت سے بچیں اور میری صحت ٹھیک رہے۔''

ڈیڑھ متوالے سیریز کا دوسرا ناول ''بے آواز سیارہ'' ۲۶ مارچ ۱۹۶۹ کو شائع ہوا تھا۔ مذکورہ ناول کے پیشرس میں بھی ابن صفی نے اپنی بیماری کا ذکر کیا تھا۔ لکھتے ہیں۔

''اس بار بعض انتظامی امور میں چند تبدیلیوں کی بنا پر یہ کتاب آپ تک دیر سے پہنچ رہی ہے۔ معافی کا خواستگار ہوں۔ جلد ہی انشاءاللہ کتابیں اور رسالے ٹھیک وقت پر شائع ہونے لگیں گے۔ ادھر میں بلڈ پریشر کا شکار بھی رہا ہوں۔ کوشش کررہا ہوں کہ جاسوسی دنیا کا ناول پرنس وحشی جلد ہی پیش کرسکوں۔''

۱۹۶۰ء سے ایک برس ادھر، ابن صفی کی زود نویسی کے ساتھ ساتھ ایک ممکنہ ذہنی دباؤ کا سبب ان کے ناولوں کے غیر قانونی ایڈیشنز کے قضیے کو بھی قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس ضمن میں ایک ایسی مثال پیش نظر ہے جو اس سے قبل اور اس کے بعد، کسی اور ناول میں دیکھنے میں نہیں آئی۔ اس کا ذکر ایک توقف کے بعد۔ پہلے یہ دیکھا جانا ضروری ہے کہ کیا ابن صفی ۱۹۶۰ء سے قبل کے ناولوں کے پیشرسوں میں بھی غیر قانونی اشاعتوں کا تذکرہ کرتے رہے تھے۔ اس کا جواب اثبات میں ہے۔ ۴ دسمبر ۱۹۵۹ء کو لکھے جانے والے جاسوسی دنیا کے ناول ''فرہاد ۵۹'' کے پیشرس سے یہ سطور ملاحظہ ہوں۔

''اب ایک اشد ضروری بات بھی سنیئے۔ کراچی کے کسی ناکام ادارے نے بک اسٹال ایجنٹوں کو خطوط لکھے ہیں کہ میں اس کے لیے کتابیں لکھ رہا ہوں۔ اس سلسلے میں بعض ایجنٹوں نے بھی مجھ سے استفسار کیا ہے...... نوٹ کیجیے کہ وہ کوئی فراڈ ہے۔ میں نے پاکستان میں کسی کو بھی اپنی کتابوں کے حقوق اشاعت کبھی نہیں دیے۔ اپنی کتابیں خود ہی چھاپتا ہوں اور وہ صرف اسرار پبلی کیشنز کراچی ۱۸ کے تحت شائع ہوتی ہیں۔ لیکن چونکہ یہ سردیوں کا زمانہ ہے اور اس زمانے میں تفریحی کتابوں کی مانگ بڑھ جاتی ہے اس لیے ہمیشہ کی طرح اس بار بھی آپ کو بھانت بھانت کے صفیوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ کبھی کوئی میرے نام میں ایک آدھ نکتے کا اضافہ کرکے دھوکا دینے کی کوشش کرے گا اور کبھی ابنِ کو مشدد کرکے پڑھنے والے کی آنکھوں میں دھول جھونکے گا۔ لہذا آپ خود ہی ہوشیار رہیے۔''(۱)

درج بالا سطور میں ایک انوکھی مثال کا ذکر کیا گیا تھا۔ غیر قانونی ایڈیشنز کے ساتھ ساتھ ابن صفی کو بک اسٹال مالکان کی جانب سے غیر ذمہ دارانہ رویے کا سامنا بھی تھا۔ یہ معاملات خصوصاً ان دنوں ابن صفی کے لیے اس قدر تکلیف دہ اور ذہنی کوفت کا سبب بن کر رہ گئے تھے کہ وہ ڈیڑھ متوالے سیریز کے دوسرے ناول

''بے آواز سیارہ'' کے ابتدائی اوراق پر کہانی کو روک کر ایک اشتہار دینے پر مجبور ہو گئے۔ یہ اپنی نوعیت کی واحد مثال ہے۔ واضح رہے کہ ایسا صرف نسخہ اول ہی میں دیکھنے میں آیا تھا جبکہ لاہور سے شائع ہونے والے یک رنگ ایڈیشنز میں اشتہار مذکورہ کو حذف کر دیا گیا تھا۔ اشتہار کچھ یوں تھا۔

ذرا ٹھہریے

معاف فرمایئے گا پہلی بار یہ حرکت سرزد ہو رہی ہے۔ یعنی کہانی کے درمیان اشتہار۔ لیکن بات ایسی ہی ضروری ہے کہ آپ کی خصوصی توجہ درکار ہے۔ مجھے اطلاع ملی ہے کہ بعض بک اسٹال ایجنٹ میرے نقالوں کی کتابیں یہ کہہ کر نئے گاہکوں کے گلے لگاتے ہیں کہ یہ بھی دراصل ابن صفی ہی کی کتابیں ہیں اور بعض کاروباری دشواریوں کی بنا پر دوسرے اداروں کے تحت شائع ہو رہی ہیں۔ نوٹ کیجیے کہ یہ کھلی ہوئی بکواس ہے ۔ میں ایسی کسی کاروباری دشواری میں مبتلا نہیں کہ اپنی کتابیں اپنے ہی ادارہ کے تحت نہ چھاپ سکوں۔ ایک بار پھر معافی چاہتا ہوں اس بے محل اشتہار کے لیے۔ میں چاہتا تھا آپ اسے پڑھ ہی لیں۔

اشتہار کا ذکر ہے تو مذکورہ ناول کے نسخہ اول کے آخری صفحات میں شائع ہوئے ایک اہم اعلان کا بیان بھی ضروری ہوگا' مذکورہ اعلان کے الفاظ یہ ہیں۔

''۲۰ اکتوبر ۱۹۶۳ء سے روز نامہ حریت کراچی میں محترم ابن صفی کا ایک نیا ناول ڈاکٹر دعا گو بالاقساط شائع ہوگا اور مکمل ہو جانے کے بعد ادارہ اسرار پبلی کیشنز کے تحت مجلد کتابی صورت میں پیش کیا جائے گا۔''

واضح رہے کہ ڈاکٹر دعا گو' ابن صفی کی عمران سیریز کا ایک یادگار ناول کہلایا جاتا ہے۔ ابن صفی نے مذکورہ ناول فخر ماتری اور نصر اللہ خاں کی فرمائش پر لکھنا شروع کیا تھا۔ ڈاکٹر دعا گو فروری ۱۹۶۴ میں کراچی سے شائع ہوا تھا۔ جب حریت اخبار میں اس کی قسط وار اشاعت نے طول کھینچا تو بھارتی قارئین کو طویل انتظار کی زحمت سے بچانے کے لئے عباس حسینی نے ابن صفی کی مشاورت سے یہ طے کیا کہ جب ڈاکٹر دعا گو کی اتنی قسطیں شائع ہو جائیں جو کہ عمران سیریز کے ایک عام شمارے کے برابر ہوں تو اسے الہ آباد سے بھی شائع کر دیا جائے۔ چنانچہ بھارت میں ڈاکٹر دعا گو تین حصوں میں شائع ہوا جن کے نام بالترتیب گھر کا بھیدی (جون ۱۹۶۴)' موت کا مہمان (جولائی ۱۹۶۴) اور ڈاکٹر دعا گو (اگست ۱۹۶۴) تھے۔

اس موقع پر خرم علی شفیق کی کتاب 'سائیکو مینشن' [۲] میں ڈیڑھ متوالے سے متعلق ان کے بیان کردہ تجزیئے کا تذکرہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ لکھتے ہیں۔

''نہ صرف ''کُبلا'' اور ''کُبڑا'' میں صوتی مماثلت ہے بلکہ کولرج کی نظم میں شہنشاہ کُبلا خاں نے ''گنبدِ عشرت'' کی تعمیر کا حکم دیا تھا اور کبڑے نے بھی خفیہ عشرت کدے تعمیر کروا رکھے ہیں' اور اپنے آپ کو ساری دنیا کا بادشاہ کہتا ہے۔ اِس مماثلت کے بعد اُس کی اور خاقانِ اعظم کی ظاہری حالتوں میں جو فرق ہے وہ اُسے شہنشاہ کی پیروڈی بنا سکتا تھا مگر ابن صفی کا قلم اُسے پیروڈی نہیں بننے دیتا۔ (کولرج کی نظم اور اِس کہانی کا تقابلی مطالعہ کسی قدر تفصیل سے بھی کیا جا سکتا ہے)۔ پہلی بات یہ ہے کہ پانچوں ناول [ڈیڑھ متوالے سیریز'

پرنس وحشی اور بیچارہ/ری] اُن ریاستوں کے ماحول کی عکاسی کرتے ہیں جو انگریزوں کے زمانے میں مقامی حکمرانوں کی نجی ملکیت قرار دی گئی تھیں اور آزادی کے بعد بھی کچھ عرصہ وہاں انہیں حکمراں خاندانوں کا تسلط برقرار رہا۔ ممکن ہے کہ تخیل میں اُس گھٹے ہوئے ماحول کو محسوس کرنے سے بھی ذہن پر کسی قسم کا دباؤ پڑا ہو (جاسوسی دنیا میں تو مصنف کا تخیل آزادی سے پہلے کے زمانے میں پہنچ گیا کیونکہ پرنس وحشی ۱۹۴۶ء کی فضا میں شروع ہوا اور بیچارہ/ری میں یہ پس منظر موجود رہا)۔''

خرم علی شفیق ''دلچسپ حادثہ'' کے پیشرس میں موجود ایک اہم بات کی جانب اشارہ کرتے ہوئے مزید لکھتے ہیں۔

''تیسرا قابلِ ذکر نکتہ اس سلسلے کی پہلی کہانی یعنی دلچسپ حادثہ کے 'پیشرس' کی وہ سطور ہیں جن میں مصنف نے اپنی ذہنی کیفیت کا موازنہ انگریزی شاعر سیموئیل ٹیلر کولرج (۱۸۳۴ء-۱۷۷۲ء) کی کیفیت سے کیا جب ۱۷۹۷ء میں کولرج اپنی مشہور نظم 'کبلا خاں' (۱۸۱۶ء) لکھ رہا تھا۔

'کولرج نے افیون کی پینک میں ایک نظم شروع کی تھی ''کُبلا خاں'' لکھ ہی رہا تھا کہ کسی طرح پینک ٹوٹ گئی......اور خود اُس کے خیال کے مطابق نظم نامکمل ہی رہ گئی......زندگی بھر کوشش کرتا رہا کہ اُسے مکمل کر ڈالے لیکن یہ بھی ممکن نہ ہوا! اور وہ اس نامکمل نظم کا داغ ہی لئے دُنیا سے رخصت ہو گیا۔ مگر بھائی۔ آج کی دنیا ابھی تک فیصلہ نہیں کر سکی کہ وہ نظم مکمّل ہے یا نامکمّل...... کچھ دعویٰ کرتے ہیں کہ مکمل ہے اور کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ بھئی کولرج صاحب خود ہی نامکمل قرار دے گئے ہیں تو پھر نامکمّل ہی ہو گی۔ ذرا ٹھہرئیے! یہ واقعہ بیان کرنے کا مقصد حسبِ ذیل ہرگز نہیں ہے کہ۔۔

خدانخواستہ لکھتے وقت میں بھی افیون ہی کی پینک میں ہوتا ہوں۔

یا اِس نامکمّل کہانی کا داغ لئے ہوئے دُنیا سے رخصت ہو جانے کا اِرادہ رکھتا ہوں۔

اِس لکھواس کا مقصد اِس کے علاوہ اور کچھ نہیں کہ۔ یار زندہ صحبت باقی'' (پیشرس۔ دلچسپ حادثہ۔ عمران سیریز نمبر ۴۰)

☆☆☆

جولائی ۲۰۱۳ میں اردو بک ریویو دلی سے عارف اقبال کی مرتب کردہ گیارہ سو صفحات کی کتاب ''ابن صفی۔ ادبی مشن اور کارنامہ'' شائع ہوئی۔ کتاب میں شامل متفرق مضامین میں نصرت ظہیر کا تحریر کردہ ایک مضمون ''ابن صفی کو لاکھوں لوگ پڑھتے تھے'' بھی شامل کیا گیا۔ نصرت ظہیر اعزازی مدیر ماہانہ اردو دنیا اور سہ ماہی فکر و ''تحقیق'' ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کا مضمون فکر اور تحقیق' دونوں سے عاری نظر آتا ہے۔ مذکورہ مضمون میں وہ ابن صفی کی بیماری سے متعلق ایک جگہ لکھتے ہیں۔

''علاج کے بعد جب ابن صفی صحت یاب ہوئے تو اور ان کا نیا ناول ڈیڑھ متوالے سامنے آیا تو قارئین نے صاف محسوس کیا کہ 'نئے ابن صفی' میں بھی وہ بات نہیں رہ گئی تھی جو بیماری سے پہلے کے ابن صفی میں تھی۔

عباس حسینی نے ڈیڑھ متوالے کی پبلسٹی غیر معمولی طور پر کی۔ انہیں اس نئے ناول سے بڑی امیدیں تھیں۔ عباس حسینی کی امیدیں پوری ہوئی یا نہیں لیکن قارئین کی توقعات پر ناول پورا نہیں اترا۔"

ہندوستان میں رہتے ہوئے مذکورہ بالا بیان ایک ایسا شخص ہی دے سکتا ہے جس نے یا تو ڈیڑھ متوالے کا مطالعہ ہی نہ کیا ہو یا پھر ۲۵ نومبر ۱۹۶۳ کو مذکورہ ناول کے پہلے اور پھر اسی سال ۵ دسمبر کو دوسرے ایڈیشن کی الہ آباد میں تقریب رونمائی کی تقاریب سے یکسر ناواقف ہو۔ دوسری تقریب میں ڈاکٹر سید اعجاز حسین، شمس الرحمان فاروقی، احتشام حسین اور سید محمد عقیل بھی شریک ہوئے تھے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ڈیڑھ متوالے کو پاک و ہند میں یکساں مقبولیت ملی تھی۔ یہ وہ ناول تھا جس کے ذریعے ابن صفی نے اپنے بدخواہوں کو للکارا تھا۔ وہ جو ان کی تین سالہ غیر حاضری میں کھمبیوں کی طرح اگ آئے تھے۔ فاضل مصنف کی نظر سے شاید زبیر رضوی کی خودنوشت "گردش پا" بھی نہیں گزری جس میں مصنف نے ڈیڑھ متوالے کے حصول کے طلبگاروں کی طویل قطار کا ذکر کیا ہے۔ مذکورہ مضمون کے حواشی میں عارف اقبال بھی یہ کہنے پر مجبور ہو گئے تھے کہ "ابن صفی کے لیے نئے ابن صفی کی اصطلاح گڑھنا بھی فاضل مبصر (نصرت ظہیر) کی اپنی سوچ ہے۔ بہتر یہ ہوگا کہ فاضل مصنف ایک بار پھر ڈیڑھ متوالے کا مطالعہ کریں"۔

واضح رہے کہ ہندوستان میں ڈیڑھ متوالے کی تقریب رونمائی کی تصاویر ناول کے ہندوستانی ایڈیشن میں اہتمام سے شائع کی گئی تھیں۔ مذکورہ تصاویر بیچارہ/ری نامی جاسوسی دنیا کے ناول کے پاکستانی ایڈیشن میں شائع کی گئی تھیں۔ پہلی تقریب کے مہمان خصوصی اس وقت کے ہند کے وزیر قانون علی ظہیر جبکہ دوسری کے لال بہادر شاستری تھے۔ مذکورہ تقاریب میں عباس حسینی کے والد حسین حیدر، مجاور حسین رضوی، شکیل جمالی و دیگر شریک تھے۔

☆☆☆

ذکر ڈیڑھ متوالے کا ہے لہٰذا مذکورہ ناول کے ابتدائی اوراق معہ پیشرس سے بات کا آغاز کیا جائے گا۔ وہ پیشرس جو اپنی جگہ ایک ادبی حیثیت و مقام کے حامل ہیں۔ لیکن پہلے ذکر ناول کے انتساب کا جو ابن صفی نے حکیم اقبال حسین کے نام ان الفاظ میں کیا تھا۔

"جناب حکیم محمد اقبال حسین ایم اے۔ پروپرائٹر۔ آئی ساکو (پاکستان) کراچی کے نام۔ جن کے ہاتھوں میں نے تین سالہ طویل علالت سے نجات پائی۔"

حکیم اقبال حسین کون تھے؟ کیا وہ محض ایک حکیم ہی تھے؟

حکیم اقبال حسین ۱۹۰۹ میں شاہ جہان آباد، دہلی میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم سینٹ اسٹیفن کالج سے حاصل کی اور بعد ازاں فارسی میں ایم اے کیا۔ نومبر ۱۹۴۸ میں پاکستان چلے آئے۔ وہ مولانا مودودی کے قریبی رفقاء میں تھے۔ حکیم اقبال حسین ایک حیرت انگیز شخصیت تھے۔ ان کی متذکرہ کتاب 'بڑھاپا اور اس کا سدباب' نے ایک زمانے میں فروخت کے نئے ریکارڈ قائم کیے تھے۔ مذکورہ کتاب کا خصوصی ذکر ابن صفی نے اپنے ایک بعد کے ناول شیطانی جھیل (جاسوسی دنیا) کے پیشرس میں بھی کیا تھا۔ کم لوگ یہ بات جانتے

ہوں گے کہ حکیم اقبال ایک اعلیٰ درجے کے شکاری بھی تھے۔ حکیم اقبال حسین نے ۱۹۳۹ء میں شملہ سے مسوری تک اپنے احباب کے ہمراہ بسلسلہ سیر و شکار بارہ روز تک جاری رہنے والا ایک سفر کیا تھا جس کی دلچسپ روداد ۱۹۴۵ میں شائع ہوئی تھی۔ بعد ازاں یہ طویل مضمون 'شملہ سے مسوری' کے عنوان سے حکیم صاحب کی کتاب 'سیر و شکار' [۲] میں شائع ہوا۔ سن ساٹھ کی دہائی میں حکیم اقبال حسین، ہمدرد کے حکیم محمد سعید مرحوم کی فرمائش پر 'ہمدرد صحت' کے لیے شکار کی کہانیاں قلم بند کرتے رہے تھے۔

حکیم اقبال حسین کا انتقال ۷۲ برس کی عمر میں ۶ اپریل ۱۹۸۰ کو کراچی میں ہوا تھا۔

ڈیڑھ متوالے کے پیش رس میں ابن صفی صحت یابی کے بعد اپنے قارئین سے عرصہ تین برس بعد ان الفاظ میں مخاطب ہوئے تھے۔

''آج پھر تین سال بعد آپ سے مخاطب ہوں۔ اور اس پر یقین رکھتا ہوں کہ آپ کی دعاؤں نے ہی اس قابل کیا کہ پھر خدمت کر سکوں۔ میرا سینہ فخر سے تن جاتا ہے جب یہ سوچتا ہوں کہ میری صحت یابی کے لیے مسجدوں، مندروں، کلیساؤں اور گردواروں میں دعائیں مانگی جاتی تھیں۔ مجھ تک میرے پڑھنے والوں کے خطوط بھی پہنچتے تھے لیکن جواب دینے سے قطعی معذور تھا۔ بس کڑھ کر رہ جاتا تھا۔ بالکل ناکارہ ہو کر رہ گیا تھا۔ توقع نہیں تھی کہ پھر لکھنے کے قابل ہو سکوں گا۔ ایسا محسوس ہونے لگا تھا جیسے کبھی کچھ لکھا ہی نہ ہو۔ بیماری کی ابتدا نروس بریک ڈاؤن سے ہوئی تھی۔ پھر یادداشت پر اثر پڑا اور اس کے بعد مستقل طور پر ہر دوسرے دن شدید قسم کے قلبی دورے پڑتے رہے۔

ادھر یاران طریقت کہ طرح طرح کی افواہیں پھیلا رہے تھے۔ ابن صفی پاگل ہو گیا ہے۔ کاٹنے دوڑتا ہے۔ ابن صفی نے پینے کی حد کر دی تھی (حالانکہ میری سات پشتوں میں بھی کبھی کسی نے نہ پی ہوگی) اس لیے ایک دن نروس بریک ڈاؤن ہو گیا۔ ابن صفی کا کسی سے عشق چل رہا تھا، اس نے بیوفائی کی، دل شکستہ ہو کر گوشہ نشین ہو گیا (حالانکہ گھٹیا قسم کے عشق کا تصور ہی میرے لیے مضحکہ خیز ہے)

آخری اطلاع یہ تھی کہ ابن صفی کا انتقال ہو گیا۔ اس خبر پر سچ مچ اسی طرح جی بھر آیا تھا جیسے میں خود ہی ابھی ابھی ابن صفی کو مٹی دے کر واپس آیا ہوں۔''

ابن صفی کے فن پر محققانہ نظر رکھنے والے اس بات پر متفق ہیں کہ بیماری کے بعد ابن صفی کے قلم کی جولانیاں مزید نکھر کر سامنے آئیں اور ۱۹۶۳ سے ۱۹۸۰ (وفات) تک کے درمیانی عرصے میں انہوں نے نت نئے اور اچھوتے ناول تحریر کیے۔ ہم یہ بات بجا طور پر کہہ سکتے ہیں کہ ابن صفی کی جاسوسی ناول نگاری کے دو ادوار ہیں۔ پہلا ان کی ذہنی بیماری تک اور دوسرا اس سے نجات حاصل کرنے کے بعد کا دور ہے۔ ان دونوں ادوار میں ایک واضح فرق کو محسوس کیا جا سکتا ہے۔ پہلے دور میں لکھے گئے ناولوں میں ان کے کرداروں کے جملوں، برتاؤ اور کہانی کی پیشکش میں ایک کھلنڈرا پن دیکھا جا سکتا ہے۔ جبکہ بیماری سے صحت یابی کے بعد کے ناولوں میں یہی کردار مائل بہ سنجیدگی ہوتے جاتے ہیں۔ اور وفات سے قبل کے دو برسوں میں تو ان کے

کرداروں بالخصوص کیپٹن حمید اور علی عمران کی سنجیدگی کے ساتھ ساتھ گفتگو میں نشتریت کو بھی محسوس کیا جا سکتا ہے۔ آخری دور کے ناولوں کو سامنے رکھ کر بعض اوقات تو یہ یقین کرنا بھی مشکل ہو جاتا ہے کہ ان کے سدا بہار کردار کیا وہی ہیں جو ابتدائی دور یعنی ۱۹۵۲ اور اس کے بعد کے ناولوں میں پیش کیے گئے تھے۔

ابن صفی کی اس بیماری میں مبتلا ہونے کا سبب ناول نگاری میں ان کا حد سے زیادہ انہماک اور ان تھک اور مسلسل محنت کو قرار دیا جاتا ہے۔ صحت یابی کے بعد ان کے معالج نے انہیں بلا تکان ذہنی کام کرنے سے منع کیا تھا۔ لیکن بیماری سے نجات کے بعد کیا ابن صفی اس ہدایت پر عمل پیرا ہو پائے تھے؟ اس کا جواب ہمیں ان کے دوست شاہد منصور کے اس مضمون کی ذیل میں درج سطور سے ملتا ہے جو انہوں نے ''افواہیں'' کے عنوان سے نئے افق ڈائجسٹ۔ جولائی ۱۹۹۴ میں لکھا تھا۔

''اسے راتوں کو جاگ کر اپنی کتابیں مکمل کرنا پڑتی ہیں۔ ان راتوں کی بے خوابی کا نتیجہ وہ ایک بار بھگت چکا ہے جب وہ موت کے منہ میں جا کر واپس آیا تھا۔ مگر اس واپسی کے سفر میں دو ڈھائی سال تک اسے چارپائی پر لیٹنا پڑا تھا۔ یہ بیماری بھی ابن صفی سے گھر کے لگاؤ کو چھین نہیں سکی۔ شروع شروع میں تو بڑے زور شور سے ڈاکٹری ہدایت کی پابندی ہوئی۔ زندگی کو باقاعدہ ٹائم ٹیبل کے خانوں میں بانٹا گیا۔ خوب چکر چلا۔ پھر دھیرے دھیرے ٹائم ٹیبل پر گرد جمنی شروع ہوگئی اور اب وہ گرد میں اتنا اٹ چکا ہے کہ پہچاننا بھی مشکل ہے کہ اصل شے کیا تھی اور دن بھر کی مہمان داری اور یار باشی کے بعد وہی آدھی رات ہی کو موصوف کو ناول لکھنے کا موقع ملتا ہے۔''

یہاں اس بات کا تذکرہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ سری ادب کی معروف برطانوی ادیبہ اگاتھا کرسٹی بھی ایک مرتبہ ذہنی خلل میں مبتلا ہوگئی تھیں۔ اس بیماری کو dissociative fugue کہا جاتا ہے۔ اگاتھا کرسٹی ۳ دسمبر ۱۹۲۶ کو جمعے کی شام اچانک لاپتہ ہوگئی تھیں اور گیارہ روز بعد ایک ہوٹل میں مقیم پائی گئیں۔ اس دوران ان پر کیا بیتی، اس بارے میں وہ کسی کو کچھ نہ بتا سکی تھیں۔ گمشدگی کے وقت ان کا ساتواں ناول The Murder of Roger Ackroyd شائع ہو کر ہر خاص و عام سے مقبولیت کی سند پا چکا تھا۔

جیسا کہ کہا جا چکا ہے کہ ڈیڑھ متوالے کی کہانی کا آغاز ''دلچسپ حادثہ'' نامی ناول سے ہوا تھا۔ علی عمران ابتدا ہی میں اپنی پڑوسن مسز پھٹا کیا سے ایک طے شدہ منصوبے کے تحت اظہار محبت کے نتیجے میں اپنا سر پھٹوا بیٹھتا ہے اور اسپتال میں داخل کیا جاتا ہے۔ سیکرٹ سروس کے سربراہ کی حیثیت سے یہ عمران کو اس کے لندن آفس سے ملنے والی اطلاع ہی کا شاخسانہ تھا کہ اسے مذکورہ پلان پر عمل درآمد کرنا پڑا تھا۔ مقصد یہ تھا کہ وہ اسپتال سے بالآخر اپنے والد کے گھر منتقل ہو سکے جہاں سے اسے اپنے والد کی حفاظت کرنے میں آسانی ہو سکے۔ عمران کے والد اور انٹیلی جنس بیورو کے ڈائرکٹر سر رحمان کے محکمے کی تحویل میں ایک غیر ملکی جاسوس کی حوالگی کے سلسلے میں اسکاٹ لینڈ یارڈ سے دو افسروں کی آمد اور ایک دوسرے ملک کے جاسوسوں کی اس معاملے میں مداخلت کے گرد گھومتی اس کہانی میں اس وقت ایک اہم موڑ آتا ہے جب ڈیڑھ متوالے کا مرکزی

ویلن ''کبڑا'' منظر عام پر آتا ہے۔ کبڑا جس کے اصلی نام کو ابن صفی نے کسی موقع پر ظاہر نہیں کیا اور وہ آخر تک ظاہری و عمومی طور پر ایک بے بس اور جسمانی طور پر کمزور کردار کی حیثیت ہی سے جانا جاتا رہا۔ درحقیقت وہ ایک جینئس تھا۔ ایک غیر ملکی ایجنٹ جن کی حرکتوں سے عمران کے ملک کے تیسری عالمی جنگ کے لپیٹے میں آنے کا خدشہ پیدا ہو گیا تھا۔ عمران اپنے والد کو درپیش تمام خطرات سے تو نکالنے میں کامیاب ہو گیا لیکن کبڑا اس کے لیے دردسر بن کر رہ گیا تھا۔ بے آواز سیارہ میں عمران کے ملک کے معروف سائنسدان ڈاکٹر داور کو کبڑے کی جانب سے اغوا کر لیا جاتا ہے اور عمران ان کی بازیابی کے لیے نکل کھڑا ہوتا ہے۔ ڈاکٹر داور ایک چور ملک کی جانب سے خلا میں چھوڑے گئے ایک بے آواز سیارے کی اپنے ایجاد کردہ طاقتور ٹیلی اسکوپ سے تصاویر لیتے ہیں۔ چور ملک کو اس بات کا علم ہو جاتا ہے اور وہ اپنے ایجنٹ کبڑے کے ذریعے ڈاکٹر داور کو اغوا کروالیتا ہے۔ عمران پہلے ہی سے بحیثیت ایک پاگل شخص کے کبڑے کی تحویل میں ہوتا ہے۔ ناول کے آخر میں ڈاکٹر اور عمران کبڑے کی قید سے فرار ہونے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔

اس موقع پر پلاٹ کے اعتبار سے یہ مضبوط کہانی ابن صفی کی تین سالہ علالت کے سبب رک جاتی ہے۔ جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے ڈیڑھ متوالے ۲۱ نومبر ۱۹۶۳ کو منظر عام پر آئی تھی۔ یہ ایک ایسے مصنف کے قلم کا شاہکار تھا جو دوران علالت پورے تین برس تک ایک لفظ بھی نہ لکھ سکا تھا۔ عارضہ اور وہ بھی دماغی...... اچھے اچھوں پر یہ وقت بھاری ہوتا ہے۔ چہ جائیکہ ایک لکھاری اور وہ بھی ایسا کہ کروڑوں قارئین کے دلوں پر راج کرنے والا...... اس کے پڑھنے والوں کو توقعات بھی اسی مناسب سے وابستہ تھیں اور ذہنوں میں گردش کرنے سوالات بھی اسی مناسبت سے قارئین کے پیش نظر تھے۔ کیا ابن صفی قلم کی جولانیاں برقرار رکھ پائیں گے......؟

ڈیڑھ متوالے کا نام بھی عجیب و غریب تھا۔ آخر اس کی وجہ تسمیہ کیا تھی......؟ کبڑے نے اس دوران ساجد نگر نامی اسٹیٹ کی حکمران رانی سے شادی رچالی ہوتی ہے اور وہ خاتون غیر معمولی طور پر قد آور دکھائی گئی ہے۔ ایک غیر معمولی طور پر حسین چہرے کی مالک بے انتہا دولت مند خاتون جبکہ کبڑا بے حد پستہ قد...... عمران اس بے ہنگم جوڑے کو اسی مناسبت سے ڈیڑھ متوالے کا نام دیتا ہے۔ اس بے جوڑ شادی کا پس منظر رانی ساجد نگر کے پالتو کتے 'بے بیؤ' کی موت ہے جس کے مرنے پر رانی غم سے نڈھال ہو گئی تھی اور قریب تھا کہ خود کو نقصان پہنچا بیٹھتی کہ اسی اثناء میں کبڑا اس سے جا ٹکرایا۔ وہ اسے دیکھ کر کھل اٹھی' اس لیے کہ اسے کبڑے میں اپنے کتے کی جھلک دکھائی دی تھی۔ پہلے رانی نے کبڑے کو اپنے پاس ملازم رکھا' پھر بے تکلف ہوئی اور پھر شادی کر بیٹھی۔

کبڑے کو پسند کرنے کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی وہ 'بے بیؤ' کی طرح رانی ساجد نگر کے تلوے چاٹا کرتا تھا۔

کبڑے کا کردار بیک وقت ایک چالاک مجرم اور ایک بے بس و مجبور انسان کی حیثیت سے سامنے آتا

ہے۔گروہ کے لوگوں کے لیے وہ خوف کی علامت تھا۔ان کی کمزوریوں پر کڑی سے کڑی سزا دینے والا جبکہ دوسری جانب رانی ساجد نگر ہو یا عمران کے کبڑے کے پاس بغرض جاسوسی بھیجے گئی روشی نامی اینگلو برمیز نسوانی کردار ان سبھوں کے سامنے اس کا کردار ایک قابل رحم انسان کا تھا۔کبڑا ایک بے رحم جاسوس تھا۔ہمبگ دی گریٹ' کہلایا جانے والا ایک گھناؤنا مجرم لیکن درحقیقت اس کا بچپن محرومیوں میں بسر ہوا تھا۔تین ناولوں کی اس سیریز کے آخری ناول ڈیڑھ متوالے میں وہ روشی کے سامنے اپنے حالات بیان کرتا ہے اور یہ وہ واحد موقع ہوتا ہے جب قاری کو اس سے ایک نوع کی ہمدردی پیدا ہو جاتی ہے۔خاص کر کہ جب وہ ان الفاظ میں اپنا ماضی بیان کرتا ہے۔

''جن لوگوں نے میری پرورش کی تھی بہت نیک لوگ تھے۔انہوں نے مجھے ایک شاہراہ پر پڑا پایا تھا۔وہ اپنے بچوں کو معمولی شرارتوں پر پیٹ دیا کرتے تھے

لیکن مجھے کبھی کسی نے نہیں مارا۔خواہ میں کچھ بھی کرتا......وہ مجھ پر ترس کھاتے تھے۔تم خود سوچو......ایک ننھا سا کبڑا......قابل رحم۔میرا جی چاہتا تھا کہ وہ عورت جسے میں ماں کہتا تھا' کبھی کبھی مجھے بھی آنکھیں دکھا دیا کرے۔مجھے بھی جھڑکا کرے......مجھے بھی مارا کرے جیسے اپنے بچوں کو مارتی تھی۔لیکن اس نے کبھی غصیلے لہجے میں مجھے مخاطب نہیں کیا۔''

غور کیجیے۔ابن صفی جب کبڑے کی زبان سے خود اس کو بجائے ایک ''کبڑا بچہ'' کے ''ایک ننھا کبڑا'' کہلواتے ہیں تو کیا یہ الفاظ قاری کے سامنے ایک مجسم بے بس ننھے کبڑے کی شکل اختیار نہیں کر لیتے؟ایک ننھا کبڑا کی اصطلاح حساس دلوں کو دکھ سے بھر دینے کے لیے کافی ہے۔ایک حقیر ننھا کبڑا جو بچپن میں ایک بچہ ہی تو تھا۔وہ تمام جذبات اور معصومانہ خواہشات رکھتا تھا جو کسی بھی ننھے سے بچے کے ہو سکتے ہیں لیکن وہ اپنی کمر کے اب کا کیا کرتا جو اس کے جسم کا لازمی جز تھا اور اب اسے اسی کے ساتھ زندگی بسر کرنی تھی۔

درحقیقت ڈیڑھ متوالے کا کبڑا ابن صفی کے دیگر ناولوں کے چند دیگر انتہائی اہم نفسیاتی کرداروں کی صف میں شامل ہے۔ایک ایسا کردار جس کی شخصیت کے گرد لپٹی تہوں کو ابن صفی نے دلچسپ حادثہ سے کھولنا شروع کیا تھا اور یہ سلسلہ بے آواز سیارہ سے ہوتا ہوا ڈیڑھ متوالے کی آخری سطور تک چلتا چلا گیا تھا۔

ڈیڑھ متوالے کا پیش رس ہو یا ناول کی کہانی......ابن صفی نے ہر قدم پر اپنی تین سالہ غیر حاضری کے دوران اس عرصے میں وقوع پذیر ہونے والے ادبی' سماجی اور سیاسی رویوں سے مکمل باخبری کا احساس دلایا ہے۔ڈیڑھ متوالے میں ابن صفی کے قلم کی جولانیاں اپنے عروج پر تھیں۔وہ ایک فطری طنز و مزاح نگار تھے اور مذکورہ ناول میں انہوں نے دل کھول کر اپنی صلاحیت کا استعمال کیا تھا۔خالص جنگل کا ماحول' شکار' رقص و طرب کی محفلیں' کیمپ فائر' شعر و شاعری کی محفل' ایکشن' جاسوسی' نفسیاتی رویے' ایڈونچر' ڈاکو......اور سلگتا سلگتا سا رومان......غرضیکہ ڈیڑھ متوالے میں ابن صفی نے ایک رنگا رنگ دنیا بسائی ہے......یہ ابن صفی کی دنیا ہے......یہ ابن صفی کی اپنے قاری کے لیے بسائی وہ پرکشش دنیا ہے جس میں وہ آج بھی سانس لے رہا ہے۔

وہ ایکشن اور ایڈونچر سے بھرپور کوئی فلم دکھنا چاہتا ہے اور اگر فلم کے انتخاب میں تذبذب کا شکار ہوتا ہے تو ڈیڑھ متوالے جیسے ناولوں کا مطالعہ شروع کر دیتا ہے۔

کون سا ایسا پہلو ہے جو ہمیں مذکورہ ناول میں نظر نہ آتا ہو...... ناول کی دلچسپی کا یہ عالم ہے کہ مجال ہے کہ ابتدا تا انتہا قاری کی توجہ کسی اور جانب مبذول ہو پائے۔ تین سال پہلے عمران اور ڈاکٹر داور کی کبڑے کی قید سے رہائی پر ختم ہونے والی کہانی ڈیڑھ متوالے کا آغاز صفدر جنگ نامی مضبوط کردار سے ہوتا ہے جو دور تک بکھرے ہوئے جنگل کے عین درمیان واقع عمارت کے مکینوں کی قسمتوں کا مالک ہوتا ہے...... ایک من موجی کنوراجدی پشتی نواب...... امریکی کاؤبوائز سے متاثر اور خود کو امریکی کہانیوں کے کسی tough guy کے روپ میں خود کو پیش کرنے کا شائق۔ یہ خود کو حضور یا سرکار کہلوائے جانے کے مقابلے میں 'باس' کہلوانا پسند کرتا ہے...... ایک ایسا کردار جس کے آزادانہ زندگی بسر کرنے کے طریقہ کار سے متاثر ہو کر آپ کو پہلی ہی نظر میں اس سے محبت ہو جاتی ہے۔ درجنوں مصاحبوں کی فوج رکھنے والا جن کے اصلی ناموں سے اسے چڑتھی اور جو انہیں 'ٹڈ' 'فریڈ' 'ڈفٹی' 'ہارڈی اور شارٹی جیسے القابات سے پکارنا پسند کرتا تھا...... اور پھر رنگا رنگ کرداروں کی اسی بھیڑ سے نکل کر سامنے آتی ہے ہمارے اس ناول کی ہیروئن...... نسیم النساء خاتون۔ صفدر جنگ کی سیکریٹری۔ لیکن یہ کیسے ممکن تھا کہ صفدر جنگ اسے اس دقیانوسی نام سے پکارتا سو وہ کہلائی ''نینا...... '' 'نینا' صفدر جنگ سے کب خوش تھی۔ بعض اوقات اسے اپنے باس پر اس شدت سے غصہ آتا تھا کہ موقع ملتا تو وہ اس کی بوٹیاں ہی نوچ لیتی۔ وہ دل ہی دل میں کہتی تھی کہ ''باس...... تم حقیقتاً مچھر جنگ ہو۔ اپنی اوقات کو نہ بھولو...... شاید میرا ہی ایک تھپڑ نہ برداشت کر سکو۔''

کبڑے کی قید سے فرار ہوئے عمران اور ڈاکٹر داور، صفدر جنگ کی کوٹھی کی جانب جا نکلے تھے۔ اور عمران کی دلچسپ و برو قت چرب زبانی کی بدولت انہیں وہاں پناہ مل جاتی ہے۔ رفتہ رفتہ عمران صفدر جنگ کا اعتماد حاصل کر لیتا ہے اور ادھر ہمارا کاؤبوائے عمران کا کبڑے کی قید میں رہنے کے پس منظر سے بھی واقف ہو جاتا ہے۔ تب عمران کو علم ہوتا ہے کہ کبڑا کسی زمانے میں درحقیقت صفدر جنگ ہی کا ایک معمولی ملازم تھا۔ صفدر جنگ اور رانی ساجد نگر کا معاملہ وہی تھا جو بادشاہوں کا آپس میں ہوا کرتا ہے۔ دونوں بادشاہ اور ایک دوسرے کے مدمقابل۔ صفدر جنگ اس بات پر شدت سے نالاں کہ اس کا ایک معمولی ملازم آج اس ایک ایسی عورت کا شوہر بن بیٹھا ہے جسے صفدر جنگ نے کبھی پسند ہی نہ کیا تھا۔ رانی ساجد نگر کو وہ حقارت سے ''شتر زادی'' کہتا تھا۔ ایک موقع پر وہ کبڑے کے بارے میں عمران کو زہر خند لہجے میں بتاتا ہے'' وہ حقیر چیونٹا میرا غلام تھا...... اور اب رانی ساجد نگر اس کی بیوی ہے۔''

ابتدا ہی میں صفدر جنگ، عمران جیسے جاذب نظر شخص سے نینا کے فطری جھکاؤ اور لگاؤ کا کھٹکا دل میں لیے عمران کو ان الفاظ میں متنبہ کرتا ہے۔

''لیکن تم میری سیکریٹری سے عشق نہیں کرو گے۔ سمجھے جوان آدمی۔''

''ان سے عشق کروں گا؟'' عمران نے حقارت آمیز لہجے میں کہا۔''ابھی ان کی عمر ہی کیا ہے۔ ارے جناب! ستر ستر سال کی بوڑھیاں پیچھے لگی رہتی ہیں مگر میں کسی کو لفٹ نہیں دیتا۔ ویسے مجھے اپنی بکری کے علاوہ آج تک کسی سے عشق نہیں ہوا ہے کیونکہ وہ صبح شام ڈھائی سیر دودھ دیتی ہے۔ الحمد اللہ......!''

نینا شرم اور جھلاہٹ کے ملے جلے اثرات کے تحت بوکھلا کر اٹھی اور تیزی سے ہال سے نکل گئی۔

اس موقع پر قارئین کی دلچسپی کے لیے ایک اہم بات کا تذکرہ ضروری ہے۔ ڈیڑھ متوالے میں نینا پر یہ عمران کی پہلی چوٹ نہیں تھی۔ اس نے ایک دوسرے موقع پر صفدر جنگ سے مخاطب ہو کر نینا کی تنگ پتلون پر ایک پھبتی کسی تھی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ پاکستانی ایٹمی کمیشن کے ایک سابق چیئرمین ڈاکٹر آئی ایچ عثمانی [۳] نے' جو ابن صفی کی تحریروں کے مداح تھے' ایک انٹرویو میں کہا تھا کہ ''میں نے ان کے ناول ''ڈیڑھ متوالے'' کے بارے میں ایک خط بھی لکھا تھا جس میں اس ناول کے بعض حصوں کے بارے میں لکھا تھا کہ یہ حصے آپ کے شان شایان نہیں اس نشان دہی پر انہوں نے میرا شکریہ ادا کیا تھا اور بعد میں اس قسم کے حصے میری نگاہ میں نہیں آئے۔''

یقیناً ڈاکٹر عثمانی کا اشارہ انہی ٹکڑوں کی جانب رہا ہوگا۔ دوسری طرف یہ ابن صفی کا وصف خاص تھا کہ وہ اپنے قارئین کی خواہشات کے مطابق لکھا کرتے تھے۔ ورنہ اپنے پڑھنے والوں کے اتنے ناز کون اٹھاتا ہے۔ رہا سوال ان کے قابل اعتراض ہونے کا تو راقم الحروف نے آج بھی ابن صفی کے پڑھنے والوں کو ناول میں بیان کردہ اسی ''مخصوص صورت حال'' میں یہ پھبتیاں کستے دیکھا ہے۔

☆☆☆

صفدر جنگ کی قید سے کبڑا ڈاکٹر داور کو لے اڑتا ہے۔ اور عمران ان کی تلاش کی فکر میں غلطاں ہو کر صفدر جنگ کو اپنی لفاظی سے تاؤ دلا کر مجبور کر دیتا ہے کہ کسی بھی طرح ڈاکٹر داور کی بازیابی ممکن ہو سکے۔ عمران کے فقرے ملاحظہ ہوں۔

''میں اسے بوریت ہی سمجھتا ہوں کہ مارے مارے پھریں شکار کے چکر میں۔ آپ نہیں جانتے کہ میں کس طرح اپنا یہ شوق پورا کرتا ہوں۔ دو چار شریف آدمی اور چند بکرے ساتھ لیے اور نکل گیا شکار کو۔ کسی جنگل میں پہنچ کر بکروں کو پہلے بندوق سے مارا' پھر ذبح کر ڈالا۔ اس کے بعد بھن رہا ہے شکار اور اور مزے کر رہے ہیں شکاری......ہا......ہا ہو''

صفدر جنگ غرا کر ناشتے کی میز سے اٹھتا ہے اور چیخ کر عمران کے متعلق اپنے مصاحبوں سے کہتا ہے کہ کھینچ کر ساتھ لے چلو اسے' میں دکھاؤں گا کہ شکار کیسے کھیلتا ہوں۔ کیمپنگ بھی ہوگی۔ شکار کا طبل بجتا ہے اور صفدر جنگ کا یہ 'غول بیابانی' لاؤ لشکر سمیت نکل کھڑا ہوتا ہے۔

جنگل میں دوران شکار ایک موقع پر عمران کا گھوڑا بدک جاتا ہے اور وہ سیدھا ساجد نگر یعنی کبڑے کے پاس جا پہنچتا ہے۔ موسم برسات کی خبر لا رہا ہوتا ہے اور ایسے موسم میں کبڑا دختر رز سے شوق کرتے ہوئے اپنی وسیع و

عریض کوٹھی کے لان میں بیٹھا ہوتا ہے۔ ناول میں یہ پہلا موقع تھا جب ابن صفی' کبڑے کی زبانی ادب کی دنیا اور رویوں کے بارے میں بات کرتے ہیں۔ طنز و مزاح کی چاشنی لیے یہ اقتباس ملاحظہ ہو۔

''کبڑا روشی سے مخاطب ہو کر بولا' کوئی حسین سا گیت چھیڑو۔ اور پھر وہ خود ہی گنگنانے لگا.. جوش کی ایک رومانی نظم۔

عجب نوجوانی تھی اپنی بھی پیارے
نہیں بھولنے کے وہ کافر نظارے

پھر نظم ادھوری ہی چھوڑ کر بولا' ایسی حسین نظمیں لکھی ہیں اس ظالم نے کہ بعض اوقات ورڈ سورتھ کو بھی جھکائی دے گیا ہے۔ واہ کیا نظم تھی آواز کی سیڑھیاں..... مگر اب آج کل عقل و دانش کے پتھر چبا رہا ہے۔''

حال ہی میں راقم الحروف نے ماہر جوش ڈاکٹر ہلال نقوی سے ابن صفی کے تحریر کردہ درج بالا ٹکڑے کی بابت گفتگو کی تھی۔ ڈاکٹر ہلال کے مطابق ''قطرہ و قلزم'' کے عنوان سے جوش ملیح آبادی کی رباعیات کا مجموعہ ۱۹۶۳ء ہی میں شائع ہوا تھا۔ جوش نے ان رباعیات میں 'عقل و دانش' ہی کی بات کی ہے۔ اسی پر زور رہا ہے۔ ڈاکٹر ہلال کے بقول جوش نے اپنی شاعرانہ زندگی میں ان گنت رباعیات تمام تر تخلیقی وقت کے ساتھ کہی تھیں' اس صنف میں ان کی دلچسپی کسی سے ڈھکی چھپی نہیں تھی۔ جوش کے نظریے کے مطابق زندگی کے تمام چھوٹے بڑے مسائل عقل ہی کے ماتحت ہیں۔ اقبال کہتے ہیں ''بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق'' جبکہ جوش کے یہاں ہمیں جو نظریہ ملتا ہے اس کے مطابق ''بہ جبر آگ میں جھونکے گئے تھے ابراہیم۔''

صفدر جنگ عمران کو کبڑے کی قید سے تو چھڑا لاتا ہے لیکن شکار کا سلسلہ اس کے حکم پر جاری ہی رہتا ہے۔ ابن صفی کا بیانیہ قاری کو کسی حقیقی شکار ہی کا لطف اٹھانے پر مجبور کر دیتا ہے۔ جنگل میں منگل کا سماں..... اسی دوران صفدر جنگ شکار کے ساتھ ساتھ مشاعرے کا اہتمام بھی کرتا ہے۔ دارالحکومت سے دو عدد شاعر درآمد کیے جاتے ہیں اور یہاں ابن صفی پھر چھیڑ چھاڑ کے موڈ میں آتے دکھائی دیتے ہیں۔ شام ڈھلتے ہی بوتلیں کھلنا شروع ہو جاتی ہیں۔ جیسے ہی ایک شاعر بیاض سنبھال کر شروع ہونے لگتا ہے' عمران ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو جاتا ہے۔

''سرکار''.... اس نے بڑی عاجزی سے پوچھا۔ ''شہر والی تو نہ ہوگی؟''

''میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔'' شاعر نے بڑی شائستگی سے حیرت کا اظہار کیا۔

''شہر کا تذکرہ سنتے سنتے کان پک گئے ہیں۔ ہر غزل میں کم از کم ایک شعر ضرور ایسا پایا جاتا ہے' جس میں لفظ شہر موجود ہو۔''

شاعر صاحب نے غیر ارادی طور پر بیاض کے صفحے پر نظر دوڑائی..... پھر مسکرائے اور بولے'' جی ہاں..... اتفاق سے ایک شعر موجود ہے جس میں شہر کا تذکرہ ملے گا۔ مگر وہ شہر آرزو ہے۔''

''وہ تو اور زیادہ بور کرتا ہے۔'' عمران سے اور زیادہ عاجزی سے کہا۔ ''مکانوں' دکانوں اور سڑکوں والے شہر

سے۔جی نہیں گھبراتا البتہ جو یہ نئے نئے شہر آپ لوگوں نے پیدا کر لیے ہیں مجھے بوکھلا کر رکھ دیتے ہیں۔"

"بیٹھ جاؤ...... بیٹھ جاؤ......" صفدر جنگ نے ہاتھ ہلا کر کہا۔

دوسرے شاعر صاحب اپنی غزل سناتے ہیں، اور نشے میں دھت سامعین کی اکثریت سے داد پاتے ہیں۔ پھر وہ دلآویز انداز میں مسکرا کر عمران سے گویا ہوتے ہیں "فرمایئے جناب غزل کیسی رہی۔اس میں تو شہر نہیں آیا۔"

اور جواب میں عمران کہتا ہے "ہر چند کہ اس میں لفظ شہر نہیں آیا...... اللہ کا لاکھ لاکھ احسان ہے مجھ پر لیکن یار پتہ نہیں کیوں ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے تم سب کسی ایک ہی استاد سے غزل کہلوالاتے ہو۔ مشاعروں میں سنتا ہوں...... رسالوں میں پڑھتا ہوں...... سب ہوں کا ایک ہی رنگ نظر آتا ہے...... خدا بھلا کرے فیض صاحب کا کہ انہوں نے اپنے بعد پھر کوئی اور جینئس شاعر پیدا ہی نہ ہونے دیا۔ صرف دو تین اس بھیڑ سے الگ معلوم ہوتے ہیں جیسے جمیل الدین عالی اور جعفر طاہر وغیرہ۔ آگے رہے نام اللہ کا......"

"اچھا......" شاعر صاحب جھلا کر بولے "سردار جعفری کے متعلق کیا خیال ہے؟"

"پتھر توڑتے ہیں۔"

"واہ واہ سبحان اللہ۔" صفدر جنگ ہاتھ اٹھا کر داد دینے کے سے انداز میں شور مچانے لگا "جواب نہیں ہے اس تنقید کا"۔

واضح رہے کہ زیر نظر تحریر کے آغاز میں فیض احمد فیض کا ایک قول نقل کیا گیا تھا۔ واضح رہے کہ فیض کے ہمراہ 'دکانیں' لگانے والوں میں سجاد ظہیر وغیرہ کے علاوہ علی سردار جعفری بھی تھے۔

☆☆☆

اس موقع پر کہ محفل ناؤنوش اپنے عروج پر تھی' کبڑے نے ایک مقامی انتہائی خطرناک ڈاکو خمیسو کے گروہ سے صفدر جنگ کے اس کیمپ پر حملہ کرا دیا۔ اندھیرے میں گولیاں چلنے لگیں۔ ہر طرف افراتفری پھیل گئی۔ لوگ زخمی ہو گئے۔ جس کا جدھر منہ اٹھا' ادھر بھاگ نکلا۔ ایسے میں نینا کے بازو سے ایک گولی چھو کر گزری اور وہ نیم بے ہوشی کے عالم میں عمران پر گر پڑی۔ عمران اسے کمر پر لادے ایک جانب رینگتا ہوا محفوظ جگہ کی تلاش میں آگے بڑھنے لگا۔ وہ ڈاکوؤں کی زد سے نکلنے میں کامیاب ہو گئے' اسی اثناء میں صفدر جنگ کا ایک پوربی بولنے والا مصاحب شیخو المعروف ٹونی بھی ان سے آملتا ہے۔

صفدر جنگ کا منجانب عمران یہ خدشہ کہ "جوان آدمی! تم میری سیکریٹری سے عشق کرنے کی کوشش نہیں کرو گے" غلط ثابت ہوا لیکن بیچاری نسیم النساء خاتون تو شکار کے دنوں ہی میں عمران میں غیر ارادی طور پر دلچسپی لینے لگی تھیں۔ یہاں عمران سیریز کے ایک کلیدی کردار جولیا فٹز واٹر کا عمران کے بارے میں وہ قول ایک مرتبہ پھر سچ ہوا کہ "وہ تھوڑے دنوں بعد ہر کسی کو اچھا لگنے لگتا ہے۔"

☆☆☆

عمران اور نینا کا میل..... جنگلوں میں ان دونوں کرداروں کا شیخو کے ہمراہ ڈاکوؤں کی دستبرد سے خود کو محفوظ رکھنے کی تگ و دو میں بھٹکنا...... مکالموں اور منظر نامے میں ایک سلگتا سا رومان..... غرضیکہ ڈیڑھ متوالے کی مجموعی فضا کسی ایڈونچر سے بھرپور فلم سے کسی طور کم نہیں کہی جاسکتی۔ لیکن کیا عمران زندگی میں کسی بھی لڑکی سے متاثر ہوا تھا؟ وہ تو صنف نازک کو متاثر کرنے والی شے تھا۔ جامعہ ملیہ دہلی کے مدرس اور ادیب ڈاکٹر خالد جاوید کہتے ہیں۔

''عمران کا کردار ابن صفی کی اپنی پیچیدہ اور تہ دار تخلیقیت کی سب سے بڑی مثال ہے۔ ساری دنیا کے جاسوسی ادب میں عمران جیسا کوئی کردار تخلیق نہیں کیا گیا نہ ہی اس کے کسی رول ماڈل کا سراغ حاصل ہوتا ہے۔ عمران کے کردار میں تو پرتیں ہی پرتیں پوشیدہ ہیں۔ ایسی ہی کسی پرت میں ایک بامعنی افسردگی بھی موجود ہے۔ وہ سماج سے برہم نہیں ہے بلکہ سماج کا مذاق اڑاتا ہے۔ وہ ایک وجودی کردار ہے۔ عمران 'حماقت' کے فلسفے کا قائل ہے۔''

مہم جوئی پر مشتمل اس دلچسپ ناول میں عمران اور نینا کے اتفاقیہ طور پر ہوئے باہمی تعلق نے ناول میں ایک خاص طرح کی دلکشی و جاذبیت پیدا کر دی ہے۔ نینا کی زندگی اس کے شب و روز اور اس کی سوچ میں علی عمران کی آمد سے قبل ایک ہی عنصر غالب تھا...... وہ بوریت اور صرف بوریت کا شکار تھی۔ لیکن عمران سے ملاقات کے بعد وہ جیسے دوبارہ جی اٹھی ہو۔ علی عمران کی حماقت سے بھرپور شخصیت اور اس کے عملی مظاہرے تو نینا نواب صفدر جنگ کی کوٹھی میں دیکھ ہی چکی تھی لیکن اسے کیا معلوم تھا کہ جلد ہی ایک ایسا وقت آئے گا جب اسے دشمنوں سے بچنے کے لیے عمران کے ساتھ جنگلوں میں مارا مارا پھرنا پڑے گا۔ یہی ناول کے دلکش ترین حصے ہیں۔ دونوں کے مابین ہوئے مکالمے دلچسپ ہیں بلکہ ان میں مزاح کے ساتھ ساتھ ابن صفی کا وہ رنگ بھی نمایاں ہے جس کے لیے وہ مشہور تھے۔ ملاحظہ کیجیے۔

''میرا باپ صفدر جنگ کا ملازم ہے۔ ہم لوگ اس کے پشتینی نمک خوار ہیں۔ کوئی بھی شریف النفس آدمی ایسے بندھنوں کو نہیں توڑ سکتا...... یا توڑ سکتا ہے؟ میں نے کئی بار سوچا لیکن جب اس کے احسانات یاد آئے تو سارا جوش ٹھنڈا ہو گیا۔'' نینا نے کہا۔

میرا بھی یہی خیال ہے کہ تم اس سے پیچھا نہیں چھڑا سکتیں۔ بہت سمجھدار اور نیک لڑکی ہو۔ بہت سمجھدار اور نیک لڑکیاں عموماً برباد ہو جایا کرتی ہیں۔'' عمران نے جواب دیا۔

''کیا مطلب''

''مطلب ہی تو سمجھ میں نہیں آتا۔'' عمران نے مغموم لہجے میں کہا۔ ''مطلب سمجھ میں آتا ہوتا تو میٹرک میں پانچ سال فیل ہوتے رہنے کے بعد پڑھنا کیوں چھوڑ دیتا۔ وہ امتحان میں پوچھتے تھے کہ عاد اعظم مشترک کسے کہتے ہیں اور میں سکندر اعظم کی سسرال کے حالات لکھ دیا کرتا تھا۔''

نینا جوان جنگلوں کا کیڑا سمجھی جاتی تھی' اس طرح رستہ بھولی کہ درست سمت کا کوئی سرا ہی نہ ملتا تھا۔ اس

دوران کئی مرتبہ ڈاکوؤں نے انہیں گھیرنے کی کوشش کی لیکن عمران کی بروقت وضع کردہ حکمت عملیوں کی وجہ سے ناکام رہے۔ عمران اور نینا کے مابین ہوئے مکالموں کی مدد سے ایک جانب قارئین محظوظ ہوتے ہیں تو دوسری طرف ان کے سامنے نینا کے نجی حالات بھی آتے جاتے ہیں۔ عمران' نینا اور ٹونی تین دنوں کے بھوکے جنگل میں بھٹک رہے ہوتے ہیں۔ ایسے میں ایک موقع پر ابن صفی کے قلم سے نکلے یہ مکالمے ملاحظہ ہوں۔

دفعتاً عمران نے ٹھنڈی سانس لی "اب یہ بات سمجھ میں آئی ہے کہ پاجامہ واقعی بڑی عظیم چیز ہے"

"خدا کے لیے چپ رہو۔" نینا مضمحل سی آواز میں بولی۔ "اب ہنسنے کی بھی سکت نہیں رہ گئی۔"

"نہیں۔ ہنسنے ہنسانے کی بات نہیں۔" عمران سنجیدگی سے بولا "میرے دادا جان مرحوم فرمایا کرتے تھے کہ پتلون کو پاجامے کی جگہ دے کر اچھا نہیں کیا گیا۔ میں سچ کہتا ہوں کہ اگر جشن کے وقت پاجامہ پہنے ہوتے تو آج بھوکوں نہ مرنا پڑتا۔ پاجامے سے کمر بند کھینچ کر گوپھن بناتا اور کرتا پرندوں کا شکار...... کیوں کیسی رہی؟"

"میں سونا چاہتی ہوں"

"ہوں...... ضرور...... اگر خواب میں روٹیاں نظر آئیں تو مجھے بھی سلا لینا...... فرض کرو اگو کچھ پرندے ہاتھ بھی آ جائیں تو کیا ہم انہیں کچا چبائیں گے۔ تم اتنی واہیات لڑکی ہو کہ سگریٹ بھی نہیں پیتیں...... پیتی ہوتیں تو دیا سلائیاں یا سگریٹ لائٹر ضرور رکھتیں۔ لاحول ولاقوۃ۔"

"تم کیوں نہیں پیتے سگریٹ۔" نینا نے سر اٹھا کر جھلائے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"نہایت فرمانبردار لڑکا ہوں۔" عمران نے سر ہلا کر کہا۔ "بچپن میں ایک بار اماں بی نے سمجھا دیا تھا کہ سگریٹ پینے سے قلب سیاہ ہو جاتا ہے۔ اسی لیے آج تک نہیں پی۔ انہی پیسوں کا گھی دودھ کھاتا پیتا ہوں۔"

نینا عمران کی لاف گزاف سن کر جھلا کر اٹھ بیٹھتی ہے اور چند مزید جملوں کے تبادلے کے بعد عمران کی ایک قیاس آرائی کے جواب میں صفدر جنگ کی ملازم ہونے کا سبب بھی ان الفاظ میں بیان کرتی ہے۔ "تم کچھ بھی نہیں سمجھے...... غلط سمجھے ہو۔ اس سے میرا کوئی ایسا رشتہ نہیں جس پر مجھے شرمندگی ہو۔ میں اس کی پروردہ ہوں۔ میری پرورش اس کی لڑکیوں کے ساتھ ہوئی ہے۔ میرا باپ اس کا ملازم ہے۔ میرے تین بھائی بھی اسی کے ٹکڑوں پر پل رہے ہیں۔ میری ماں بچپن ہی میں مر گئی تھی۔ صفدر جنگ نے مجھے محل کی نرسوں کے سپرد کر دیا تھا۔"

شیخو المعروف ٹونی' ابن صفی کے قلم سے تخلیق کردہ ایک دلچسپ کردار ہے۔ ڈیڑھ متوالے کی رنگا رنگ دنیا دیگر کرداروں کے ساتھ ساتھ شیخو کے دم سے بھی آباد ہے۔ ابن صفی' صفدر جنگ کے اس 'منہ لگے' کردار کا تعارف ایک موقع پر ان الفاظ میں کراتے ہیں۔

"اس کا نام شیخو تھا لیکن اس دربار میں ٹونی کہلاتا تھا۔ چونکہ پڑھا لکھا نہیں تھا اس لیے ابھی تک صفدر جنگ اسے ڈھب پر نہیں لا سکا تھا۔ ہر چند کہ وہ شیخ ثناء اللہ شارٹی اور منشی کرامت اللہ ہارڈی کی نقل کرنے کی کوشش کرتا تھا مگر وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی۔ اس کی تو زبان بھی ٹھیک نہیں تھی۔ آدھی اردو اور آدھی پوربی

بولتا تھا۔"

ناول میں ایک مقام پر عمران، شینخو کو اسے فارسی پڑھ لینے کا مشورہ دیتا ہے اور جواب میں شینخو ان الفاظ میں اپنے بارے میں بتاتا ہے۔

"اب کا پڑھبے بڑھوتی ما...... ہمار سرکار بہت چاہن کہ ہم انگریجی پڑھ لے ای۔ مدانہ پڑھ سکن.....بس باسٹر واسٹر کہہ لے ات ہی..... اور او کا ہوت ہے..... ڈیم بلاڈی ڈیوٹ"

"ایڈیٹ" عمران نے تصحیح کی۔

"ہی.....ہی....." ٹونی سر ہلا کر بولا۔

ڈیڑھ متوالے سے شینخو کے چند فقرے ملاحظہ ہوں۔۔

ہم کا جانی باس یو سرواحرامی پن کرنا مانگتا (ایک موقع پر گھوڑے کو قابو کرتے ہوئے)

ہم رہے جائیت ہے باس..... ہائے بپون.... ایہہ کی مہتاری کا..... (اپنے قافلے کے اراکین کے پیچھے چھوڑ جانے پر ردعمل)

ہائے بپون ہس نیک گاوت ہو۔ (ایک شاعر کی غزل سن کر)

اے تم کا ایٹ کیٹ نہیں آوت (عمران کے شراب نوشی سے انکار پر)

باہ با..... باہ بھیا..... رگڑ دیو سرون کا..... ڈیم بلاڈی باسٹر والا۔ (عمران کے ڈاکوؤں پر قابو پانے کی کوشش کے دوران ستائشی ردعمل)

دیکھیو سرون..... ہم کہت رہن کہ کونو ہمار منی دیکھ لہس تو تمہار کچومر نکال سے ای..... باہ..... ٹیا..... باہ..... باہ بھیا باہ۔ (ڈاکوؤں کے بے بس ہو جانے پر ان سے مخاطب ہو کر)

ایک موقع پر نینا کے ڈاکوؤں کی جانب سے اغوا کر لینے جانے کے بعد عمران بھی سخت پریشانی کے عالم میں شینخو سے الجھ پڑا تھا۔ ملاحظہ ہو یہ اقتباس۔۔

"ہائے بٹیا..... تم کہاں گیو..... اب کہاں ڈھونڈی تم کا۔"

"خاموش رہو۔ بورنہ کرو۔" عمران اس کا شانہ تھپکتے ہوئے بولا۔

"اب کا کریہو" ٹونی نے کہا۔

"اپن اور تمہار کھپار لڑائے دیب۔" عمران نے جھلا کر کہا "اب بولیو تم اور ہم گھٹکی دباوا تمہار۔"

عمران، نینا اور شینخو کو جنگلوں میں بھٹکتے کئی روز گزر چکے تھے کہ اچانک وہ خمیسو کے گروہ کے لوگوں کے نرغے میں آ گئے۔ نینا اغوا کر لی گئی اور عمران اور شینخو محفوظ جگہ پر چھپنے کی وجہ سے بچ نکلے۔ ادھر نینا خمیسو کے ڈیرے پر پہنچا دی گئی اور عمرن اور شینخو اس کی تلاش میں بھٹکتے بھٹکتے بالآخر اس تک جا پہنچے۔ بلند قامت اور انتہائی طاقتور خمیسو اور عمرن کا ٹکراؤ ہوا۔ یہ ایسا تھا جیسے پہاڑ کے سامنے کسی چیونٹی کو لا کھڑا کر دیا جائے۔ اس جنگ میں عمران محض اپنی 'جلت پھرت' کی وجہ سے غالب رہا بلکہ ایسے ہی جیسے اس نے آگے چل کر اٹلی میں درپیش

ایک مہم کے دوران اپنے سے جسمانی طور کہیں زیادہ زور آور ''ایڈالاوا'' کو شکست دی تھی۔ خمیسو عمران کے ایک داؤ کی وجہ سے ٹانگ کی ہڈی ٹوٹ جانے کی وجہ سے بے بس ہوگیا اور اس کی پناہ گاہ میں ان تینوں نے رات گزاری۔ نصف شب کو عمران کو یہ علم ہوا کہ خمیسو کو کسی نے گولی مار کر قتل کر دیا ہے۔ یہ کبڑا تھا جس نے خمیسو کا قتل کیا تھا اور عمران کے سامنے انجان بنتا رہا تھا۔ تینوں کی واپسی کبڑے کی جیپ میں ہوئی۔ کبڑا صفدر جنگ کی کوٹھی کی جانب چلنے سے انکاری ہوتا ہے۔ یہ صورت حال دیکھ کر تکان اور کوفت کا شکار شیخو کبڑے کی گردن پر ریوالور کی نال لگا کر اسے زبردستی کوٹھی کی جانب چلنے کو کہتا ہے۔ کبڑا عمران سے سخت احتجاج کرتا ہے اور جواب میں عمران کہتا ہے۔

''مجبوری ہے۔ اس سنکی سولجر کو سمجھا لینا میرے بس میں بھی نہیں ہے''

دلچسپ بات یہ ہے کہ الہ آباد میں نکہت کلب کے قیام کے بعد ابن صفی جن قلمی ناموں سے طنزیہ و مزاحیہ مضامین لکھتے رہے تھے' اس میں ایک معروف نام ''سنکی سولجر'' بھی تھا۔ بالآخر کبڑے نے صفدر جنگ کی کوٹھی تک انہیں پہنچایا جہاں صفدر جنگ نے اسے ایک مرتبہ پھر اپنے ساتھ آ ملنے کی پیشکش ان الفاظ میں کی۔ ''اس اونٹنی (رانی ساجد نگر) پر لعنت بھیج دو تو میں تمہیں پھر سے خوش آمدید کہوں گا۔''

صفدر جنگ کو عمران کی اصلیت کا علم ہو چکا تھا۔ وہ عمران سے حد درجے متاثر تھا۔ ادھر عمران پر یہ انکشاف ہوا کہ صفدر جنگ اور اس کے والد سر رحمان' آکسفورڈ میں ہم جماعت تھے۔ صفدر جنگ نے عمران کی شخصیت کو مدنظر رکھتے ہوئے ایک موقع پر نینا سے اس کی شادی کی بات چھیڑ دی۔ وہ نینا کو قائل کرنے کے لیے ان الفاظ میں گویا ہوا ''تم ساری زندگی تو اس طرح نہیں گزار سکتیں۔

آخر سلطانہ' درشہوار' نازلی۔ سبھی کی شادیاں ہوئی تھیں۔ اب تم بھی بوجھ معلوم ہونے لگی ہو۔''

لیکن عمران اور شادی...... یہ بات ناممکنات میں سے تھی۔ یہ الگ بات ہے کہ صفدر جنگ کی جانب سے نینا سے شادی کی بات چھیڑنے پر وہ بری طرح سٹپٹا جاتا ہے۔ یہ اقتباس ملاحظہ ہو۔

صفدر جنگ' عمران کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر آہستہ سے بولا ''میرے ساتھ آؤ۔'' اور وہ ایک دور افتادہ کمرے میں آئے۔ صفدر جنگ چند لمحے عمران کے چہرے پر نظر جمائے رہا۔ پھر پوچھا ''نینا پسند ہے؟''

''ب...... ج...... ہپ......'' عمران سچ مچ بوکھلا گیا۔

''میں نے اسے بیٹیوں کی طرح پالا ہے اور اس کی حفاظت کی ہے۔ مجھ پر بار ہے...... کیا خیال ہے تمہارا ؟''

مگر وہ عمران ہی کیا جو کسی بھی سنجیدہ بات کو چٹکیوں میں نہ اڑا سکے۔ نہایت آسانی سے اس نے بات کا رخ ہی موڑ دیا۔ اس کا جواب تھا۔

''خیال نہایت معقول ہے...... لیکن شاید میری شادی کبھی نہ ہو سکے۔''

''کیوں'' صفدر جنگ پوچھتا ہے۔

''میں ذیابیطس کا مریض ہوں۔ آئے دن طرح طرح کے ظلم ہوتے ہیں مجھ پر۔ ابھی کچھ ہی دن ہوئے والد صاحب اپنے پیر صاحب سے کلونجی پھکوا کر لائے...... مجھے کھلانی چاہی۔ میں نے طبی نکتہ نظر سے انہیں کچھ سمجھانا چاہا۔ بگڑ گئے۔ کہنے لگے اب گھوڑوں کو کھلائی جاتی ہے تو ان کی ٹانگیں مضبوط ہو جاتی ہیں۔ چپ چاپ قائل ہونا پڑا۔ کھائی جناب کلونجی...... شام ہی سے خون کا پیشاب شروع ہو گیا اور اب بھی وہی عالم ہے۔''

☆☆☆

ڈیڑھ متوالے کا اختتام بھی ذہنوں کو جھنجھوڑ دینے والا ہے۔ کبڑا عمران کے ہاتھوں زندہ گرفتار ہونے پر زہر پی کر اپنی زندگی ختم کرنے کو ترجیح دیتا ہے۔ ابن صفی ان الفاظ میں اس کی موت پر تبصرہ کرتے ہیں کہ۔

''اب خالی شیشی اس کی مٹھی میں دبی ہوئی تھی اور سریع الاثر زہر اپنا کام کر چکا تھا۔ یہ تھا ہز ایڈیو سنکر یسی ہمبگ دی گریٹ کا انجام...... یعنی جیتے جی اسے کوئی بھی ہاتھ نہ لگا سکا تھا''

کبڑے کا یہ انجام ابن صفی کے اپنے اس بیان کا پرتو ہے جس میں انہوں نے کہا تھا۔

''میں جب بھی کسی مجرم کو قانون کے حوالے کرنے لگتا ہوں تو سوچتا ہوں کہ کیا اب ہمیں مجرموں سے پناہ مل جائے گی۔ کیا مجرموں کو سزا دینے سے وہ برائی مٹ جائے گی جس میں مبتلا ہو کر یہ پھانسی کے تختے کی طرف آتے ہیں۔ اب تک کروڑوں قاتل سزائے موت پا چکے ہوں گے لیکن کیا اب قتل نہیں ہوتے۔ اس کا حل شروع ہی سے موجود تھا لیکن اس طرف کسی نے دھیان ہی نہیں دیا۔ بروں سے زیادہ برائی کی طرف دھیان دیا جائے۔ یہ سوچا جائے کہ آخر جرم کیے ہی کیوں جاتے ہیں۔ کیوں نہ سماجی زندگی کو اس معیار پر لایا جائے کہ جہاں جرم کا کوئی سوال ہی نہ رہ جائے۔''

☆☆☆

حواشی۔

۱۔ سائیکو مینشن۔ خرم علی شفیق۔ فضلی سنز، کراچی۔ ۲۰۱۱

۲۔ سیر و شکار۔ مترجم و مولف حکیم اقبال حسین۔ صفیہ اکیڈمی۔ کراچی۔ سن اشاعت، ۱۹۶۶

۳۔ ڈاکٹر آئی ایچ عثمانی۔ عشرت حسین عثمانی۔ پاکستان اٹامک انرجی کمیشن کے دوسرے چیرمین جو ۱۹۶۰ سے ۱۹۷۲ تک اس عہدے پر فائز رہے۔ تاریخ پیدائش، ۱۵ اپریل ۱۹۱۷۔ تاریخ وفات، ۱۷ جون ۱۹۹۲۔ مئی ۱۹۹۸ میں ڈاکٹر عثمانی کو ان کی خدمات کے اعتراف میں پس مرگ نشان امتیاز دیا گیا۔

۵۔ سید جعفر طاہر۔ پیدائش، ۲۹ مارچ ۱۹۱۷۔ وفات، ۲۵ مئی ۱۹۷۷۔ مولانا صلاح الدین احمد کے مجلے ادبی دنیا (۱۹۴۶) میں شائع ہوئی جعفر طاہر کی اس غزل نے خاصی مقبولیت حاصل کی تھی۔

کوئی حرم سے نکلے ہے کوئی بتاں کی راہ
ہائے کہاں پہ آ کے ملی ہے کہاں کی راہ

جعفر طاہر کے چند اشعار ملاحظہ ہوں کہ ان کے جائزے سے ہمیں اس بات کا اشارہ ملتا ہے کہ ابن صفی نے آخر کن وجوہات کی بنا پر انہیں دیگر شعراء کی بھیڑ سے علاحدہ قرار دیا تھا۔

میں نے جو تیرے تصور میں تراشے تھے کبھی
لے گئے وہ بھی میرے گھر سے پجاری پتھر
ناز ہر بت کے اٹھا پائے نہ جعفر طاہر
چوم کر رکھ دیے ہم نے یہ بھاری پتھر
سینۂ سنگ سے دریا نہیں بہتے دیکھے
کون کہتا ہے کہ ہیں درد سے عاری پتھر
بتائیں ہم بھی کبھی درد آبشاروں کا
کسی پہاڑ کے دامن میں رو لیا جائے
میرے رفیق بہت جلد آنے والے ہیں
میرے لہو سے صلیبوں کو دھو لیا جائے

الف سے ابن صفی بی۔اے

مسعود احمد بہاری

جاسوسی قاعدہ

دیکھو بچو! یہ ابن صفی بی۔اے ہیں۔ ''بی۔اے'' ان کی ڈگری اور ٹریڈ مارک ہے۔ نام کا جزو نہیں۔اس لیے ہوشیار رہو اور انہیں خط لکھتے وقت بی۔اے کا اضافہ ضرور کرو ورنہ ناراض ہو جائیں گے۔اب یہ ہرگز مت پوچھنا کہ اتنے بڑے ہو کر بھی صرف بی۔اے کیوں ہیں۔ ایم اے یا پی ایچ ڈی کیوں نہیں؟ ممکن ہے وضعداری کے خیال سے آگے نہ پڑھنا چاہتے ہوں۔ ویسے خاصے وسیع المطالعہ آدمی ہیں اور چاہیں تو نہایت آسانی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کر سکتے ہیں۔

پیارے بچو! کیا تم بتا سکتے ہو اگر یہ ''ڈاکٹر ابن صفی'' بن جائیں تو ان کے قارئین کی صحت پر اس کا کیا اثر پڑے گا؟ اگر نہیں بتا سکتے تو خاموش رہو، ہنسنے یا مسکرانے کی ضرورت نہیں۔

بچو! تم نے ابن صفی بی۔اے کی تصویریں اخباروں، رسالوں اور عمران سیریز کی کتابوں میں دیکھی ہوں گی۔ اچھے خاصے گلفام نظر آتے ہیں لیکن اگر پاس جا کر دیکھو تو......؟

خیر جانے دو، پردہ پوشی بڑی اچھی بات ہے۔

عزیز از جان بچو! جیسا کہ تم جانتے ہو، ابن صفی بی اے ''ایشیا کے سب سے بڑے جاسوسی ناول نگار'' کہلائے جاتے ہیں۔ اب میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ خطاب انہوں نے خود سے اپنے اوپر مسلط کر لیا ہے یا ان کے بے شمار شاگردوں نے از راہ عقیدت انہیں دیا ہے۔ خیر...... جو کچھ بھی ہو، میں اسے نہایت فضول سا خطاب سمجھتا ہوں۔ یہ تو تمہیں معلوم ہی ہے کہ پاکستان کی ہر نئی چیز ''ایشیا کی سب سے بڑی'' چیز ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر ایشیا کا سب سے بڑا جوٹ مل (خیر یہ ڈھاکے میں رہ گیا اور اب اس کا تذکرہ بیکار ہے) ایشیا کا سب سے بڑا ہوائی اڈہ، ایشیا کی سب سے بڑی بندرگاہ، اور ایشیا کا سب سے بڑا کھاد کا کارخانہ۔ حاشا وکلا تم یہ نہ سمجھنا کہ میں ابن صفی بی۔اے اور کھاد کے کارخانے میں کوئی تعلق پیدا کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔

نہیں، بچو، میں تو صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ وہ اس دم چھلے کے بغیر بھی پسند کیے جا سکتے ہیں۔ یوں اگر ناول کی تیکنک کی بات اٹھائی جائے تو مجھے ڈرتے ڈرتے کہنا پڑے گا کہ ان کے بے شمار ناولوں میں شاید نصف درجن ہی اس معیار پر پورے اتریں گے۔ اگر بہت سارے ناول لکھنے سے ہی کوئی بڑا ناول نگار بن جایا کرے تو ایم۔اسلم کو اردو کا سب سے بڑا ناول نگار تسلیم کرنا پڑے گا۔

پیارے بچو، ابن صفی بی۔اے کی عظمت اس میں نہیں ہے کہ انہوں نے بے شمار ناول لکھ ڈالے ہیں بلکہ اس میں ہے کہ انہوں نے ادب کی ایک ایسی شاخ کی خدمت کی ہے جسے ہمارے نقادوں نے سرے سے

شاخ ہی نہیں سمجھا۔ انگریزی زبان میں جاسوسی ادب کو متفقہ طور پر ادب کا ایک حصہ سمجھا جاتا ہے لیکن تعریف کرو ہمارے سکہ بند نقادوں کی کہ وہ لایعنی بلینک ورس اور سمبولک پوئٹری کی تعریف میں تو زمین و آسمان کے قلابے ملا سکتے ہیں مگر اردو کے جاسوسی ادب کا نام سنتے ہی الرجک ہو جاتے ہیں۔

پیارے بچو! میں یہ تو مانتا ہوں کہ اردو زبان میں جاسوسی ادب کے نام سے اب تک جو کچھ کیا گیا ہے اس میں برائے نام مواد ہی توجہ دینے کے قابل ہے لیکن دو ایک نام ایسے ضرور ہیں جو اس توجہ کے مستحق تھے۔ اب میں یہ کیوں کہوں کہ ان میں پہلا نام ابن صفی بی۔ اے کا ہے۔ اردو کے جاسوسی ادب پر غالباً اب تک صرف دو مضمون لکھے گئے ہیں۔ پہلا مضمون شاید نادم سیتاپوری کا تھا جو ساقی کراچی میں آج سے کوئی دس بارہ سال پہلے چھپا تھا اور دوسرا مضمون ڈاکٹر احسن فاروقی نے خود ابن صفی بی۔ اے پر لکھا تھا۔ اللہ اللہ خیر صلہ!!

(نئے افق۔ اگست ۱۹۸۱ء)

ریشوں کی یلغار عمران سیریز نمبر ۸۳

خطرناک ڈھلان عمران سیریز نمبر ۸۴

ابن صفی صاحب کے مختلف ناولوں کے وہ سرورق جنہیں میں نے انگریزی رسائل سے تراش خراش بنایا اور شائع کیا۔ ان کے علاوہ بھی کئی اور سرورق ہیں جو فی الحال دستیاب نہیں ہو سکے۔

کالی کہکشاں عمران سیریز نمبر ۹۱

جنگل میں منگل عمران سیریز نمبر ۸۵

خوشبو کا حملہ عمران سیریز نمبر ۹۷

متحرک دھاریاں عمران سیریز نمبر ۹۶
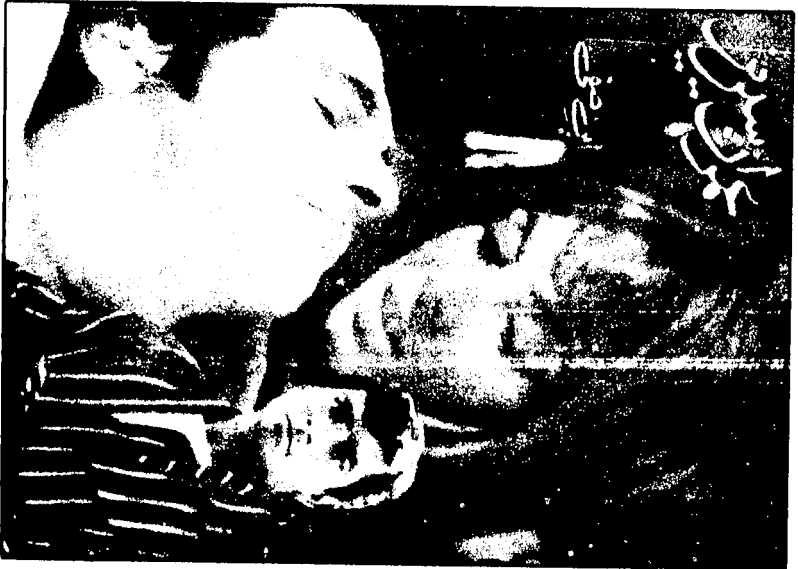
بابا سگ پرست عمران سیریز نمبر ۹۸

مہکتے محافظ عمران سیریز ۹۹

زیر امین عمران سیریز نمبر ۱۰۱

موروثی ہوس جاسوسی دنیا نمبر ۱۱۹

بلدران کی ملکہ

ابن صفی صاحب کے مختلف ناولوں کے وہ سرورق جنہیں میں نے انگریزی رسائل سے تراش خراش کر بنایا اور شائع کیا۔ان کے علاوہ اور بھی سرورق ہیں جو فی الحال دستیاب نہیں ہو سکے۔

جب میں نے ۹ مارچ ٦٦ء کو جناب ابن صفی صاحب کو اپنا یہ شعر:

اس شہر کے دیوانوں میں ایک نام میرا بھی شامل تھا
مجنوں ہی نہیں تھا عشق میں کامل میں بھی جنوں میں کامل تھا

سنایا تو انہوں نے حسب معمول میری حوصلہ افزائی کرتے ہوئے اپنا یہ شعر:

حضرتِ مجنوں سنبھل کر دشت میں رکھیے قدم
ہم سے دیوانے بھی پائے جاتے ہیں صحرا کے بیچ

اپنے دستخط کے ساتھ سہ رنگا شعلہ الٰہ آباد ایڈیشن عنایت فرمایا۔ سہ رنگا شعلہ دراصل عمران سیریز کا ناول ہے جسے الٰہ آباد سے جاسوسی دنیا میں شائع کیا گیا ہے جبکہ کراچی سے یہ عمران سیریز میں شائع ہوئی ہے۔ حالانکہ وہ سہ رنگا شعلہ مجھے اپنے دستخط کے ساتھ ۷ افروری ٦٦ء کو دے چکے تھے لیکن میرے شعر کے جواب میں انہوں نے سہ رنگا شعلہ الٰہ آباد ایڈیشن پر اپنا یہ شعر تحریر کر کے دیا تھا۔

عمران سیریز نمبر ۶۳
ابن صفی
۱۴/۲/۶۶
لوبولی لا
ابن صفی
بی۔ اے
اسرار پبلیکیشنز ۱۔ فردوس کالونی کراچی ۱۸

ابن صفی
کی زیرِ ادارت نکلنے والا پہلا ڈائجسٹ
ابنِ صفی میگزین
عنقریب منظر عام پر آرہا ہے
اس ڈائجسٹ میں وہ سب کچھ ہوگا جو دورِ جدید کے ڈائجسٹوں میں
قارئین پڑھنا پسند کرتے ہیں۔ علی عمران کا نیا مسلسل قسط وار ناول جو اس
ماہنامہ کو منفرد بنا دے گا اس کے علاوہ ملک کے تمام نامور لکھنے والے
حصہ لے رہے ہیں۔ یہ ہر لحاظ سے مکمل اور معیاری پرچہ ہوگا۔ اگر آپ کے
ذہن میں کوئی تجویز ہے تو ہمیں لکھئے تاکہ آپ کے مشوروں کی روشنی میں اس ماہنامہ کو
زیادہ سے زیادہ معیاری بنانے کی کوشش کی جاسکے
پوسٹ بکس ۲۱۴۷ کراچی ۱۸

ماہنامہ
جاسوسی دنیا
الٰہ آباد

قاتل کا ہاتھ

خاص نمبر

مصنف
ابن صفی بی اے

قیمت خاص نمبر
ایک روپیہ ۵۰ پیسے

سالانہ قیمت
نو۹ روپئے

ماہنامہ جاسوسی دنیا الٰہ آباد ۳

ٹیلیفون نمبر ۱۳۰

جاسوسی دنیا ۹۶

خاص نمبر

قاتل کا ہاتھ

ابن صفی

بی۔ اے

اسرار پبلیکیشنز ۱ فردوس کالونی۔ کراچی ۱۸

عمران سیریز
دوسری آنکھ
ابن صفی
بی۔اے
اسرار پبلیکیشنز فردوس کالونی کراچی

گولڈن جوبلی نمبر
عمران سیریز
شوگر بینک
مصنف
ابن صفی بی اے
اسرار پبلیکیشنز فردوس کالونی کراچی

جاسوسی دنیا ۱۰۳

تباہی کا خواب

ابن صفی
بی۔ اے

اسرار پبلیکیشنز ۱۔ فردوس کالونی، کراچی ۱۸

جاسوسی دنیا ۱۰۴

(خاص نمبر)

مہلک شناسائی

ابن صفی
بی۔ اے

اسرار پبلیکیشنز ۱۔ فردوس کالونی، کراچی ۱۸

ابن صفی
۱۲/۵/۶۹

عمران سیریز نمبر ۵۵

میناروں والیاں

ابن صفی بی اے

اسرار پبلیکیشنز ۱۰ فردوس کالونی کراچی ۱۸

جاسوسی دنیا نمبر ۹۶

ابن صفی

سہمی ہوئی لڑکی

ابن صفی
بی اے

اسرار پبلیکیشنز ۱۰ فردوس کالونی کراچی ۱۸

دست قضا

سید عبدالاحد گیاوی

میں ابن صفی کو ۱۹۵۸ء سے ان کی عظیم الشان کہانیوں اور ذہن میں چپک جانے والے کرداروں کے توسط سے جانتا ہوں۔ اس وقت میں چھٹے درجے کا طالب علم تھا۔ میرے کورس کی کتابوں میں ان کی ایک نہ ایک کتاب ضرور چھپی ہوتی تھی اور جب کلاس خالی ہوتی یا ٹفن کا وقفہ ہوتا تو میں ان کی کتاب میں غرق ہو جاتا۔ میرے اردگرد فریدی، حمید، عمران، قاسم، صفدر، جولیا، انور، ریکھا، رشیدہ، فیاض اور بہت سے دوسرے کردار منڈلاتے رہتے۔ شب کے وقت کورس کی کتابوں کو جیسے تیسے پڑھ کر کھانے پر ٹوٹ پڑتا اور پھر بستر میں گھستا۔ اور ''جاسوسی دنیا'' شروع کر دیتا۔

والدہ کے تیور اس معاملے میں بڑے ہی غضبناک ہوتے تھے جب تک مجھے یہ احساس ہوتا وہ جاگ رہی ہیں، میں تاریخ جغرافیہ یا اور کوئی کتاب اٹھا کر اس طرح پوز کرتا جیسے دنیا میں کورس کی کتابوں کے علاوہ اور کوئی کتاب پڑھنے کو ہے ہی نہیں اور نہ مجھے کبھی دوسری کسی کتاب سے اتنی گہری انسیت رہی ہے۔

میری والدہ میری ان حرکات اور دکھاوے سے اچھی طرح واقف تھیں۔ زبان تو نہ ہلتی مگر ان کی آنکھیں، خدا کی پناہ میری تو روح فنا ہتی۔ مگر ابن صفی!

اس طرح وقفے وقفے سے اٹھ کر مجھے چیک کرلیا کرتی تھیں اور ساتھ ہی مجھے سو جانے کی ہدایت اور میری صحت کے خراب ہو جانے کی تنبیہہ بھی کرتی تھیں۔ ادھر وہ مطمئن ہو کر واپس گئیں اور ادھر ابن صفی پھر نکل آئے۔ غرض کہ یہ آنکھ مچولی ہوتی رہتی اور میں ابن صفی سے چپکا رہتا۔ اس وقت سے لے کر آج تک حسب معمول چپکا ہوا ہوں۔

وقت کے ساتھ ساتھ انسان کا سب کچھ بدل جاتا ہے والدہ محترمہ جنت کو سدھار گئیں۔ مگر یہ بات ضرور بتاتا چلوں کہ ابن صفی سے چپکے رہنے کے باوجود جب میں والدہ کی ہدایت اور خواہش کے مطابق اپنی پڑھائی تمام کر کے ان کا سہارا بنا تو اب یہی ہستی ابن صفی کی کتابوں کو اپنے آنچلوں سے صاف کر کے میری میز پر سجاتی تھیں۔ اس لیے کہ وہ جانتی تھیں کہ جب ان کا پریشان حال بیٹا گھر آتا ہے تو دو چیزوں سے نہ صرف خوش ہو جاتا ہے بلکہ اس کی تمام تھکن دور ہو جاتی ہے۔ ایک ماں کی شفقت اور دوسرے ابن صفی کی کتاب اور میں واقعی سب کچھ بھول جاتا تھا۔

میرا دوسرا دور میری ازدواجی زندگی سے شروع ہوتا ہے جہاں دنیاداری جیسی عظیم ذمہ داریوں کا بوجھ ہوتا ہے۔ کام کاج کی الجھن ہوتی ہے، مگر اس کے باوجود میں نے ابن صفی کو نہیں چھوڑا یا یوں کہیے ابن صفی نے مجھے نہیں چھوڑا۔

اہلیہ محترمہ کو ابن صفی سے بڑا بیر تھا (اس بیر میں جو خلوص و محبت پنہاں تھی وہ میں بحیثیت شوہر اچھی طرح جانتا ہوں) اس وقت ابن صفی کی کتاب کسی پھڑ پھڑاتے ہوئے پرندے کی طرح ایک جھٹکے کے ساتھ کسی دیوار سے ٹکراتی، جب ان کی کتاب سے برمحل اور موزوں، دلچسپ اور دل میں اتر جانے والا کوئی مکالمہ یا عمران اور حمید کے شرارت آمیز اور مزاحیہ جملے انہیں سناتا۔ واقعی یہ بات کچھ ظلم ہی جیسی ہے رات کا ایک بج رہا ہو، ایک انتہائی نیک اور فرمانبردار قسم کی عورت جو گھر کے ہنگامے اور چولھا چکی سے دامن بچا کر آرام کرنا چاہتی ہو، اس پر غنودگی اور نیند کا غلبہ چھایا ہوا ہو۔ اس کے بستر کے قریب کوئی سو پاور کا بلب روشن کیے ابن صفی میں کھویا ہو اور یہ کہ وقفہ وقفہ سے دو چار جملے بھی، اس کے کانوں میں انڈیلتا ہو تو اس عورت کی ابن صفی سے بیزاریت عین فطری ہے۔

نتیجتاً ابن صفی کی کتابیں کم ہونے لگیں اور اب مجھے اس کے لیے وقت ڈھونڈنا پڑتا، نہ ملنے پر میرا پارہ گرم ہو جاتا، بحث و تکرار تک ہو جاتی۔ ایک محاذ جنگ قائم ہو جاتا۔ زبانی گولیاں اور بم ایک دوسرے پر برسائے جاتے۔ مکالہرا لہرا کر ابن صفی کی حمایت اور مخالفت میں ڈائیلاگ بولے جاتے اور جب میری مخالفت نیند کے تھپیڑوں سے چور اور بے دم ہو کر اپنے بستر پر گر پڑتی تو میں آہستہ سے کھسک جاتا اور پھر کسی نہ کسی طرح، بستر کے نیچے تکیہ کے غلاف میں، الماری میں، بکس میں، کپڑوں کی تہ میں یہاں تک کہ باورچی خانہ اور نعمت خانہ سے ابن صفی کو ڈھونڈ نکالتا اور اب بیگم بھی میری ہی طرح ان معمولات کی عادی ہو چکی ہیں۔ وہ بھی ابن صفی کے کردار کی طرح اپنے دشمن کے سامنے سپر ڈال چکی ہیں۔

اب میں اصل موضوع کی طرف واپس آ رہا ہوں۔ سب سے پہلے میں یہ واضح کر دوں کہ میں خدانخواستہ کوئی ادیب افسانہ نگار، تنقید نگار، مقالہ نگار، شاعر، فلسفی یا اس قسم کی کوئی بھی چیز نہیں ہوں۔ میں محض ابن صفی کے پرستاروں میں سے ایک پرستار ہوں، اردو سے جو تھوڑی بہت واقفیت ہے وہ بھی مرحوم ابن صفی کی مرہون منت ہے۔ جس کے سہارے آج اپنے افسردہ جذبات کا اظہار کر رہا ہوں۔

مجھے یہ بتانا ہرگز نہیں ہے کہ ابن صفی کی عظمت کیا تھی۔ ادب کے میدان میں ان کی کیا حیثیت تھی، کیا مرتبہ تھا اور کیا مقام تھا، وہ کس پائے کے ادیب تھے اور ان میں کتنی صلاحیت تھی۔ وہ کس سے بلند تھے اور کس سے کمتر، نقادان ادب انہیں کن نگاہوں سے دیکھتے تھے، ان کے کم ہو جانے سے دیوار ادب میں کوئی شگاف پڑا یا نہیں، کوئی کمی ہوئی یا نہیں، ایسے نازک مسئلے پر روشنی ڈالنے والے لاکھوں جید قسم کے صاحب قلم موجود ہیں جو اس میں الجھ سکتے ہیں۔ میں تو صرف یہ کہوں گا اور چیلنج کے ساتھ کہوں گا کہ اس دنیائے اردو میں ہے کوئی ایسا ادیب جو ابن صفی جیسا ادبی کارنامہ پیش کرے؟ جو بیک جنبش قلم لاکھوں نہیں کروڑوں انسانوں کے ذہن اور دل و دماغ سے چپک جائے اور اپنا مسکن بنا لے۔ ہے کوئی ایسا ادیب جس کو پڑھنے والے پاگل اور سنکی کہلائیں؟ ہے کوئی ایسا ادیب جس کو پڑھنے کے لیے اپنے سیکڑوں ضروری کاموں اور ضرورتوں کو ''بس اس کے بعد'' کہہ کر ٹالتا رہے اور نقصان اٹھاتا رہے؟ ہے کوئی ایسا ادیب جس کی ایک ایک کتاب کو لوگ بار بار

پڑھیں اور ہر بار وہی خوش بو اور تازگی محسوس کریں؟ ہے کوئی ایسا ادیب جس کی آنے والی دوسری کتابوں کے لیے لوگوں میں بے چینی اور بے قراری پائی جائے؟ ہے کوئی ایسا ادیب جس کی کوئی کتاب اسکولوں اور کالجوں کی بنچ پر، دفتر کی میز پر، ہوٹل اور ریستورانوں میں، پارکوں اور دکانوں میں خواب گاہوں، باورچی خانوں میں اور راہ چلتے لوگوں کی جیبوں میں بیک وقت نظر آتی ہو؟ نہیں ہرگز نہیں، کبھی نہیں اور یہ حقیقت ہی بذات خود ابن صفی کی عظمت اور بلندی کی جیتی جاگتی دلیل ہے، جس سے کوئی انکار نہیں کرسکتا۔ حتیٰ کہ انہیں بھی تسلیم کرنا ہوگا جو ابن صفی کے بدترین مخالف ہوں گے۔ کم ازکم ان کا ضمیر یہی کہتا ہوگا' بڑے بڑے نقال ابن صفی کا کچھ نہیں بگاڑ سکے۔ لوگوں نے کم کوشش نہیں کی مگر ہمیشہ منہ کی کھاتے رہے۔ اگر ابن صفی کو ملک کے نامور، بیمثال اور عظیم ترین ادباء و شعراء حضرات جانتے ہیں تو یہ ان کی عظمت کی دلیل ہرگز نہیں ہوسکتی نہ اسے ثبوت بنا کر پیش کیا جاسکتا ہے۔ یہ تو یہی ہوگا کہ ''من ترا حاجی بگویم تو مرا حاجی بگو کی پہچان تو ان طبقوں سے ہوسکتی ہے جن میں پڑھے لکھے، غریب' امیر' ڈاکٹر' انجینئر' مولوی' پروفیسر' رکشے والی' مل مزدور' صحافی' کلرک' دکاندار' عورت' مرد بھی شامل ہیں کھیتوں کھلیانوں میں جس کا تذکرہ ہو اور جس کے ادب میں آج کے ماحول کی سچی عکاسی ہوا سے اور اس کے کردار کو اٹھتے بیٹھتے یاد کیا جاتا ہو' میں نے کسی ادیب میں یہ قدرت نہیں دیکھی کہ وہ ہر طبقے میں یکساں طور پر مقبول اور ہردلعزیز ہو اور ہر جگہ جلوہ گر ہو۔ بلکہ یوں کہیے ہر طبقہ میں جلوہ گر ہو۔

عوام کا وہ طبقہ بھی جسے کسی محنت مزدوری کے بعد تھوڑی سی تفریح چاہیے' تھکے اور جھلسے ہوئے دل و دماغ کو بے تحاشہ ذہنی سکون اور بالیدگی اور یہ مواد' کہانی اور کرداروں کی شکل میں' برجستہ جملے اور مزاحیہ فقروں کی شکل میں ابن صفی ہی وہ واحد تخلیق کار تھا جو فراہم کرتا تھا' اور آج یہی طبقہ اس ادیب سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے محروم ہوگیا' مگر اس کی کتاب' اس کا کردار' ہمیشہ ہمیشہ زندہ و پائندہ رہے گا' لوگ اس کو پڑھتے رہیں گے' اور بار بار پڑھتے رہیں گے۔

ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ یہ قطعی ناممکن ہے کہ بڑی بڑی اور موٹی موٹی فارسی نما اردو کی ادبیات مثلاً تنقید' مقالہ...... انشائیہ' تبصرہ یا اس قسم کے اور بھی بہت سے لوازمات جو اردو زبان وادب میں رائج ہیں اور جن کا علم اہل علم ہی کو ہوسکتا ہے' پڑھ کر ایک پل کے لیے بھی مسرت و خوشی حاصل کریں اور سکون و شادابی پاسکیں۔ میرے خیال میں ممکن نہیں' ہاں ایک طبقہ جو اسی طبقہ کا ہوتا ہے' بیشک تسکین محسوس کرسکتا ہے۔ مثلاً جدید شاعری' اب ظاہر ہے کہ جدید شاعری کے رموز و اسرار اور نشیب و فراز سے جو واقف ہوگا وہی پڑھے گا اور خوش ہوگا۔ ورنہ اچھے بھلے' پڑھے لکھے لوگوں کی کھوپڑی اڑ جاتی ہے مگر یہ سمجھ میں نہیں آتی' اسی طرح تنقید کسی کتاب' مصنف اور شعراء پر تبصرہ' بڑے بڑے پیچیدہ قسم کے مقالے' انشائیے' اور مضامین یہ تو وہی پڑھے گا اور محظوظ ہوگا جو اس صنف سے واقف ہوگا۔ اس کے نکات' الجھاؤ اور گھتیوں سے آشنا ہوگا اور جانتا اور سمجھتا ہوگا لیکن جہاں تک عام لوگوں کی بات ہے وہ دھیان تک نہیں دیتا۔ ایسا کیوں ہوتا ہے یہ تو صاحب ادراک ہی بتا سکتے ہیں' میں تو صرف اتنا جانتا ہوں کہ ادیب تو وہی بہتر' عظیم اور ہردلعزیز ہے جو ہم جیسوں کو نہ صرف

خوشی، مسرت فراہم کرتا ہے، بلکہ الجھن، پریشانی تھکان اور پراگندگی کو دور کرتا ہے، اور کچھ ہی لمحے کے لیے سہی دنیاومافیہا سے بے خبر کر ڈالتا ہے اور جب قاری اپنے تمام دکھ، تھکن اور کوفت کو ابن صفی کے ناول پڑھ کر بھول جاتا ہے اور اس کی روح مسکرا اٹھتی ہے تو یہی ابن صفی کے فن اور اس کی عظمت کی معراج ہے۔ اب کسی سے موازنہ یا بہتر وکمتر میں الجھنا، بحث ومباحثہ میں پڑنا دلائل اور ثبوت فراہم کرنا میری نظر میں تضیع اوقات ہے۔ بہرحال انکے اس سانحہ عظیم سے ان کے تمام قاریوں کو جو دکھ اور ملال ہوا ہے اس کی تلافی ہو سکے گی، یہ میں نہیں کہہ سکتا، مگر اتنا ضرور کہوں گا کہ

''بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا''

ابن صفی کی ایک کتاب کا عنوان تھا ''دست قضا'' جو آج خود ابن صفی کا عنوان بن گیا یہ کسے معلوم تھا اور میں ان کی روح سے بصد احترام معذرت کرتے ہوئے اپنے اس عقیدت بھرے مضمون کا عنوان بھی ''دستِ قضا'' تجویز کرر ہا ہوں۔

اور اب آخر میں نہ صرف اپنی جانب سے بلکہ ان کے تمام شیدائیوں کی جانب سے ان کی تمام کتابوں، کرداروں اور ایک ایک فقرے کو ان کی عظیم ترین روح کو عقیدت سے بھرپور سلام پیش کرتا ہوں۔

جادوگر

حاجی عدیل

کسی بھی بڑے آدمی سے ملنے کی خواہش کرنا اور رکھنا کوئی انوکھی بات نہیں۔ ابن صفی سے ملنے کی خواہش بہت عرصے تک میرے دل میں پرورش پاتی رہی۔ میری اس خواہش کو اکثر سبط اختر نے مہمیز کیا۔ سبط اختر اور ابن صفی نے ایک ساتھ ہی بی۔ اے کیا تھا۔ وہ اکثر کہتے کہ ابن صفی ہمارے گروپ میں سب سے زیادہ ذہین ہیں۔ طنز و مزاح نگاری میں تو ان کا جواب نہیں۔ کئی حوالوں سے سبط اختر کی زبان سے ابن صفی کا ذکر سنتا رہا۔ سبط اختر خود بھی افسانے لکھتے اور طنزیہ مضامین بھی تخلیق کرتے تھے۔ پاکستان آنے کے بعد ان کی صلاحیتوں کو زنگ لگ رہا تھا۔ پی آئی اے کی یونین نے ان کی ادارت میں ایک نیم ادبی اور نیم سیاسی ماہنامہ ''منشور'' جاری کیا۔

اس ماہنامے کے سلسلے میں جب بھارت اور پاکستان کے دانشوروں سے خط و کتابت شروع ہوئی تو بھارت میں موجود اختر الایمان، کیفی اعظمی، جانثار اختر، سردار جعفری، عصمت چغتائی، واجدہ تبسم، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی اور رام لعل وغیرہ کو خط لکھے جانے لگے تو ابن صفی کا ذکر پھر نکل آیا۔

ابن صفی نے بھارت میں جاسوسی ناول لکھ لکھ کر دھوم مچا دی تھی۔ ان کے ناول پاکستان میں بھی فروخت کے ریکارڈ توڑ رہے تھے۔ ابن صفی کا نام جاسوسی کہانی کے حوالے سے نہیں بلکہ طنز و مزاح کے حوالے سے فکر تونسوی کے ساتھ آیا تھا۔ ان کے نام پر ہمارے درمیان بیٹھے ہوئے ایک دانشور بدک گئے اور برا سا منہ بنا کر بولے۔ ''اگر ابن صفی ہمارے لیے لکھنے کو تیار بھی ہو جائیں تو ہم انہیں شائع نہیں کریں گے کیونکہ وہ لوگوں کے ذہن کو مفلوج کر رہے ہیں۔''

چونکہ ان صاحب کا تعلق ''منشور'' کی ادارت سے تھا اس لیے چند لمحے تو ہم سب خاموش رہے پھر ایک صاحب نے کہا۔

''کیا آپ نے ابن صفی کو پڑھا؟''

''مجھے پڑھنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔'' ان صاحب نے کہا۔ ''جاسوسی کے جھوٹے قصے، مار دھاڑ اور بھونڈا مذاق۔''

''میرا خیال ہے پھر آپ کو بولنے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔'' سبط اختر نے کہا۔ ''میں جانتا ہوں طنز و مزاح کے سلسلے میں ابن صفی کا قلم نشتر ہے نشتر۔''

سبط اختر کے اس فقرے نے بحث کے در وا کر دیے۔ دو گھنٹے تک ترقی پسند ادب، آفاقی ادب، ادب عالیہ اور رجعت پسند ادب پر دھواں دھار بحث ہوتی رہی مگر اس پوری بحث میں جاسوسی یا سری ادب کسی خانے میں

سمانہیں سکا اس لیے وہ آخری وقت تک ''متنازعہ ادب'' ہی رہا۔
آخر میں سبط اختر نے یہ کہہ کر بحث ختم کردی کہ ہم اگر ابن صفی کو شائع نہیں کریں گے تو ان کے پڑھنے والوں کے حلقے میں کمی واقع نہیں ہوگی۔''

میں نے اس بحث میں حصہ نہیں لیا تھا لیکن بحث کے دوران ہی میں نے فیصلہ کرلیا تھا کہ ابن صفی صاحب کو ضرور پڑھوں گا پھر ابن صفی صاحب کی چند کتابیں پڑھنے کے بعد میرا پہلا تاثر یہی تھا کہ ابن صفی جادوگر ہے۔

ابن صفی کا مطالعہ ہی نہیں مشاہدہ بھی بہت وسیع تھا۔ شاعری' ادب' تاریخ' فلسفہ' نفسیات' جنسیات اور سائنس! ان سارے افق کے وہ شناور تھے اور ان کی علمیت ان کے تخلیق کردہ ہر فقرے میں جھلکتی تھی۔

کردار نگاری میں ان کا جواب اردو ادب میں تلاش کرنا ناممکن کی حد تک مشکل ہے۔ وہ اپنے بنیادی کرداروں پر ہی توجہ نہیں دیتے تھے بلکہ سر راہ آجانے والے ہر کردار کو بھی زندہ جاوید بنادیا کرتے۔ اس سلسلے میں بھی ان کا مقابلہ کرنا مشکل ہے۔ قاری کو کرداروں کے ساتھ ہی نہیں اپنے لفظ لفظ کے ساتھ وہ محو سفر رکھتے تھے۔ فقروں کی تراش' جملوں کی نشست و برخاست اور روانی میں قاری ایک بار بندھ جاتا تو اسے باہر نکلنے کا راستہ ہی نہیں ملتا۔

ابن صفی کے پیش کردہ مجرموں سے بیک وقت قارئین کو نفرت اور ہمدردی ہوتی ہے۔ ان کرداروں سے جہاں شدید نفرت کا احساس ہوتا ہے وہاں ان سے رحم اور ہمدردی کے جذبات بھی ذہن کے کئی گوشوں سے ابھر آتے۔ لیونارڈ' فنچ' الفانسے' سنگ ہی' ناتونہ' تھریسیا وغیرہ۔

صفی صاحب یہ بات اچھی طرح سے جانتے تھے کہ انسان پیدائشی مجرم اور قاتل نہیں ہوتا بلکہ حالات اسے جرم کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔ ان پر ابن صفی کا قلم بڑی سفا کی سے نشتر زنی کرتا تھا۔ یہی نہیں وہ انسان کی نفسیاتی الجھنوں' جنسی ناآسودگیوں اور محرومیوں پر نہ صرف کاری ضربیں لگاتے تھے بلکہ ان پر مرہم رکھنا بھی انہیں خوب آتا تھا۔

ابن صفی نے جہاں انفرادی جرائم پر بے مثال ناول لکھے وہاں اجتماعی اور بین الاقوامی جرائم پر بھی حرف آخر ہی کی طرح لکھا۔ انہوں نے ملکی اور بین الاقوامی طور پر کی جانے والی سازشوں کی نشاندہی کرنے میں کبھی کوتاہی کا مظاہرہ کرنے کی کوشش نہیں کی کبھی واضح اور کبھی مبہم انداز میں اشارے کیے۔

صفی صاحب جزئیات نگاری سے عموماً گریز ہی کرتے تھے لیکن ماحول کی عکاسی چند فقروں اور چند لفظوں میں کرنے کا انہیں فن آتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جزئیات نگاری کے مظاہرے میں ان کی کہانی کبھی سست رو نہیں ہوتی تھی۔

ابن صفی نے صرف ذہنوں سے چپک جانے والے کردار ہی تخلیق نہیں کیے بلکہ انہوں نے علاقے اور ملک بھی تخلیق کیے۔ شکرال اور زیرولینڈ۔

شکرال کا ماحول، وہاں کے کردار، ان کی نفسیات، ان کی سوچ کا انداز، ان کا رہن سہن، ان کے رسم ورواج، ان کے مذاہب، ان کا فلسفہ حیات، ان کی محبتیں اور نفرتیں، ان کی دشمنی اور دوستی، ان کی بود و باش اور ان کے جنگ کے انداز ایک ایک چیز پر ابن صفی کے قلم نے گلکاریاں کی ہیں اور ایسے نقشے کھینچے کہ ماحول کی اجنبیت کے باوجود ہم خود کو اسی ماحول کا حصہ تصور کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

زیرولینڈ کے بارے میں صرف اتنا کہنا ہی کافی ہے کہ انسانیت اور امن وسلامتی کی دشمن بڑی طاقتوں کے خلاف جرائم پیشہ افراد کا محفوظ محاذ زیرولینڈ ہے۔ زیرولینڈ ان کی پناہ گاہ ہے۔ ان کی تجربہ گاہ ہے اور ان کی جنت ہے۔ زیرولینڈ کی تخلیق کر کے ابن صفی نے یہ اشارہ دیا کہ بڑی اور منفی طاقتوں کے خلاف اس انداز میں بھی لڑا جا سکتا ہے۔ چور پر مور والی کہاوت یا کہانی حقیقت کا اس طرح روپ بھی دھار سکتی ہے۔

میں بھی اور بہت سے لوگوں کی طرح ہر ماہ وہ ناول پڑھنے کا عادی ہو گیا تھا کہ ایک دن ابن صفی اپنی ہی کسی نفسیاتی الجھن کا شکار ہو گئے۔ ان کے قارئین کا جو حال تھا سو تھا۔ ان لوگوں کی حالت قابل رحم تھی جو ان کے ناول فروخت کر کے ہر ماہ ہزاروں کما رہے تھے۔ ان لوگوں نے بہت جلد صبر کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دیا اور ان لوگوں کی ایما پر ہی ایک عدد ابن صفی کے کئی ابن صفی بن گئے۔ ہر لکھاری اس دعویٰ کے ساتھ میدان میں آیا کہ وہ ابن صفی ہے لیکن دعوے کرنے والا ہر فرد اندر سے بالکل کورا اور خالی تھا۔ ابن صفی جس افق پر پرواز کر رہے تھے اس کی گرد کو پانا بھی کسی کے بس میں نہیں تھا۔

نام نہاد ابن صفیوں نے قانونی گرفت سے بچنے کے لیے کئی راہیں نکالیں کوئی اَبن صفی ہو گیا تو کوئی این صفی ایسے سارے صفی پڑھنے میں ابن صفی ہی آتے تھے۔ چند ماہ تک ابن صفی کے نام پر کاٹھ کباڑ فروخت کرنے والے پہچان لیے گئے اور ان کی دکانیں بند ہونے لگیں۔

جب دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو گیا تو پھر چند حضرات میدان میں یہ کہہ کر جم گئے کہ وہ اپنے ہی نام سے ابن صفی کے کرداروں اور ان کے طرز تحریر کی کرشمہ سازیاں جاری رکھیں گے۔ ایسے حضرات ابن صفی کے کرداروں اور طرز تحریر کا سرقہ بھی زیادہ دنوں نہیں کر سکے۔ ہوا یہ کہ نقل مطابق اصل بنانے کے چکر میں وہ اپنی چال بھی بھولنے لگے اور انہیں پھر اس سمت سفر کرنا پڑا جہاں سے وہ چلے تھے۔

صحت یابی کے بعد ایک دن پھر ابن صفی میدان میں آ گئے۔ اس کے بعد برساتی مینڈکوں کو ناپید ہونا ہی تھا سو وہ ہو گئے اور وہ لوگ جنہیں ابن صفی کا عقیدت مند اور ان کی اجازت سے ان کے کرداروں اور طرز تحریر کا گمان تھا وہ زندہ رہنے کے لیے ہاتھ پاؤں مارنے لگے لیکن جب اصل مارکیٹ میں ہوتا ہے تو نقل کو کون پوچھتا ہے۔

اس سارے عرصے میں ابن صفی صاحب سے نہیں مل سکا کیونکہ میں تنہا موصوف سے ملاقات کی ہمت اپنے اندر پا نہیں رہا تھا۔ ایک خیال ذہن میں یہ بھی موجود تھا کہ میں تو ابن صفی کو جانتا ہوں لیکن ان سے میرا تعارف کون کرائے گا۔ اس وقت میں نے تخلیقی میدان میں قدم تو رکھ دیا تھا لیکن نو وارد ہی تھا۔ شاعری بھی

کرنے لگا تھا اور سیاسی مضامین بھی، لیکن تھا طفل مکتب ہی۔ ایسی صورت میں ابن صفی صاحب سے میں اپنے بارے میں کہہ بھی کیا سکتا تھا۔

خدا خدا کر کے وہ دن آ ہی گیا اور میں ان دنوں ابن صفی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا جن دنوں ان کا ناول ''ڈاکٹر دعاگو'' مارکیٹ میں آیا تھا۔

ابن صفی صاحب سے ملنے کے بعد میرا پہلا تاثر یہی تھا کہ کاش میں ان سے نہ ملتا تو بہتر تھا۔ یہی وجہ ہے کہ میں سمجھتا ہوں ابن صفی صاحب ملنے کی نہیں بلکہ پڑھنے کی چیز تھے۔ ان سے ملاقات سے قبل میں سوچتا تھا، ابن صفی باغ و بہار طبیعت کے مالک ہوں گے، چٹکلا باز، بذلہ سنج، حاضر جواب، بات میں سے بات پیدا کرنے والے، یعنی اپنے کردار عمران اور فریدی کا حسین امتزاج لیکن وہ تو دیکھنے میں بالکل عام سے آدمی ہی نہیں بلکہ بات کرنے میں بھی عام آدمی تھے۔ نہ علمیت کا رعب، نہ دبدبہ، اس کے برخلاف وہ انکساری اور کم سخنی کا نمونہ تھے۔ علیک سلیک کے بعد وہ منتظر رہے کہ میں کچھ بولوں گا۔ میں انتظار کرتا رہا کہ اب ان کے منہ سے شگوفے پھوٹیں گے، پھول کھلیں گے، ایک لمحے میں وہ محفل کو زعفران بنادیں گے۔ ان کی معطر معطر گفتگو سے میں بھی اپنے ذہن کو گلزار بنالوں گا لیکن یہ سب نہیں ہوا، خاموشی کی ایک سونی اور بھدی دیوار میرے اور ان کے درمیان حائل رہی۔

ان کی محفل میں میرے علاوہ بھی کئی افراد بیٹھے ہوئے تھے اور آپس میں گفتگو کر رہے تھے۔ میں چونکہ ان افراد کے لیے اجنبی تھا اس لیے ان میں سے کوئی بھی مجھ سے مخاطب نہیں ہوا اور نہ ہی میں نے ان سے گفتگو کا آغاز کیا۔ تھوڑی دیر میں دل میں تنہائی کا احساس جگائے خاموش بیٹھا رہا لیکن کب تک، مجھے تو بہر حال کچھ بولنا ہی تھا۔ اس لیے گویا ہوا۔ ''اچھا صاحب مجھے اجازت دیں۔'' آواز قدرے تیز تھی۔

''جی...... ہاں۔'' ابن صفی صاحب نے جیسے چونک کر میری طرف دیکھا اور پھر بولے۔ ''آتے جاتے رہا کریں میاں۔''

اس ملاقات کے بعد ان سے ملنے کی ہمت ہی نہیں کر سکا۔ حالانکہ ان سے ملنے کی تمنا دل میں جوان رہی، مچلتی رہی، اس تمنا کو بھلانے کا ایک طریقہ میں نے نکال لیا۔ جب بھی ان سے ملاقات کرنے کے لیے دل مچلتا تو میں ذہن میں کبھی عمران کے کردار کو جگا لیتا یا کبھی فریدی کے کردار کو بیدار کر لیتا۔ ان دونوں کرداروں میں مجھے ابن صفی کی ذات رواں دواں نظر آتی اور میں ملاقات کا لطف اٹھا لیتا۔ اب بھی میں یہی کرتا ہوں۔

اسرار ماموں

ام کاشان

ابن صفی کو مرحوم لکھتے ہوئے کلیجہ منہ کو آتا ہے جبکہ ایسا ہونا نہیں چاہیے کیونکہ لغوی اعتبار سے مرحوم کے معنی ہیں جس پر اللہ کی رحمت کی گئی یا جس پر اللہ کی رحمت ہوئی۔ ابن صفی جب تک زندہ رہے، ان پر اللہ کی رحمت رہی اور مرنے کے بعد تو انہیں مرحوم ہونا ہی تھا کہ زندگی کے مصائب و آلام، تفکرات اور امتحان سے چھوٹ گئے۔

میں ابن صفی کو ابن صفی سے پہلے، اسرار ماموں کے نام سے جانتی تھی۔ وہ میری امی کے چچازاد بھائی تھے اور امی کو حاجرہ باجی کہہ کر مخاطب کیا کرتے تھے۔ جب تک امی بقید حیات رہیں وہ مجھے اپنے ہمراہ اسرار ماموں کے ہاں لے جاتی رہیں اور اسرار ماموں بھی ہمارے ہاں آجایا کرتے تھے مگر امی کے انتقال کے بعد یہ آمدورفت صرف خاندانی تقاریب میں ملاقات کی حد تک محدود ہو کر رہ گئی۔

جب پہلی بار مجھے یہ معلوم ہوا کہ اسرار ماموں ابن صفی ہیں تو مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ گھر میں ان کے ناول پڑھے تھے، اور ان ناولوں کی مدد سے ابن صفی کی شخصیت کا جو خاکہ میرے ذہن میں بنا تھا، وہ ایک بہت ہی سنجیدہ اور بھاری بھر کم شخصیت کا تھا۔ مگر اس اظہار کے بعد کہ وہی ابن صفی ہیں، مجھے ان کی شخصیت میں کرنل فریدی کا پرتو نظر آیا تو دوسری طرف کیپٹن حمید کا سا...... ہنس مکھ شخص بھی، وہ اپنی ذات میں! اگر ایک ذمے دار کرائم رپورٹر انور تھے تو دوسری طرف بچوں کی محفل میں بچہ بن جانے والے عمران بھی۔ ان کی شخصیت ایک تراشے ہوئے پہلودار ہیرے کی سی تھی۔

ابن صفی ایک شاعر اور ناول نگار کی حیثیت سے تو پہچانے گئے مگر جب ان کی شخصیت پر تحقیقی کام ہوگا تو لوگوں کو یہ جان کر بڑی حیرت ہوگی کہ وہ ایک اچھے ماہر نفسیات اور سائنس داں بھی تھے۔

۶۵ء یا ۶۶ء کی بات ہے، ان دنوں ہمارا چھوٹا سا کنبہ معاشی بحران کا شکار تھا۔ پاپا کی ہومیوپیتھک پریکٹس برائے نام چل رہی تھی۔ انہوں نے رات کی شفٹ میں ایک مقامی فیکٹری میں ملازمت اختیار کر لی اور ناتجربے کاری کی بنا پر ان کا ایک ہاتھ مشین کی زد میں آکر کچلا گیا۔ امی پر دہری ذمے داری آن پڑی، یعنی گھرداری کے ساتھ ساتھ فکر معاش بھی تھی۔ وہ بہت اچھی خیاطہ تھیں۔ فیشن اور ڈیزائن ایجاد کرنے میں اپنا جواب آپ تھیں۔ سو انہوں نے مشین سنبھال لی۔ انہی دنوں اسرار ماموں ملنے آئے، انہیں حادثے کا علم ہوا تو اظہار افسوس کیا...... پھر ان کی پرخلوص اور حساس طبیعت نے ہمارے گھر کے مسائل کو بھانپ لیا۔ بڑی کوشش کی کہ حاجرہ باجی یا بھائی صاحب ان سے اعانت قبول کر لیں مگر دونوں کی غیور فطرت آڑے آئی اور انہوں نے بڑی خوبصورتی سے اس طرح انکار کر دیا کہ اسرار ماموں کو برا نہ لگے۔

اس بات کے ہفتے بھر بعد اسرار ماموں دوبارہ جب ملنے آئے تو ان کے ہاتھوں میں ڈھیر ساری کتابوں کا

ایک گٹھر تھا۔ یہ ساری ان کی اپنی کتابیں تھیں جو انہوں نے یہ کہہ کر مجھے تھما دیں کہ لو بیٹا' ماموں کی طرف سے تمہارے لیے ایک تحفہ۔

میں کتابیں لے کر بہت خوش ہوئی' پھر بعد میں یہی کتابیں محلے میں ایک آنہ یومیہ کرائے پر چلنے لگیں۔ اس کرائے سے میرے تعلیمی اخراجات بخیر وخوبی پورے ہو جاتے۔ اس وقت تو یہ بات سمجھ میں نہ آئی مگر آج سوچتی ہوں کہ اسرار ماموں نے انسانی نفسیات کو سمجھتے ہوئے اور امی پاپا کے جذبہ خودداری کو ٹھیس پہنچائے بغیر.....کیسی خوبصورتی سے ہماری مدد کی۔ ان کا تحفہ ہمارے لیے معاشی آسانی کا سبب بن گیا۔

یہ سلسلہ میری میٹرک کی تعلیم تک جاری رہا' جس سال مجھے میٹرک کا امتحان دینا تھا' اسی سال میری امی کا انتقال ہو گیا۔ تب بھی تمام عزیز واقارب کے مقابلے میں اسرار ماموں ہی نے مجھے تسلی و تشفی دی اور ڈھارس بندھائی۔ امی کے انتقال کے بعد ان کی آمد ورفت ہمارے گھر میں کم ہو گئی مگر جب بھی کسی خاندانی تقریب میں شرکت کرتی تو ان سے ضرور ملاقات ہوتی۔ انہوں نے میرے شوہر کو بھی بڑی عزت اور توقیر سے نوازا۔ اپنے بچوں سے دلہا بھائی کہہ کر تعارف کرایا اور پھر جب ملتے تو انہیں دیر تک اپنے پاس بٹھاتے۔

یادوں کے حوالے سے ایک واقعہ میرے ذہن میں ابھر رہا ہے۔ جس کا تعلق ابن صفی کے بچپن سے ہے اور اس کی راوی میری امی تھیں۔ ہوا یوں کہ ایک دن میں نے باتوں ہی باتوں میں امی سے پوچھا "امی.....امی.....یہ ماموں ہر مہینے اتنا بڑا ناول کیسے لکھ لیتے ہیں؟"

اس پر امی نے کہا۔ "بیٹی! یہ ہمارے' تمہارے اور دوسرے لوگوں کے لیے تو واقعی بہت مشکل کام ہے مگر اسرار کے لیے یہ کوئی مشکل کام نہیں اور جاسوس تو وہ بچپن کا ہے۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے یہ کوئی اس وقت کی بات ہے جب اسرار ساتویں یا آٹھویں کلاس کا طالب علم تھا۔ چھٹی کلاس کے دو ہم عمر طالب علم' ایک ہی کتاب کے دعوے دار تھے' کلاس مانیٹر نے یہ مسئلہ اپنے کلاس ٹیچر کے سامنے پیش کیا۔ انہوں نے کافی غور وخوض کے بعد ناکامی تسلیم کرتے ہوئے' ہیڈ ماسٹر کے سامنے یہ معاملہ پیش کر دیا۔ ہیڈ ماسٹر صاحب نے دونوں بچوں کو بلایا۔ باری باری دونوں سے الگ الگ سوال کیے' ڈرایا بھی مگر دونوں میں سے کوئی بھی کتاب کے حق سے دستبردار ہونے پر آمادہ نہ ہوا۔ جس دکان سے کتاب خریدی گئی تھی' وہاں سے رابطہ قائم کیا گیا' بک سیلر کو اسکول بلا کر دونوں بچے دکھائے گئے کہ وہ اپنے خریدار کو پہچانے.....مگر وہ بے چارہ اپنے اصل خریدار کی نشاندہی کرنے سے اس لیے قاصر رہا کہ جس دن یہ کتاب فروخت ہوئی' وہ خود دکان پر موجود نہیں تھا بلکہ اس کے بڑے بھائی تھے جو لکھنو میں بغرض ملازمت مقیم ہیں۔ انہوں نے ہی یہ کتاب فروخت کی تھی' اور اب وہ لکھنو جا چکے تھے۔ امید کی یہ کرن بھی جھلملا کر اندھیروں میں گم ہو گئی۔ سب بہت پریشان تھے' اسکول کے سارے اساتذہ اپنا اپنا ذہن کھپا کر تھک چکے تھے۔ مگر فیصلہ نہیں کر پا رہے تھے کہ کتاب کا اصل مالک کون ہے؟

تب ہی اسرار کو اس مسئلے کا علم ہوا' وہ ہیڈ ماسٹر کی خدمت میں پہنچے اور ان سے درخواست کی کہ وہ دونوں دعوے دار بچوں کے پورے پورے بستے ایک دن کے لیے ان کے حوالے کر دیں۔

''ہیڈ ماسٹر صاحب' اسرار احمد کی اس تجویز پر حیران تو ہوئے مگر وہ خود بھی دل سے چاہتے تھے کہ اس مسئلے کا حل جلد از جلد سامنے آ جائے۔ انہوں نے چپڑاسی کو بھیج کر دونوں بچوں کے بستے اپنے دفتر میں منگوا لے اور اسرار احمد کے حوالے کر دیے۔ اسرار احمد دونوں بستے لے کر وہیں بیٹھ گئے اور کافی دیر تک ایک بستے کی ساری کتابیں اور کاپیاں نکال کر بغور دیکھتے رہے' ایک بستہ دیکھ چکنے کے بعد' انہوں نے اسے ہیڈ ماسٹر کے حوالے کر کے کہا۔ ''اسے آپ اپنی الماری میں بند کر کے رکھ دیں' کل دوسرے بستے کا جائزہ لینے کے بعد پھر فیصلہ کروں گا۔''

''دوسرے دن اسرار نے دوسرے بستے کی کتابوں اور کاپیوں کا جائزہ لیا' ابھی وہ پورا بستہ بھی نہ دیکھ پائے تھے کہ ایک دلفریب مسکراہٹ ان کے لبوں پر کھیلنے لگی' جسے ہیڈ ماسٹر صاحب نے بھی دیکھ لیا۔ پوچھا'' کیوں میاں کیا اصلیت کا پتا چل گیا؟''

اسرار کی مسکراہٹ اور گہری ہوگئی' جواب میں بولے۔ ''جی ہاں' کامیابی ہوئی تو ہے' اب آپ دونوں طالب علموں اور ان کے کلاس ٹیچر کو یہیں بلا لیں۔''

''لیجیے صاحب! حکم کی دیر تھی' چپراسی بھیج کر سب کو بلوا لیا گیا۔ اب ہیڈ ماسٹر صاحب کے کمرے میں جماعت ششم کے دونوں طالب علم' ان کے کلاس ٹیچر کے علاوہ دوسرے ٹیچرز بھی جمع ہو گئے تھے۔ انہیں دلچسپی یہ تھی کہ جس مسئلے کو وہ نہ سلجھا سکے تھے' دیکھیں' سیکنڈری کلاس کا ایک طالب علم کیسے سلجھاتا ہے؟

''دونوں طالب علموں میں ایک ہندو تھا' اور دوسرا مسلمان' ہندو لڑکے کا نام چھیدی لعل اور مسلمان لڑکے کا نام رجب علی تھا۔ اسرار نے پہلے چھیدی لعل سے پوچھا۔ ''کیوں' میاں یہ کتاب تمہاری ہی ہے؟''

وہ چمک کر بولا۔ ''جی جناب! سو فیصد' یہ کتاب میری ہے' میں نے فلاں دکان سے خریدی تھی۔''

اب اسرار نے اس کا بستہ کھولا اور تمام کاپیاں' کتابیں نکال کر سب کو دکھانے کے بعد بولے۔ ''دیکھیے چھیدی لعل کی کتابوں اور کاپیوں پر ہندی اخبار کے کور چڑھے ہوئے ہیں...... پھر دو تین کتابیں کھول کر ان پر لگی ہوئی بک سیلر کی مہر دکھا کر کہا۔ ''یہ ساری کتابیں چھیدی لعل نے اپنے محلے کے بک سیلر سے خریدی ہیں...... یہاں تک کہ کاپیاں بھی۔'' پھر انہوں نے رجب علی کے بستے کی کتابیں اور کاپیاں سب کے سامنے نکالیں اور انہیں دکھا کر بولے۔ ''دیکھیے' رجب علی کی کتابوں اور کاپیوں پر انگریزی رسالے کے کور چڑھے ہوئے ہیں اور یہ کتاب جس پر چھیدی لعل کا دعویٰ ہے کہ اس کی ہے' اس پر بھی انگریزی رسالے کا کور چڑھا ہوا ہے۔ یہ کور' رجب علی کی کتابوں کے کور سے تو ملتا ہے لیکن چھیدی لعل کی کتابوں کے کور سے نہیں۔''

پھر انہوں نے چھٹی کلاس کے ٹیچر سے' جو خود بھی ہندو تھے' کہا کہ وہ چھیدی لعل سے معلوم کریں کہ اگر یہ کتاب اس کی ہے تو یہ کور جو کتاب پر چڑھا ہوا ہے اس نے کہاں سے حاصل کیا؟ اور یہ کہ اس نے دوسری کاپیوں اور کتابوں کی طرح اس کتاب پر بھی ہندی اخبار کا کور کیوں نہیں چڑھایا؟ دوسری بات یہ معلوم کریں کہ چھیدی لعل نے جب اپنی ساری کتابیں اور کاپیاں' اپنے محلے کے ہندو دکان دار سے خریدی ہیں تو صرف

یہ ایک کتاب مسلمان محلے کے مسلم بک سیلر سے کیوں خریدی؟ اسرار کی باتیں سن کر سب ہی عش عش کر اٹھے۔

چھیدی لعل احساس شرم سے پسینے میں نہا گیا' اس کی زبان گنگ ہوگئی' منہ سے ایک لفظ بھی نہ کہہ سکا۔

ہیڈ ماسٹر صاحب نے دوسرے ٹیچروں کے باہمی مشورے سے وہ کتاب' رجب علی کو دلوادی......

پھر چھیدی لعل نے خود بھی اعتراف کرلیا کہ واقعی اس کا دعویٰ غلط تھا اور اس نے یہ سمجھ کر کہ رجب علی کی کتاب پر اس کا نام تو لکھا ہوا ہے نہیں' وہ اسے ہتھیانے میں کامیاب ہو جائے گا۔''

تو ایسے ذہین تھے' اسرار ماموں' بچپن میں بھی۔ انہوں نے وہ کام چٹکیوں میں کر دکھایا جس سے بڑے عاجز آ گئے تھے۔ خدا غریق رحمت کرے اور انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے وہ صرف ایک انسان ہی نہیں' اپنی ذات میں ایک انجمن بھی تھے۔

جاسوسی ادب میں انہوں نے اپنی محنت' ذہانت اور لگن سے جو مقام حاصل کیا ہے' اس میں وقت کے ساتھ ساتھ اضافہ ہوگا......اور اردو ادب میں جاسوسی ادب کے حوالے اور اضافے سے انہیں ایک طویل مدت تک یاد رکھا جائے گا۔

(نئے افق' اگست ۱۹۸۸ء)

ابنِ صفی: عظیم جاسوسی ناول نگار

گل محمد قریشی

اردو میں ٹکسالی اور سکہ بند ادیبوں نے ''جاسوسی ادب'' کو ابھی تک کھلے دل سے ادب کی صنف نہیں مانا ہے' لیکن ترقی یافتہ اقوام اور ترقی یافتہ ادب میں اس تعصب کا خاتمہ ہو چکا ہے اور عالمی پیمانے پر جاسوسی کہانیوں کو وہی درجہ حاصل ہے جو ادب کی کسی اور صنف کو حاصل ہوتا ہے۔

اردو میں جاسوسی ناول نگاری کے حوالے سے ابنِ صفی کا نام سب سے نمایاں ہے۔ ابن صفی کا اصل نام ''اسرار احمد'' تھا۔ وہ اپریل ۱۹۲۸ء میں قصبہ ''نارا' ضلع الہ آباد'' انڈیا میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام ''صفی اللہ'' تھا۔ مشہور شاعر نوح ناروی مرحوم' رشتہ میں ابن صفی کے ماموں تھے۔ علمی وادبی گھرانے سے تعلق کی بناء پر ابن صفی کو بچپن ہی سے علم وادب سے دلچسپی اور شغف رہا۔ انہوں نے صرف آٹھ سال کی عمر میں ''طلسم ہوشربا'' کی ساتوں جلدیں پڑھ ڈالیں۔ انہوں نے میٹرک اور انٹرمیڈیٹ کا امتحان الہ آباد سے پاس کیا۔ ۱۹۴۷ء میں ''الہ آباد یونیورسٹی'' میں داخلہ لیا' لیکن فسادات کی وجہ سے وہاں زیادہ عرصہ نہ رہ سکے۔ بعد میں انہوں نے ''آگرہ یونیورسٹی'' سے بی اے کیا۔ ابن صفی کے والد صفی اللہ تقسیم کے بعد ۱۹۴۷ء میں کراچی منتقل ہو گئے جبکہ ابن صفی بعد میں تعلیم مکمل کرنے کے بعد ۱۹۵۲ء میں پاکستان آئے۔ ان کے یونیورسٹی کے اساتذہ میں ڈاکٹر اعجاز اور فراق گورکھپوری جیسے مشہور ومعروف صاحبان علم ودانش شامل ہیں۔ ان کے الہ آباد کے دیرینہ دوستوں میں ڈاکٹر مجاور حسین (ابن سعید) ڈاکٹر راہی معصوم رضا' اشتیاق حیدر' یوسف نقوی' سرور حسین' حمید قیصر' قمر جالسی' نازش پرتاب گڑھی' شکیل جمالی' اور علی عباس حسینی شامل ہیں۔ معروف مصنف مشتاق احمد قریشی' ابن صفی کے لائق شاگرد ہونے کا شرف رکھتے ہیں جبکہ مشہور رائٹر ایم اے راحت بھی ابن صفی کو اپنا استاد مانتے ہیں۔ ایشیاء کا یہ عظیم جاسوسی ناول نگار ۲۶ جولائی ۱۹۸۰ء کو کینسر کا شکار ہو کر اپنے خالق حقیقی سے جاملا۔

ابن صفی اردو کے پہلے بڑے کل وقتی جاسوسی ناول نگار ہیں جنہوں نے اس صنف ادب میں قابل قدر اور طبعزاد کام کیا اور اسے ایک قابل ذکر مقام عطا کیا۔

ابن صفی نے زمانہ طالب علمی سے ہی لکھنا شروع کر دیا تھا۔ ۱۹۴۸ء میں علی عباس حسینی نے ماہنامہ ''نکہت'' کی داغ بیل ڈالی تو ابن صفی ابتداء ہی سے اس کی ٹیم میں شامل رہے۔ وہ ''نکہت'' اور دیگر رسائل میں طغرل فرغان' عقرب بہارستانی اور اسرار احمد کے نام سے طنز ومزاحیہ مضامین کے ساتھ ساتھ شاعری بھی کرتے رہے۔ ۱۹۵۲ء میں انہوں نے ایک نئے ماہنامے ''جاسوسی دنیا'' کا آغاز کیا۔ اس میں ہر ماہ ایک مکمل جاسوسی ناول چھپنے لگا۔ اس نئی صنف کے لیے انہوں نے ''ابن صفی'' کا قلمی نام

منتخب کیا۔ ان کا پہلا ناول ''دلیر مجرم'' ۱۹۵۲ء میں الہ آباد سے ماہنامہ ''جاسوسی دنیا'' کے تحت شائع ہوا۔ ابتداء میں ابن صفی، رائیڈر ہیگرڈ، سر آرتھر کانن ڈائل اور ارل اسٹینلے گارڈنر سے متاثر تھے۔ لہٰذا ان کے ابتدائی آٹھ ناول مغربی ادب سے ماخوذ ہیں۔ ۱۹۵۶ء میں انہوں نے کراچی سے شہرہ آفاق ''عمران سیریز'' کے ناول لکھنے شروع کیے اور جاسوسی ادب میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا۔ ابن صفی نے مجموعی طور پر تقریباً ڈھائی سو ناول لکھے جو کہ ہر طبقے میں مقبول ہوئے۔ الہ آباد میں انہوں نے ''جاسوسی دنیا'' (فریدی حمید سریز) کے صرف سات ناول لکھے' بقیہ ناول پاکستان آ کر تخلیق کیے۔

جس دور میں ابن صفی نے جاسوسی ناول نگاری شروع کی اس دور میں برصغیر میں جنسی لٹریچر بکثرت شائع ہو رہا تھا۔ فحش نگاری کے اس سیلاب کو روکنے کے لیے انہوں نے جدید طرز پر جاسوسی ناول نگاری کا آغاز کیا۔ اس طرح نہ صرف یہ کہ جنسی لٹریچر کا خاتمہ ہو گیا بلکہ اردو میں طبعزاد جاسوسی ناول نگاری کا رجحان زور پکڑ گیا۔

ابن صفی' ماحول اور منظر نگاری سے بھرپور کام لیتے ہیں ان کا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے جاسوسی ناولوں میں اپنے گردوپیش کی دنیا سے مواد اکٹھا کیا اور اپنے کردار منتخب کر کے اپنے ناولوں میں واقعیت اور حقیقت پسندی کا اضافہ کیا۔

ابن صفی کا حقیقی کارنامہ زندہ رہنے والے آفاقی کرداروں کی تشکیل ہے۔ فریدی' حمید' قاسم' فیاض' سلیمان' روشی' جولیا اور عمران' یہ سارے کردار زندگی کی طرح زندہ ہیں۔ ابن صفی نے سب سے زیادہ جس کردار پر محنت کی وہ ''کرنل فریدی'' کا کردار ہے۔ ابن صفی کے ناولوں کا یہ اہم ترین کردار ہے۔ فریدی' ساری دنیا پر قانون کی حکمرانی کا خواہاں ہے۔ وہ ہمیشہ اس کوشش میں رہتا ہے کہ خون کا ایک قطرہ گرائے بغیر مجرم اور اس کے گروہ کو قانون کے حوالے کر دے۔ فریدی' ایک ذہین' نڈر اور باحوصلہ کردار ہے۔ ابن صفی کے ناولوں کا دوسرا اور سب سے زیادہ مقبول کردار ''عمران'' ہے۔ اس کردار کے دو متضاد پہلو ہیں۔ دیکھنے میں احمق' لیکن اعصاب شکن ماحول میں گھر جانے پر درندہ' یہی تضاد لوگوں کو بھا گیا۔ عمران' دراصل ابن صفی کا آئیڈیل کردار ہے۔ ''علی عمران'' جو ایم ایس سی اور پی ایچ ڈی ہے۔ اس نے بظاہر ڈگری کو سرد خانے میں محفوظ کر رکھا ہے۔ وہ اپنی ساری حماقتوں اور معصومیت کے ساتھ یوں جلوہ گر ہوتا ہے کہ سب ہی اس خبطی اور ازلی بیوقوف کے گرویدہ نظر آتے ہیں۔ وہ مجرمانہ کیس کی گتھیاں اس طرح سلجھاتا ہے کہ مجرم اور پولیس دونوں حیران رہ جاتے ہیں۔ وہ بزم میں بذلہ سنج' پرلطف اور کھلنڈرا ہے تو رزم میں نڈر' جیالا اور بہادر ہے۔ عمران کا کردار خاصا تہہ دار اور پرپیچ ہے۔ خود اس کے چار روپ ہیں۔ عمران' ایکس ٹو' پرنس آف ڈھمپ' رانا تہور علی' یہ ابن صفی کے شگفتہ قلم کا نتیجہ ہے کہ ہر ناول میں عمران ہمارے سامنے نت نئے روپ میں آتا ہے اور ایک اچھے خالق کی طرح ابن صفی نے زندگی کے سارے رنگ' زندہ متحرک انسانوں کے سارے جذبات' کیفیات و تجربات کو عمران کے

کردار میں سمودیا ہے۔اس طرح عمران اردو ادب کا ایک جیتا جاگتا کردار بن گیا ہے۔

ابن صفی کے دیگر کرداروں میں ''حمید'' ایک اہم کردار ہے۔ وہ شرارتیں کرتا نظر آتا ہے مگر اس کی شرارتیں اس کا مذاق اور اس کی غیر سنجیدگی بھی کارآمد ہوتی ہے۔اکثر اس کی یہ حرکتیں ''فریدی'' کے لیے نشان راہ بن جاتی ہیں۔ابن صفی نے اپنے جاسوسی ناولوں میں مزاحیہ کرداروں کی پیشکش سے دو مختلف کام لیے ہیں۔ایک تو تلاش وتجسس کے دوران سنجیدگی کے اثر کو کم کرنے اور دوسرے پلاٹ میں واقعات کی کڑیاں جوڑنے کے لیے ان کرداروں سے بڑی مہارت اور چابکدستی سے کام لیا ہے۔

ابن صفی نے اپنے ناولوں میں بہت سے نفسیاتی شہ پارے بھی تخلیق کیے ہیں جن میں انسانی نفسیات کا بہترین تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔اس اہم خصوصیت کی بناء پر ان کے ناولوں میں ایک خاص قسم کا دل آویز اثر پیدا ہو گیا ہے۔انہوں نے اپنے ناولوں' زہریلا آدمی' لاشوں کا آبشار' سینکڑوں ہم شکل' پراسرار موجد' شاہی نقارہ' سائے کی لاش' چاندنی کا دھواں' پتھر کی چیخ' سہ رنگا شعلہ' تیسری ناگن' چمکیلا غبار' ڈیڑھ متوالے وغیرہ ہیں جو نفسیاتی کردار پیش کئے ہیں وہ کمال کا درجہ رکھتے ہیں۔ان کرداروں اور ناولوں کو دنیا کے ترقی یافتہ ادب کے مقابلے میں بلا جھجک پیش کیا جا سکتا ہے۔

ابن صفی کے جاسوسی ناولوں میں وہ غدار بھی ہیں جو ہوس زر میں مبتلا ہو کر شہروں کو لاشوں کا بازار بنا دیتے ہیں' اور اپنی سماجی حیثیت کا نقاب اپنے مکروہ چہروں پر ڈالے رہتے ہیں (مثلاً قبر اور خنجر) اور وہ جنسی مریض بھی ہیں جو ہمارے معاشرے کو ایک بڑا قحبہ خانہ بنا دینا چاہتے ہیں (مثلاً لڑکیوں کا جزیرہ) انہوں نے اپنے ناولوں میں فحش نگاری کو قریب تک نہ آنے دیا' بلکہ اس کی حوصلہ شکنی کی۔ان کے ہاں اصلاح کا پہلو جا بجا نظر آتا ہے۔''دشمنوں کا شہر'' اس کی ایک بہترین مثال ہے۔

کسی تحریر کے ادب ہونے کی شرط یہ ہے کہ وہ زندگی کی عکاس ہو اور اسے عوام کی طرف سے قبول عام کی سند حاصل ہو۔ابن صفی کی تحریروں میں یہ دونوں صفات بدرجہ اتم موجود ہیں۔ان کی تحریریں نہ صرف ادب بلکہ مقصدی ادب ہیں۔ان کی کہانیوں میں ہمیشہ ایک پیغام چھپا ہوتا ہے اور وہ ہے قانون کا احترام۔

ابن صفی کے ناولوں کی ایک اور خصوصیت ''آفاقیت'' ہے۔''افغانستان'' عمران سیریز کے آخری ناولوں میں واضح طور پر موجود ہے۔''زیرولینڈ'' ان کے خوابوں اور بڑی طاقتوں کی کشمکش کی ایک ادبی صورت ہے۔پاکستان کے مسائل اور پڑوس سے ہماری کہانی تو حقیقی طور پر ابن صفی کے ہاں موجود ہے۔''مشرق وسطیٰ'' بھی ان کا موضوع ہے۔وہ اتحاد بین المسلمین کے قائل ہیں۔

ابن صفی کا اسلوب ان کے ناولوں کی طرح منفرد ہے۔ان کی تحریریں سلاست اور لطافت کا نمونہ ہیں۔ان کا انداز بیان نہایت دلکش' شگفتہ' سبک اور شائستہ ہے۔ان کی تحریریں سادگی کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔ کہیں کہیں تشبیہات واستعارات اور محاورات کا استعمال بھی کرتے ہیں' لیکن وہ بے جا طور پر ان کے

استعمال کے شوقین نہیں، اور نہ ہی عربی و فارسی کے نامانوس الفاظ استعمال کر کے اپنا سکہ بٹھانا چاہتے ہیں۔ ابن صفی کے ناولوں کی زبان بڑی شستہ، رواں اور ٹکسالی ہے ان کے ناولوں کو ان کی معیاری زبان، برجستہ مکالمے اور شوخی و ظرافت نے بھی بے پناہ مقبولیت عطا کی۔ وہ طنز و مزاح سے خوب کام لیتے ہیں، ان کے اکثر فقرے اتنے برجستہ ہوتے ہیں کہ سنجیدہ آدمی بھی متبسم ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ابن صفی نے مزاح اور سسپنس کو یکجا کر کے ایک بہت بڑا کارنامہ انجام دیا۔

ابن صفی کے قارئین میں دکاندار سے لے کر کلرک تک اور اعلیٰ افسر سے لے کر دانشور تک سبھی شامل تھے۔ پروفیسر ڈاکٹر ابوالخیر کشفی، محمد حسن عسکری، سرشار صدیقی اور پروفیسر مجنوں گورکھپوری جیسے جلیل القدر صاحبان علم و ادب بھی ابن صفی کے قارئین میں شامل ہیں۔ انگریزی کی مشہور جاسوسی مصنفہ ''اگاتھا کرسٹی'' جیسی مستند شخصیت بھی ابن صفی کے فن کی معترف تھی۔

ابن صفی کی شہرت اور مقبولیت کے سبب ان کے نام سے ملتا جلتا نام رکھ کر بہت سے نقالوں نے لاکھوں روپیہ کمایا۔ جاسوسی ادب کی ''الف لیلہ'' لکھنے والا یہ شخص عوام الناس میں امیر خسرو اور نظیر اکبر آبادی کی طرح دلپسند تھا۔

روزنامہ ایکسپریس کراچی

ایک شرارت ایک زندہ تجسس......!

مشتاق احمد قریشی

۵ جولائی کو میں جیسے ہی دفتر پہنچا کہ مجھے اپنے دفتر میں بیٹھے ہوئے ابھی چند منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ اسلام علیکم کی آواز نے مجھے چونکا دیا آنے والے نے بڑی بے تکلفی سے میرے کیبن کا دروازہ کھولا اور میرے سامنے آ کر کرسی پر بیٹھ گیا۔

یہ میرا پرائمری سے سیکنڈری اسکول تک ہم جماعت جمیل تھا۔ اپنے زمانے میں وہ بڑا ہی کھلنڈرا اور تیز طرار لڑکا تھا جہاں کہیں دو چار دوست کھڑے باتیں کر رہے ہوتے وہ آتا اور اپنے آنے کی اطلاع کسی نہ کسی کی گردن پر ایک زوردار چپت لگا کر دیتا یہ اس کی عادت تھی جس پر کئی بار اسے دوستوں کی مزاحمت اور ناراضگی کا بھی سامنا کرنا پڑتا تھا۔ ایک طویل عرصے بعد یوں اچانک نمودار ہونے پر مجھے حیرت ہوئی اور خوشی بھی۔

جمیل مجھ سے ملنے تقریباً پندرہ سال بعد آیا تھا اور آتے ہی بڑی بے تکلفی سے بیٹھتے ہوئے بولا یار تیری کتاب ''یادش بخیر ابن صفی'' کا اخبار میں اشتہار دیکھ کر آیا ہوں دیکھوں تو تم نے ابن صفی کے بارے میں کیا جھک ماری ہے۔

طالب علمی کے زمانے میں جمیل کی رہائش فردوس کالونی میں کہیں تھی وہیں ابن صفی صاحب کا دفتر بھی واقع تھا وہ ہفتے دو ہفتے میں یا کبھی کبھی مہینہ بعد ابن صفی صاحب کو سلام کرنے کے بہانے ان کے دفتر میں جا گھستا اور کچھ دیر باتیں کر کے نکل جاتا تھا اس نے کئی بار مجھے بتایا بھی کہ میں آج تمہارے گرد کے دفتر حاضری دینے گیا مگر تم سے ملاقات نہیں ہو سکی چلو اب تو ہو ہی گئی جب ملتا شکوہ شکایت کے دفتر کھولے رکھتا۔

میں نے اس کی باتیں سنتے ہوئے ''یادش بخیر ابن صفی'' اس کے سامنے رکھ دی جسے اٹھا کر وہ الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔ سرورق دیکھ کر بولا۔

''یہ تصویر تو غالباً ۶۵ کی دکھائی دیتی ہے تمہارے پاس تو کافی تصاویر ہوں گی کیونکہ تمہارا تعلق تو تقریباً پچاس پچپن سال کا جو ہوا۔ بائیس سال ان کی زندگی میں اور تینتیس چونتیس سال ان کی وفات کے بعد۔

مجھے اس کا سن یاد نہیں ہو سکتا ہے تم درست کہہ رہے ہو۔

کچھ دیر وہ کتاب کو الٹ پلٹ کر دیکھتا رہا اوراق الٹتا پلٹتا رہا فہرست دیکھ کر مسکراتے ہوئے شرارت سے بولا۔ تمہاری یہ کتاب نامکمل ہے اس میں ایک چیز کا تو تم نے ذکر ہی نہیں کیا۔

''وہ کیا؟''میں نے استعجاب سے پوچھا۔
''تجھے تو معلوم ہے کہ ابن صفی صاحب نشہ کیا کرتے تھے اس کا تو کہیں ذکر نظر نہیں آ رہا۔''
''کیا بکواس کر رہے ہو تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا۔''میں نے اپنے غصے کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔
''کیا میں غلط کہہ رہا ہوں۔''
''ہاں تم غلط کہہ رہے ہو بلکہ بکواس کر رہے ہو۔''
شاید میرا بلڈ پریشر بڑھنے لگا تھا' وہ پھر شرارت سے مسکراتے ہوئے بولا۔
''نہیں نہیں میں سچ کہہ رہا ہوں میں نے خود دیکھا ہے انہیں نشہ کرتے ہوئے۔ کیا تجھے یاد نہیں۔
اب میرے صبر کا پیمانہ سچ مچ لبریز ہو گیا میں نے اپنی نشست سے اٹھتے ہوئے اسے اپنے دفتر سے نکل جانے کو کہا' مگر وہ تو بڑے آرام سے بیٹھا مسکراتا رہا میں نے شدید غصے کی حالت میں اسے کہا۔
جاتے ہو یا اپنے آدمیوں سے اٹھوا کر باہر پھنکوا دوں۔
میں پھر بھی یہی کہوں گا کہ وہ نشہ کرتے تھے۔
میں اپنے غصہ پر قابو نہ رکھ سکا شاید میری برداشت جواب دے گئی میرا ایک زوردار تھپڑ اس کے داہنے گال پر پڑا وہ کرسی سے گرتے گرتے بچا' میری بلند آواز اور اس کے گال پر پڑنے والے تھپڑ کی آواز نے میرے دفتر کے اسٹاف کو میرے کیبن کے باہر جمع کر دیا شاید وہ میرے کسی حکم کے منتظر تھے کہ اتنی ہی دیر میں اس نے آواز دے کر کہا۔
''چلو یہاں کھڑے کیا تماشہ دیکھ رہے ہو ایک گلاس پانی لاؤ اور مجھے حکم دیا کہ بس بہت ہو گیا اب اپنی کرسی پر بیٹھ جاؤ ورنہ میرا ہاتھ بھی اٹھ سکتا ہے' پانی کا گلاس ایک ہی سانس میں ختم کرنے کے بعد وہ میری طرف متوجہ ہوا۔ میرا خون کھول رہا تھا میرا سر پھٹنے کو تھا' اس نے بڑے تحمل اور مستحکم لہجے میں مجھے مخاطب کیا۔
جناب قریشی صاحب آپ کہتے ہیں کہ آپ ابن صفی کے قریبی ساتھیوں میں سے ہیں میں مان لیتا ہوں لیکن نہایت ہی افسوس ناک بات ہے کہ آپ کو یہ تک پتہ نہیں یا آپ دانستہ اس بات سے انکار کر رہے ہیں کہ آپ کے محترم ابن صفی صاحب نشہ کیا کرتے تھے۔
اتنا کہہ کر اس نے اپنی کرسی کو میز سے ذرا دور کر لیا کہ کہیں میرا ہاتھ دوبارہ اس کے گال تک نہ پہنچ جائے۔ میں ایک بار پھر اپنی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا' اس نے بڑے تحکم بھرے انداز میں مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔
بس بہت ہو گیا اب بیٹھ جاؤ اور میری بات غور سے سنو۔ میں قطعی غلط نہیں کہہ رہا۔
کچھ دیر رک کر غالباً اس نے اپنی سانسیں درست کیں اس عرصے میں وہ اپنے داہنے گال کو جس پر تھپڑ پڑا تھا سہلاتا رہا' اور مجھے شرارت بھری نظروں سے گھورتا بھی جا رہا تھا۔ پھر ہلکی سی مسکان کے

ساتھ بولا۔
اب اگر میں یہ کہوں کہ میں نے تو ان کے ہاتھ میں بوتل بھی دیکھی ہے تو تم تو مجھے مار ہی ڈالنے کو دوڑ پڑو گے یہ بات میں بالکل درست کہہ رہا ہوں اس میں جھوٹ قطعی نہیں ہے۔
میں خون کا گھونٹ پی کے رہ گیا منہ دوسری طرف کر لیا۔
اس نے غالباً میری خاموشی کو میری شکست جانا اور مجھے مزید کچھ کہنے یا غصہ دلانے کے لیے بڑے پراسرار انداز میں مسکراتے ہوئے یادش بخیر اٹھا کے میرے سامنے میز پر زور سے دے ماری اور کہنے لگا۔
تمہارا کیا خیال ہے میں کوئی جھوٹا انسان ہوں تم سے یہ سب جھوٹ کہہ رہا ہوں۔
ہاں تم قطعی جھوٹے اور کمینے انسان ہو'ایک درویش صفت انسان پر الزام ہی نہیں تہمت بھی لگا رہے ہو۔
اگر میں ثابت کر دوں تو۔
تم ہرگز ہرگز یہ ثابت نہیں کر سکتے۔
اور اگر میں نے خود تم سے بھی اس بات کا اقرار کرا لیا تو؟
بکو کیا بکتے ہو۔
میں غصے میں پیچ و تاب کھا رہا تھا' میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ سامنے بیٹھے شخص کو جان سے مار دو۔
ذرا ٹھنڈا ہو کر میری بات سنو اور میری بات کا جواب دینا۔
اچھا ٹھیک ہے میں نے بمشکل کہا۔
مجھے یہ بتاؤ کہ ابن صفی صاحب سگریٹ پیتے تھے یا نہیں؟
ہاں سگریٹ تو پیتے تھے'لیکن پھر انہوں نے اسے چھوڑ دیا تھا۔
چلو میں مان لیتا ہوں لیکن جب تک بھی سگریٹ پیا پیا تو سہی کیا اس میں تمباکو استعمال نہیں ہوتا' مجھے بتاؤ چلو ہاں یا ناں میں ہی جواب دو۔
''ہاں ہوتا ہے۔'' میں نے جواباً کہا۔
کیا سگریٹ پینے کا عادی شخص سگریٹ پیے بغیر رہ سکتا ہے۔''
''پتہ نہیں' میں نے کہا۔
''مجھے پتہ ہے کیونکہ میں سگریٹ خود بھی پیتا ہوں۔ مجھے پتا ہے کہ سگریٹ نوش اور وہ جو عادی سگریٹ نوش ہو سگریٹ پیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اب مجھے یہ بتاؤ کیا' ابن صفی صاحب پان نہیں کھاتے تھے۔
ہاں کھاتے تھے' اکثر کتھا چونا اور سپاری کھاتے دیکھا ہے۔
تمہیں یہ تک تو پتہ نہیں کہ وہ اپنے بٹوے میں کیا کچھ لیے پھرتے تھے' وہ پان میں تمباکو کا استعمال کیا کرتے تھے' پان میں تمباکو کا استعمال اور سگریٹ کے ذریعے تمباکو کو کشید کرنا یہ نشہ نہیں تو اور کیا ہے۔ یہ اور بات کہ تمباکو کے نشے کو لوگ نشہ نہیں سمجھتے کیونکہ یہ عام طور پر ہمارے معاشرے میں استعمال ہوتا

ہے ہمارے دیہاتوں میں تو عورتیں بھی تمباکو پیتی ہیں یہ اور بات کہ اونچی سوسائٹی کی خواتین بھی شوقیا یا لت کے عادی سگریٹ پیتی ہیں جناب نشہ تو نشہ ہے چاہے وہ ہلکا ہو یا تیز۔ میں نے یہ بھی کہا کہ میں نے ان کے ہاتھ میں بوتل دیکھی ہے۔

ہاں اس بکواس کا کیا مطلب ہے۔ چونکہ میں نے اس عرصے میں بلڈ پریشر کی دوا بھی لے لی تھی' جس سے میری طبیعت قدرے بہتر ہو چکی تھی۔

ہاں میں نے یہ بات بھی غلط نہیں کہی۔ اس کے تو تم خود بھی گواہ ہو۔

میں گواہ ہوں' میں نے حیرانگی سے دریافت کیا۔

ہاں تم بھی گواہ ہو۔

پھر تم نے اپنی بکواس شروع کر دی۔ اب اٹھو اور چلتے پھرتے نظر آؤ بہت ہو گیا۔ ایسا نہ ہو کہ میری برداشت پھر جواب دے جائے۔ ایک دم سے اس نے ایک بلند بانگ قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

''ابے' تجھے یاد نہیں جب ایک بار میں ابن صفی صاحب کے دفتر میں بیٹھا ان کا بھیجا کھا رہا تھا تو تو کسی صاحب کو ان سے ملانے لایا تھا تو پھر میں نے پوچھا۔

تو پھر یہ کہ ان صاحب کے آنے کے باعث یا تمہارے آنے کی وجہ سے صفی صاحب نے برابر کے وزیر ریسٹورنٹ سے تین بوتلیں منگائی تھیں۔

کاہے کی بوتلیں منگائی تھیں۔ میں نے سوال کیا۔

آئسکریم سوڈے کی پاکوکا کمپنی کا آئسکریم سوڈا اس زمانے میں کافی مشہور اور نیا مشروب جو تھا۔

تو اس میں نشے کی کیا بات تھی۔ آئسکریم سوڈے میں نشہ کہاں سے آ گیا۔

میں نے یہ کب کہا کہ بوتل نشے کی تھی' میں نے تو صرف ان کے ہاتھ میں بوتل دیکھنے کی بات کی تھی۔ اگر تمہارا اپنا دماغ خراب ہے جو تم اسے نشے کی بوتل سمجھ بیٹھے ہو تو اس میں میرا کیا قصور ہے۔ مجھے تو تمہاری کتاب کے ساتھ ساتھ پندرہ سال بعد ملنے والا یہ تمانچے کا تمغہ کافی عرصہ تک یاد رہے گا۔ مجھے تو حیرت ہے تم جو خود کو ابن صفی صاحب کی تحریروں کے شناور سمجھتے ہو اور مجھے بھی خوب اچھی طرح پہچانتے ہو' میں نے تو حضرت ابن صفی صاحب کی تقلید کرتے ہوئے چند جملے بول کر تجسس اور پراسراریت پیدا کرنے کی کوشش کی تھی لیکن یہ تجربہ مجھے خاصہ مہنگا پڑا ہے لیکن تم جیسے جاہلوں سے اللہ محفوظ ہی رکھے۔

مجھے یہ دیکھ کر بڑی خوشی بھی ہوئی کہ تیس پینتیس سال گزرنے کے باوجود ابن صفی صاحب کے متعلق تمہارا جنون ابھی ویسا ہی زندہ اور تازہ ہے تمہاری ان سے اٹوٹ محبت دیکھ کر مجھے کوئی حیرانی نہیں ہو رہی ہے۔ چلو میں نے تمہیں ابن صفی کے نام پر معاف کیا تم بھی کیا یاد رکھو گے کہ کسی فقیر سے پالا پڑا تھا۔ یہ بھی یاد رکھنا کہ میں وہ شخص ہوں جس کا ذکر ابن صفی صاحب نے ۶۹ میں اپنی کتاب مناروں

والیاں' عمران سیریز میں میرا نام لیے بغیر کیا ہے تیرا نام تو کبھی کہیں نہیں لیا اور بڑا شاگرد بنا پھرتا ہے۔ میں نے وہ ناول اب تک بہت سنبھال کر رکھا ہوا ہے۔

ایک بات اور بتا تا چلوں میں نے جو تمہاری یہ کتاب میز پر دے کر ماری تھی' دراصل میں نے اپنا غصہ تمہاری اس تصویر پر جو اس شیشے کے نیچے لگی ہے نکال لیا' اب اجازت دو پھر کبھی زندگی نے وفا کی اور موقع ملا تو پھر یونہی آ جاؤں گا۔

میں حیرانگی سے منہ کھولے اس شخص کو دیکھتا رہا جس نے چند منٹوں میں میری چولیں ہلا کر رکھ دی تھیں' میں سوچنے لگا جانے ایسے کتنے دیوانے ہوں گے جو ابن صفی صاحب کو کس کس رنگ میں دیکھتے ہوں گے محسوس کرتے ہوں گے یقیناً یہ بھی اس کی ابن صفی سے محبت کا کوئی انوکھا ہی انداز تھا۔ جاتے جاتے وہ ایک اور جملہ کستا گیا۔

تمہیں تو معلوم ہے کہ میرے والد صاحب کی ٹوپیوں کی دکان تھی' انہوں نے بڑے بڑوں کو ٹوپی پہنائی ہوگی لیکن آج میں نے تمہیں بھی ٹوپی پہنا ہی دی آخر' اللہ حافظ یہ کہتا ہوا وہ تیزی سے دروازہ کھولتا ہوا چلا گیا۔ اور میں اس کے بارے میں ابن صفی صاحب کے بارے میں اس کی شرارت پر سوچتا ہی رہ گیا۔

ابنِ صفی، حماقت کے فانوس میں بصیرت و آگہی کا لائحہ

محمد مقیم

شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

''باہر لان پر سورج کی پہلی کرن گلابی رنگ کی پچکاری مار رہی تھی اور رکھوالی کے السیشن اس انداز میں زبانیں نکالے ہانپ رہے تھے جیسے انھی کی محنت نے سورج طلوع ہونے میں مدد دی ہو۔'' (رائفل کا نغمہ، ج۔۳۴، ص۔۳۱۱)

درج بالا اقتباس کا اس مضمون سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ایک جملے کے اس اقتباس کی چستی اور درستی یہ سوال اٹھاتی ہے کہ کیا یہ کسی معمولی لکھنے والے کا کارنامہ ہے؟ اس سوال کا جواب اثبات میں دیا جا سکتا ہے بشرطیکہ لکھنے والے کے یہاں اس کی مثال اتفاق کا درجہ رکھتی ہو۔ لیکن یہ محض اتفاق نہیں ہے، اس قسم کے سیکڑوں جملے ابنِ صفی کی تخلیقات سے منتخب کیے جا سکتے ہیں۔ جب ایسی صورت حال ہو تو ہمیں یہ ماننا پڑتا ہے کہ ابنِ صفی نہ صرف بہترین تخلیقی صلاحیت کے حامل تھے بلکہ اس کے اظہار میں کامل بھی تھے۔ مندرج اقتباس مخصوص واقعے کے تناظر میں محض مزاح کا نمونہ نہیں ہے۔ کامیاب مزاح نگاری کے لیے مشاہدے کی وسعت اور گہرائی ضروری ہے۔ مشاہدے کی وسعت کے سہارے مزاح پیدا کرنا مزاح نگار کے زاویۂ نظر اور تخیل پر مبنی ہے۔ کسی فرد کے زاویۂ نظر اور تخیل کی بات کی جائے تو کہنا بے جا نہ ہوگا کہ تخلیق کار کے لیے اشیا تجریدی حیثیت رکھتی ہیں۔ اس طور پر دیکھا جائے تو درج بالا اقتباس میں زمین اور آسمان کا قلابہ جس انداز سے ملایا گیا ہے ابنِ صفی کی خیال بندی کہلائے گا۔ یہ خیال بندی ابن صفی کے 'عام/اصل قاری' نہیں بلکہ 'قاری بالکنایہ' سے اپنا تعلق استوار کرتی ہے۔ ان بر سبیل تذکرہ باتوں کی ضرورت اس لیے محسوس ہوتی ہے کہ آج کے دور میں ابنِ صفی اور ان کی تخلیقات پر ''مقبول عام ادب'' کے حوالے سے بات کرنے کا بڑا زور ہے۔ مقبول عام ادب یا پاپولر لٹریچر کی اصطلاح کس قدر مبہم اور مغالطہ انگیز ہے اس بات پر غور نہیں کیا جاتا۔ میرے خیال سے پاپولر یا مقبول ادیب صرف وہی ہو سکتا ہے، جس کے یہاں 'قاری بالکنایہ' کے لیے کوئی جگہ نہ ہو۔

استاد محترم ڈاکٹر خالد جاوید نے 'کراچی لٹریری فیسٹول' کے دوران ایک گفتگو میں ابن صفی کے تعلق سے فکر انگیز اشارہ دیا کہ 'صرف مقبول ہونے سے کام نہیں بنے گا' مقبول تو شاہ رخ خان اور سنیل گاوسکر بھی ہوتے ہیں۔'' یہ جملہ دراصل اردو ادب میں ابنِ صفی کے مقام کا صحیح تعین کرنے کی سمت فکر کی دعوت دیتا ہے۔ یہ گفتگو یوٹیوب پر موجود ہے۔ اگر محض مقبولیت کی بات کی جائے تو میں معذرت کے ساتھ عرض کروں گا کہ اردو میں غالب سے زیادہ مقبول شاید ہی کوئی ہو۔ اس مقبولیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ بالکل اُمی اور جاہل اور مزدور پیشہ لوگ جب ترنگ میں کوئی شعر گڑھتے ہیں تو کہتے ہیں 'چچا غالب نے کہا ہے' اتنا ہی نہیں

بعض فحش برائے فحش اشعار کو بھی چچا غالب کے نام سے سند دی جاتی ہے۔ کچھ تک بندیاں، مع تخلص گردش کرتی ہیں۔ حضرت امیر خسرو دہلوی کی مقبولیت کو جاننے کے لیے یہی کافی ہوگا کہ بہت سا ہندوی کلام جس کی تاریخی حیثیت اور وقت کا تعین بھی مشکل ہے آں جناب کی ملکیت سمجھا جاتا ہے۔ علاوہ ازیں سعادت حسن منٹو بھی کچھ کم مقبول نہیں ہیں۔ آج بھی بالخصوص ہندی میں 'منٹو کی کہانیاں' یا 'سعادت حسن منٹو کی کہانیاں' ہندوستان کے کسی بھی فٹ پاتھ، کسی بھی ریلوے اسٹیشن اور کسی بھی پل کے نیچے بہ آسانی مل جاتی ہیں۔ یہ حقائق طبیعت پر گراں گذرنے کے باوجود ان دو حضرات کی بے پناہ مقبولیت پر دال ہیں۔ بعض اچھے تخلیق کاروں کی تصویر کے دو رخ ہوتے ہیں ایک کی تشکیل 'اصل قاری' کرتا ہے لیکن ادبی مقام 'قاری بالکنایہ' سے قائم ہوتا ہے۔ تصویر کا یہ دوسرا رخ ہی اصلیت ہے۔

ابن صفی کی تکنیک وحدت تاثر کو مسترد کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ناولوں میں ایسی فکر انگیز باتوں کو تلاش کرنا چنداں مشکل نہیں ہوگا جن کے سہارے وحدت تاثر کی ٹکسال میں ایک ایک ناول سے کم از کم تین تین افسانے یا ناولٹ ڈھالے جا سکتے ہیں۔ ابنِ صفی کو حاشیے پر لے جانے میں وحدت تاثر کا فقدان بھی اہم سبب ہے حالاں کہ وحدت تاثر کو توڑنا بھی آرٹ ہے۔ ایک زمانے تک اور کسی قدر آج بھی وحدت تاثر زیرو واٹ کا وہ بلب سمجھا جاتا ہے، جس کی روشنی میں قاری پر دانشوری کا لرزہ طاری ہوتا ہے، مسائل کا انکشاف ہوتا ہے اور متحرک و غیر متحرک اشیا پر اسرار نظر آتی ہیں، غیر مرئی چیزیں مرئی ہو جاتی ہیں۔ اس مضمون کا بنیادی مقصد ہی یہ ہے کہ ابنِ صفی کے ناولوں سے ایسے اقتباسات پیش کیے جائیں جو روشنی اور دانشوری کا منبع ہیں۔ جن کی جانب کچھ تو اردو دنیا کے تحفظات کی خاطر اور کچھ اپنے ٹھٹھول کو ابنِ صفی کے فلسفۂ حماقت سے ہم آہنگ کرنے کی وجہ سے توجہ نہیں دی گئی۔ یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ ابنِ صفی کے یہاں مزاح محض تفنن طبع کے لیے نہیں ہے بلکہ ایک قسم کا احتجاج ہے، جو حمید کے کردار میں جھلاہٹ کے طور پر ظاہر ہوتا ہے۔ عمران کے کردار میں مزاح باقاعدہ ایک فلسفے کی شکل میں ترویج پاتا ہے۔ اسی لیے میں نے ابنِ صفی کے مزاح کو "فلسفۂ حماقت" اور مضمون کے عنوان میں "حماقت کے فانوس" سے موسوم کیا ہے۔ فریدی حمید سیریز اور عمران سیریز میں بالخصوص حمید اور عمران کے مابین مزاح کا جو بنیادی افتراق ہے اس کی طرف ڈاکٹر خالد جاوید نے کراچی لٹریری فیسٹول کی گفتگو میں اشارہ بھی کیا ہے۔ اس تمہیدی گفتگو کے بعد اقتباسات پر نظر کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے، جو کہ اس مضمون کا مقصد بھی ہے۔

ابن صفی متعدد بار جدید عہد کے فلسفے اور دانشوری کی پول کھولتے ہیں اور زیرِ زمین مقاصد کو واضح کرتے ہیں۔ یہ بات بڑے آدرشوں اور بلند بانگ نعروں کے لیے ناقابل برداشت ہے۔

"ہم لوگوں کا خیال ہے کہ عقلمندی ہی انسانیت کے لیے وبال بن گئی ہے۔"

"وہ کیسے؟" روشی نے پوچھا اور ایک ویٹر کو اشارے سے بلا کر کافی کے لیے کہا۔ پھر بوڑھے کی طرف متوجہ ہوگئی، بوڑھا کہہ رہا تھا۔ "ایٹم اور ہائیڈروجن بم احمقوں کی ایجاد نہیں ہیں۔"

''اوہ......!'' روشی کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں! اور اب اسے محسوس ہوا کہ وہ کسی کریک آدمی سے گفتگو نہیں کر رہی ہے! وہ جلدی جلدی پلکیں جھپکاتی ہوئی بولی۔ ''یہ تو فلسفیوں کی انجمن ہے!۔''

''ہرگز نہیں، فلسفی ہی تو آدمیوں کو عقل مند بناتے ہیں!'' بوڑھے نے سنجیدگی سے کہا---'' (حماقت کا جال، ج ۔۱۳، ص ۱۱)

عمران کا فلسفہ۔

''اپنے وجود کے ثبوت کے لیے میں ڈیکارٹس کے خیال سے متفق ہوں۔ یعنی میرا ادراک میرے وجود کا ثبوت ہے اور میرا وجود کسی کی حماقت کا نتیجہ ہے۔ لہٰذا حماقت ہی بنیادی حقیقت ٹھہری۔ دنیا کے سارے فتنوں کی جڑ تو عقل ہے۔ اس لیے عقل اٹھا کر طاق پر رکھ دینا چاہیے۔ جیسے میں نے رکھ دی ہے!'' (آنکھ شعلہ بنی، ج ۔۲۵، ص ۔۲۳۱)

''برتر وہی ہے جو بے وقوف ہو۔ جتنا بے وقوف اتنا ہی برتر۔ پہلے مرد عورت پر حکومت کرتا تھا......طاقت سے......اب بے وقوف یعنی برتر بنا کر حکومت کرتا ہے۔ برتر بنا کر حکومت کرنے میں اسے دہرا فائدہ ہے یعنی عورت پر دہری ذمہ داریاں عائد ہو جاتی ہیں۔ وہ انھیں خود سے برتر بنا کر گھروں کی چار دیواریوں سے نکال لاتا ہے انھیں اپنے دوش بدوش کام کرنے کا موقع دیتا ہے۔ رہ گئے چار دیواریوں والے فرائض، تو عورت انھیں عادتاً انجام دیتی ہے یعنی مرد عورتوں کے دوش بدوش بچوں کو دودھ نہیں پلاتا۔ عورتوں کے دوش بدوش گھر کی صفائی نہیں کرتا۔ بچوں کے کپڑے نہیں دھوتا۔ اس وقت وہ پلنگ پر لیٹ کر ٹانگوں کو سمیٹ کر تاش کھیلنے لگتا ہے۔ سبحان اللہ... عورت اسی لیے مرد سے برتر ہے کہ اس نے دہری ذمے داریاں سمیٹ رکھی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مردوں کے مقابلے میں عورتیں نہ تو گنجی ہوتی ہیں اور نہ توندیں رکھتی ہیں۔ سبحان اللہ بلکہ ماشاء اللہ۔'' (آہنی دروازہ، ج ۔۹، ص ۔۱۵۰-۱۵۱)

''عورتیں عموماً ہنسنے ہنسانے پر جان دیتی ہیں اور احمقوں سے تو انھیں بڑی دلچسپی ہوتی ہے بشرطیکہ وہ ان کے شوہر نہ ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ انجمن کے ممبر، عورتوں کی تعداد بڑھانے میں حیرت انگیز طور پر کامیاب ہوئے تھے۔ مقصد یہ تھا کہ ان کے ذریعہ حکومت کے راز معلوم کیے جائیں۔'' (آنکھ بنی شعلہ، ص ۔۶۳)

اس ساری دردسری کا مقصد قومی آئل فیلڈ سے آئل کی چوری ہے۔

حمید کی باتیں۔

''تمھارے یہاں کی عورتیں دنیا کا آٹھواں عجوبہ معلوم ہوتی ہیں۔'' جولیا نے کہا۔

''اور مرد اس سے بھی زیادہ الو کے پٹھے ہیں۔''

''کیوں؟''

''اس لیے کہ ہمارے یہاں شادی سے پہلے میڈیکل ٹیسٹ کا رواج نہیں ہے۔''

(خون کا دریا، ج-۱۴، ص ۲۷۲)
معنی خیز اشاروں میں کس گندگی کی طرف دھیان دلایا!! اس بات کو منفی لیا جائے کہ مثبت۔
ابن صفی کسی سیاسی نظریے یا جماعت کا نام لیے بغیر اشارتاً کہتے ہیں۔
''بتاؤ!'' مورینا گرجی! ''ہڑتال کیوں ناکامیاب ہوئی تھی۔'' (جہنم کی رقاصہ، ج ۷، ص-۵۱)
''اس کے بازوؤں پر خنجر کی نوک سے انقلاب لکھو۔'' (ایضاً)
مندرجہ اقتباس میں اشارہ کہے دیتا ہے اشتراکیت، اشتراکیت، اشتراکیت۔ اس اشتراکی انقلاب کی قلعی کس طرح کھلتی ہے ملاحظہ کیجیے۔
''سنو!'' دیسی دانت پیس کر بولا! ''میں تمھارے ساتھ تھا میں اپنی زندگی سے کھیلا ہوں! میں نے تمھارے لیے کیا نہیں کیا...... ! لیکن اب تمھاری پول کھل چکی ہے...... ! تمھاری تنظیم کا دعویٰ ہے کہ ساری دنیا کے آدمیوں کی بہی خواہ ہے لیکن یہ دعویٰ ایک کھلا ہوا جھوٹ ہے...... تمھاری تنظیم ساری دنیا میں ایک مخصوص قسم کا انقلاب لانا چاہتی ہے۔ محض اس لیے کہ دنیا کے کسی گوشے میں اس کے مخالف نہ رہ جائیں! اور وہ ملک ساری دنیا پر اپنی چودھراہٹ قائم کرلے جو اس تنظیم کا مرکز ہے۔!'' (ایضاً)
یہاں روس کی مکاری کی طرف واضح اشارہ ہے۔ آج یہ بات بالکل عیاں ہو چکی ہے۔ لہٰذا کمیونزم کے خطوط پر چل کر اپنی منفرد پہچان قائم کرنے والے ملک ''چین'' کو بھی روس برداشت نہیں کرسکا اور لینن کے پرستاروں نے ''ماؤزے تنگ'' کو مکار کہا۔ حالاں کہ لینن ازم کے گروہ نے ماؤ کی جو پول کھولی ہے وہ کذب و افترا نہیں ہے اور ایسا بھی نہیں ہے کہ یہ سب کچھ انسانیت کے نام پر کیا۔ یہ سب کچھ مرکزیت کے کھودینے کا خدشہ تھا۔ خود روسی انقلاب نے بھی ماضی میں کافی درندگی سے کام لیا تھا۔ یہاں تو بس لینن ازم اور ماؤ ازم کا ٹکراؤ تھا جس کے سبب روس کی پیشوائی کو صدمہ پہنچ رہا تھا۔ یوں بھی چین ایک ایشیائی ملک ہے۔ سوویت یونین کی مخالفت کر کے مارکسی رہنا کس قدر دشوار تھا اس کا اندازہ باقر مہدی کے اس بیان سے ہوتا ہے جو انھوں نے خلیل الرحمٰن اعظمی کے ادھورے خاکے میں لکھا ہے۔
''مگر وہ سوویت مارکسزم اور مارکسزم کو الگ الگ نہ دیکھ سکے تھے۔ اس میں ان کا قصور نہیں ہے۔ کتنے ہی دانشور اس کا شکار ہوئے ہیں۔ سارتر نے ایک جگہ لکھا ہے کہ سوویت یونین کی مخالفت کر کے مارکسی رہنا بڑا دشوار تھا۔''
(تنقیدی کشمکش، باقر مہدی، خیاباں پبلی کیشنز، سنہ ندارد، ص-۲۴۳)
چند ممالک میں مارکسزم کو مخصوص حالات کی بنا پر کامیابی نصیب ہوئی۔ ہر ملک میں مارکسی معاشرے کی تشکیل ممکن نہیں۔ اس کے مختلف اسباب ہوسکتے ہیں جن میں ایک سبب درج ذیل بھی ہوسکتا ہے۔
''کتیا سنو!'' اچانک ارشاد غرایا۔ ''یہاں اس ملک میں تمھارے ناپاک ارادے کبھی شرمندۂ تکمیل نہیں ہوسکیں گے۔ یہاں کی فضا میں ایسا معاشرہ زندہ ہی نہیں رہ سکتا جو خدا کے وجود سے خالی ہو! اور اب تم بھی جاؤ

...'' (جہنم کی رقاصہ، ص۔۵۴)

ابنِ صفی ایسے یوٹوپیائی انقلاب اور انقلابی ادب کا مذاق بھی اڑاتے ہیں مثلاً عمران ''نواب مشکور'' نامی دیباچہ نویس قسم کے آدمی کے پاس پرولتاری ادیب بن کر جاتا ہے۔

''ایک دن یہ محل خاک کا ڈھیر ہو جائیں گے۔'' عمران دونوں ہاتھ ہلا کر ہذیانی انداز میں بولا۔ ''ساری عمارت خاک میں مل جائے گی۔ بہت بڑا انقلاب...... ہوا میں کروٹ بدل رہا ہے۔'' (پاگل کتے، ج ۱۲، ص۔۳۲)

''بہت بڑا انقلاب'' کے بعد سکتہ اور پھر ''ہوا میں کروٹ بدل رہا ہے'' کا فقرہ قابلِ تحسین ہے۔ ابنِ صفی صرف اشتراکیت ہی کو دور کا سہاونا ڈھول نہیں سمجھتے اور نہ ہی انھوں نے مخالفت میں کوئی محاذ قائم کر رکھا ہے۔ بلکہ وہ بہت سے مجرد تصورات کے تئیں تشکیک کا رویہ اختیار کرتے ہیں۔ جمہوریت کے تعلق سے درجِ ذیل اقتباس دلچسپی سے خالی نہیں ہے۔

''ہم لوگ جمہوریت کو مضحکہ خیز تصور کرتے ہیں ڈی گاریگا نے کہا۔ ''اسی لیے ہمارے یہاں ابھی تک شہنشاہیت قائم ہے لیکن ہماری شہنشاہیت تمھاری جمہوریت سے کہیں زیادہ بہتر ہے۔''

''اسی لیے تمھارا موجودہ حکمراں تخت کے جائز وارث کے قتل کی کوشش کر رہا ہے۔'' انور طنزیہ لہجہ میں بولا۔

''اوہو! کیا تمھاری جمہوریت کا دامن اس بدنما داغ سے پاک ہے؟ کیا تمھارے یہاں ایمان دار لیڈر قتل نہیں کیے جاتے۔ شہنشاہیت میں تو ایک نالائق سے دوچار ہونا پڑتا ہے لیکن جمہوریت میں نالائقوں کی ایک پوری ٹیم وبالِ جان بن جاتی ہے۔ ایک نالائق سے پیچھا چھڑانا آسان ہے لیکن پوری ٹیم سے نپٹنا مشکل ہو جاتا ہے۔''

(بھیانک جزیرہ، ج ۱۱، ص۔۲۴۹)

شاید اسی لیے ایک موقع پر لکھا ہے۔

''جب ایک آدمی پاگل ہو جاتا ہے تو اسے پاگل خانے میں کیوں بند کر دیتے ہیں اور جب کوئی قوم پاگل ہو جاتی ہے تو ''طاقتور'' کیوں کہلانے لگتی ہے۔''

(انوکھے رقاص، ج ۳۴، ص۔۱۲۸)

''آدمی خدا ترس نہیں ہے۔ بکواس ہے! بس وہ ایک ایسا درندہ ہے جو ننگا رہنا پسند نہیں کرتا...... اپنی درندگی پر نت نئے غلاف چڑھاتا رہتا ہے۔ انھیں غلافوں میں سے ایک انسانیت بھی ہے!'' (عمران کا اغوا، ج ۱۹، ص۔۱۰۲)

علاقائیت کا جذبہ ہی دراصل نیشنلزم کی بنیاد ہے۔ علاقائیت کا رجحان نہ صرف انسانیت بلکہ ہندوستان اور پاکستان ایسے ممالک کے لیے کس قدر مہلک ہے اس پر بات کرنے کا یہاں موقع نہیں۔ کہنا بس اتنا ہے کہ ابن صفی ایک موقعے پر نیشنلزم کے بارے میں لکھتے ہیں۔

''شکریہ خان زادی! محض نظریات کی دیواریں ہمارے درمیان حائل ہیں، ورنہ ہم سب ایک ہیں!''

''نظریات نہیں بلکہ علاقائیت کہو۔ نظریہ تو ایک ہی ہے!''

''علاقائیت ہی تو علیحدگی کے نظریات گھڑتی ہے۔ بنیادی نظریہ علاقائیت کی نفی کرتا ہے لیکن بنیادی نظریہ ہمارے لیے صرف شاعری بن کر رہ گیا ہے، جس پر ہم سر تو دھن سکتے ہیں، عمل میں نہیں لا سکتے!''
(شہباز کا بسیرا، ج ۴۵، ص۔ ۳۰۶)

آئیڈیالوجی اور نظریات کی دھوپ میں، مساوات کی چھاؤں کا خواب دکھانے والے کس طرح اپنے قومی تفوق کا نہ صرف احساس رکھتے ہیں بلکہ تیسری دنیا کے ذہن اور علم کو کس قدر حقیر سمجھتے ہیں، ابنِ صفی کا غیر مقلدانہ ذہن اس بات کی بخوبی آگہی رکھتا تھا۔ ابن صفی اپنی آگہی کا اظہار فن کے پیرائے میں بلا جھجک کرتے تھے۔ فن کے پیرائے کی قید کے ساتھ میں نے یہ بات اس لیے کہی ہے کہ ابن صفی مقصدی اور افادی ادب کے دیگر لکھنے والوں کی طرح تقریر نہیں کرتے تھے۔ ان کے یہاں مقصدیت اور افادیت کا گذر افسانے کے قواعد کی راہ سے ہوتا ہے۔ لہٰذا ابن صفی کی تحریروں کے مطالعے سے یہ بات منکشف ہوتی ہے کہ ابن صفی کے بعض منفی اور بالکل بے پرواہ کردار بھی قاری کو چونکا دیتے ہیں۔ 'سنگ ہی' کی مثال لے لیجیے۔

''آپ تنظیم کے بڑوں میں سے ہیں!''

''سب فریب ہے۔ سفید فاموں کی بالادستی کی چھاؤں میں بڑا ہوں اور بس۔ یہ مردود کتنی ہی مساوات کی باتیں کریں سب دھوکا ہوتا ہے۔ ایک خوبصورت فریب!''

(جونک اور ناگن، ج ۵۴، ص۔ ۲۶۱)

صہیونیت اور ہپی ازم کے بارے میں لکھتے ہیں۔

''اب منشیات کی وبا آئی ہے، مایوسی پھیلانے والے لٹریچر کے ذریعے پہلے ان کے گرد قنوطیت کی دیواریں کھڑی کی گئیں پھر مفلوج کر دینے والی منشیات کا چکر چلا دیا گیا!''

(اَیڈلاوا، ج ۴۱، ص ۳۶۷)

''صہیونی تنظیم عیسائیوں اور مسلمانوں کو نیست و نابود کر دینا چاہتی ہے۔ آنکھیں پھیلا کر دیکھو تو تمھیں دنیا کا بڑا حصہ صہیونی سرمائے میں جکڑا ہوا نظر آئے گا۔ اس کے بہترین دماغ آئے دن طرح طرح کے فلسفے تراش کر غیر صہیونی دماغوں کو پراگندہ کرتے رہتے ہیں۔ مثال کے طور پر موجودہ 'ہپی ازم' صہیونیوں کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔'' (دستِ قضا، ج ۳۵، ص۔ ۱۰۸)

''میں سمجھتا ہوں لیکن میں تمھیں تنگ نظر نہیں کہوں گا کیوں کہ میرا بھی اسی پر ایمان ہے کہ یہ ساری دنیا کے خلاف صہیونی سازش ہے۔ یہودی خود کو بقیہ نسلوں سے برتر سمجھتے ہیں اور ساری دنیا پر اپنا قبضہ چاہتے ہیں۔ منشیات سے قبل انھوں نے جنسیت کی وبا پھیلائی تھی۔'' (ایڈلاوا، ج ۴۱، ص۔ ۳۶۷)

مختلف نظریات کی بری طرح ناکامی کے باوجود عمل پر اصرار کے متعلق ذیل کا معنی خیز اقتباس ملاحظہ کیجیے۔

''حماقت کا احساس ہو جانا دانش مندی کی علامت نہیں ہے۔ دانش مند وہ ہے جو مسلسل حماقتوں کا مرتکب ہوتا چلا جائے حتیٰ کہ لوگ اسے سچ مچ دانش مند تسلیم کر لیں۔ بھلا حماقت کا احساس ہو جانے کے بعد

پچھتاوے کے علاوہ اور کیا ہاتھ آتا ہے؟" (ایش ٹرے ہاؤز' ج'۳۵'ص۔۲۰۲)

فرائڈ پر چوٹ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"میں اسے فراڈ سمجھتا ہوں۔ میں ثابت کر سکتا ہوں کہ لاشعور کوئی چیز ہی نہیں ہے۔ میں اس کے سلسلے میں اپنی ذاتی تھیوری رکھتا ہوں۔ فرائیڈ جسے لاشعور کہتا ہے اسے میں بطل الشعور کہتا ہوں۔ میں نفسیات پر اتھارٹی ہوں۔ کیا سمجھتی ہیں آپ!"

(چالیس ایک باون' ج'۷'ص:۸۹)

"...فرائڈ کو پڑھا ہے تم [جمن] نے؟"

"جی۔ ہاں پڑھا ہے!"

جنسیت کے گرد ایسی دیو مالائی فضا بکھیری ہے اس نے کہ اس کے دور کے نوجوان پاگل ہو گئے تھے۔ ادھر ایک جرمن ماہر معاشیات اخلاقیات کو اضافی قدر قرار دے چکا تھا۔ جوانی بہک جانے کے بہانے چاہتی ہے' اسے سائنٹفک طور پر اس ڈھرے پر ڈالا گیا۔" (ایڈلاوا' ج'۴۱'ص۔۳۶۷)

لاشعور کے بالمقابل 'بطل الشعور' کی ترکیب لائق توجہ ہے۔

سائنس' فلسفہ' دانشوری یا خطرناک حد تک بڑھی ہوئی علمیت کے ذریعے خوفناک جرائم۔

"اوہ...... یہ ذراسی بات نہیں تھی حمید صاحب! تم خود سوچو کہ اگر درمیان میں ڈاکٹر گوہن والا نسخہ نہ نکل پڑتا تو برونو ہی کا وفد کامیاب ہوتا اپنی کوششوں میں اور ہمارے عوام میں' جو اس کے ملک کے خلاف برے خیالات پائے جاتے تھے' کیا وہ برقرار رہتے...... ارے یہ بڑی طاقتیں اسی طرح تو ایشیا پر سکہ جما رہی ہیں۔ کہیں غلہ تقسیم ہو رہا ہے' کہیں کپڑے بانٹے جا رہے ہیں اور کہیں کسی وبا کا خاتمہ کرنے کے لیے مفت دوائیں بھاری مقدار میں تقسیم کی جا رہی ہیں۔ جہاں ان چیزوں کی ضرورت نہیں ہوتی وہاں بھی ضرورت پیدا کر لی جاتی ہے۔ طریقہ یہی ہوتا ہے جو ہمارے یہاں اختیار کیا گیا تھا۔ مصنوعی قحط پیدا کیے جاتے ہیں۔ مصنوعی وبائیں پوری پوری بستیوں پر دھاوا بول دیتی ہیں اور پھر یہ فرشتے آ کر ہمارے آنسو پونچھتے ہیں اور ہماری دعائیں بھی لے جاتے ہیں...... کتنا کمینہ ہے آدمی......؟ ذرا سوچو تو کیا وہ کتوں کے ساتھ بھی باندھے جانے کے لائق ہے؟" (وبائی ہیجان' ج'۳۹'ص'۷۵)

ان حقائق کا تعلق صرف مسیحا بننے کی خواہش سے نہیں بلکہ حصول دولت اور صنعتوں کی ترقی کے لیے نئی مصنوعات کی ضرورت پیدا کرنے سے بھی ہے۔ فلسفہ' علمیت اور دانشوری کس طرح لوگوں کو غلام بناتے ہیں ملاحظہ کیجیے۔

"وہ ایک غیر ملکی ایجنٹ تھا۔ اپاہج کے روپ میں یہاں مایوسی کے جراثیم پھیلایا کرتا تھا۔ تم جانتے ہی ہو کہ یہ کن لوگوں کی تکنیک ہے۔ نوجوان اس کی علمیت سے مرعوب ہو جاتے تھے اور وہ انھیں اپنا ہم خیال بناتا تھا۔" (ہیروں کا فریب' ج'۷'ص۔۱۷۱)

کس طرح اس کی تفصیل ملاحظہ فرمائیں۔

"ہالی ڈے کیمپ میں زیادہ تر نوجوانوں کا اجتماع ہوتا ہے جو مسرتوں اور ولولوں سے بھرپور نظر آتے ہیں۔ مستقبل کے متعلق ان کے خیالات رجائی ہوتے ہیں لیکن داوران میں مایوسی اور دہریت کے جراثیم پھیلاتا تھا۔ وہ اس کی باتیں سن کر سوچتے تھے کہ اتنے فرشتہ سیرت آدمی کو خدا نے اپاہج کیوں کر دیا۔ کیا یہ انصاف ہے بس پھر ان کے ذہن بہکنے لگتے تھے۔ وہ انھیں اچھی طرح مایوس کر دینے کے بعد اپنے آقاؤں کے دیس کا پروپیگنڈا شروع کر دیتا تھا۔" (ایضاً، ص، ۱۸۷)

یہ بات صرف اسی کے متعلق نہیں بلکہ ہر ازم کے لیے کہی جا سکتی ہے کہ شروعات خدا پر حملہ کر کے یعنی آسمان کی طرف منھ کر کے تھوکنے سے ہوتی ہے انجام معلوم!

"ہاہا---- تم یہ سمجھتے ہو کہ میں تمھیں معمولی قسم کا چور یا ڈاکو سمجھتا ہوں۔ کیا تم اس ملک کے ایجنٹ نہیں ہو جو ساری دنیا میں انتشار پھیلا کر شیطانی حکومت کا خواب دیکھ رہا ہے۔ کیا تم اپنی اسکیم کے مطابق یہاں مایوسی اور دہریت کے جراثیم نہیں پھیلا رہے تھے۔ مایوسی اور دہریت کے شکاروں کو اپنی نجات کا راستہ صرف تمھاری ہی آئیڈیالوجی میں نظر آتا ہے۔" (ایضاً، ص ۱۸۳)

شاید انھی وجوہات کی بنا پر انور کہتا ہے۔۔

"انسان کتنا مجبور ہے۔ ایک عظیم تاریکی میں رینگتا ہوا یہ حقیر کیڑا کس طرح دوسروں کا پابند ہے اور دوسرے اس کے پابند ہیں۔ نہ جانے کب یہ بے بسی ختم ہوگی۔ یہ تاریکی دور ہوگی!" (ہیرے کی کان، ج ۷، ۳، ص۔ ۵۳)

ابن صفی کے یہاں عورتوں کے تعلق سے جس قسم کی گفتگو پائی جاتی ہے اس میں کسی قسم کی تضحیک کا پہلو شامل نہ ہونے کے باوجود تانیثیت کی طبع پر گراں گزر سکتا ہے۔ مثلاً 'زینت' زینو نامی نسائی کردار۔

"بس کرو!" وہ ناخوش گوار لہجے میں بولی۔ "اس لفظ کو سنتے سنتے کان پک گئے ہیں۔ میرے عقیدے کے مطابق دین سے انحراف اور وطن دشمنی کے علاوہ اور کوئی فعل غداری نہیں کہلایا جا سکتا!" (کالی کہکشاں، ج ۵۴، ص۔ ۲۵)

یہ شکایت پیدا ہو سکتی ہے کہ یہ عورت کی وہ تصویر ہے جو مرد نے بنائی ہے۔ اس بارے میں اتنا ہی کہا جا سکتا ہے کہ اگر مرد کسی جیتے جاگتے نفس کا نام ہے اور وہ حواس خمسہ رکھتا ہے تو اس کا بھی اپنا ادراک ہوگا۔ ادراک ہوگا تو اظہار بھی ہوگا، ادراک کی سچائی اور اظہار کی معروضیت میں خلوص شرط ہے۔ مثلاً شہناز کے ناز اور حمید کی پریشانی دیکھ کر فریدی کے ادراک کا حوالہ دیا جا سکتا ہے جو نہ صرف مشاہدے پر مبنی ہے بلکہ اسی سماج میں رہنے کی وجہ سے تجربہ بھی کہلائے گا۔

"عورت بات بات پر روٹھتی ہے اور متوقع رہتی ہے کہ اسے کوئی منائے گا اور اگر اس کی یہ خواہش پوری نہیں ہوتی تو اسے اپنی زندگی ویران نظر آنے لگتی ہے۔ وہ یہ سمجھنے لگتی ہے کہ دنیا میں اس کا کوئی ہمدرد نہیں۔ اس کا وہ وقتی طور پر روٹھ جانا ایسی صورت میں کوئی اہمیت نہیں رکھتا جب کہ کوئی اسے منائے لیکن اگر اس کی یہ توقع

پوری نہ ہوئی تو یہی حالت ایک مستقل مظلومیت بن جاتی ہے اور یہ بھی سمجھ لو کہ اگر کسی عورت کو مظلومیت کا خبط ہو گیا تو مرد کے لیے ایک مستقل عذاب بن جاتی ہے...... کیا سمجھے!''

(احمقوں کا چکر، ج:۸، ص:۲۳)

تجربہ اس لیے بھی کہلائے گا کہ فریدی کے نزدیک کوئی بھی معاملہ نجی یا ذاتی نہیں ہے حتیٰ کہ موت بھی۔

''موت کے علاوہ اور کسی معاملے کو نجی یا ذاتی نہیں کہا جا سکتا۔ مگر نہیں موت بھی کیوں؟ کیا ایک آدمی کی موت کا اثر دوسروں پر نہیں پڑتا۔ کسی نہ کسی صورت میں دوسرے آدمی بھی اس سے متاثر ہوتے ہیں لہٰذا موت بھی نجی یا ذاتی نہیں ہے۔''

(شادی کا ہنگامہ، ج:۳۶، ص:۲۹۹)

معاشرتی عدم۔ مساوات اور درونِ خانہ اذیت کے خلاف ''زیبا'' نامی لڑکی کا ردِ عمل دراصل ایک مرد کا ادراک اور تانیثیت کی آواز ہی ہے۔

''میرے دل میں انسانیت کے لیے ذرہ برابر بھی ہمدردی نہیں ہے! میں تباہی اور بربادی دیکھنا چاہتی ہوں، نوعِ انسانی کی تباہی اور بربادی خواہ وہ ایٹم بموں کے ذریعے ہو! خواہ ان ایٹموں کے ذریعہ جو خود انسان کے جسم و ذہن میں پائے جاتے ہیں! میں جو کچھ بھی کر رہی ہوں اس سے شرمندہ نہیں ہوں۔ مجھے آدمیوں ہی نے تباہ کیا ہے! مجھے میرے باپ نے تباہ کیا ہے! سوتیلی ماں نے تباہ کیا ہے۔ وہ دونوں مجھ پر بے پناہ مظالم کرتے تھے! میں بچی تھی! جوان تھی! اس وقت میرا باپ مجھے بیتوں سے پیٹا کرتا تھا! سوتیلی ماں جو عمر میں مجھ سے تھوڑی ہی بڑی تھی مجھے بھوکا رکھتی تھی! ___ خواہ مخواہ مجھے آوارگی اور بدچلنی کے الزام دیتی تھی! حالاں کہ میں مقدس فرشتوں کی قسم کھا سکتی ہوں کہ اس وقت میں پاکدامن تھی! مجھے نفرت ہوگئی! عورتوں سے نفرت ہوگئی۔ مردوں سے نفرت ہوگئی! ___ حتیٰ کہ ماں بننے سے بھی نفرت ہوگئی جو ہر عورت کی سب سے بڑی خواہش ہوتی ہے! اب میں بہت خوش ہوں! ___ لڑکیاں خود کو بیچتی ہیں! میں ان سے رقمیں وصول کر کے انھیں پہنچاتی ہوں جو ان لڑکیوں کو عصمت فروشی پر مجبور کرتے ہیں! وہ لڑکیاں خود تباہ ہوئی ہیں اور اب معاشرے کو تباہ کر رہی ہیں۔ میرے باپ کا کلیجہ ٹھنڈا ہو رہا ہے! اور میری سوتیلی ماں ایسی لڑکیاں جن رہی ہے جو اس کا کلیجہ ٹھنڈا کریں گی...... ! اس سیلاب کو کون روک سکے گا...... ! کوئی بھی نہیں!'' (لڑکیوں کا جزیرہ، ج:۳، ص:۱۰۱)

اس اقتباس میں گھریلو۔ تشدد اور بے اعتدالی کی وجہ سے پیدا ہونے والا ردِ عمل کس قدر شدید اور منفی ہے یہ بالکل ظاہر ہے لیکن ایسے ردِ عمل کے حامل بعض افراد میں اپنے عمل کے تئیں کتنا خلوص ہے؟ ان کی جھلاہٹ سے واضح ہے۔ اس جھلاہٹ کو تخلیق کار کی تیسری آنکھ دیکھتی ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں۔

''نہیں حمید اتنی بے دردی سے نہ ہنسو...... یہ مسئلہ بڑا دردناک ہے۔ پچیس سال سے پہلے لڑکیوں کو عقل نہیں آتی اور والدین کا یہ عالم ہے کہ وہ ان کی طرف سے آنکھیں بند کر لیتے ہیں یا پھر ان کے اذہان پر غلط قسم

کی مغربیت طاری ہوتی ہے یا پھر وہ اس کے قائل ہوتے ہیں کہ پودوں کے پھیلنے اور بڑھنے کے لیے کھلی ہوا اور روشنی ضروری ہے، مگر مثال برائے مثال ہی ہونی چاہیے! آدمی پودا نہیں ہے۔ پابندیوں ہی میں اس کی نشوونما بہتر طور پر ہو سکتی ہے کیوں کہ پابندیوں ہی نے اسے ادنیٰ حیوان سے آدمی بنایا تھا اور پابندیاں ہی اس میں سلامت روی برقرار رکھ سکتی ہیں!'' (آوارہ شہزادہ، ج:۳۹، ص:۲۲۲)

ہر شخص یکسانیت سے چھٹکارا پانا چاہتا ہے، بور ہونا ایک فیشن یا آرٹ بن چکا ہے۔ ایسے میں کشتی کے مقابلے کا انتظام کرانے والا ٹیوی نامی کردار کتنی بلیغ بات کہتا ہے۔

''نہیں یکسانیت سے اکتا کر آدمی جائے گا کہاں۔ ہاں اگر وہ اپنی کھال چھوڑ کر بھاگ سکے یا اپنی ہڈیوں کے پنجرے سے نکل سکے تو میں یہ کہوں گا کہ وہ یکسانیت سے نجات پا سکا ہے!'' (لڑاکوں کی بستی، ج:۴۰، ص:۳۵)

لیکڑری سمبل شراب کے متعلق کہتے ہیں۔

''میری دانست میں تو پینا ہی بڑی عجیب بات ہے!''

''کیوں؟''

''اچھے بھلے آدمی کی مدہوشی...... مدہوشی جو خود ہی اپنے اوپر مسلط کی جائے حماقت نہیں تو اور کیا ہے!''
(دوسری آنکھ، ج:۲۵، ص:۱۳۶)

ذیل کے اقتباسات میں ابنِ صفی نے عمران، فریدی، حمید، صفدر، انور اور قاسم کو مشرقی فلسفہ اور اس کی سریت کا نمائندہ بنا دیا ہے اور خود مشرق کی آواز ہو گئے ہیں۔

''میں جانتی ہوں۔ اچھی طرح جانتی ہوں۔ تم مشرقیوں کا فلسفۂ پاکیزگی عجیب ہے۔ خود پر ظلم کرتے ہو تم لوگ!''

''مشرق اسی فلسفے کی بنا پر زندہ ہے۔ تم لوگ اسی فلسفے کی بنا پر اس میں کشش محسوس کرتے ہو۔ پاکیزگی اور سریت ہی کا نام حسن ہے!'' (آنکھ شعلہ بنی، ج:۲۵، ص:۱۵۳)

یہاں پاکیزگی بمعنی طہارت نہیں بلکہ کردار کی طہارت یا حقیقی کنوار پن ہے اور سریت سے مراد صنفِ مخالف کے بدن کے اسرار۔ اس کے بعد ابنِ صفی مشرق و مغرب کے اعمال و افکار کے تضاد اور افتراق کو پیش کرتے ہیں۔

''تم مشرقیوں کے اعمال ہی فلسفیانہ ہوتے ہیں اور مغرب میں افکار کے علاوہ اور کچھ نہیں رہا!'' (ایضاً ص:۱۵۹)۔

''مشرق ہم سے کمتر نہیں ہے بلکہ اسے آگے بڑھنے کا موقع ہی نہیں مل سکا۔ صدیوں سے سفید فام قومیں اسے اپنی غلامی کی زنجیروں میں جکڑے رہی ہیں اور انھوں نے اسے اُبھرنے نہیں دیا لیکن اب وہ بھی آہستہ آہستہ بے دار ہو رہا ہے!''
(زمین کے بادل، ج:۳۶، ص:۳۹۸)

''یہ مشرقی آدمی عموماً بدنما مٹی کے ڈھیر معلوم ہوتے ہیں لیکن جب انھیں کریدو تو ایسے جواہرات نکلتے ہیں کہ آنکھیں چندھیا جائیں۔'' (ایضاً' ص:۳۹۸-۳۹۹)

''تو تم یہیں کوئی بزنس کیوں نہیں کر لیتے۔اپنے ملک واپس جا کر کیا کرو گے؟'' گورشیو بولا۔
''میری ماں منتظر ہوگی!'' عمران ٹھنڈی سانس لے کر بولا اور سونیا اسے بہت غور سے دیکھنے لگی۔'' (معصوم درندہ' ج:۵۴' ص:۱۶۶)۔

نوآبادیاتی ممالک کی آزادی کے بعد کی کڑوی حقیقت۔

''پہلے ہم صرف ایک کے غلام تھے اور اب ہمارا گزارہ دردر کی بھیک پر ہے۔ہم ہر ایک کے آگے ہاتھ پھیلانے کے لیے آزاد ہیں......ہاہاہا......آزاد ہیں......یہ آزادی ہے......زندہ باد!'' (آوارہ شہزادہ' ج:۳۹' ص:۱۸۶)۔

''تم ایک نیم وحشی معاشرے سے تعلق رکھتے ہو!'' ڈان فاگان بولا۔تمھارا معاشرہ لٹیروں اور بھکاریوں کا معاشرہ ہے۔تم ان درندوں کے نقال ہو جو خلائی دوڑ کو آدمی کی ترقی سمجھتے ہیں۔'' (عقابوں کے حملے' ج:۳۵' ص:۲۸۴)۔

''تم کون ہو؟''
''مسلمان!''
جیمسن نے پھر قہقہہ لگایا......اس بار وہ بری طرح جھلا گئی۔
''میرا مذاق اڑا رہے ہو؟''
''تم خود مذاق اڑا رہی ہو اپنا۔یہ سیلولس اور یہ کھال سے چپکا ہوا زیریں لباس اور یہ آوارہ گردی جب کہ تمھیں حکم دیا گیا ہے کہ اپنے گھروں سے لگی رہو اور اپنے سروں پر اوڑھنیاں ڈالو!''
''شٹ اپ۔یو ڈرٹی بیسٹ......میں مرشد کی کنواری ہوں۔ابھی جل کر بھسم ہو جاؤ گے۔تم اپنی شکل دیکھو گندے ہپی!''
''میں تو پیسائی ہوں۔میری بات ہی نہ کرو!'' (پھر وہی آواز' ج:۳۵' ص:۳۱۰)

درج بالا مکالمے۔کہہ رہے ہیں کہ۔

''آج کا آدمی قدامت اور نئی تہذیب کی درمیانی دلدل میں بری طرح پھنسا ہوا ہے۔'' (آتشی پرندہ' ج:۳۷' ص:۱۵۹)

ان مکالموں کے۔حوالے سے میں قرۃ العین حیدر کے ناول ''آخر شب کے ہم سفر'' کا ذکر کروں گا۔ریحان الدین احمد جو کہ بنگال کی زیر زمین انقلابی تحریک سے منسلک ہے ایک موقعے پر دیپالی سرکار کو اپنے والد کے مولوی ہونے اور ان کے ساتھ نماز پنجگانہ میں حاضری دینے کی بات کہتا ہے۔اس موقع پر

دیپالی سرکار کو ہنسی آجاتی ہے اور یہ ہنسی ریحان الدین احمد کو ناگوار گزرتی ہے۔ کیوں؟ اس کی وجہ درج بالا دوسرے اقتباس سے معلوم ہو جاتی ہے۔ ایسی ہی باتیں درج ذیل اقتباسات سے بھی ظاہر ہوتی ہیں۔ ایک موقعے پر انور اپنے دوست محمود سے کہتا ہے۔

''آج کا آدمی قدامت اور نئی تہذیب کی درمیانی دلدل میں بری طرح پھنسا ہوا ہے۔ ایک طرف تو اسے آج کی مساوات کھینچتی ہے اور دوسری طرف صدیوں پرانا ضمیر جو عورت کی محکومیت کا عادی ہو چکا ہے۔ ذہن کے دروازے پر دستک دیتا رہتا ہے۔ قہر درویش برجان درویش۔ تپ دق میں مبتلا ہو جائے۔ نہ آپ صحیح معنوں میں مساوات برت سکتے ہیں اور نہ کھلم کھلا عورت پر اپنی حاکمیت جتا سکتے ہیں، بس گھٹتے رہیے۔''

(آتشی پرندہ، ج: ۷، ۳، ص: ۱۵۹)

انور کی بات سن کر محمود کہتا ہے۔

''میں تم سے بالکل متفق ہوں۔ سچ مچ آج کی ازدواجی زندگی بہت بھیانک ہے اور تم نے اس کی وجہ جو بتائی ہے اسے میں درست سمجھتا ہوں۔ یہی الجھاوا مجھے خاموش رکھتا ہے اور میں سارے خاندان میں زن مرید مشہور ہو گیا ہوں اور زن مرید کہنے والے جاہل نہیں بلکہ اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ ہیں!'' (ایضاً)

سر ہنری فنلے کا خط جس کے ذریعے ابن صفی یورپ کی ترقی اور دولت کے اسباب میں سے ایک بنیادی سبب بتاتے ہیں جس سے ابنِ صفی کے تاریخی شعور کا پتہ چلتا ہے۔

''میری قوم صرف ایک عورت کے لیے اتنا بڑا خطرہ مول نہ لے گی۔ خیر میں انتہائی کوشش کروں گا اور اگر اس میں بھی کامیابی نہ ہوئی تو میں اپنی لالچی قوم کو دوسری طرح راضی کروں گا۔ میں سی. جی لا دیوتا کی ایک پیتل کی مورتی بنا کر اسے انتہائی پراسرار طریقے پر شہرت دوں گا۔ ان دنوں میرے ملک میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو خزانوں کی تلاش میں مشرق کا سفر کرتے ہیں۔ دولت کی لالچ میں اپنی زندگی کی بھی پروا نہیں کرتے۔ میں انھیں اسی طرح کچنار کے جنگلوں میں بھیجوں گا۔'' (پہاڑوں کی ملکہ، ج: ۸، ص: ۱۲۲)

اسی طرح ایک اور جگہ۔ مغرب کی غاصبانہ فطرت اور طمع کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

''مصر قطعی پراسرار نہیں۔'' فریدی نے کہا ''بعض انگریزوں کی بیمار ذہنیت نے اسے پراسرار بنا دیا ہے۔ ہم لوگ عام طور پر یہ سمجھتے ہیں کہ انگریزوں میں ضعیف الاعتقاد نہیں ہیں حالاں کہ پینتالیس فی صدی انگریز اتنے ضعیف الاعتقاد واقع ہوئے ہیں کہ ان سے ہماری نانیاں اور دادیاں بھی پناہ مانگ جائیں۔'' (موت کی آندھی، ج: ۸، ص: ۱۵۱)

بیمار ذہنیت کا۔ تعلق صرف ضعیف الاعتقادی سے نہیں ہے بلکہ خزانے یا سونے کی تلاش میں ملکوں ملکوں بھٹکنے اور دنیا کا امن متزلزل کرنے سے بھی ہے۔ زخم دینا اور پھر اس پر مرہم رکھنا یورپ اور امریکہ کی پرانی عادت ہے۔ مرہم پٹی کا کام یو۔ این۔ او سے لیا جاتا ہے۔ ابن صفی اتحادیوں پر بھی چوٹ کرتے ہیں کیوں کہ وہی تو انسانیت کے علمبردار بنے ہوئے تھے۔ ایک موقعے پر عمران کہتا ہے۔

''نازی درندوں میں بھی تھوڑی بہت انسانیت تھی لیکن انسانیت کے دعوے داروں نے ہیروشیما کو تباہ کردیا۔''(معصوم درندہ،ج:۴۵،ص:۱۶۵)

درج ذیل اقتباس میں ''جیرالڈ شاستری'' نامی مجرم کا مکالمہ ہے جو مغرب کے بطن سے پھوٹا ایک مستشرق ہے۔ جس کا عقیدہ ہے کہ ایک اپاہج انسان سے ایک طاقتور اور کارآمد بن مانس بہتر ہے۔ اس مکالمے سے بھی مغرب اور استعماری ممالک کی دوغلی پالیسی کا اظہار ہوتا ہے۔ قاری کے ذہن میں فوری طور پر امریکہ اور اقوام متحدہ کے نام ابھرتے ہیں۔ کیا یہ دو نام ''امن کی فاختائیں'' ہیں جن کے پیٹ میں بم بھرے ہوئے ہیں۔

''میں دنیا کو دھوکے میں ہرگز نہیں رکھوں گا۔ میں کبھی نہ کہوں گا کہ ان بن مانسوں سے کھیتی باڑی کا کام لیا جائے۔ میں ایسی امن کی فاختہ نہیں اڑاتا جس کے پیٹ میں بم بھرے ہوئے ہوں۔ میں اعلانیہ کمزوری کی تباہی ہوں۔''(جنگل کی آگ،ج:۲۲،ص:۱۱۶)

مندرجہ بالا اقتباسات ایک کھلی ہوئی حقیقت ہیں۔ ابن صفی جس عہد میں لکھ رہے تھے ایسی بات واضح لفظوں میں لکھنا گویا اکبرالہ آبادی کی طرح خود کو مطعون کرنا تھا۔ یہ بڑے جگر کی بات ہے کیوں کہ ۱۸۵۷ کے بعد سے علم، روشن خیالی اور دانشوری کی ہوا تو مغرب کی جانب سے ہی آرہی ہے۔ ایسی صورت میں مغرب کے خلاف کچھ لکھنا گویا خود کو لاعلم، کورمغز اور رجعت پسند کہلوانا ہے۔ مگر کھرے فن کار کو اس بات کی کیا پروا۔

(نوٹ: اس مضمون میں درج کیے گئے تمام اقتباسات کا متن عارف اقبال، ایڈیٹر ''اردو بک ریویو'' کا مرتب کردہ ہے)

ابن صفی اعداد کے آئینے میں

اُم کاشان

علم کی عام طور سے دو بڑی اور اہم اقسام تسلیم کی گئی ہیں ایک وہ جو براہ راست خدا کی طرف سے انسان کو عطا کیا جاتا ہے۔ اور دوسرا وہ جو انسان اپنی محنت تجربے اور مشاہدے سے آپ حاصل کرتا ہے' اس میں اول الذکر علم تو خداوند تعالیٰ اپنے رسولوں' پیغمبروں' روحانی اور مذہبی رہنماؤں علماء کرام کو عطا کرتا ہے اور یہ لوگ اپنے قدرتی علم کے ذریعے حقیقت اور سچائی کی شہادت دیتے ہیں جبکہ دوسری قسم کا علم وہ ہے جسے سائنسدان' ماہرین علوم' فلسفی' ڈاکٹرز' مصنف اور شاعر وغیرہ اپنے تجربات اور ذاتی مشاہدات اور محنت و توجہ سے حاصل کرتے ہیں پھر اس کا عملی ثبوت پیش کرتے ہیں۔ پھر ان علوم میں بھی بے شمار شاخیں ہیں جیسے علم الاعداد اور علم النجوم وغیرہ...... جدید دور میں سائنس نے جہاں اور بہت سے سربستہ راز آشکارا کیے ہیں وہیں علم الاعداد اور علم النجوم کے متعلق بھی تحقیق و تجربے سے حقائق کا پتہ چلایا ہے۔ یوں اب علم نجوم اور علم الاعداد محض فٹ پاتھ نشین پروفیسرز حضرات کے روٹی روزی کمانے کا ذریعہ ہی نہیں رہا بلکہ باقاعدہ تحقیق نے اسے جدید سائنسی علوم کی صف میں لا کھڑا کیا ہے۔

بیسویں صدی کے عظیم اور ایشیاء کے نامور مصنف' اردو جاسوسی ناول نگار اور سری ادب کو عوامی سطح پر روشناس بلکہ قبول عام کی سطح تک لانے والے قلم کار حضرت ابن صفی مرحوم کے شب و روز ان کی مصروفیات' عادت واطوار' ذہانت' شرافت' مقبولیت' دوست واحباب اور اہل خاندان کے ساتھ تعلقات' چھوٹے اور بڑے کے ساتھ ان کا سلوک' سب پر نجوم کے اثرات اور اعداد کی خصوصیات کے ذریعہ واضح اور درست ثابت کرنا ہے۔

ابن صفی مرحوم کی تاریخ پیدائش کا علم تو خود ان کو بھی نہیں تھا اس بات کو یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ ان کی تاریخ پیدائش اہل خانہ کو بھی یاد نہیں۔ ابن صفی مرحوم بقلم خود کے زیر عنوان اپنے متعلق لکھتے ہوئے یہ ضرور فرماتے ہیں کہ ۱۹۲۸ء کی اپریل کی کوئی تاریخ ضرور تھی۔ یعنی انہیں اپنے اہل خانہ اور بزرگوں سے اتنا تو معلوم ہو ہی گیا کہ وہ اپریل ۱۹۲۸ء کی کسی تاریخ کو اس جہانِ فانی میں اپنی عمر عزیز پوری کرنے اور گزارنے کے لیے بھیجے گئے۔ سال پیدائش کا عدد دو بنتا ہے اور ابن صفی کا خاندانی و پیدائشی نام اسرار احمد کے حاصل اعداد کا مجموعہ دو ہی ظاہر ہوتا ہے۔ اگر ہم یہ فرض کر لیں کہ نام اور سن پیدائش کے عدد دو کا تعلق بھی دو ہی ہے تو دائرۃ البروج کا دوسرا برج ثور ہے۔ جس کا عرصہ مدت ۲۱ اپریل سے ۲۲ مئی ہوتا ہے۔ مگر مرحوم ابن صفی کی شخصیت کا جائزہ لینے پر برج ثور کی کوئی بھی خصوصیت ان میں نظر نہیں آتی' برخلاف اس کے ابن صفی کی شخصیت کی تمام صفات اور خصوصیات برج حمل جو دائرۃ البروج کا اول یعنی سب سے پہلا برج ہے میں ملتی ہیں۔ علم نجوم اور دائرۃ

البروج کے لحاظ سے نام کا پہلا حرف الف جو دونوں یعنی اصلی اور قلمی ناموں میں موجود ہے۔ برج حمل سے ہی تعلق رکھتا ہے۔ اس لیے یہ بات زیادہ وثوق اور یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ ابن صفی مرحوم کی پیدائش کا عرصہ ۲۲ مارچ سے لے کر ۲۰ اپریل کے درمیان کا ہے۔ چونکہ ان کا نام اور سن پیدائش کا مجموعی حاصل عدد ۲ بنتا ہے اور یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ ابن صفی کے سرپرستوں نے یہ نام یعنی اسرار احمد یوں ہی بلا سوچے سمجھے نہیں منتخب کیا ہوگا۔ اس نام کو منتخب کرنے میں بڑی حکمت عملی اور دور اندیشی کارفرما رہی ہوگی۔ اس لیے ان کی ممکنہ تاریخ ۵ اپریل یا ۱۴ اپریل ہو سکتی ہے۔ پانچ اپریل ۱۹۲۸ء کو جمعرات کا دن تھا اور دنوں میں جمعرات کا دن نمبر ۵ شمار ہوتا ہے جبکہ ۱۴ اپریل ۱۹۲۸ء کو ہفتے کا دن تھا...... اور ہفتے کے دن کا عدد دو ہے۔ اس طرح بڑے یقین کے ساتھ اسرار احمد کی تاریخ پیدائش ۱۴ اپریل ۱۹۲۸ء قرار دی جا سکتی ہے۔ ان تمام کا مجموعی حاصل عدد دو بنتا ہے اور علم الاعداد کے اصول کے مطابق یہ کلیہ رائج ہے کہ نومولود کا نام اس کے دائرۃ البرج کے متعلقہ حرف اور تاریخ پیدائش کے مجموعی عدد کے مطابق رکھا جائے...... یقیناً ابن صفی کے بزرگوں نے نام کا انتخاب کرتے وقت اسی حکمت عملی کو مدنظر رکھ کر نام تجویز کیا ہوگا۔ اس نام کو منتخب کرنے میں عدد دو کے موجود ہونے کی حکمت عملی صاف اور واضح طور پر نظر آتی ہے اور یہی دو کا عدد اسرار احمد کے نام میں مخفی ہے آگے چل کر جب ان کی شخصیت اور زندگی کے واقعات کا اعداد کے حوالے سے ذکر ہوگا تو آپ کو یہ بات اور بھی وضاحت کے ساتھ سمجھ میں آ جائے گی۔

ابن صفی یہ اسرار احمد کا قلمی نام ہے۔ ایسا قلمی نام جس نے اردو ادب میں عالمی پیمانے پر نہ صرف دھوم مچا دی بلکہ اردو تاریخ کے صفحات میں اپنے لیے ایک مخصوص جگہ ایک مخصوص مقام بھی بنا لیا...... ابن صفی کے اعداد کا حاصل عدد آٹھ ہے اس عدد نے بھی ابن صفی کی زندگی میں بڑا نمایاں کام کیا ہے۔ سب سے پہلے تو یہ سمجھ لیں کہ عدد آٹھ وہ عدد ہے جو دو پر اور آٹھ جفت گروپ کے اعداد سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس عدد کی حکمرانی ابن صفی کی زندگی میں دو کے مقابلے میں بہت زیادہ نظر آتی ہے۔ اس کی وجہ عرف عام میں ابن صفی کی مقبولیت ہے۔ یہ بات ذہن میں رکھتے چلیے کہ پکارے جانے والے نام کا عدد ہی زندگی پر اثر انداز ہوتا ہے۔ ابن صفی کے مجموعی عدد آٹھ کے حوالے سے ہی آپ دیکھیں کہ ابن صفی کے جاسوسی ناول نگاری کا آغاز ۱۹۵۲ء سے کیا۔ اس سال آغاز کا مجموعی عدد آٹھ ہے۔ جاسوسی دنیا سیریز کے کل ۱۲۵ ناولز لکھے ان سب کو مختصر کرنے پر یہی آٹھ کا عدد سامنے آتا ہے، پھر عمران سیریز کا سلسلہ شروع ہوا اور اس سلسلے کے ایک سو سولہ ناولز منظر عام پر آ ئیے۔ ۱۱۶ کا مختصر عدد بھی آٹھ ہے۔ پھر ابن صفی کے سال وفات پر نظر ڈالیے۔ یہ ۱۹۸۰ء ہے اور اس کا حاصل عدد بھی آٹھ ہے۔

ابن صفی سے پہلے اگر ہم اسرار احمد جو مرحوم کا اصل اور حقیقی نام ہے کا جائزہ لیں تو بہتر ہوگا۔ اس نام کا مجموعی یا مختصر عدد دو ہے، ان میں الف اور رے دو، دو دفعہ آیا ہے، نو حروف کا یہ مجموعہ ایک کے علاوہ تمام نورانی حروف پر مشتمل ہے نورانی حروف کی تعداد کل ۱۴ ہے۔ یہ نورانی حروف بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ قرآن کریم

کی بعض سورتیں بھی انہیں نورانی حروف سے شروع ہوتی ہیں۔ جیسے سورہ بقر کا آغاز الف لام میم سے سورہ آل عمران بھی انہی حروف سے، سورہ رعد الف لام را سے سورہ طٰہٰ طا سے اور سورہ نمل طاسین سے شروع ہوتی ہیں۔ اس مثال کے ذریعے آپ پر ان حروف کی قدر و قیمت واضح کرنی ہے...... ان ہی حروف کا استعمال عامل حضرات تعویزات اور نقش لکھنے میں بھی کرتے ہیں۔ یوں عدد کی مطابقت کے ساتھ ساتھ نام کے حروف میں ایک کے علاوہ بقیہ تمام حروف کا نورانی حروف کے گروپ سے تعلق رکھنا واضح کرتا ہے کہ ابن صفی مرحوم ہٰے سرپرست اعداد کی قوت کے ساتھ ساتھ نورانی حروف کی قدر و قیمت سے بھی بخوبی واقف تھے۔

علم الاعداد کے علماء ماہرین کے مطابق عدد دو کی حامل شخصیت کا مالک تخلیقی صلاحیتوں اور قوتوں کا مالک ہوتا ہے۔ نمبر۲ کا حامل شخص بے حد رحم دل، روشن خیال اور نہایت سلجھے ہوئے ذہن کا مالک ہوتا ہے۔ یہ شخص دوسروں کو مشکلات و الجھنوں سے نجات دلانے کے لیے صحیح اور درست سمت میں رہنمائی کرتا ہے جبکہ یہ لوگ اپنی عملی زندگی میں اپنے نقصانات کے خود آپ ہی ذمہ دار ہوتے ہیں۔ ایسا اسی لیے ہوتا ہے کہ عدد دو کے حامل شخص کی زندگی پر چاند کے عروج و زوال کے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بعض اوقات ان کی صلاحیتیں بہت اعلیٰ اور عمدہ ہوتی ہیں اور بعض اوقات بہت معمولی اور غیر اہم...... یہ لوگ بڑی اعلیٰ صلاحیتوں کے مالک اور بڑی بااعتماد شخصیت کے ہوتے ہیں۔ یہ اکثر دوسرے افراد کا اثر قبول کر لینے کی وجہ سے اپنی بہترین صلاحیتوں کے اظہار سے محروم بھی رہ جاتے ہیں۔ حالانکہ اگر یہ اپنے عملی اقدام میں سختی سے کام لیں تو یقیناً خوش گوار اور مثالی زندگی کے مالک بن سکتے ہیں دوستوں کے ساتھ وفاداری میں بھی یہ مثالی فرد ہونے کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ نمبر دو کا حامل شخص خلوص و وفاداری کا پیکر ہوتا ہے۔ وہ اپنے گرد دوستوں کا جھرمٹ دیکھنا پسند کرتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ وہ اپنے دوستوں کی وجہ سے مشکلات کا شکار بھی رہتا ہے مگر اپنے احباب کو نوازنے میں کہیں نہیں چوکتا...... یہ لوگ گھریلو دلچسپیوں کے بھی دیوانے ہوتے ہیں اس نمبر کی نمبر ایک اور نمبر سات کے ساتھ بڑی موافقت ہے۔

اب آیئے ابن صفی کے قلمی نام کے حامل عدد یعنی عدد آٹھ کی خصوصیات پر ایک نظر ڈالیں۔ عدد آٹھ کا مالک شخص محبت کے نظریات کا حامل ہوتا ہے۔ یہ شخص بے حد نظریاتی اور ان کا ذہن واقعات سے لبریز ہوتا ہے۔ اس کے ذہن میں جو بات ٹھہر جائے اس پر عمل کرنے کی ٹھان لیتا ہے۔ خواہ پھر اس کے لیے اسے کتنی ہی مشکلات اور دشواریوں کا سامنا کیوں نہ کرنا پڑے۔ بلاشبہ یہ لوگ دباؤ تلے دبے ہونے کے باوجود وہی کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں جو ان کے نزدیک درست اور ٹھیک ہوتا ہے۔ یہ لوگ دلائل کی نسبت عمل پر زیادہ یقین رکھتے ہیں ابن صفی کی پیدائش چونکہ ہفتے کے دن ہوئی ہے اور ہفتے کے دن پر زحل کی حکمرانی ہے۔ زحل کے اسی اثر نے ابن صفی کے مزاج کو پرسکون بنا دیا ہے۔ دور اندیشی اور احتیاط بھی ان کی شخصیت میں نمایاں ملتی ہے۔ اگرچہ ان کو کبھی کبھی خوبصورتی یا خوش آئندہ تصورات بھی متاثر کرتے ہیں لیکن ان پر عمل قطعی نہیں کرتے کیونکہ یہ ان کے نزدیک محض دیوانے کی خواہش جیسے ہوتے ہیں۔ ان میں وفاداری کے ساتھ

ساتھ قربانی کا جذبہ بھی ہوتا ہے ان کی وفاداری کی تعریف ہر جگہ کی جاتی ہے۔ گھریلو طور پر بڑی پسندیدہ شخصیت کے مالک ہوتے ہیں۔ اہل خانہ اور بچوں سے خصوصی رغبت رکھتے ہیں۔ گھر ان کے لیے راحت و تسکین اور اطمینان بخش جگہ ہوتی ہے یہ زندگی کی مادی ضروریات اور مسرتوں کو حاصل کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں محنت اور اعتماد کے ساتھ کام کرتے ہیں۔ اپنے عظیم منصوبے بنا کر خود عمل پیرا ہونے کے بجائے اکثر دوسروں کے سپرد کر دیتے ہیں۔ اپنے عظیم تخیلات اور تصورات کو دوسروں کے سامنے ظاہر کر دینے میں کبھی تکلف اور بخل سے کام نہیں لیتے۔

عدد آٹھ کا حامل شخص اپنی پوشیدہ صلاحیتوں کی وجہ سے اپنے ارادوں پر مضبوطی سے قائم رہتا ہے۔ اور کامیابی حاصل کر کے ہی دم لیتا ہے۔ اس شخص میں انتقامی یا حاسدانہ جذبہ قطعی نہیں ہوتا۔ نمبر ۴ اور چھ ان کے موافق اعداد ہیں۔

عدد دو اور آٹھ کی تمام خصوصیات کو مدنظر رکھتے ہوئے آیئے اب ہم ابن صفی کی گزاری ہوئی ذاتی گھریلو اور بیرونی زندگی پر ایک تنقیدی نظر ڈالیں اور دیکھیں کہ ان خصوصیات اور نکات کی روشنی میں یہ ساری باتیں ان کی زندگی میں کس طرح پوری ہوتی ہوئی نظر آتی ہیں۔

عدد دو جو اصل نام اسرار احمد کا حاصل ہے لفظ ناروی کی اضافت کے ساتھ عدد ۸ بن جاتا ہے۔ لیکن ہم یہاں صرف اسرار احمد کے حاصل اعداد یعنی ۲ نمبر کی خصوصیات کو ہی مدنظر رکھتے ہوئے گفتگو کریں گے۔ اس نمبر کی سب سے بڑی اور اہم خصوصیت تخلیقی صلاحیتوں کا ہونا ہے اور اس صلاحیت کا اظہار اسرار احمد کی زندگی میں سات آٹھ سال کی چھوٹی سی عمر میں ہی ہونا شروع ہو گیا۔ جب انہوں نے طلسم ہوشربا جیسی کلاسیکی ادب کی ساتوں جلدیں نہایت دلچسپی اور انہماک سے پڑھ کر ختم کر دی تھیں اور تعلیم کے لحاظ سے ساتویں منزل عبور بھی نہ کر پائے تھے کہ ان کا افسانہ معروف ناول نگار وصحافی جناب عادل رشید کی ادارت میں شائع ہونے والے ہفتہ روزہ شاہد بمبئی میں شائع ہوا' تعلیم کی آٹھویں اور نویں منزل پر پہنچتے پہنچتے اسرار احمد نے شاعری بھی شروع کر دی' اپنی ان تخلیقی صلاحیتوں کا اظہار کرتے ہوئے اسرار احمد بزبان قلم ابن صفی کے نام سے بتاتے ہوئے لکھتے ہیں کہ پہلی کہانی اس وقت لکھی جب ساتویں درجے کا طالب علم تھا۔ اس کا نام ناکام آرزو تھا۔ یہ کہانی عادل رشید مرحوم نے اپنے رسالے شاہد میں شائع کی تھی۔ آٹھویں یا نویں درجے میں پہنچ کر شاعری شروع کی' حضرت جگر مرادآبادی حواس پر چھائے ہوئے تھے۔ لہٰذا خمریات پر ہی طبع آزمائی ہوئی اور اس زور و شور سے ہوئی کہ کبھی کبھی سوچنا پڑتا' کہیں سچ مچ تو نہیں پینے لگا۔ (بحوالہ نئے افق ابن صفی نمبر اگست ۸۱ء مضمون بقلم خود)

دوسری خصوصیت اس نمبر یعنی عدد ۲ کی رحمدلی' روشن خیالی اور اسلجھے ہوئے ذہن کا مالک ہونا ہے۔ ابن صفی کو قریب سے جاننے والے تمام دوست' احباب' عزیز و اقارب سب اس امر پر متفق ہیں کہ ابن صفی مرحوم بڑی ہنس مکھ طبیعت کے مالک تھے۔ دوستوں کے دوست' عزیزوں کے عزیز اور ضرورت مندوں کے معاون

ومددگار...... وہ اپنے معروف کردار حمید کی طرح بذلہ سنج، عمران کی طرح حاضر جواب بھی تھے...... وہ یوں تو فطرتاً خاموش طبع واقع ہوئے تھے، مگر کبھی کبھی چند جملوں میں ان کا جواب لاکھوں پر بھاری ہوتا تھا...... وہ لطیف پیرائے میں بڑی سے بڑی بات آسانی سے کہہ جاتے تھے۔ابن صفی کی شہرت اور مقبولیت سے متاثر ہوکر نجانے کتنے لوگ ابن بن گئے...... مگر وہ چونکہ محض نقلی ابن بنے تھے اس لیے وقت کے ساتھ ساتھ اپنی موت آپ ہی مرگئے۔ابن صفی مرحوم نے اسی روش کا اپنے ناول ''لڑکیوں کا جزیرہ'' میں ایک کردار کے ذریعے اظہار یوں کیا ہے۔

کیا نام بتاؤں......

ابن ہدہد......

وہ ہنستا ہوا ایڈیٹر کے کمرے کی طرف چلا گیا۔عمران کی سنجیدگی میں ذرہ برابر فرق نہیں آیا۔تھوڑی دیر بعد اس نے واپس آکر کہا جائیے۔عمران اکڑتا ہوا کمرے کے دروازے کی طرف آیا۔ چق ہٹائی اور اندر چلا گیا...... ایڈیٹر دونوں ہاتھ میز پر رکھے قہر آلود نظروں سے دروازے کی طرف گھور رہا تھا......

''تشریف رکھیے......'' وہ غرایا۔

یہ ایک لمبا تڑنگا اور صحت مند آدمی تھا۔عمر چالیس اور پچاس کے درمیان رہی ہوگی۔

''آپ بھی ابن ہیں؟'' اس نے عمران کو کینہ توز نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''جی ہاں بندے کو ابن ہدہد کہتے ہیں۔''

کیا ابن کوئی بیماری ہے......؟ جسے دیکھیے نام کے ساتھ ابن لگائے چلا آرہا ہے...... بیٹھیے نا بہت سی باتیں کرنی ہیں آپ سے......''

عمران بیٹھ گیا۔

''آپ کیوں آئے ہیں......؟''

''اپنی ایک کہانی لایا ہوں......''

مگر آپ کو نام بدلنا پڑے گا...... میرے پرچے میں جاسوسی کہانیاں بالکل شائع نہیں ہوتیں......

''اجی یہ رومانی افسانہ ہے۔

پھر تو آپ کو نام بدلنا ہی پڑے گا۔''

اچھا تو صرف ہدہد کردیجیے گا۔''

دیکھا آپ نے یہ ہے ابن صفی کی فطری شوخی اور شرافت یہ اسی کا ظرف ہے جو اپنے نام کا خود اسی طرح مذاق اڑا سکتا ہے۔اب رہی بات ابن صفی کی مدد اور تعاون کرنے والی صفت کی۔وہ واقعی ضرورت مندوں کی مدد اس طرح خاموشی کے ساتھ کیا کرتے تھے کہ دوسرے ہاتھ تک کو خبر نہیں ہوتی تھی...... میرا ہی ایک تاثراتی مضمون اسرار ماموں، مطبوعہ نئے افق اگست ۸۸ء سے ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں۔

میں کتابیں لے کر بہت خوش ہوئی...... پھر بعد میں یہی کتابیں محلے میں ایک آنہ یومیہ پر چلنے لگیں...... اس کرائے سے میرے تعلیمی اخراجات بخیر وخوبی پورے ہونے لگے۔اس وقت تو یہ بات سمجھ میں نہ آئی' مگر آج سوچتی ہوں کہ اسرار ماموں نے انسانی نفسیات کو سمجھتے ہوئے اور امی' پاپا کے جذبہ خودداری کو ٹھیس پہنچائے بغیر' کس خوبصورتی سے ہماری مدد کی۔ان کا یہ تحفہ ہمارے لیے معاشی آسانی کا سبب بن سکا۔

تیسری خصوصیت عدد دو کی دوستی سے متعلق ہے کہ عدد دو کا مالک شخص خلوص و وفاداری کا پیکر ہوتا ہے۔ اس صفت کا ذکر مضمون میرے بھائی جان' از ریحانہ لطیف نئے افق ابن صفی نمبر ۱۹۸۶ء ملاحظہ فرمائیں۔وہ لکھتی ہیں بھائی جان کے قریبی احباب یہ بات اچھی طرح جانتے ہیں کہ وہ کبھی کسی کی دل شکنی نہیں کرتے تھے۔ بھائی جان غصے کو ضبط کرنے کے فن سے واقف تھے......دوسری مثال خود مشتاق احمد قریشی کی ہے۔ ایک دلچسپ بات بتاتی چلوں وہ یہ کہ جناب مشتاق احمد قریشی کے اعداد کا مجموعہ بھی دو ہی نکلتا ہے جب دو ہم خیال شخص مل جائیں تو پھر دوستی وہاں گہرے قریبی تعلقات میں ڈھل جاتی ہے۔یہی کچھ ابن صفی اور مشتاق احمد قریشی کے ساتھ ہوا'لذت زیست کے زیر عنوان قریشی صاحب لکھتے ہیں۔

شعور آتے ہی جو آنکھیں کھولیں تو وہ جاسوسی دنیا کے ناولوں پر کھولیں۔پھر یہ جنون اتنا بڑھا کہ میں جاسوسی دنیا کے ناول لکھنے والے کا گرویدہ ہوتا چلا گیا۔میرا یہی اضطراب بالآخر ایک دن مجھے جاسوسی دنیا کے ناولوں کے مصنف محترم ابن صفی (مرحوم) کے در فیض پر لے گیا اور جلد ہی میری عقیدت اور ان کی محبت ایک ایسے رشتے میں گندھ گئی جس کی مثال مشکل ہے۔انہوں نے ہمیشہ مجھے بہت عزیز رکھا اور خورد بزرگی کے باوجود انہوں نے میری عزت کی...... یہ ان کے مزاج کا خاصہ بھی تھا...... کہ وہ بڑوں کا احترام اور چھوٹوں کی عزت کرتے تھے...... یہ ان کی اعلیٰ ظرفی تھی کہ انہوں نے ہمیشہ مجھے چھوٹے بھائی کی مانند سمجھا......میری ذہنی تربیت اور اخلاقی اقدار میں ان کا ہاتھ ہے۔آج میں جو کچھ بھی ہوں انہی کی محبت اور شفقت کے فیض کا نتیجہ ہے اس ضمن میں محترم شکیل جمالی کا یہ جملہ بھی بطور حوالہ لکھ دینا دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا۔محترم شکیل جمالی اجالے تیری یادوں کے ''زیر عنوان'' لکھتے ہیں (نئے افق ابن صفی نمبر اگست ۸۷ء) محترم عباس حسینی صاحب سے ان کے جو تعلقات تھے اس کے بارے میں کچھ کہنا ہی نہیں ہے۔بس ان کا یہ جملہ یاد آ رہا ہے جو انہوں نے ڈیڑھ متوالے' کی اشاعت کے موقع پر اپنے پیغام میں افواہیں پھیلانے والوں کے سلسلے میں لکھا تھا......ان بے چاروں کو شاید یہ نہیں معلوم کہ ایک درجن کتابیں تو میں عباس حسینی کی مسکراہٹ پر قربان کر سکتا ہوں......عدد دو کی دوست نوازی' دوست کے لیے قربانی اور ایثار کا اس سے بڑا اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے۔

عدد آٹھ یہ عدد ابن صفی کے قلمی نام کے اعداد سے حاصل ہوا ہے اور ابن صفی کی عملی زندگی میں اسی عدد کا بھی بھر پور اثر رہا ہے۔جیسا کہ میں ابتداء میں لکھ چکی ہوں کہ ابن صفی کے تمام جاسوسی اور عمران سیریز کے ناولوں کو الگ الگ تعداد کے اعداد اور سال وفات کا عدد بھی آٹھ ہی ہے۔ابن صفی نے کرسچین کالج الہ آباد سے انٹرمیڈیٹ کا امتحان پاس کیا۔اس کالج کے اعداد کا مجموعہ بھی آٹھ ہے۔ یہاں ان اعداد کا ذکر کر دینا بھی

دلچسپی سے خالی نہ ہوگا جوان اعداد یعنی دو اور آٹھ کے ساتھ مطابقت اور موافقت رکھتے ہیں۔ نمبر ۲ کے ساتھ نمبر ایک اور سات جبکہ نمبر آٹھ کے ساتھ نمبر چار اور چھ کی موافقت ہوتی ہے۔ یادگار حسینی انٹر کالج الٰہ آباد وہ تعلیمی ادارہ ہے جہاں محترم ابن صفی صاحب نے دو سال تک مدرس کے فرائض انجام دیئے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہہ لیں کہ ابن صفی مرحوم نے ناول نگاری کی طرف آنے سے قبل اپنی عملی زندگی کا آغاز ایک مدرس کی حیثیت سے کیا اور ان کے اندر کا یہ مدرس ان کے ہر ناول میں موجود نظر آتا ہے۔ عدد آٹھ کی تمام تر خصوصیات ہم ان کے ناولز کے کرداروں میں ہی نہیں ان کی زندگی میں بھی موجود پاتے ہیں۔ عدد آٹھ کے حامل شخص میں جو بھی کام ان کے سامنے ہوگا اسی میں کامیابی حاصل کرنے کا جذبہ آغاز سے ہی نمایاں ہو کر سامنے آئے گا۔ ان نکات کی روشنی میں بقلم خود کے زیر عنوان ابن صفی کے اپنے الفاظ میں یہ اقتباس ملاحظہ فرمائیں۔

پھر ایک دن یہ ہوا کہ ایک ادبی نشست میں کسی بزرگ نے کہا۔ اردو میں صرف جنسی افسانوں کی مارکیٹ ہے۔ اس کے علاوہ اور کچھ نہیں بکتا۔ میں نے (ابن صفی) کہا یہ درست ہے لیکن ابھی تک کسی نے بھی جنسی لٹریچر کے سیلاب کو روکنے کی کوشش نہیں کی۔ کسی طرف سے آواز آئی یہ ناممکن ہے...... جب تک کوئی متبادل چیز مقابلے پر نہ لائی جائے یہ قطعی ناممکن ہے۔

متبادل چیز...... میں نے سوچا (ابن صفی) اور پھر آٹھ سال کی عمر کا وہی بچہ سامنے آ کھڑا ہوا جس نے طلسم ہوش ربا کی ساتوں ضخیم جلدیں چاٹ ڈالی تھیں اور یہ بھی دیکھا تھا کہ اسّی سال کے بوڑھے بھی بچوں کی طرح طلسم ہوش ربا میں گم ہو جاتے ہیں۔ یہ واقعہ ۱۹۵۱ء کا ہے ٹھیک ایک سال بعد جاسوسی دنیا کے سلسلے کا اجرا ہوا جو ان کی آخری سانسوں تک جاری رہا۔ ابن صفی نے اس بات کو ایک چیلنج کی طرح قبول کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے اردو ناول نگاری کے افق پر پوری طرح چھا گئے...... انہوں نے صرف تھکے ہوئے ذہنوں کو اپنی تحریروں کے ذریعے صحت مند تفریح ہی فراہم نہیں کی بلکہ ذوق مطالعہ کو بھی فروغ دیا۔ ابن صفی کا یہ بھی ایک کارنامہ ہے کہ ان کے قلم نے ادب العالیہ کی رسائی عوام تک کر دی...... وگرنہ اس سے پہلے تک ادب العالیہ کی پہنچ صرف اور صرف خواص تک ہی تھی...... ابن صفی کے ناولز کسی نہ کسی واضح سماجی مقصد کے لیے لکھے گئے۔ ان میں برائے نام اور نہایت مختصر مشاہرے پر بطور ٹیچر کام کرنے والی لڑکیوں کا مسئلہ ہو یا وطن سے غداری کرنے والے ملت فروش لوگوں کا، بین الاقوامی اسمگلروں کا مسئلہ ہو یا کوئی اور سماجی، معاشی مسئلہ ابن صفی نے ہر موضوع پر ہر مسئلہ پر بڑی مہارت سے قلم اٹھایا ہے۔ ابن صفی کے ناولوں کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ بہت سے ایسے لوگوں نے جو اردو سے واقف نہیں تھے نے اردو سیکھی اور اردو کی آفاقی شیرینی ولذت سے آگاہ ہوئے۔ ابن صفی نے اپنے ناولز کے ذریعے صرف اردو ادب کی ہی خدمت نہیں کی بلکہ عدد آٹھ کی ایک بڑی خوبی یونانی مکتبہ فکر کے مطابق عدل وانصاف سے متعلق ہونا بھی ہے...... یونانی تھیوری کے مطابق اس نمبر یعنی آٹھ نمبر کا تعلق انصاف اور حق سے ہے ان کے یہاں عدد آٹھ کا تصور ایک شخص ہاتھ میں تلوار اور دوسرے ہاتھ میں ترازو لیے ہوئے کا ہے...... دلیر مجرم سے لے کر صحرائی دیوانہ تک اور عمران سیریز میں خوفناک عمارت سے لے کر آخری

آدمی تک کوئی بھی ناول ہاتھ میں لے کر پڑھنا شروع کر دیں، اپنے ہر ناول میں ابن صفی عدد آٹھ کے یونانی تصور کی طرح ایک ہاتھ میں تلوار اور دوسرے ہاتھ میں ترازو لیے کھڑے نظر آئیں گے۔ تلوار علامت ہے جرائم اور جرائم پیشہ افراد کی بیخ کنی کرنے کی جبکہ ترازو انصاف وصداقت کی علامت ہے۔ ابن صفی کا ہر ناول اسی خوبی اور حسین توازن سے مزین ہے۔ مجرم اپنی ذہانت میں لیونارڈ ہو یا سنگ ہی...... ہارپر ہو یا بلنگر...... ابن صفی کا کرنل فریدی ہو یا عمران کوئی نہ کوئی مجرم کے مضبوط اور نہایت چالاکی سے بنائے گئے حصار کو نہایت آسانی سے توڑ کر اس تک نہ صرف پہنچ جاتا ہے بلکہ اس کے ساتھ پورا پورا انصاف بھی کرتا ہے...... ابن صفی کے ہاتھ کی تلوار کبھی کسی مجرم کو اس کے جرم سے زیادہ سزا نہیں دیتی...... اس کے ہاتھ کا ترازو غیر متوازن ہو کر کبھی کسی طرف زیادہ نہیں جھکتا۔ ابن صفی ایک مصنف نہیں اپنی فطرت کے لحاظ سے ایک بالغ نظر انصاف پسند جج ہے...... مجرم کتنا بھی شہ زور، پھنے باز، یا تعلقات والا ہی کیوں نہ ہو، ابن صفی کی عدالت میں پہنچنے کے بعد اسے اس امر کا بخوبی احساس ہوتا ہے کہ اس کے جرائم کے ساتھ پورا پورا انصاف کیا جائے گا...... اور اسے قانون کے مطابق اتنی ہی سزا ملے گی جتنا اس نے جرم کیا ہے۔

عدد آٹھ کے ساتھ چونکہ روز پیدائش یعنی ہفتے کے دن کی مناسبت سے زحل کا اثر بھی شامل ہو گیا ہے اسی اثر کی وجہ سے ابن صفی کی طبیعت اور مزاج میں سکون دور اندیشی اور احتیاط بدرجہ اتم موجود تھی۔ اس خصوصیت کا ذکر اسرار احمد کے انٹرمیڈیٹ کالج کے زمانے کے ایک استاد پروفیسر انوار الحق کی زبانی سنیے۔ پروفیسر صاحب اپنے شاگرد اسرار احمد کے متعلق بتاتے ہوئے کہتے ہیں کہ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اسرار احمد اپنے ہم جماعتوں میں بڑی ہر دل عزیز شخصیت کے مالک تھے۔ نہایت خاموش طبیعت ہر معاملے میں گہری نظر رکھنے کے عادی...... پاکستان میں جب ان سے میری ملاقات ہوئی تو ان میں کوئی تبدیلی محسوس نہ کر سکا...... کالج کے زمانے کے اسرار احمد اور پاکستان کے اسرار احمد میں رنگ ونسل، آب وہوا یا بدلتی تہذیب کی کوئی اضافی علامت نظر نہیں آئی...... وہی سنجیدگی، گہری نظریں، خاموش طبیعت اور متانت جو کالج کے زمانے میں تھی اب بھی موجود تھی...... ابن صفی کے مزاج کی یہی خوبی انہیں اپنے حلقہ احباب میں ممتاز کرتی ہے۔

عدد آٹھ کی حامل شخصیت عملی زندگی میں ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے بھی کامیابی حاصل کرتی ہے۔ بلکہ عدد آٹھ کے زیر اثر لوگ کامیاب ترین سرجن بھی ہوتے ہیں۔ ان خصوصیات کو ذہن میں رکھتے ہوئے آپ ابن صفی کی تحریروں پر نظر ڈالیں۔ کیا آپ کو وہ ایک اچھے ڈاکٹر اور کامیاب سرجن نظر نہیں آتے......؟ وہ ایک اچھے شفیق اور ماہر ڈاکٹر کی طرح مرض کی تشخیص کرتے ہیں۔ پھر اس کا علاج...... اگر مرض زیادہ شدت اختیار کر گیا ہے اور سرجری اس کے لیے ضروری ہے تو پھر آپریشن کرنے سے بھی گریز نہیں کرتے مگر ابن صفی کا یہ آپریشن اپنے مریض کے ساتھ دشمنی پر نہیں محبت اور انتہائی خلوص پر مبنی ہوتا ہے وہ ایک مخلص ومہربان ڈاکٹر اور سرجن کی طرح علاج وآپریشن کرتے ہیں۔

آپ ابن صفی کا کوئی بھی ناول ہاتھ میں اٹھائیے، اسے پڑھنا شروع کر دیجیے...... لفظ لفظ پڑھتے ہوئے

آگے پڑھتے جایئے۔ ورق ورق الٹتے جایئے...... آپ کو قدم قدم پر مجرم کی عیاریاں سانس روکنے اور آنکھیں پھاڑنے پر مجبور کردیں گی ہر نئے موڑ پر ایسا محسوس ہوگا کہ مجرم اب گرفتار ہوا' مگر چالاک مجرم ہر نئے موڑ پر قانون کو طرح دے کر نکل جاتا بھی محسوس ہوگا ہر صفحہ پر آپ کو مجرم قانون کے ہاتھوں میں آتا ہوا نظر آئے گا مگر صفحہ پلٹنے پر وہ مجرم نہیں کوئی اور ہوگا...... مگر آخری صفحے پر پہنچتے پہنچتے یا آخری لائنوں کے زیر نظر آنے پر فریدی یا عمران مجرم کو ہتھکڑیاں پہنا کر قانون کے حوالے کرتے ہیں تو آپ بحر حیرت میں غوطہ لگاتے نظر آئیں گے۔ آپ سوچ میں پڑ جائیں گے کہ یہ اصل مجرم تھا...... بھئی اس کردار کے متعلق تو ذرہ برابر بھی شبہ نہیں ہوا تھا کہ یہ مجرم ہوگا۔ ابن صفی کے ناولوں کا یہی بھرپور سسپنس تو اس کی کامیاب سرجری ہے اور یوں اس عدد ۸ کی خصوصیت پر ایمان لانا ہی پڑتا ہے کہ اسی عدد کے حامل افراد بہترین ڈاکٹر و سرجن بھی ہوتے ہیں۔ یہ بات قطعی غلط نہیں ہوگی اگر میں یہ کہوں کہ ابن صفی اگر ناول نگاری کی طرف نہ آتے تو وہ ایک اچھے سائنٹسٹ ڈاکٹر اور سرجن بھی ہوسکتے تھے...... اٹھائیس سال تک لوگ اگر ان کے ناولوں کے منتظر رہے تو ڈاکٹر و سرجن ہوتے تو اسپتال میں کراہتے ہوئے مریض شفایاب ہوکر مسکراتے ہوئے گھر جاتے۔

عدد آٹھ کی خصوصیات میں ایک بڑی اور اہم خصوصیت دوسروں کو سکھانا' بتانا اور انہیں آگے بڑھانا بھی ہے...... جہاں تک سکھانے کا کام ہے یا بتانے اور آگے بڑھانے کا تعلق ہے تو یہ خصوصیات ایک اچھے مدرس اور ٹرینڈ ٹیچر کی ہوتی ہیں۔ چونکہ عدد آٹھ کے حامل افراد عملی شخصیت کے مالک ہوتے ہیں۔ جفاکشی' حاضر دماغی' چارہ سازی اور انتھک محنت ان کی خصوصیات ہوتی ہیں۔ یہ ماتحت بن کر زندگی نہیں گزار سکتے۔ اسی وجہ سے ملازمت کرنا بھی پسند نہیں کرتے...... آپ ابن صفی کی زندگی کا جائزہ لیں تو یہ خصوصیت یہاں بھی اپنے آپ کو منواتی نظر آئے گی۔ ان کے ایک استاد پروفیسر انوارالحق نے جب کافی عرصہ بعد ملاقات ہونے اور ان کے ناول نگار بننے کی خبر سن کر سوال کیا کہ میاں اسرار شاعری چھوڑ کر جاسوسی ناولوں کی طرف کیسے راغب ہوگئے تو محترم ابن صفی کے اپنے الفاظ میں اس کا جواب یوں تھا محترم...... بات دراصل یہ ہے کہ شاعری سے واہ' واہ کی غذا حاصل کر کے ذہن کو تقویت تو بخشی جاسکتی ہے لیکن یہ پیٹ بھرنے کا ذریعہ ثابت نہیں ہوسکتی۔ ملازمت مجھے پسند نہیں۔ اس لیے جاسوسی ناولوں کو ذریعہ معاش بنالیا...... دیکھا آپ نے...... عدد آٹھ کی صفات ابن صفی کے مزاج میں کس قدر کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہیں۔ آپ یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ آٹھ کے عدد نے ابن صفی کی شخصیت اور مزاج پر کتنا گہرا اثر چھوڑا ہے۔

میں پہلے بھی شاید لکھ چکی ہوں کہ ابن صفی ناول نگار بننے سے پہلے یادگار حسینی انٹر کالج الٰہ آباد میں دو سال تک بطور مدرس درس و تدریس کا کام کرچکے تھے۔ وہ اس میدان میں بھی نہایت کامیاب ثابت ہوئے۔ ان کا کامیاب مدرس ہونا بھی عدد آٹھ کی خصوصیات کا مظہر ہے۔ پھر وہ ناول نگار ہوکر بھی کب ٹیچنگ کے پروفیشن سے دامن چھڑا سکے۔ وہ اپنی ہر ناول میں ایک اچھے ڈاکٹر' کامیاب سرجن ذہین سائنسدان اچھے خوش مزاج' خوش اخلاق حاضر جواب شخص' حق و انصاف پسند مصنف کی حیثیت سے ہی سامنے نہیں آئے' اچھے' سلجھے

ہوئے ماہر نفسیات مدرس کی صورت میں بھی ملیں گے۔ حقیقتاً انہیں ایسا ہی ہونا چاہیے تھا جیسا کہ وہ تھے۔

ابن صفی کے دوست احباب، عزیز و اقارب اور تمام ملنے جلنے والے اس بات کی واشگاف الفاظ میں بلا جھجک گواہی دیں گے کہ ابن صفی مرحوم اپنی تمام زندگی میں بااخلاق، بامروت اور مذہبی شخصیت بھی تھے اور ان کی شخصیت کا یہ رنگ ان کی تمام تحریروں میں بھی جھلکتا نظر آتا ہے۔ آپ حضرات کو یاد ہوگا کہ ابن صفی اردو کے جنسی ادب کے خلاف میدان میں اترے تھے..... یہی وجہ تھی کہ ان کی تحریر میں شائستگی، اخلاق، مروت اور حیا کی بھینی بھینی مہک تو محسوس ہوتی ہے پھکڑ پن اور جذبات کو غلط انداز میں ابھارنے والا رنگ کہیں نہیں ملتا۔

ان کے یہاں جنس کا تذکرہ ہے، نائٹ کلبوں میں مردوں کے ساتھ بانہوں میں بانہیں ڈالے رقص کا ذکر ہے مگر لذت انگیزی کے ساتھ نہیں اس کے مضر اثرات کے ذکر کے ساتھ..... ان کا قلم ایسے تذکروں میں بڑی احتیاط کے ساتھ چلتا ہے وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ ان کے قاری بڑی عمر کے سنجیدہ مزاج اور تجربہ کار لوگ ہی نہیں کچے ذہنوں کے اسکول میں پڑھنے والے طلبا بھی ہیں۔ انہوں نے ناول لکھتے وقت ہمیشہ اس بات کو مدنظر رکھا کہ ان کا کوئی ناول کوئی قاری اپنے بزرگوں اپنے بڑوں اور اپنے سرپرستوں سے چھپا کر نہ پڑھے۔ یہی وجہ ہے کہ ابن صفی کے قارئین میں ہر عمر، ہر مزاج کے افراد شامل ہیں۔ طلبہ، طالبات، وکیل، سائنسدان، لیکچرار اور پروفیسرز، کارخانوں، ملوں، فیکٹریوں میں شدید جسمانی محنت کرنے والے مزدور...... سب ہی اس کے ناول بڑی دلچسپی اور رغبت سے پڑھتے ہیں۔ کیوں پڑھتے ہیں صرف اس لیے کہ انہیں ابن صفی وہی کچھ پڑھنے کو دیتا ہے جس کی انہیں ضرورت ہے۔ ادب اور اخلاق ابن صفی کی تحریروں کا خصوصی عنصر ہے۔ کسی نے مرحوم سے یہ سوال کیا تھا کہ آپ کی تحریریں اتنی پاکیزہ اور نکھری نکھری سی کیوں ہوتی ہیں؟ اس کا جواب مرحوم نے یوں دیا کہ میری تحریروں میں میرے والد بھی ساتھ ساتھ ہوتے ہیں۔ ذرا غور تو کیجیے اس جواب پر...... کس قدر لطیف اور بلیغ جواب ہے۔ یہ کوزے میں سمندر کو بند کر کے رکھ دیا ہے ابن صفی نے اس جملے میں، ابن صفی نے اپنے والد محترم کو خراج عقیدت ہی پیش نہیں کیا بلکہ یہ بتانے کی کوشش بھی کی ہے کہ والدین کا احترام ہی اولاد کو منزل مقصود پر پہنچاتا ہے۔ ابن صفی نے دلیر مجرم سے لے کر آخری آدمی تک دو سو اکتالیس ناول لکھے اور بے شمار مستقل اور عارضی کردار ضرورت کے مطابق تخلیق کیے ان میں سے کسی بھی کردار کو تنقیدی نگاہ سے دیکھا جائے، فریدی، حمید، انور، قاسم، رشیدہ، عمران، صفدر، جولیا، جیسے مستقل کردار کس قدر مہذب اصول پسند، بلند خیالات، اعلیٰ سوچ، بہترین تصورات کے مالک کردار ہیں۔ فریدی کی اصول پسندی، بلند کرداری ہی اسے حمید سے فادر ہارڈ اسٹون کہلواتی ہے۔ حمید شوخ ہے کبھی کبھی ماحول کے آگے جھکنے لگتا ہے تو فریدی اسے بڑے پیار سے سمجھا کر برائی سے دور کھینچ لے جاتا ہے۔ ابن صفی کے یہ تمام مستقل کردار کبھی کسی کے ساتھ زیادتی نہیں کرتے، کبھی کسی کو نقصان نہیں پہنچاتے، بلکہ احترام انسانیت کا درس دیتے نظر آتے ہیں۔ ناول کے کرداروں میں یہ بات یوں ہی نہیں آ گئی، ابن صفی اپنی ذات، اپنی شخصیت میں بھی ایسے ہی ہیں۔ بہن کی ناراضگی کے خیال سے ان کے سامنے ہاتھ جوڑ کر بیٹھ جانے میں وہ برائی نہیں سمجھتے۔ ماں کی

جوتیوں کو سر پر رکھ کر یہ کہنا 'اماں' میں جو کچھ بھی ہوں آپ کی ان ہی جوتیوں کے طفیل ہوں اور اپنے بچوں کے جھرمٹ میں ان کے ساتھ ایک دوست کی طرح گھل مل جاتے ہیں اور یہ سب مذہبی تعلیم وخیالات اور اعلیٰ تربیت کا اثر ہے۔

مصور پاکستان، شاعر مشرق علامہ اقبال کا ذاتی عدد بھی آٹھ ہے۔ اقبال کی تمام تر شاعری کا محور مسلم نوجوان کو اس کی نشاۃ ثانیہ سے روشناس کرانا اور اس کی خودی کو بیدار کر کے اسے معاشرے کا ایک مفید اور کارآمد پرزہ بنانا ہے۔ علامہ اقبال کہیں، چین وعرب ہمارا ہندوستان ہمارا، مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا، جیسا ترانہ لکھ کر مسلم قومیت کو اجاگر کرتے ہیں تو ابن صفی مرحوم اپنے ناولوں میں اللہ الزم کا پرچار کرتے ہوئے، دونوں کا عدد آٹھ ہے۔ دونوں کا نظریہ اور دلی خواہش بھی ایک...... محمد حسین آزاد بھی عدد آٹھ کے حامل فرد ہیں۔ وہ بھی اپنی تحریروں سے اصلاح معاشرہ کا کام لینا چاہتے ہیں۔ ابن صفی کا نظریہ بھی یہی ہے۔ جہاں جہاں آپ عدد آٹھ کی کارفرمائی اور اثرات پر نظر ڈالیں گے وہاں آپ کو اخلاقی اقدار، تہذیب، نیکی، ایمانداری ایک دوسرے کے ساتھ اچھا سلوک، انسانی رشتوں کا پرچار عام ملے گا۔ رسول کے عدد آٹھ ہیں۔ سب جانتے ہیں کہ رسول کا کام کیا ہے، احمد ندیم قاسمی، قرۃ العین حیدر، احمد فراز، فیض یہ سب عدد آٹھ کے اثرات کے تحت آتے ہیں اور ان سب کا کام ہمارے سامنے کھلی کتاب کی طرح پھیلا ہوا ہے۔

عدد آٹھ کی ایک خصوصیت کا اظہار ابھی باقی ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ عدد آٹھ کی حامل شخصیت کی خدمات کا اعتراف اور اس کے مقام کا تعین...... کہتے ہیں کہ ایسے شخص کی خدمات کا اعتراف اور اس کے مقام کا تعین اس کی وفات کے بعد ہوتا ہے...... اب دیکھنا یہ ہے کہ تاریخ ابن صفی کی خدمات کا اعتراف اور ان کے ادبی مقام کا تعین کب کرتی ہے اور انہیں کس مرتبے پر فائز کرتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آج نہیں تو کل ابن صفی کو اردو ادب میں اس کا جائز مقام ضرور ملے گا...... اور اس لیے ملے گا کہ ابن صفی نے اردو ادب کے لیے ایک مشن کی طرح کام کیا ہے۔

چند آنسو چند آہیں

نسرین قریشی

کتنی مشکل زندگی ہے، کس قدر آساں ہے موت
گلشنِ ہستی میں مانندِ نسیم، ارزاں ہے موت

جانے والے چلے جاتے ہیں مگر جانے غم میں اتنی پائیداری کہاں سے آجاتی ہے کہ لمحہ لمحہ درد کی شدت سے کانپ اٹھتا ہے۔ جولائی کا مہینہ اور ۱۹۸۰ء کا سال کتنا دکھی کر دینے والا ہے۔ آنکھیں اشکبار ہیں اور روح میں بہت دور تک ویرانیاں اور لاکھوں سناٹوں نے جنم لے لیا ہے، میں اسرار احمد سے کبھی نہیں ملی مگر اس کے باوجود ان سے ایک ناتا ہے جو اٹوٹ ہے، میں اسے اٹوٹ ہی سمجھتی تھی مگر موت نے ثابت کیا کہ یہ ٹوٹ بھی سکتا ہے اور واقعی آج محترم ابن صفی منوں مٹی تلے دفن ہیں، اک ویرانی ہے جو ابنِ صفی پورے برصغیر میں چھوڑ گئے ہیں۔ اس وقت نہ تو میرے آنسو بہہ رہے ہیں اور نہ ہی لہجہ کپکپا رہا ہے...... مگر ابدی جدائی کی صلیب زندگی کے ہر لمحے پر بھاری محسوس ہو رہی ہے۔ وہ جو لاکھوں پڑھنے والوں کے محبوب لکھنے والے تھے، جاسوسی ادب کی درخشاں شخصیت تھے آج ہم میں نہیں مگر یہ پاگل من کہاں مانتا ہے۔ اس کے احساسات تو آج بھی وہی ہیں جو ان کی حیات میں تھے۔ ان کی شوخ تحریریں ایسی تھیں کہ محسوس ہوتا وہ ہم میں مسکراہٹیں بانٹ رہے ہیں اور اب ان کی یادیں آنسو بن کر روح کی گہرائی میں اترتی محسوس ہو رہی ہیں۔ علم و ادب کا وہ سورج جس کے ذہن کا نور ہمارے تاریک ذہنوں کو منور کرتا تھا وہ ہمیشہ کے لیے کہیں جا چھپا ہے۔

ان کی تحریر میں شوخی و طنز کا حسین امتزاج ہے۔ برجستہ و بے ساختہ جملوں کی بھرمار ہے۔ اپنے کرداروں کے منہ سے جملے کچھ اس انداز سے کہلواتے کہ اس پر برجستگی و بے ساختگی قربان ہو ہو جاتی ہے۔ سادگی اور شوکت الفاظ کا ایسا امتزاج کہ دل خوش ہو جاتا ہے اور ان کی تمام تحریریں اسی زیور سے مزین ہیں۔ جاسوسی ادب، آج تک ان جیسا قلمکار نہ پیدا کر سکا ہے نہ آئندہ ممکن دکھائی دیتا ہے۔ وہ اس صنف سخن کے بے تاج بادشاہ تھے اور اس میدان میں ان کی شہرت دور دور تک ہے اور دوام ہے۔ صرف ابن صفی کے طفیل اردو ادب ایک نئی صنف سے روشناس ہوا۔

جاسوسی ادب کا چاند بادلوں میں چھپ گیا، مگر ہمیشہ کے لیے...... اور آج ان کی عظمت سے آگاہ کرنے کے لیے مجھے یہ چند آہیں، بھرنی پڑیں۔ یہ چند آنسو بہانے پڑے، ان کی شخصیت ذہن میں لائیں۔ اپنی چشم تصور کو وا کریں تو ان کی سمندر جیسی گہری اور بیکراں زندگی کے مدوجزر، تلاطم اور تموج سب ہی کچھ آنکھوں میں سمٹ آتا ہے۔ موت ابدی حقیقت ہے اور اس حقیقت نے ہم سے ہمارا محبوب قلمکار چھین کر ہمیں تہی دست کر دیا ہے مگر ان کی تحریریں، ان کا اسلوب اور ان کا انداز بیاں ایسا نہیں جو کسی کے سامنے ہار جائے۔ اچانک ''آنچل'' کے ستمبر کے شمارے پر نظر پڑی، جس کے سرورق پر ان کی شگفتہ شگفتہ سی تصویر مجھ سے ہم کلام ہے ؎

مدتوں ذہن میں گونجوں گا سوالوں کی طرح
تجھ کو یاد آؤں گا گزرے ہوئے سالوں کی طرح
ڈوب جائے گا جو کسی روز خورشید انا
مجھ کو دہراؤ گے محفل میں مثالوں کی طرح !

سرگوشیاں

زیب النساء

کراچی، روشنیوں کا شہر ہے لیکن روشنیوں کا پس منظر بڑا بھیانک ہوتا ہے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے' ابن صفی میگزین کے ادارے میں ابن صفی (جنہیں مرحوم لکھتے ہوئے کلیجہ منہ کو آتا ہے) نے اپنی والدہ ماجدہ کے انتقال پر ملال پر لکھا تھا ''آج روشنیوں کے شہر میں ایک بچہ تنہا رہ گیا''

وہی تنہائی کا مارا بچہ' روشنیوں کے شہر میں بھٹکتے بھٹکتے تاریکیوں میں گم ہو گیا۔

۱۹۲۸ء کو ہندوستان کے شہر الہ آباد کے ایک گاؤں نارہ کی زرخیز زمین سے پیدا ہونے والا یہ نرم و نازک پودا' اپنی جنم بھومی کی مٹی سے تمام اثرات قبول کر کے ماہ و سال کی گردش کے ساتھ ساتھ بڑھ کر تناور درخت کی شکل اختیار کر گیا۔ ایک ایسا درخت جس کی جڑیں ہر اردو داں طبقے کے دلوں تک گہری اتر گئی ہیں۔ اب وہ ایک تعلیم یافتہ نوجوان تھا۔ اس نے اپنے ماحول سے بالیدگی حاصل کی ہے۔ اپنے مشاہدے کو دوسروں تک پہنچانے کے لیے اپنے پر تجسس قلم کا سہارا لیا۔

والدین نے ان کا نام اسرار احمد رکھا تھا لیکن حضرت نوح ناروی کی اس زرخیز زمین نے اسے اسرار ناروی بنا دیا اور نارہ کی سرزمین سے ایک شاعر نے اپنے فن کا لوہا منوانا شروع کر دیا۔ فکر میں پختگی اور مزاج میں سنجیدگی آتی گئی جو بڑھتے بڑھتے زمانے کی عطا کردہ تلخیوں میں گھل گئی تو وہ طغرل فرغان بنا اور طنز کے زہریلے نشتر سماج کے کہن سالہ پھوڑے پر چلانے لگا۔ کہتے ہیں اسی زمانے میں کسی نے کہا...... کہ جاسوسی ادب' ادب کہلانے کا مستحق نہیں ہے۔ طغرل فرغان نے چیلنج قبول کیا۔ اب وہ جاسوسی ادب کے قریب گیا اور اپنا تعارف بحیثیت ابن صفی کرایا۔ پھر اس فن کو اپنی فنکارانہ صلاحیت سے چار چاند لگا دیئے۔ ایسا لگتا تھا کہ اردو ادب کی کوکھ سے جاسوسی ادب تولّد ہوا اور اولا دِ نرینہ کی دیرینہ خواہش پوری ہو گئی۔

اس پوت کے پاؤں پالنے ہی میں دیکھ کر اردو ادب کی جانی پہچانی شخصیت جناب عباس حسینی نے گود لے لیا اور اس کا نام جاسوسی دنیا رکھا۔ اس طرح اردو داں طبقہ ایک نئے ادب اور مطالعے کی دنیا سے روشناس ہوا۔ وہ منشی تیرتھ رام فیروز پوری کے اکتا دینے والے مغربی ماحول اور غیر ملکی ناموں سے بیزار ہو چکا تھا لیکن گولیاں کڑوی ہونے کے باوجود مریض آنکھ بند کیے نگل رہا تھا۔ اس وقت جاسوسی دنیا کا اجراء ہوا وہ سرور آمیز لگا اور اس کے مزاج کی جستجو بھی بڑھ گئی۔ اس طرح ابن صفی الہ آباد میں ایک گھنے سایہ دار درخت کی طرح کھڑا ہو گیا۔ ابن صفی کا نام اردو قارئین کے لیے توجہ کا مرکز بن گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے جاسوسی ادب کے آسمان پر چاند بن کر جگمگانے لگا۔ اسکول کا طالب علم اپنی کورس کی کتابوں میں جاسوسی دنیا چھپائے پڑھنے لگا۔ اگر میں یہ کہوں تو بے جا نہ ہوگا کہ لوگ محض ابن صفی کو پڑھنے کے لیے اردو سیکھنے لگے۔

اپنے اسی عروج کے زمانے میں ابن صفی نے ۵۲ء میں ہندوستان سے ہجرت کی اور پھر ان کا وجود کراچی میں نظر آنے لگا۔ جاسوسی ادب کا یہ چاند اردو کے آسمان پر بڑی آب وتاب سے چمکنے لگا اس کی چکا چوند سے متاثر ہو کر کئی اہل قلم این صفی، اَبن صفی وغیرہ بن گئے۔ مگر کہتے ہیں کہ کوا ہنس کی چال چلے تو اپنی چال بھی بھول جاتا ہے آج کا قاری بڑا ذہین وفطین ہے اسے اصل ونقل کی خوب پہچان ہے۔ وہ فوراً تاڑ جاتا ہے کہ یہ تو فریدی کی کاپی ہے اور عمران کا بھونڈا چربہ ہے۔

پاکستان آنے کے بعد ایک عام آدمی کو اس ماحول کو سمجھنے اور برتنے کے لیے جن دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے وہ روز روشن کی طرح عیاں ہے۔ جبکہ اس حساس دل فنکار کو نجانے کتنے پاپڑ بیلنے پڑے ہوں گے۔ یہ تو ابن صفی ہی جانیں۔

یہاں آنے کے بعد انہیں جو غیر معمولی شہرت ملی وہ ان کے دوست اور دشمنوں کے لیے لمحہ فکریہ تھی انہوں نے ان پر کاروباری انداز میں بڑے اوچھے قسم کے جملے بھی کہے لیکن ابن صفی صرف جاسوسی ناول نگار ہی نہیں تھے بلکہ باحیثیت طغرل فرقان ایک طنز نگار...... باحیثیت اسرار ناروی ایک شاعر بھی تھے اور بقول جوش کے اچھا شاعر کبھی برا نہیں ہوتا وہ ایک اچھا انسان بھی تھے۔ وہ واقعات کی کڑیاں ملا کر اپنا مطلب نکالنے کے فن میں بڑے مشاق تھا انہوں نے ہر جگہ اپنے اس فن کا بہترین مظاہرہ کیا۔

ابن صفی نے کراچی میں ایک فلم "دھماکہ" کی کہانی بھی لکھی جو فارمولا فلم نہ ہونے کی وجہ سے زیادہ پسند نہ کی گئی۔ اس پر لوگوں نے اور خصوصاً پریس نے جو بھی تبصرہ کیا وہ ان کا انداز فکر تھا۔

ہمارا خیال ہے کہ کسی فلم کی ناکامی یا کامیابی میں صرف کہانی کا دخل نہیں ہوتا۔ ڈائریکشن، کردار نگاری اور موسیقی بھی ضروری عنصر ہیں۔ ہم نے دیکھا کہ اُن کی شخصیت کے درخت پر شہرت کے پھول کھلتے گئے تو اُن کی خوبی یہ تھی کہ وہ سراپا انکسار تھے۔ اتنے اعلیٰ ظرف تھے کہ ملنے والا حیرت زدہ رہ جاتا۔ ان کی سادگی، ملنساری اور خوش اخلاقی مشہور جاسوسی ناول نگار ابن صفی سے نہیں اسرار احمد سے متعارف کراتی جو ایک اچھا باپ، اچھا شوہر، اچھا دوست اور اچھا انسان تھے۔ اسرار احمد سے مل کر ملاقاتی پر اسرار ہو جاتا۔

ان کی بیماری کی خبر سن کر انڈیا سے شکیل جمالی بھی تشریف لائے تھے۔ اس وقت ابن صفی اسپتال سے گھر آ چکے تھے۔ شکیل جمالی سے انٹرویو کے لیے لاہور سے خاص طور پر رخسانہ آرزو آئی تھیں۔ ان کا یہ انٹرویو آنچل میں شائع ہو چکا ہے۔ اس میں ابن صفی کو دیکھنے کے بعد آپ کو اندازہ ہو سکتا ہے کہ تندرستی اور توانائی کا پہاڑ عمران اور فریدی کو پروان چڑھاتے چڑھاتے خود کتنا ریزہ ریزہ ہو چکا ہے۔

انہوں نے عمران سیریز کا آخری ناول "آخری آدمی" اپنے آخری ایام ہی میں تکمیل کو پہنچایا اور رمضان المبارک کی ایک صبح ساڑھے 3 بجے جب لوگ سحری کے لیے جاگ رہے تھے وہ ابدی نیند سو گئے۔ روشنیوں کے شہر کی جھوٹی روشنیوں کو چھوڑ کے موت کے حقیقی اندھیرے میں گم ہو گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

۲۸ء کو دنیا میں آنے والا ۵۲ء کو کراچی ہجرت کرنے والا ۸۰ء میں ملک عدم چلا گیا۔

پیدا کہاں ہیں ایسے پرگندہ طبع لوگ
افسوس! ہم کو میر سے صحبت نہیں رہی

آنچل ستمبر 1980ء

ابن صفی! ذرا ہٹ کے

یاسر پیرزادہ

یہ میرے لڑکپن کی بات ہے، میں اپنے والدین کے ساتھ ان کے کسی ملنے والوں کے ہاں گیا ہوا تھا۔ بڑوں کے درمیان امریکہ اور روس پر گفتگو ہو رہی تھی اور میں بے تحاشہ بور ہو رہا تھا۔ اس گھر میں میرا کوئی ہم عمر تھا اور نہ ہی دلچسپی کا کوئی سامان، اچانک میری نظر سائیڈ ٹیبل پر رکھے ایک ناول پر پڑی اور میں نے حسب عادت وقت گزاری کے لیے اسے پڑھنا شروع کر دیا۔ جوں جوں میں اس ناول کے صفحے پلٹتا گیا توں توں میری دلچسپی میں اضافہ ہوتا گیا اور پھر ایک گھنٹے کے اندر میں نے وہ پورا ناول گھول کے پی لیا۔ ابن صفی سے میری یہ پہلی ملاقات تھی۔

ابن صفی سے اگلا تعارف والد محترم نے کروایا۔ ان کے علم میں تھا کہ میں گھٹیا قسم کے جاسوسی ناول پڑھتا ہوں، اور اگر اسی تواتر کے ساتھ پڑھتا رہا تو ایک دن نالائق قسم کا جاسوس بن جاؤں گا یا پھر خودکش بمبار کیونکہ ان ناولوں میں ''مذہبی جاسوسی'' کا تڑکا لگا ہوتا۔ سو ابن صفی کا دوسرا ناول مجھے والد صاحب نے لا کر دیا جسے مجھ سے پہلے وہ خود پڑھنے بیٹھ گئے اور جیسا کہ مجھے اندیشہ تھا، ختم کر کے ہی دم لیا۔ بعد ازاں میں نے ایک عدد لائبریری ڈسکور کی جہاں سے اس نوع کے ناول اور رسالے باآسانی کرائے پر پڑھنے کے لیے مل جاتے تھے۔ چنانچہ میں نے ایک دن میں چار چار ناول پڑھنے شروع کیے اور لگ بھگ اڑھائی تین مہینوں میں ابن صفی کی عمران سیریز اور جاسوسی دنیا ختم کر ڈالیں۔ یہی نہیں بلکہ اس کے بعد دوبارہ ہر ناول کرائے پر لیا گیا اور نئے سرے سے پڑھا گیا۔ چند مہینوں بعد اس لائبریری کی ایک نئی ''برانچ'' کھل گئی، مجھے شبہ ہے کہ وہ برانچ میرے کرائے کے پیسوں سے ہی کھولی گئی ہوگی۔ آج میری اپنی چھوٹی سی لائبریری میں ابن صفی کے تمام ناول کا سیٹ موجود ہے۔ جسے میں نہ جانے کتنی بار پڑھ چکا ہوں اور ہر بار یوں لگتا ہے جیسے پہلی مرتبہ پڑھ رہا ہوں۔ آپ مجھے ''حافظ'' ابن صفی بھی کہہ سکتے ہیں۔

ابن صفی کی تحریر کی بنیادی خوبصورتی اس کی کردار نگاری ہے، وہ دو سطروں میں کردار کا خلاصہ نکال کر رکھ دیتے ہیں۔ ان کا سب سے مقبول کردار علی عمران ہے جو بظاہر احمق نظر آتا ہے مگر حقیقتاً اس کے کئی روپ ہیں۔ علی عمران کا کردار دلچسپ ہونے کے ساتھ ساتھ پیچیدہ بھی ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہر ناول میں اس کردار کے چند ایسے پہلو سامنے آتے ہیں جو قاری کے لیے نئے ہوتے ہیں اس کردار کا تفصیلی احاطہ خود ابن صفی نے اپنے ایک شاہکار ناول ''ڈاکٹر دعاگو'' میں کیا اور بتایا کہ کیوں علی عمران کی شخصیت اس قدر غیر متوازن ہے اس کی اپنے باپ سے کیوں نہیں بنی۔ وہ ہر بات کو ہنسی میں کیوں اڑا دیتا ہے، اسے کرمنالوجی میں دلچسپی کیسے پیدا ہوئی اور وہ لندن سے یورپین اسٹائل کا قلندر بن کر کیسے لوٹا؟

ابن صفی کا دوسرا بڑا کردار کرنل فریدی ہے۔ ابن صفی کو عمران سے زیادہ فریدی سے پیار تھا کیونکہ جو رکھ رکھاؤ، خاندانی وقار رعب ودبدبہ امارت، طاقت اور پرسنالٹی فریدی کے حصے میں آئی، عمران ایک لحاظ سے اس سے محروم رہا۔ قارئین نے اس 'جانبداری' کا عملی مظاہرہ ان کے ناول ''زمین کے بادل'' میں دیکھا جس میں یہ دونوں کردار پہلی اور آخری بار یکجا ہوئے۔ ناول کے کلائمکس میں عمران کسی زہریلی گیس کے زیر اثر ناکارہ ہوجاتا ہے جبکہ فریدی سانس روکے رکھتا ہے۔ اور پھر بالاخرتن تنہا آٹھ آدمیوں کو زیر کرکے اپنے ساتھیوں کو دشمن سے صاف بچالے جاتا ہے۔ اس موقع پر عمران کی بے بسی قارئین کو ایک آنکھ نہیں بھائی اور انہوں نے ابن صفی کو

لاتعداد خطوط لکھ کر اپنے جذبات کا اظہار کیا جس کے جواب میں موصوف نے توبہ کرلی کہ آئندہ ان دونوں کرداروں کو اکٹھا کرکے کسی کی مٹی پلید نہیں کریں گے۔ اسی ناول کے پیش رس میں ابن صفی نے بتایا کہ ان کے تمام ناول اور کردار ان کے اپنے ہیں سوائے پہلے ناول ''دلیر مجرم'' کے جسے اور بھی کئی مغربی مصنفین نے اپنے اپنے انداز میں لکھا تاہم فریدی اور حمید ابن صفی کے اپنے کردار تھے، صرف پلاٹ باہر سے لیا گیا تھا۔ ابن صفی کی کل پانچ کہانیوں کے پلاٹ اور تین کرداروں کے علاوہ کوئی ایک کردار یا ناول ایسا نہیں جو اوریجنل نہ ہو۔ عمران سیریز کے تمام ناول اور کردار بے داغ ہیں اور ان میں کسی قسم کی کوئی ملاوٹ نہیں۔ سنگ ہی، تھریسیا، جوزف، جولیانا فٹنر، کیپٹن حمید، انور رشیدہ، استاد نرالے عالم، روشی، سر سلطان، ظفرالملک، جیمسن تنویر، سپرنٹنڈنٹ فیاض اور میرا پسندیدہ قاسم چند ایسے لازوال کردار ہیں جو ابن صفی کی تخلیقی جادوگری کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ ان کے ناولوں کے وہ کردار بھی قاری کی یادداشت سے چپک کررہ جاتے ہیں جو کسی ایک ناول میں ہی جلوہ گر ہوئے جیسے فراگ، علامہ دہشت ناک، ہمبک دی گریٹ، ایڈلاوا، بوغا، الفروزے اور خمیسو۔ یہ فہرست مزید طویل بھی ہوسکتی تھی کیونکہ ابن صفی اگر کسی راہ چلتے بندے کا بھی ذکر کرتے جس کا کام دو صفحوں کے بعد ختم ہوجاتا تو اس کی کردار نگاری بھی ایسے کرتے کہ بندہ عش عش کر اٹھے۔

ابن صفی کے ناول پڑھتے وقت ایک اور بات جو قاری کو مبہوت کردیتی ہے وہ ان کی منظر نگاری ہے۔ برازیل اور اٹلی کے ساحلوں اور افریقہ کے جنگلوں کا ذکر وہ یوں کرتے ہیں جیسے سالہا سال وہاں رہ چکے ہوں۔ مقامی لوگوں کی بولیوں، ان کے رہن سہن، بودوباش، اور رسم ورواج کا ایسا نقشہ کھینچتے ہیں کہ قاری اپنے آپ کو اسی مقام پر تصور کرکے گم ہوجاتا ہے۔ اور سب سے حیرت انگیز بات یہ ہے کہ ابن صفی نے ہندوستان سے پاکستان آنے کے بعد افریقہ اور یورپ تو کجا کبھی پاکستان سے باہر تک قدم نہیں رکھا۔ یہ تمام محیر العقول کہانیاں انہوں نے اپنے چھوٹے سے گھر کے کمرے میں ایک چارپائی پر بیٹھ کر تخلیق کیں۔ واضح رہے کہ جس زمانے میں یہ کہانیاں لکھی گئیں وہ انٹرنیٹ تو کیا فون کا دور بھی نہیں تھا۔ اب تو ایک بچہ بھی گوگل پر سرچ کرکے معلوم کرلیتا ہے کہ افریقہ میں کتنی قسموں کے سانپ پائے جاتے ہیں، ابن صفی کی ایک اور خصوصیت ان کی مزاح نگاری ہے۔ جس اعلیٰ پائے کا مزاح ہمیں ان کے ہاں ملتا ہے وہ کسی بھی جید، مستند اور باقاعدہ قسم

کے مزاح نگار سے کمتر درجے کا نہیں۔ ان کے ناول کے تو ''پیٹرس'' کا ہی جواب نہیں۔ ان کے کردار قاری کو بے ساختہ قہقہہ لگانے پر مجبور کر دیتے ہیں اور یہی فن مزاح نگاری کی معراج ہے۔ اس مختصر سے کالم میں ابن صفی کے فن کا احاطہ کرنا تو ممکن نہیں لہٰذا میں صرف ان کے ایک دو جملے یہاں نقل کر دیتا ہوں۔ ''بوغا' سیریز میں ایک جگہ لکھتے ہیں ''ڈیڈی ہمیں بالآخر آدمی مل گیا......! لڑکی نے خوش ہو کر کہا۔ ''بڑی دلچسپ اطلاع ہے۔'' ڈیڈی نے کتاب سے نظر ہٹائے بغیر کہا۔ ''حالانکہ مجھے سالہا سال سے تلاش تھی لیکن ایک بھی نہ مل سکا۔'' اسی طرح ان کا ایک جملہ ہے ''عمل اور ردعمل کا نام زندگی ہے۔ منطقی جواز تو بعد میں تلاش کیا جاتا ہے۔'' یہ چاولوں کی دیگ کے دو دانے بھی نہیں۔ میں کوئی نقاد نہیں جو ادب میں ابن صفی کے مقام کا تعین کر سکوں تاہم میں اتنا ضرور جانتا ہوں کہ ابن صفی کے مقام کا تعین کسی نقاد کے بس کا کام بھی نہیں کیونکہ بقول ابن صفی ''میری کتابیں لائبریریوں میں نہیں بلکہ بستر کے تکیے کے نیچے پائی جاتی ہیں۔ ابن صفی کو محض ایک جاسوسی ناول نگار کا لیبل لگا کر نظر انداز کر دینا اس کہنہ مشق ادیب کے ساتھ ''ادبی دہشت گردی'' ہے۔ ہمیں اس دہشت گردی کا نوٹس لینا چاہیے۔

نوٹ: ابن صفی کی سالگرہ اور برسی دونوں ماہ جولائی کے ایک ہی دن آتی ہیں' لہٰذا آج کا یہ کالم اس عظیم تخلیق کار کے نام!

(یاسر پیرزادہ ایک نامور صحافی اور اہل قلم ہیں اور وہ ایک خوب صورت صحافی اور مردِ قلم جناب عطاالحق قاسمی کے صاحب زادے ہیں روزنامہ جنگ میں ان کے اور اُن کے محترم والد کے کالم سرفہرست شائع ہوتے ہیں)

روزنامہ جنگ ۲۶ جولائی ۲۰۱۳ء

''ابن صفی کا تخلیقی افق 'چمکیلا غبار' کے حوالے سے''

رویدا ضمیر۔طالبہ۔جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

۱۴تا۱۶ دسمبر ۲۰۱۲ کو جامعہ ملیہ دہلی میں ابن صفی سیمنار میں پڑھا گیا

ایک زمانہ وہ تھا جب فلسفہ اپنے عروج پر تھا اچھے اور برے کی تمیز فلسفیانہ انداز سے کی جاتی تھی۔فلاسفہ طے کرتے تھے کہ سماج کے لیے کونسی چیز بہتر ہے اور کونسی مضر۔اس کے بعد مذہب نے ہمارے دروازے پر دستک دی اور تقریبا زندگی کے ہر شعبے کو متاثر کیا۔اب اچھے اور برے کا معیار مذہب نے طے کرنا شروع کر دیا اور سماج و معاشرہ ''آمنا و صدقنا'' کرتا رہا۔

آج جس دور میں ہم سانس لے رہے ہیں یہ سائنس اور ٹکنالوجی کا دور ہے۔اس دور میں صحیح اور غلط کا معیار سائنس و ٹکنالوجی طے کرتی ہے اور ہم مجبوراً اسے قبول کرنے پر آمادہ ہوتے ہیں۔اب چیز کے کئی معنیٰ نہیں رہ گئے ہیں کہ کیا ہونا چاہیے اور کیسا ہونا چاہیے۔اب صرف آپ کو ایسا ہی ہونا ہے جیسا سائنس چاہتی ہے۔حلانکہ ادب سائنس کی ضد ہے۔سائنس Fact کی بات کرتی ہے اور ادب Imigination کی۔کہانی ہوا میں وجود میں نہیں آتی۔ہمارے پاس بکھری ہوئی ہزاروں چیزیں ہمیں دعوت دیتی ہیں کہ ہم ان کا مشاہدہ کریں اور انہیں زبان عطا کریں۔ابن صفی کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے اس دور میں ایسے موضوع پر گفتگو کی جب مشرق اور خاص کر ہندوستان کا مسلم سماج اس سے بے بہرہ تھا۔

ابن صفی نے کم و بیش ۲۵۰ ناول لکھے ۱۵۹ اس میں سے خاص نمبر ہیں خاص نمبروں کے علاوہ بھی ابن صفی کے تمام ناول اپنی جگہ دلچسپ اور مکمل ہیں۔لہٰذا کسی ناول کو گفتگو کا موضوع بنانے کے لیے انتخاب کرنا میرے لیے ایک مشکل کام تھا۔میں نے کافی تگ و دو کے بعد ایک ناول ''چمکیلا غبار'' کا انتخاب کیا جو ۱۹۵۹ میں شائع ہوا تھا۔یہ ناول جاسوسی دنیا کا ۸۳واں ناول ہے۔یہ وہ دور ہے جب ابن صفی نے شاہکار ہی لکھے ہیں۔اس ناول کے بعد انہوں نے زمین کے بادل' بوغا سیریز' چاندنی کا غبار وغیرہ ناول لکھے۔جون ۱۹۶۰ تک ابن صفی جاسوسی دنیا کے ۸۸ (پرنس وحشی) اور عمران سیریز کے ۴۱ (بے آواز سیارہ) ناول لکھ چکے تھے۔ یہ دور ابن صفی کی تحریروں کا سنہرا دور ہے اسی کے بعد ان پر شیزوفرینیا بیماری کا حملہ ہوا جس میں ڈپریشن اور اختلاج بنیادی اثرات ہوتے ہیں۔ان کے بیٹے احمد صفی کے مطابق ''نیویارک کے ایک ماہر نفسیات نے بتایا کہ بہت سے تخلیق کار کے ذہن کی کارکردگی جب بہت بڑھ جاتی ہے اور وہ تیزی سے عمدہ تخلیقات کا ڈھیر لگا دیتے ہیں تو اچانک ان کا ذہن کام کرنا بند کر دیتا ہے۔کچھ یہی حال ابن صفی کے ساتھ ہوا۔۱۹۶۰ سے ۱۹۶۳ تک ان کا قلم خاموش رہا۔۱۹۶۳ میں ''ڈیڑھ متوالے'' جیسا خاص نمبر لکھا اور جاسوسی دنیا میں روح پھونک دی۔زیر بحث ''چمکیلا غبار'' ہے جس میں کئی سائنسی ایجادات کو پیش کیا گیا ہے۔جو جنگ کے دوران ایک

سائنس داں ڈاکٹر داؤد کے حوالے کر دیتا ہے اور اس سے استدعا کرتا ہے کہ بھلے انہیں تلف کر دینا لیکن مخالف قوت کے ہاتھ کبھی مت آنے دینا۔

ڈاکٹر داؤد ریاضی داں ہے وہ یہ تجربہ جو کچھ نامکمل سا تھا مکمل کرنے کے لیے ایک سائنسداں پروفیسر غوری کے حوالے کر دیتا ہے۔ دوسرے ممالک کو کسی طرح اس ایجاد کی بھنگ لگ جاتی ہے اور ۳ مختلف پارٹیاں اس غبار کو حاصل کرنے میں تگ ودو کرتی نظر آتی ہیں۔ ابن صفی نے اس ناول میں کئی نقطوں کو ابھارا ہے۔ کہانی کا پلاٹ بہت الجھاؤ لیے ہوا ہے جس میں کئی کہانیاں ایک ساتھ چلتی ہیں کہ قاری ایک سرے سے دوسرا سرا ملانے میں تذبذب کا شکار ہو جاتا ہے ناول میں سائنسی ایجاد یعنی بالکل نئی دریافت ''چمکیلا غبار'' ہے جس کی خوبی فریدی کی زبان میں۔ ''یہ ایجاد حقیقتاً حیرت انگیز ہے چمکیلے ذرات ایک مقناطیسی نظام کے گرد مخصوص فاصلے سے چکراتے رہتے ہیں۔ یہ فاصلہ گھٹایا یا بڑھایا بھی جا سکتا ہے مثال کے طور پر جو ذرات فنچ کے گرد چکراتے رہے تھے۔ یہی ایک طیارے کی حفاظت بھی کر سکتے ہیں۔'' اس غبار کے اوپر گولیاں، میزائل یا کوئی بھی ثقیل چیز اثر انداز نہیں ہوتی ہے۔ فنچ اس غبار کو حاصل کرنے کے بعد شہر میں بہت تباہیاں مچاتا ہے بینک لوٹنا، صرافوں سے سونا چھین لینا وغیرہ۔ اور کسی طرح ہاتھ بھی نہیں آتا ہے فنچ یوں بھی بہت پھرتیلا، جاپانی النسل، بمشکل ۳ فٹ کا ہے جو لمحوں میں یہ جا وہ جا، کہ فریدی جیسا Active بندہ بھی زچ ہو کر رہ جاتا ہے۔ اور یہ غبار فنچ اپنی چالاکی سے حاصل کرتا ہے۔ فنچ کا کردار پہلی بار زہریلے تیر 1957 میں نظر آتا ہے اس کے بعد کئی ناولوں میں آنے کے بعد کچھ دن تک غائب ہو جاتا ہے۔ پھر پراسرار طریقے سے اس ناول میں اس کی واپسی ہوتی ہے۔ ابن صفی نے اس ناول میں سائنس کی دنیا میں کئی نئے انکشافات کیے ہیں آج سے تقریباً پچاس برس قبل لکھا گیا یہ ناول سائنسی جہاں کی اس طرح سیر کراتا ہے گویا آج کی ترقی یافتہ سائنس و ٹکنالوجی کی دنیا میں ہو۔ آج کی دنیا میں انسان دن بدن ترقی کی منازلیں طے کرتا ہے سائنس میں نئے نئے انکشافات کرتا ہے اور بنی آدم کا کردار اتنی ہی پستیوں میں گرتا چلا جاتا ہے۔ ابن صفی نے اس ناول میں سکّے کے دوسرے پہلو پر روشنی ڈالی ہے کہ سائنسی ایجادات جہاں مفید ہیں تو اگر وہ غلط ہاتھوں میں پڑ جائیں تو مضر بھی ہیں۔ ناگاساکی اور ہیروشیما کی تباہی و بربادی ہماری آنکھوں کے سامنے ہے 9/11 کے واقعات بھی ہمارے ذہنوں سے ابھی محو نہیں ہوئے ہیں۔ کیا ان کے پیچھے سائنس کی کرم فرمائیاں نہیں ہیں وہی میزائل جو جنگی حالات میں کارآمد ہیں تو ان کا غلط استعمال مضر بھی ہے بلکہ جنگ مشرق میں ہو یا مغرب میں، نوع انسان کی جنگ ہے آخر اور خون دشمن کا ہو یا دوست کا بنی آدم کا خون ہے۔

بہر حال فنچ کی نموداری اس ناول میں پروفیسر غوری کی تجربہ گاہ میں ہوئی تھی۔ جو مصنوعی انڈے سے شتر مرغ کا بچہ برآمد کرنے کا دعویٰ کرتا ہے لیکن بدقسمتی سے انسان کا بچہ یعنی فنچ بہترین قسم کے میک اپ کے ساتھ برآمد ہو جاتا ہے کہ حمید، اور فریدی بھی پہلے پہچان نہیں پاتے ہیں۔ آخر میں فریدی کے ذہن میں آتا ہے کہ ہر سائنس ایجاد کا ایک توڑ ہوتا ہے۔ فنچ جس درخت کے نیچے کھڑا ہے اس پر شہد کا ایک چھتہ ہے فریدی اس

درخت پر پتھر چلا کر بھاگ لیتا ہے اور شہد کی مکھیاں فنچ کو لپٹ جاتی ہیں یوں فنچ پر قابو پایا جاتا ہے۔ ابن صفی کے سائنٹیفک ذہن کی داد دینی پڑے گی کہ انہوں اس ناول میں ایک ایسے نقطے کو اجاگر کیا ہے جو ابن صفی سے پہلے عالمی ادب میں صرف Russen ناول نگار Mikhail Bulgakov کے یہاں پایا جاتا ہے میخائل ۱۵ مئی ۱۸۹۱ میں رشن حکومت میں پیدا ہوا تھا۔ مشہور و مقبول رشن ناول نگار اور ڈرامہ نگار تھا اس کے زیادہ تر ناول سائنس فکشن ہوتے تھے جس میں وہ نئے نئے تجربات پیش کرتا تھا۔ 1940 میں میخائل کا انتقال ہوا۔ ابن صفی کا خلاقانہ ذہن بھی کچھ کم نہ تھا۔ بقول خالد جاوید۔

''ابن صفی کو رشن نہیں آتی تھی لہذا یہ قیاس کرنا کہ ابن صفی نے میخائل کے نظریہ سے استفادہ کیا ہے درست نہیں ہے۔ کیونکہ میخائل کے ناولوں کا انگریزی ترجمہ 1963 میں شائع ہوا۔''

اس ناول کی شروعات بہت ہی ڈرامائی انداز میں ہوتی ہے ڈاکٹر داؤد جو ملک کا مشہور ریاضی داں ہے۔ قتل ہو جاتا ہے مرتے وقت اس کی زبان پر الو' الو کی تکرار ہے اور مرنے سے پہلے اپنے خون میں انگلیاں ڈبو کر مثلث اور دائرہ بناتا ہے۔ حمید اس واقعہ کو سن کر کہتا ہے ممکن ہے ڈاکٹر داؤد نے اپنی زندگی میں کسی الو کو مثلث یا دائرہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہو۔ ریاضی داں ہی ٹھہرا واقعی ڈاکٹر داؤد کو ان دنوں خبط سوار ہو گیا تھا کہ وہ سرکلر ٹرینگل بنا سکتا ہے۔ سرکل اور ٹرینگل سے تو سب واقف ہیں لہذا وہ دائرہ مثلث کو ملا کر سرکلر ٹرینگل بنائے گا یعنی ایک نئی چیز حمید کا یہ جملہ ریاضی داں حضرات پر ایک طنز ہے کہ وہ زندگی بھر مثلث اور دائرہ بنانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں لیکن اصل دائرہ نہیں' انسان دائرہ نما تو لا سکتا ہے لیکن دائرہ نہیں۔ الو اور اقلیدس یعنی جیومیٹری کا الجھاؤ اس ناول میں مزید سپنس پیدا کرتا ہے۔ میجر والٹن جو ڈاکٹر داؤد کا قاتل ہے کی شکل الو سے بہت ملتی ہے لہذا فریدی کا خیال ہے کہ مرتے وقت اپنے قاتل کا نام نہ لے کر ڈاکٹر داؤد نے اس کی تصوراتی تشکیل بیان کی تھی۔ ابن صفی نفسیات کے ماہر تھے یہ ناول جہاں سائنس فکشن اور نئے نئے ایجادات کے باب وا کرتا ہے وہیں انسانی نفسیاتی گرہوں کے اسرار و رموز سے بھی واقف کراتا ہے ناول کے آخر میں راز کھلتا ہے کہ اصل سائنسداں مقدس غوری ہے جو زمین دوز تہہ خانے میں چمکیلے غبار کے تجربے کو مکمل کر رہا تھا اور فنچ اتفاقاً اس راز سے واقف ہو جاتا ہے لہذا وہاں سے چمکیلا غبار چوری کر کے شہر میں تباہیاں پھیلاتا ہے۔ جس پر بمشکل قابو پایا جاتا ہے۔ سائرہ پروفیسر غوری کی بیٹی ہے جو انجمن ترقی خواتین کی سکریٹری ہے یہ جان کر حمید کہتا ہے'' قاتل کے استفسار پر میجر والٹن تصوراتی تشکیل کی وجہ سے جب الو بن گیا تو پھر صوتی اعتبار سے سائرہ اور مقدس' ڈاکٹر داؤد کو دائرہ اور مثلث یاد دلا گئے تھے بالکل اسی طرح جیسے لفظ چقندر سن کر بندر کا خیال آتا ہے۔ نمرود کے نام پر زبان امرود کا ذائقہ محسوس کرنے لگتی ہے۔''

پروفیسر غوری کی بیٹی انجمن ترقی خواتین کی سکریٹری ہے اور قاسم اس انجمن میں یک مشت ۳ ہزار رقم مہیا کرتا ہے جس کی وجہ سے انجمن ترقی خواتین کے جلسے میں قاسم کو صدر بنایا جاتا ہے۔ خیال رہے ابن صفی نے اس دور میں لکھنا شروع کیا جب اردو میں عریانیت و جنسیت کی ہوڑ مچی ہوئی تھی اور نئے نئے رجحانات ادب

میں درآئے تھے بہت سی تحریکوں نے اپنے جھنڈے گاڑنے شروع کردئے تھے۔ ترقی پسند تحریک، سوشلزم، نیمزم، کیمونزم، فاشزم، وجودیت وغیرہ کے نعرے بلند کیے جارہے تھے ایسے وقت میں ابن صفی نے غیر جنسی رویوں کو اپنے ناولوں میں برتا ہے اوران کا یہ حربہ کامیاب بھی ہوا۔ ابن صفی نے اپنے ناولوں میں وقتاً فوقتاً ان تمام تحریکوں یا رجحانات کو موضوع گفتگو اور طنز کا نشانہ بنایا ہے سچ تو یہ ہے کہ ابن صفی کسی تحریک یا رجحان کے قائل نہیں تھے۔ بلکہ ان پر طعنہ کشی کی ہے اپنے ایک ناول ''پاگلوں کی انجمن'' کے پیش رس میں کہتے ہیں کہ ''میں معاشرے میں اللہ کی ڈکٹیٹرشپ چاہتا ہوں، تم انفرادی طور پر اپنی حالت سدھارتے جاؤ پھر دیکھو کتنی جلدی ایسا معاشرہ بن جاتا ہے جس پر اللہ کی حاکمیت ہو'' ''دھواں ہوئی دیوار'' کے پیش رس میں لکھتے ہیں۔

''میں تو اللہ کی ڈکٹیٹرشپ کا قائل ہوں اس میں اس کی گنجائش نہیں ہوتی کہ جتنے پگ کا نشہ ہوا ویسا ہی بیان داغ دیا آپ بھی کسی ازم وزم میں پڑنے کے بجائے اسلام کو سمجھنے کی کوشش کیجیے۔ سارے ازم محض وقتی حالات کی پیداوار ہیں اور کبھی ایک ازم کی دشواری کسی زمانے میں دوسرے ازم کی پیدائش کا سبب بنتی رہتی ہے۔''

ابن صفی نے ان مفکرین پر رمز وکنایہ میں ایسے فکر انگیز تبصرے کردئے ہیں جو مختصر ہونے کے باوجود متحیر کردینے والے ہیں ایجاز واختصار اور رعایت لفظی ابن صفی کی خوبی ہے۔ ناول ''چمکیلا غبار'' میں ابن صفی نے فیمنزم جیسے مسئلے کو چھیڑا ہے یہ بات بھی قابل غور ہے کہ خواتین کی ترقی کا رجحان ابن صفی سے تقریباً ایک صدی پہلے وجود پاچکا تھا یعنی ۱۹ صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے شروعات میں تقریباً ۱۹۱۰ میں۔ لیکن اس پر باقاعدہ تصنیفات نہیں موجود تھیں۔ ترنم ریاض کے مطابق۔

''میری وول اسٹون کرافٹ کی تصنیف "A Vindication of the right of womens" عورتوں کے مسائل پر لکھی گئی پہلی کتاب ہے جو 1972 میں شائع ہوئی یہ تصنیف مرد اور عورت کے مساوی حقوق پر اصرار کرتی ہے۔''

(اردو میں نسائی ادب کا منظر نامہ۔ مرتبہ قیصر جہاں، صفحہ ۷۵)

ناول ''چمکیلا غبار'' میں اسی رجحان پر روشنی ڈالی ہے جو ایک مجلس میں نظر آتا ہے۔ قاسم اس جلسے کا صدر ہے۔ اب قاسم کی صدارت کا منظر ملاحظہ ہو۔

جلسہ میں حمید مدعو ہے جو قاسم کی بیوی کو بھی لے کر جلسہ میں جاتا ہے قاسم کے جسم پر شیروانی ایسے منڈھی پڑی ہے جیسے کسی منارہ پر غلاف منڈھ دیا گیا ہو لوگوں کا ہنسی سے برا حال ہے قاسم خطبہ صدارت کے لیے آگے بڑھتا ہے مائک کا اسٹینڈ اس نے اس انداز میں پکڑ رکھا تھا جیسے اسے چبا ہی جائے گا پھر بہ مشکل تمام اس کے حلق سے آواز نکلی

''خواتین وخواتان!

''ہیر ہیر مجمع نے تالیاں پیٹیں۔

غالباً قاسم اس وقت خود شناس بننے کی کوشش کررہا تھا اس لیے اور زیادہ بوکھلاہٹیں سرزد ہورہی تھیں ''خواتین

وخواتان'' غالباً اسے غلط معلوم ہوا تھا لہٰذا دوسری بار اس نے حاضرین وحاضرات کی ہانک لگائی۔ قہقہوں سے پنڈال اڑا جا رہا تھا۔ قاسم نے نروس ہوکر بولنا شروع کر دیا۔ جی ہاں میں صدر بننے کے لائک نہیں تھا آپ کی مہربانی ہے کہ آپ نے مجھے صدر بنا دیا۔ الاقسم میں بالکل...... بالکل...... الو کا پٹھا...... ارے باپ رے ...... اس نے دونوں ہاتھوں سے منھ دبا لیا پھر بہت زور سے بولنے لگا۔ اجی تین ہزار کیا آپ پر تو تین لاخ نثار ہیں۔ الاقسم اتنا جی چاہتا ہے کہ خواتین ترقی کریں۔ جی ہاں...... آپ لوگ کرکٹ بھی کھیلا کیجیے۔ بڑی جان آتی ہے بدن میں اور قیا قہوں...... میں اب خوب جی کھول کر چندہ دوں گا۔ ٹھینگے سے کوئی کچھ کہا کرے۔''

خرم علی شفیق اپنی کتاب سائکومینشن میں ابن صفی کے ناول ''چمکیلا غبار'' میں خواتین کی ترقی کے تعلق سے لکھتے ہیں۔

''برصغیر کے اسلامی معاشرے اور اس سے جنم لینے والے پاکستانی معاشرے میں خواتین کی حیثیت کو بتدریج تبدیل کرنے میں دو قسم کے رجحانات کارفرما رہے ہیں ان میں سے ایک رجحان کے نمایندے سر سید احمد خاں، علی برادران، علامہ اقبال اور ان کے ہم خیال افراد میں ان لوگوں کے خیال میں خواتین کی ترقی ایک مسلسل عمل تھا جسے ملت کی اجتماعی ضروریات کی روشنی میں سمجھا جا سکتا تھا۔ ابن صفی کا تعلق بنیادی طور پر اسی فکری دھارے سے تھا اور طنز و مزاح کے پیرائے میں اس نقطہ نظر کی نمائندگی شاید جاسوسی دنیا کا ۸۳ ویں ناول چمکیلا غبار ۱۹۵۹ کے مندرجہ ذیل اقتباس سے بہتر کہیں اور نہیں ہوتی ہے۔''

ابن صفی کا ۱۹۵۹ میں لکھا گیا یہ ناول جس میں انجمن ترقی خواتین کے ذریعے سے عورتوں کی فلاح و بہبود پر روشنی ڈالی گئی ہے بلکہ قاسم جیسے گرانڈیل قسم کے احمق سے ایسی باتیں کہلائی ہیں جو اول درجے کی بیوقوفانہ گفتگو ہے۔ ابن صفی نے قاسم سے خطبہ صدارت دلا کر اس کمزور انجمن کا مذاق اڑایا ہے کہ یہ ایسی ہی انجمن ہے کہ قاسم بھی اس کا صدر بن سکتا ہے۔ قاسم کے منہ سے یہ کہلانا کہ آپ لوگ کرکٹ بھی کھیلا کیجیے عورتوں کی ترقی کی تفریحی توسیع ہے۔ قاسم کے ذریعے سے خواتین کی ترقی پر خطبہ، خواتین کی ترقی پر ایک دھیما احتجاج بھی ہے۔ قارئین جانتے ہیں کہ ابن صفی مغربیت کے قائل نہیں تھے۔ مغربی تہذیب پر انھوں نے جا بجا طنز کئے ہیں مغربیت کی دوڑ میں عریانیت عام ہوگئی ہے اور یہ عریانیت ہی ابن صفی کو ناگوار گذرتی تھی۔ ابن صفی نے اپنے بہت سے ناولوں میں مغربی تہذیب اور عریانیت کے اپنانے پر پھبتیاں کسی ہیں۔ ابن صفی جس زمانے میں لکھ رہے ہیں۔ اس وقت دو رجحان خواتین کی ترقی کے لیے عام تھے پہلا رجحان تو وہ جس کا ذکر خرم علی شفیق کی زبان میں کیا جا چکا ہے۔ دوسرا وہ جو مغربی طرز تکلم سے متاثر تھا اور کسی حد تک فیمنزم کی نمائندگی کر رہا تھا ان افکار کو فروغ دینے میں مولوی ممتاز علی اور ان کے فرزند امتیاز علی تاج اور دوسرے بہت سے اکابرین شامل تھے۔ اردو شاعری میں مجاز پہلے شخص ہیں جنھوں نے اپنی نظم ''نوجوان خاتون سے'' 1937 میں لکھی جس میں مجاز نے عورتوں کو حجاب اور اپنے آنچل کو پرچم بنانے کا مشورہ دیا اور فیمنزم کی روایت کو آگے بڑھایا۔

حجاب فتنہ پرور اب اٹھالیتی تو اچھا تھا

خود اپنے حسن کو پردہ بنا لیتی تو اچھا تھا
تیری نیچی نظر خود تیری عصمت کی محافظ ہے
تو اس نشتر کی تیزی آزما لیتی تو اچھا تھا
ترے ماتھے پہ یہ آنچل بہت ہی خوب ہے لیکن
تو اس آنچل سے اک پرچم بنالیتی تو اچھا تھا

آہنگ۔108-107

مجاز کی یہ نظم اسی دوسرے رجحان کی تلقین کرتی نظر آتی ہے ہندوستان میں خواتین کی ترقی کا نظریہ تیزی سے پنپ رہا تھا بہت سے ادیبوں نے اس رجحان کو اپنی شاعری ونثر کا موضوع بنایا اور تانیثیت مقبول ترین موضوع بن گیا۔لیکن اس ترقی کی دوڑ میں علامہ اقبال کے اس اقتباس کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا جو 1910 میں انہوں نے اپنی ڈائری میں لکھا تھا۔اس کا ترجمہ یوں ہے۔

''ہمارے نوجوان مبلغ سمجھتے ہیں کہ مغربی طرز پر تعلیم کی چند خوراکیں مردہ مسلمان عورت کو دوبارہ زندہ کر کے اسے کفن پھاڑنے پر آمادہ کردے گی۔شاید یہ درست ہے لیکن مجھے یہ اندیشہ ہے کہ اپنے آپ کو برہنہ پاکر اسے ایک دفعہ پھر اپنا جسم ان نوجوان مبلغوں کی نگاہوں سے چھپانا پڑے گا۔''

ابن صفی کے ناول ''چمکیلا غبار'' میں اٹھائے گئے نقطے کو اقبال کے قول کی روشنی میں دیکھا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ ابن صفی کو بھی ان تبدیلیوں کا احساس تھا جو سماج میں ہو رہی تھیں یا ہونے والی تھیں یہ سچ ہے کہ ابن صفی کے ناولوں میں مستقبل کے متعلق بہت سی پیشین گوئیاں پائی جاتی ہیں اور ان مسائل کی صرف نشاندہی ہی نہیں بلکہ ان کے حل بھی پیش کئے گئے ہیں اور یہ وہ فن ہے جو کسی بھی ادیب کو عظیم بنانے کے لیے کافی ہوتا ہے۔

ابن صفی اپنے ناول ''ستاروں کی چیخیں'' کے پیش رس میں لکھتے ہیں۔

''سماجی قدریں تیزی سے بدل رہی ہیں آج سے پندرہ بیس سال پہلے شرافت کا جو معیار تھا اسے آج ہلاکت زدگی اور جہالت سے تعبیر کیا جاتا ہے مثال کے طور پر ''پردہ'' کو لیجئے۔ پہلے یہ شرافت اور عالی نسلی کی پہچان تھی آج پردہ نشین خواتین کو یا تو نچلے طبقے سے متعلق سمجھا جاتا ہے یا جاہل''

راشد اشرف کے الفاظ میں۔

''فکری اعتبار سے ابن صفی کے ناولوں نے اپنے قاری کو معاشرتی برائیوں کے خلاف صف آرا ہونے کا سلیقہ سکھایا ہے۔''

ابن صفی کے جملوں کی برجستگی کی مثال پورے اردو ادب میں ملنا مشکل ہے ان کے ہر جملے پر حوالے یا مثال کا گمان ہوتا ہے جس میں حد درجہ تنوع پایا جاتا ہے اور یہ کمال احمد کمال جیسے لافانی کردار کے خالق کے علاوہ اور کسی کو حاصل نہیں ہوا اسی ناول سے چند مثالیں ملاحظہ ہو۔

لڑکی ...... نہ میں سمجھا سکتی ہوں اور نہ تم سمجھو گے۔ لہٰذا ہمیں دوسری باتیں کرنی چاہئیں مثلاً خرابی صحت کی باتیں، بڑھتی ہوئی گرانی کی باتیں، اگر تھوڑی بہت سوجھ بوجھ نہ بھی رکھتے ہو تو انٹرنیشنل پولیٹکس کی باتوں میں بھی کوئی مضائقہ نہیں۔

حمید مضائقہ تو اس میں بھی نہ ہوگا اگر میں تمھارا گلا گھونٹ دوں!

دوسری مثال۔

قاسم غصے میں آ کر حمید سے کہتا ہے ''وہ خط ابا جان کے پاس قیسے پہنچا جس میں لکھوایا تھا نور چشمی جان بہار سلمہا السلام علیکم۔ فریدی ہنس پڑتا ہے۔ ''قاسم ہے نہ بے وقوفی کی باتیں''۔ جب میں نے کہا تھا نور چشمی قیوں..... تو پھر مایا تھا ممکن ہے چشمہ لگاتی ہو۔

ایک اور مثال۔

اپنی گاڑی میں اچانک لڑکی کی آواز سن کر حمید کے ہاتھ اسٹرینگ پر کانپ کر رہ جاتے ہیں مگر جلد ہی اپنی آواز پر قابو پا کر پرسکون لہجے میں کہتا ہے۔

ویسے میری گاڑی پہلے بھی کئی بار لڑکیاں جن چکی ہے!'' اوہ تب تو آپ ایک تجربہ کار مڈوائف بن چکے ہونگے ''مڈہزبینڈ''۔ حمید نے ٹھنڈی سانس لیکر کہا۔

یہ مکالمہ اور مڈہزبینڈ ایسا متبادل ہے کہ قاری بے اختیار قہقہہ لگانے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ ایک اور مثال۔

''موت سے ڈرتے ہو'' فریدی مسکرایا

''شادی سے پہلے یقیناً ڈرتا ہو۔ پھر شادی کے بعد بھلا موت کہاں آتی ہے۔''

ان مثالوں میں طنز وظرافت کی چاشنی سموئی ہوئی ہے کہ قاری بے اختیار سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

ابن صفی نے اپنی تخلیقات کے ذریعے اپنی زندگی میں ہی تین نسلوں کو متاثر کیا ہے۔ ان کا انداز تحریر و تکلم نرالا ہے جس کی دھڑکن ان کے قارئین کے دلوں میں سنی جا سکتی ہے۔ ابن صفی کے ناول نہ صرف سراغ رسانی کی بہترین مثالیں ہیں بلکہ اپنے اندر بیک وقت ادب، ماحول، سائنس، تاریخ، جغرافیہ اور جیومیٹری کی حقیقتیں اور قدریں بھی متوازی انداز سے سموئے ہوئے ہیں۔ کہ وہ ناول مصنف کی تخلیقی رعنائیوں کے ساتھ ادب اور زندگی کا صحیفہ نظر آتے ہیں۔ ان کے ناولوں میں جذباتی ونفسیاتی ہم آہنگی حد درجہ پائی جاتی ہے جو ان کے ناولوں کی جمالیات ہے۔ اور ان کے قاری کو بور ہونے سے بچا لیتی ہے۔

ابن صفی کے خلاقانہ ذہن کو سلام

ابن صفی کے ناول۔ میرا شوق' میرا جنون

ڈاکٹر سیّد احمد قادری' نیو کریم گنج' گیا (بہار)

ابن صفی ایک ایسا نام ہے' جسے بچپن سے سُنا اور پڑھا اور آج تک بُھلا نہیں پایا۔ ابن صفی اور ان کے ناولوں کو ہمارے نقاد اردو ادب میں کوئی مقام دینے کو تیار نہیں ہیں' لیکن میرا دعویٰ ہے کہ مقام نہیں دینے کے باوجود ابن صفی نے اپنے ناولوں کے حوالے سے اردو ادب میں اتنا اہم مستحکم اور اعلیٰ مقام بنا لیا ہے جو اردو ادب میں اچھے اچھوں کو نصیب نہیں ہے۔

ابن صفی کی تحریر میں وہ نشہ تھا جو بہت سارے افسانے' ناول اور اشعار کو یکجا کرنے کے بعد بھی نہیں ملا۔ کیا جادو تھا کہ جس نے بھی ایک بار ابن صفی کو پڑھ لیا وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس کی تحریر کے سحر میں کھو گیا اور نشہ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اِسے جتنا پیا جائے' اس کی طلب بڑھتی جاتی ہے اور یہی خوبی تھی' ابن صفی کی تحریروں کی' کہ ایک ناول پڑھ کر ختم کیا اور فوراً' دوسرے ناول کی طلب ہوتی' پوری پوری رات بجلی نہیں رہنے پر لالٹین کی روشنی میں ابن صفی کا ناول پڑھتا اور نیند کوسوں دور بھاگ جاتی۔

ابن صفی کے ناولوں کو پڑھنا' میرا جنون تھا' اور یہ جنون میرے اندر کس طرح پیدا ہوا' اس کا دلچسپ واقعہ میں نے عرصہ قبل یعنی ۱۹۸۵ء میں شائع ہونے والے اپنے پہلے افسانوی مجموعہ ''ریزہ ریزہ خواب'' میں اس طرح بیان کیا ہے۔

''ان ہی دنوں میری باجی کو کہانیوں کا شوق پیدا ہوا اور وہ ابّا جان سے بچوں کا رسالہ ''کھلونا'' منگانے لگیں۔ باجی کا رعب ایسا غالب تھا کہ میں ان سے ''کھلونا'' لے کر پڑھ نہیں سکتا تھا۔ اسی لئے میں ان کے سونے کا انتظار کرتا رہتا اور جب وہ سو جاتیں تو میں چپکے سے ان کے سرہانے سے کھلونا' اٹھاتا اور پڑھتا۔ اسی طرح گرمی کی ایک دوپہر کو بھی میں ''کھلونا'' لے کر پڑھ رہا تھا کہ اتنے میں ان کی نیند ٹوٹ گئی اور وہ مجھ سے کھلونا مانگنے لگیں' اس وقت میں ایک کہانی میں منہمک تھا' میں نے کہا' میں ذرا یہ کہانی پڑھ لوں تو دیتا ہوں' لیکن وہ واپس لینے کو بضد ہو گئیں' نتیجہ میں ہم دونوں میں لڑائی ہو گئی' لڑائی کیا ہوئی' باجی نے اپنی عادت کے مطابق میری پٹائی کر دی۔ میں رونے لگا۔ بات ابّا تک پہنچی' انھوں نے باجی کو ڈانٹ پلائی اور مجھے چپ کرانے اور بہلانے کے خیال سے اپنے بُک شلف سے ابن صفی کے دو ناول دئیے اور کہا' ''لو تم انھیں پڑھو۔''

ظاہر ہے اس عمر میں یہ کتابیں میرے پلّے کیا پڑتیں' لیکن میں نے باجی کو مرعوب کرنے کے لئے کہ دیکھو میں ایسی کتابیں پڑھ رہا ہوں' جو ابّا پڑھتے ہیں۔ پڑھنا شروع کیا' پڑھنا کیا شروع کیا' بلکہ یوں کہا جائے تو بہتر ہوگا کہ ورق گردانی شروع کی اور اس ورق گردانی میں کبھی کبھار دو چار ورق پڑھ بھی لیتا' اور انھیں دو چار

اوراق نے گویا مجھ پر جادو کر دیا۔

قاسم کی غوں غاں، اس کی حماقتیں، عمران کا کھلنڈرا پن، اس کی بے حد دلچسپ اور ہنستے ہنستے پیٹ میں بل پڑ جانے والی باتیں، حمید کا اسمارٹنس، اس کی حرکتوں پر کرنل فریدی کی ڈانٹ پھٹکار، رشیدہ اور انور کی نوک جھوک...... ابتداء میں یہ سب مجھے بڑا اچھا لگا...... ان کرداروں سے میری اتنی زیادہ دلچسپی بڑھ گئی کہ میں نے پورا ناول پڑھنا شروع کر دیا، باتیں کچھ سمجھ میں آتیں اور کچھ سر کے اوپر سے گزر جاتیں، لیکن دلچسپی میں کمی نہیں آئی، بلکہ بڑھتی چلی گئی اور دھیرے دھیرے مجھے کرنل فریدی کی آہنی اور مقناطیسی شخصیت میں دلچسپی پیدا ہونے لگی۔ اس کی شخصیت نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا۔ اس کی بے پناہ صلاحیتیں، اس کی ذہانت، اس کا علم، اس کا وقار، اس کی دوستی، اس کی دشمنی...... ان ساری خوبیوں نے مجھے کرنل فریدی کا فین بنا دیا اور شعوری و لاشعوری طور پر میں خود کو اس کی شخصیت میں ڈھالنے لگا۔ اس کے نئے نئے کیس ابا جان کے خوف سے نصابی کتابوں میں چھپا چھپا کر پڑھتا اور سوچا کرتا کہ میں بھی بڑا ہو کر کرنل فریدی بنوں گا اور ملک و قوم اور سوسائٹی کے کوڑھ کو ان کے کیفر کردار تک پہونچاؤں گا۔ لیکن ناول کی دنیا اور حقیقی دنیا میں بڑا فرق ہوتا ہے...... یہاں ہر شخص کئی چہرے رکھتا ہے، کبھی کچھ اور کبھی کچھ، جو نہیں رکھتے وہ مجبور ہو کر رکھنے لگتے ہیں اور جو مجبور ہو کر بھی نہیں رکھتے، ان کی قسمت میں دکھ، مصیبتیں در در کی ٹھوکریں ہوتی ہیں۔ شروع میں، میں نے ایسے کئی چہرے دیکھے تو مجھے حیرت ہوئی، بہت افسوس ہوا اور پھر میں عادی ہوتا گیا۔ میرے اندر کا کرنل فریدی آہستہ آہستہ مرتا چلا گیا۔"

ابن صفی نے ہزاروں، لاکھوں قارئین کو جھوٹ، فریب، دھوکہ، استحصال، ظلم، تشدد، جبر، اذیت، انتشار، افراتفری، درد و کرب، گھٹن، مایوسی اور بدعنوانیوں سے نبرد آزما ہونے کا حوصلہ دیا ہے۔ زندگی کی بہت ساری سچائیوں اور تلخ حقیقتوں سے روشناس کرایا ہے، اتنی روشناسی اور حوصلہ دینے والا کردار میرے خیال میں اب تک اردو ادب میں کوئی پیدا نہیں ہوا ہے۔

میں اس بات کا بھی اعتراف کرتا ہوں کہ میں سائنس کا طالب علم رہا ہوں اور آج جس حد تک اردو زبان کو میں جان سکا ہوں اور سمجھ سکا ہوں وہ ابن صفی کی دین ہے۔ ایسی خوبصورت اور سادہ زبان وہ استعمال کرتے تھے کہ بہ آسانی سمجھ میں آجائے اور جس کی سمجھ میں آجائے وہ اس زبان کی سحر میں کھو جاتا۔

ابن صفی کو اس دار فانی سے کوچ کیے کئی دہائی گزر چکی ہے، لیکن اب تک کوئی دوسرا ابن صفی تو کیا اس کا نعم البدل پیدا نہیں ہو سکا۔ ایسا لگتا ہے کہ ابن صفی جن خصوصیات کا خزانہ لے کر پیدا ہوئے تھے وہ اپنے ساتھ لے گئے۔ ورنہ کوئی وجہ نہیں کہ جاسوسی دنیا، آج اتنے سارے وسائل ہونے کے باوجود اپنا وجود قائم نہیں رکھ سکا۔ یہ ابن صفی کے علم و فن کا ہی کمال تھا کہ اردو کے ساتھ ساتھ ہندی زبان میں بھی کوئی ابن صفی نظر نہیں آتا اور لوگ آج بھی کرنل ونود کو ڈھونڈتے ہیں۔ ابن صفی نے جتنے جیتے جاگتے کردار پیدا کر دیئے، ویسے کردار اتنے برسوں بعد بھی سامنے نہیں آسکے۔ ابن صفی اردو زبان و ادب میں ہمیشہ ہمیشہ زندہ رہینگے، اس کا مجھے یقین ہے۔

ابن صفی کے کردار

عمران عاکف خان۔ بھرت پور (راجستھان)

جب فلک برسوں پھرتا اور سرگرداں رہا تب کہیں جا کے خاک کے پردے سے کچھ ایسے انسان نکلے جنھوں نے یوم ورود سے یوم رخصت تک ایسے لاجواب کارنامے انجام دیے جن کے دم سے گلشن مہک رہے ہیں۔ پھولوں کی خوشبوئیں ان کے آگے ماند پڑ گئیں، سورج کی تمازت نے انھیں سلام کیے اور چاند کی رونق ان کے سامنے پھیکی پڑتی چلی گئی۔ افلاک و ارضین ان کے دم سے رشک جنت بن گئے۔ وہ ایسے تھے جنھوں نے زمین پر انمٹ نقوش چھوڑے اور آسمانوں پر زندہ کارنامے رقم کیے۔

ایسے ہی انہانوں میں سے ایک انسان (اسرار احمد اسرار ناروی) ابن صفی: آمد (۱۹۲۸) رخصت: (۱۹۸۰) کا نام اردو تاریخ کا ایک ایسا نام ہے جس کی مثال دور دور تک نہیں ملتی۔ وہ اپنے سلسلے کے خود ہی بانی اور خود ہی خاتم تھے۔ نہ جانے قدرت نے انھیں کہاں سے اتنی صلاحتیں ودیعت کر دی تھیں کہ وہ ایک ہی نشست میں قاری کو سارے عالم کی سیر کرا دیتے تھے۔ سمندروں، بلند و بالا پہاڑوں، سائنسی آلات، مشینوں، تخریب کار انسانوں، تیسری دنیا کی شرارتوں، زمیندار اور خاندانی رؤسا کی بربادیوں، بلیک میل کرنے والوں کو ان کے مفید و مضر اثرات سے واقف کراتے تھے۔ نہ صرف یہ بلکہ اپنے جاندار، فکرمند، قوم، ملت اور ملک کے ہمدرد، ملک پر منڈلاتے خطروں سے لڑ جانے والے کرداروں کی بدولت اپنے سحر میں جکڑ لیتے تھے۔ زندہ کرداروں کے خالق انھیں شاید اسی لیے کہا گیا ہے اور یہ حقیقت بھی ہے ان کے کردار ہمارے ہی ہم نفس اور ہم نوا ہیں۔ انھیں دنیاوی انسانوں سے بلا تفریق رنگ و نسل، زبان و بیان، ملکی و غیر ملکی ہر ایک سے انسانیت کی بنیاد پر ہمدردی ہے۔ انھیں شہر کا ماحول خراب کرنے والوں اور انسانوں کے قتل کرنے والوں سے اتنی نفرت ہے جس کی انتہا نہیں۔ یہی نہیں بلکہ ان کے اندر جسارت، شجاعت، ہمت، حوصلہ مندی، دیانت، امانت، انسانیت، ہوش مندی، عفت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ انھیں خبر ملتی کہ تارجام کی پہاڑیوں میں ملک کی تباہی کا خفیہ مشن بنایا جا رہا ہے۔ روزانہ رات کو ایک روشنی کا مینار سا اٹھتا ہے..... بس فریدی اور اس کی ٹیم اس کا راز جاننے کے لیے کمربستہ ہو جاتی ہے۔ ایکس ٹو کو اطلاع ملتی ہے کہ سنگ ہی ٹپ ٹاپ نائٹ کلب میں ہیرا پھیری میں مصروف ہے تو ایکس ٹو (بشکل عمران) اپنی پوری ٹیم سمیت میدان میں نظر آتا ہے اور اس کی حماقتیں عروج کی منزلوں سے پار ہو جاتی ہیں۔ صفدر، خاور، جولیا، صدیقی اور نعمانی (ناچاقی کے باوجود) سرفروشی کے لیے تیار نظر آتے ہیں۔

ابن صفی کے کرداروں کے سربراہوں (عمران۔ فریدی) کی خطرات کی بو سونگھنا۔ حالات سے باخبر رہنا اور دشمن کے وار سے ہوشیار رہنا نیز اپنے ماتحتوں پر حدود میں رہتے ہوئے شاہ خرچی، مساوات اور ان کی بک بک، جھک جھک اور لاکھ سمجھانے کے باوجود بھی اپنی حرکتوں سے باز نہ آنے پر شفقت، بھی ایک نادر و نایاب مثال ہے۔ فریدی نواب خاندان سے تعلق رکھتا ہے مگر حمید پر اس کی شفقتوں، نوازشوں، عنایتوں اور عطاؤں کی ایک طویل

فہرست ہے۔ فریدی حمید کو اپنے بھائیوں سے بڑھ کر مانتا ہے۔ بار ہا ایسا ہوتا ہے کہ وہ حمید کی شرارتوں سے تنگ آ کر اسے گھر سے نکل جانے کی دھمکی دیتا ہے' مگر حمید اسے ہنس کر ٹال دیتا ہے۔ اور اگر کبھی حکم کی تعمیل کرنے کے لیے اٹھنے کی کوشش بھی کرتا ہے تو فریدی اپنی مصروفیتیں چھوڑ کر اسے گلے سے لگالیتا ہے۔ ''ارے بیٹے خاں' کیا ناراض ہو گئے' ابھی لونڈے ہو' بڑوں کی باتوں کا برا نہیں مانتے' چل بیٹھ تھوڑی دیر بعد لکھنؤ چلنا ہے وہاں آج قدیم افریقی رقاص اپنے فن کا مظاہرہ کرنے والے ہیں۔ تمہیں اجازت ہے کھل کر رقص کرنا اور نعیمہ بھی وہیں موجود ہو گی ......'' اور حمید کی باچھیں کھل جاتی۔ تھوڑی دیر پہلے کی خفگی بھک سے ہوا میں اڑ جاتی۔ ایسا نہیں تھا کہ حمید ہمیشہ شرارتیں ہی کرتا رہتا تھا اور بالکل ناکارہ انسان تھا' حقیقت یہ ہے کہ کبھی کبھی تو وہ فریدی سے دو قدم آگے نکل جاتا تھا۔ خطرات کے وقت میں فریدی کا سایہ بنا رہتا تھا اور اس کی آرزو ہوتی تھی کہ چیف کی جانب آنے والی ہر گولی پہلے اس کے سینے کو چھلنی کرے۔ دو چار مواقع تو ایسے بھی آئے کہ حمید کی بدولت ہی فریدی کو زندگی ملی۔ یہی وجہ تھی کہ فریدی اسے اس کی تمام تر نا اہلیوں' شرارتوں' بچکانہ حرکات اور مسخرے پن سمیت جاں عزیز سمجھتا تھا۔

دوسری جانب عمران کا بھی یہی عالم تھا۔ بسا اوقات سلیمان اسے الو بنا دیتا تھا۔ عمران کے قیمتی کپڑے' ٹائی' سوٹ یہاں تک کہ جوتے تک وہ استعمال کر لیتا تھا۔ ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ عمران اپنا جاپانی سوٹ تلاش کر رہا ہے' جوزف پہلے ہی لاعلمی کا اظہار کر چکا ہے۔ اب باری سلیمان کی ہے مگر وہ نہیں بتاتا' بیچ میں گل رخ کود پڑتی ہے۔ ''صاحب جی! کل سلیمان آپ کو وہ سوٹ پہن کر بازار میں گھوم رہا تھا' مجھ سے کہا تھا بتانا مت ورنہ......'' ''ارے کہاں ہے وہ کم بخت' آج بھی اس نے ناشتے میں وہی دال پکائی ہے.....'' عمران کا مصنوعی غصہ گویا فلیٹ کی فضا کو پھاڑنے لگتا تو دوسری طرف سے سلیمان بسورتا ہوا آتا۔ ''میں کیا کرتا اس کالے سے کہا تھا' جا بازار چلا جا مگر اس نے کہا مجھے افریقہ کی ناگن ڈس لے گی' منحوس کہیں کا گیا نہیں....'' ''باس یہ کیا بولتا' میں اس کو ماڈالوں گا....'' جوزف نیم اردو میں بھڑکتا اور عمران اپنا سر پیٹ کر رہ جاتا۔ ''تم دونوں کی وجہ سے میں کسی دن خود کشی کر لوں گا....'' بس اتنا ہی کہہ پاتا کہ فیاض کا فون آ جاتا اور عمران دوڑ پڑتا۔ فیاض کو جیسے تیسے رام کرتا تو مخصوص کمرے کے سگنل اسے اندر سے ہلا دیتے اور عمران ایکس ٹو بن کر اپنے ماتحتوں کو ہدایات دیتا۔ باہر آ کر پھر وہی پیٹ کی دہائی' مگر سلیمان آج کل شہزادہ بن گیا ہے لہٰذا عمران باہر ہی زہر ماری کرتا ہے اور پھر'' کار جہاں دراز ہے اب میرا انتظار کر.....'' کی رٹ لگاتا ملک دشمن عناصر سے مقابلہ کرنے چل پڑتا۔

ابن صفی کے کردار اتنے اعلا اور بلند مقامات پر فائز ہونے کے باوجود بھی اپنے متعلقین' دوست احباب' اقربا اور اپنے اہل خانہ کے دوستوں کو نہیں بھولتے' بلکہ اگر کہیں سر راہ بھی ان سے ملاقات ہو جائے تو انھیں چائے پانی کے بغیر جانے نہیں دیتے۔ اگر کبھی وہ رات میں اس وقت یاد کریں جب عمران یا فریدی کیسوں کو سلجھانے میں مصروف ہوں' سب چھوڑ چھاڑ کر دوڑے چلے آتے ہیں۔ اسے انسانیت کی معراج کہا جاتا ہے جس کا ان دنوں بہت تیزی سے فقدان ہوتا جا رہا ہے۔

ان زندہ جاوید کرداروں کی ایک عظیم خوبی اور بھی تھی جس نے بڑے بڑے انسانیت کے دعویداروں کو حیران کر دیا ہے۔ وہ عیش طرب اور نشاط کے مقامات پر' جہاں خوش پوش جوڑے دنیا جہان کی نعمتوں سے لطف اندوز

ہوتے ہیں' فائیو اسٹار بلکہ آٹھ ستارہ ہوٹلوں میں جہاں شراب اور منشیات کی ریل پیل ہوتی ہے۔ رقص گاہوں میں جہاں اعلا طبقے کے لوگ مدہوش ہو کر ٹھمکے لگاتے ہیں ان مقامات پر یہ عفیف' دوشیزاؤں سے زیادہ شرمیلے وہ شراب جیسی ام الخبائث سے بچتے ہوئے صرف ٹھنڈے پانی پر اکتفا کرنے والے اور رقاصوں کا نظارہ ہی کر تے ہیں' پھر جوں ہی انھیں مجرم کے باہر نکلنے کا احساس ہوتا ہے کھانا تک چھوڑ کر اس کا تعاقب کرنے لگتے ہیں ۔ان کے قدم نہ طوفانی رات روکتی ہے اور نہ ہی سنگینیوں کی باڑھ' نہ انھیں آگے جانے والی گاڑیوں سے پھینکے گئے گرینڈ مرعوب کرتے ہیں اور نہ ہی پہاڑوں کی بلندیاں کے ان کے پیر جکڑتی ہیں ۔ان کے عزائم کے آگے مافوق الفطرت عناصر بھی نہیں ٹھیرتے ۔شاہی نقارہ میں فریب کار ایک ہیروں کے تخت کے لیے کس طرح کی فریب کاری کرتے ہیں اور گاؤں والوں کو گڑھی سے دور رکھنے کے لیے سازش اعظم رچاتے ہیں مگر فریدی اور حمید اس راز کا پردہ فاش کر کے ہی دم لیتے ہیں اور مجرم کو زمین کی سات تہوں سے نکال لاتے ہیں۔

سر سلطان' رحمان صاحب' ڈپٹی ڈائریکٹر فیاض' ثریا' ڈاکٹر خالد' لیڈی تنویر' سر تنویر' ایسے کتنے ہی نام ہیں جن کی اعلا طبقی اپنی جگہ عمران' ان سے بھی مذاق کرتا ہے ان کے ساتھ حماقتیں کرتا ہے اور اکثر اتنا سنجیدہ ہو جاتا ہے جیسے مملکت کا سربراہ ہو۔ مجرم کے ہتھکڑی ڈالتے وقت اس کے چہرے پر بلا کی سفاکیت نظر آتی تھی اور جیسے ہی مجرم کو انتظامیہ کی کسٹڈی میں پیش کرتے' حماقتیں' پھر چہرے پر ڈیرا جما لیتیں ۔فریدی اس وقت ڈراؤنا بن جاتا جب اس کے ہاتھ مجرم کی گردن پر پڑ جاتے' اس سے پہلے وہ اتنا محتاط ہوتا جیسے ریت پر چل رہا ہو اور اس کی ذرا سی بے خیالی سے مجرم ہوشیار ہو جائے گا۔

ابن صفی کے کرداروں میں کچھ باتیں بہت ہی قدر مشترک ہیں ۔(۱) وہ کیس کی تفتیش میں عجلت سے کام نہیں لیتے ۔(۲) باوجود اس کے کہ مجرم ان کے آس پاس ہی موجود ہوتا ہے' وہ پہچان بھی جاتے ہیں کہ صد فیصد یہی مجرم ہے مگر اس کی منصوبہ بند گھیرابندی کرتے ہیں ۔(۳) کچھ لوگ ہاتھ آ جاتے ہیں مگر پھر بھی انھیں سرغنہ کی تلاش رہتی ہے اور اس تک پہنچنے کے لیے انھیں متعدد بھیس بدلنے پڑتے ہیں' متعدد مقامات پر آگ' خون' گولی' بم اور فریب کاریوں کا شکار ہونا پڑتا ہے ۔مگر عزم مصمم اور جذبہ صادق انھیں منزل تک پہنچا ہی دیتا ہے۔

ان کے علاوہ ابن صفی کے یہ کردار بھی قارئین کے ذہنوں میں دیر تک رہتے ہیں ۔سر سلطان' طاہر صاحب (بلیک زیرو)' استاد محبوب نرالے عالم' انور رشیدہ' فریدی کے اسسٹنٹ انسپکٹر جگدیش' لیڈی انسپکٹر ریکھا۔ظفر اینڈ جیمسن' قاسم' قاسم کی بیوی' مسٹر عاصم اس طرح کے اور نام بھی ہیں جو انسانوں کے درمیان فرشتوں کا کردار ادا کرتے تھے اور جرائم سے پاک معاشرے کی تعمیر میں لگے رہتے تھے اور کچھ وہ لوگ تھے جن کے ناموں سے ہی ان کی شقاوت قلبی اور سفاکیت کا مظاہرہ ہوتا تھا۔ سنگ ہی' تھریسا' اور ایسے ہی بہت سے نفرت کے سوداگر ہیں جن کے شر سے معاشرے' ملک' عوام تھراتے ہیں مگر عمران اور فریدی کے جانباز انھیں کسی طرح مقصد میں کامیاب نہیں ہونے دیتے ۔ایسے نایاب اور زندہ کرداروں کے خالق ابن صفی کے لیے میں بس یہی کہوں گا کہ

زمانے گذرے ہیں کتنے نہ آیا آپ سا کوئی
جب آئے آپ تو ثانی نہیں ہے آپ کا کوئی

اِبن صفی کا البیلا کردار ''عمران''

ظہیر دانش۔ ہندوستان

ابن صفی (۲۸/اپریل ۱۹۲۸۔۲۶ جولائی ۱۹۸۰) اردو ادب میں ایک خوشگوار جھونکے کی طرح وارد ہوئے' اہل علم اور تشنگان ادب کو خوشگوار حیرت اور مسرت سے دوچار کیا۔ آپ کا پہلا ناول ۱۹۵۲ میں 'دلیر مجرم' کے نام سے شائع ہوا۔اس کے بعد ابن صفی کی شہرت اتنی بڑھی کہ لوگ آپ کے ناول پڑھنے کے لئے اردو سیکھنے لگے ۔اردو میں جاسوسی ناول لکھنا آسان نہ تھا۔ابتداء میں کچھ لوگوں نے انگریزی ناولوں کے تراجم کئے مگر چل نہ سکے۔ جب ابن صفی نے اس میدان میں قدم رکھا تو اسے روشن کردیا۔ مذکورہ مضمون میں ہمیں ابن صفی کے لاجواب و بے مثال کردار ''عمران'' پر گفتگو کرنا ہے۔

ابن صفی نے اپنے ناولوں کے لئے دو طرح کے کردار تراشے۔ایک ہے عمران سیریز جس میں جولیا' روشی' x2 'صفدر' جوزف' کیپٹن فیاض' سر سلطان' سنگ ہی وغیرہ کی کہکشاں ہے۔ دوسری قسم فریدی اور حمید سیریز کے ضمنی کردار ہیں قاسم' انور وغیرہ۔عمران سیریز کے ناول طنز ومزاح' تفریح اور قہقہوں سے بھرپور ہوتے ہیں لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ دونوں کی طرح یہ کردار نہایت کامیاب ہیں۔ان میں کردار نگاری کی ساری خصوصیات موجود ہیں۔

میں ذاتی طور پر ابن صفی سے متأثر ہوں۔ میں نے ان کے تقریباً تمام ناولوں کا مطالعہ کیا ہے۔ مجھے عمران کا کردار از حد پسند ہے کیونکہ عمران بیک وقت شعلہ بھی ہے اور شبنم بھی۔ بے وقوف بھی ہے اور عقلمند بھی۔ نہایت نرم دل بھی ہے اور نہایت سفاک بھی۔لڑکیوں کے معاملے میں بالکل اناڑی بھی ہے اور لڑائی کے معاملے میں زبردست ماہر' زبردست لڑاکا بھی اور بہترین نشانے باز بھی۔ گویا عمران کا کردار متضاد کیفیتوں کا ملغوبہ ہے۔عمران سیریز کے ناولوں میں طنز از حد ملتا ہے بطور خاص عمران عورتوں کے معاملے میں یا عالمی مسائل کے بارے میں جب طنز کرنا شروع کرتا ہے تو بڑا لطف آتا ہے۔ جناب عارف اقبال نے عمران کا تعارف پیش کرتے ہوئے لکھا ہے۔

''علی عمران جو ایم ایس سی' پی ایچ ڈی (آکسن) ہے' جس کے پاس اعلاترین ڈگریاں ہیں لیکن اس نے اپنی ڈگریوں کو سرد خانے میں محفوظ کر رکھا ہے''۔

اس کردار کے ذریعے ابن صفی دنیا کے ہر معاشرے پر طنز کرتے ہیں کہ اب ہم ڈگریوں کے سائے میں چلتے ہیں اور ہمارے ہر فعل پر ڈگریوں کا پرتو نظر آتا ہے اور یوں ان کا حصار ہمیں دوسروں کے دلوں میں اترنے سے روکتا ہے''۔ (سفاک مجرم کا پیش لفظ بعنوان نقوش' ص:۳' فرید بک ڈپو دہلی)

ہم عمران کے کردار کو 'دھوئیں کی تحریر'' نامی ناول کے۔پس منظر میں دیکھنے کی کوشش کریں گے۔ یہ ناول

سائنس کی حیرت انگیز ایجاد کے منفی استعمال سے متعلق ہے۔ایک سائنس دان نے دوسرے کے تیار کردہ راکٹ پر قبضہ جمالیا اوراس کے ذریعے تخریب کاری کر کے لوگوں کی دولت کے بڑے حصے کولوٹ لیا۔اخیر میں عمران کی بدولت اس سائنس دان کوقانون کے حوالے کیا جاتا ہے۔عمران اس ناول میں ایک کھلنڈرے نوجوان کی طرح نظر آتا ہے۔عمران کی یہ تصویر دیکھیں۔

''عمران بڑے جوش وخروش کے ساتھ میز پر طبلہ بجارہا تھا۔اس کی آنکھیں بند تھیں اور چہرے پر ایسے انہماک کے تاثرات تھے جیسے بہت ہی اہم فریضہ انجام دے رہا ہو۔محکمۂ سراغرسانی کا سپرنٹنڈنٹ اس سے تھوڑے ہی فاصلے پر بیٹھا ہوا اسے غصیلی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ظاہر ہے کہ یہ سپرنٹنڈنٹ کیپٹن فیاض کے علاوہ اور کوئی سپرنٹنڈنٹ نہ رہا ہوگا' آج کل اسے اللہ واسطے کا بیر ہوگیا تھا' بنائے فساددراصل رات کے شہزادے کا کیس تھا'' (سفاک مجرم'صفحہ:۱۴)

عمران کے کردار کے ذریعے ابن صفی جومکالمے۔تیار کرتے ہیں وہ کافی دلچسپ اور معنی خیز ہوتے ہیں۔ان مکالموں میں بہت سی باتوں پر طنز ہوتا ہے تو کہیں حقیقت کا اظہار ہوتا ہے عمران اور روشی کے درمیان جومکالمے ادا کئے گئے ہیں وہ بڑے پر لطف ہیں' ملاحظہ کریں۔

''روشی کہہ رہی تھی کہ سب سے پہلے دوربین گلیلو نے بنائی تھی اور عمران کہہ رہا تھا نہیں دنیا کی سب سے ''پہلی دوربین گورداس پور کے شیخ چھتانی نے بنائی تھی'' بات بڑھ گئی' روشی میز پر گھونسہ مارکر بولی'' تم لوگ ہمیشہ کے تنگ نظر ہو جہاں مغرب نے کوئی نئی چیز ایجاد کی تم نے نعرہ لگایا کہ واہ یہ صدیوں پہلے کسی مسلمان نے بغداد میں بنائی تھی۔یہ کیا لغویت ہے؟''

''میں گورداس پور کی بات کررہا ہوں۔جہاں بہت اچھا گڑ بنایا جاتا ہے۔میرا دعویٰ ہے انگلینڈ اور امریکہ والے اتنا اچھا گڑ نہیں بناسکتے''

''مت بکواس کرو میں نہیں جانتی کہ گڑ کسے کہتے ہیں''

''یہ لو! جب تم نہیں جانتی تو انگلینڈ اور امریکہ والے کیا جانتے ہوں گے' اگر انہوں نے دو چار سو سال بعد گڑ بنالیا تو یہی سمجھیں گے گڑ ہماری ایجاد ہے۔بھئی واہ اور اگر اسوقت کوئی یہ کہے گا کہ چار سو سال پہلے ہی گورداس پور والے گڑ بنانا جانتے تھے تو تم جیسی کسی تنگ نظر کو تاؤ آجائے گا''

''گڑ کیا چیز ہے؟'' روشی جھلا کر بولی۔

''بہت بری چیز ہے'' عمران سنجیدگی سے سر ہلا کر بولا۔یہ گفتگو اونچی آواز میں ہورہی تھی۔دونوں سنجیدہ تھے اس لئے قرب وجوار کی میزوں پر کے لوگ متوجہ ہوگئے تھے۔

''بتاؤ نا! کیا چیز ہے!'' روشی نے جھلائے ہوئے لہجے میں کہا۔

''ارے اسے چھوڑو بھی!''

''نہیں دوسری بات نہیں' تمہیں بتانا پڑے گا''

''گڑ'' عمران کچھ سوچتا ہوا بولا'' کسی طرح سمجھاؤ نگا۔ کسی دن دکھاؤں گا''
ساتھ ہی عمران نے روشی کو کچھ اشارہ کیا اور روشی یکلخت خاموش ہو گئی۔
''اچھا تم یہیں انتظار کرو میں ابھی گڑ لا رہا ہوں'' اس نے اٹھتے ہوئے کہا اور ڈائننگ ہال سے باہر نکل گیا'' (سفاک مجرم' ص:۱۶)

عمران کے ان مکالموں سے آپ کو اندازہ ہو گیا ہو گا کہ ابن صفی کا مطالعہ کتنا وسیع تھا۔ وہ کیا کیا جانتے تھے۔ ابن صفی کی منظر نگاری پوری طرح ابھر کر سامنے آتی ہے۔ وہ تفنن طبع کی خاطر کبھی کسی فلسفی کا قول بھی اپنے کرداروں کے ذریعے کہلواتے ہیں اور سچویشن ایسی ہوتی ہے کہ بے اختیار ہنسی چھوٹ جاتی ہے۔ مثال کے طور پر کبھی لڑائی کا موقع ہوتا ہے اور عمران کنفیوشس کے اقوال دہرا رہا ہے' یہ جملے دیکھئے۔
''کنفیوشس نے کہا تھا کہ غصہ کی آگ عقل کا ایندھن بن جاتی ہے اور آدمی کسی جلی ہوئی عمارت کی طرح ویران ہو جاتا ہے جو بیکار ہو جانے کے باوجود بھی زمین پر اپنا تسلط جمائے رکھتی ہے''۔ (سفاک مجرم' ص:۵۳)
اس مختصر سے۔ جائزے سے اندازہ ہوتا ہے کہ عمران متنوع خصوصیات کا کردار ہے' جو ہر سچویشن کے لئے مناسب ہے۔ اسی ناول میں وہ ایک ایسی عورت سے عشق کا اظہار کرتا ہے۔ اداکاری اتنی سچی اور حقیقت سے قریب معلوم ہوتی ہے کہ تصنع پر حقیقت کا گمان ہوتا ہے۔ عمران کے کردار کو لے کر بہت سے ناول نگاروں نے ناول لکھے ہیں۔ لیکن کسی ناول نگار نے عمران کے کردار کا حق پوری طرح ادا نہیں کیا۔ تقریباً تمام ناول نگار عمران کے کردار کو نبھانے میں ناکام رہے ہیں۔

ابن صفی کی تحریر
''چھُٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی''

علامہ اعجاز فرخ۔ ہندوستان

ادب کی درجہ بندی کا نقطۂ آغاز کیا ہے؟ اس کی وجوہات کیا ہیں' کس کو اعلیٰ اور کس کو ادنیٰ قرار دیا گیا۔ کیا اس میں بھی چھوت چھات کا عمل دخل ہے۔ یہ سب طویل مباحث ہیں۔ اصل مسائل تو یہ ہیں کہ ادب کے ایوان میں کس کے قدموں کی چاپ سنائی دی اور اب تک کس کی گونج اور بازگشت باقی ہے۔ دوسرا مسئلہ یہ بھی ہے کہ ادب برائے ادب کے بجائے ادب برائے زندگی تسلیم کرلیا گیا۔ ادب کے وسیلے سے انسانوں ہی کے حوالے کرنا کیا یہ ایک سعیٔ رائیگاں ہے؟ مجھے اپنے قلم کے پرکاری دائرے اور اس کے محیط کا پورا اندازہ ہے کہ وہ بہت زیادہ تنگ ہے' اس لئے میں ادب کی درجہ بندی کے ذیل میں اردو کے قد آور نقادوں اور اُن کے وضع کردہ اصول کے ضمن میں اس لئے بھی گریز آمادہ ہوں کہ نارتبہ شناسی کے الزام سے بچ سکوں۔

اس امر میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ خیال کا اچھوتا پن اور لفظ کے وسیلے سے اُس کی ترسیل ایک نازک فن ہے۔ فن کی صناعی کسی بھی تخلیق کو شاہکار بنا سکتی ہے لیکن اس فن کی غرض وغایت سلیقہ اظہار اور ان سب سے سواء بھرپور ابلاغ کہ۔

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اُس نے کہا
میں نے جانا کہ گویا یہ بھی میرے دِل میں ہے

والی کیفیت پیدا کردیتا ہے لیکن اس تخلیق کی غرض وغایت میں اگر تعمیر پوشیدہ ہے تو اس ادب کی نہ صرف قدر افزائی کی جانی چاہیئے بلکہ اس کی دیرپائی بھی مسلّمہ ہے۔ اس موقع پر یہ جملہ بھی شائد درست قرار پائے کہ ''ہر تعمیر میں ایک صورت خرابی کی'' بھی مضمر ہے۔ اور یہی دستور کائنات بھی ہے۔

انسانی شعور کی بالیدگی ایک مسلسل عمل ہے۔ اُس کا ذوق طلب علم اپنے حواس خمسہ سے ہر آن ایک نیا ادراک چاہتا ہے اور اس طرح کائنات کی بیکراں وسعتوں میں اُس کی توجہات شعور کی ترسیم میں اہم کردار بھی ادا کرتی ہیں۔ انسان کے خمیر میں خیر وشر کی آمیزش ہے ورنہ حسد ورقابت نہ ہوتی تو پہلا قتل بھی نہ ہوتا۔ اس اعتبار سے یہ بات بھی کہی جاسکتی ہے کہ جرم وسزا کا تصور بھی اسی کا ایک حصہ ہے۔

ابن صفی مرحوم کے تعلق سے نقادان سخن اور قارئین کے درمیان جو متضاد کیفیات نظر آتی ہیں وہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ جہاں ذہانت اپنی پوری صلاحیت کے ساتھ جلوہ گر ہو وہاں اختلاف اور تضاد تو فطری ہے اور یہ کوئی غیر معمولی نہیں ہے۔

بیسویں صدی کی نصف کے بعد ابن صفی کے ناول جاسوسی دنیا کے نام سے منظر عام پر آئے۔ یہ بات

وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ شاہد دہلوی کا پرچہ ساقی اور جاسوسی دنیا بک اسٹال پر ایک دن سے زیادہ کبھی نہیں نظر آئے بلکہ ان کے منظر عام پر آنے سے پہلے پہلے ان کی کاپیاں محفوظ ہو جایا کرتی تھیں۔ اس کے بعد کچھ یہی حال ابن سعید کی رومانی دنیا کا ہوا۔ شاہد دہلوی نقل وطن کر کے کراچی منتقل ہوئے، کسمپرسی میں گذار گئے۔

ابن صفی کا تخلیقی ذہن ایک عجیب اُپج کا حامل تھا۔ اُنہوں نے نہ صرف کردار تراشے بلکہ ایک مستقل شہر آباد کیا۔ اُس کی سڑکیں، عمارتیں، چوراہے، کوٹھیاں، گلیاں، کوچے، سمندر، بندرگاہ، قریبی جزیرے، اطراف و اکناف کی بستیاں، ہوٹل، طعام گاہ، نائٹ کلب، تفریحات۔ اس شہر کے معمار ابن صفی تھے، اس کے مکین اُن کے جانے پہچانے تھے۔ کوٹھیوں کی طرز آرائش وزیبائش سب کچھ اُن کے مزاج پلاٹ کے مطابق تھے۔

اُن کے یادگار کردار احمد کمال فریدی، ساجد حمید، قاسم، خان بہادر عاصم، انسپکٹر جگدیش، لیڈی انسپکٹر ریکھا، انور، رشیدہ، طارق اس کے کاندھے پر سیاہ نیولا، ان تمام کرداروں کی نفسیات کی تشکیل میں غیر معمولی زیرکی کا مظاہرہ کیا گیا ہے۔ اُن کے تمام ناولوں میں یہ کردار اپنی پوری نفسیات کے ساتھ دکھائی دیتے ہیں اور اس طویل عرصے میں کہیں کوئی جھول نظر نہیں آتا۔

ابن صفی کے ناولوں میں ایک عجیب گہرا طنز بھی خال خال دکھائی دیتا ہے جو معاشرتی طبقات پر چوٹ ہے مثلاً کلب میں کیپٹن حمید کا اپنے بکرے بغرا خاں کے سر پر فلیٹ ہیٹ اور گلے میں ٹائی اور پھر یہ اصرار بھی کہ اگر خواتین اپنے پالتو کتے کلب میں لاسکتی ہیں تو بکرے کے لئے کلب میں داخلہ نہ ہونے پر احتجاج ایک معاشرے کا عکاس ہے۔

آرلکچو ہوٹل میں گرانڈیل احمق قاسم کا لنچ اور ''فل فلوٹیاں'' یہ ایسی ذہنی اختراع ہے کہ ابن صفی کے علاوہ پھر کسی کے پاس دکھائی نہیں دیتی۔ ابن صفی نے پورے جاسوسی نظام کو اس طرح منظم کیا ہے کہ کبھی کبھی انسان حقیقی زندگی میں اُس کو معیار بنا کر جب اپنے دور میں موجودہ نظام کا جائزہ لیتا ہے تو سچائی خلوص دیانت داری اور فرض شناسی کے جو اقدار ابن صفی نے تراشے ہیں اُن کے آگے تو موجودہ نظام بالکل برعکس دکھائی دیتا ہے۔ ابن صفی کے کرداروں میں ایک پوشیدہ فورس بلیک فورس بھی ہے جو خالص فریدی کا عملہ ہے جس سے حمید بھی ناواقف ہے۔ کرنل فریدی کے مزاج اور استقامت کے ساتھ ساتھ اُس کی شخصیت میں جنسِ مخالف کی طرف رجحان کے بجائے صرف کام سے دلچسپی اور اس کے بالکل برعکس کیپٹن حمید کی افتادِ طبع کے پیش نظر فریدی کے لئے ''کرنل ہارڈ اسٹون'' کا لقب معنیٰ خیز ہے۔

جاسوسی دنیا سے ہٹ کر اگر نکہت سیریز پر نظر جائے تو اُس کے کردار ان کرداروں سے بالکل مختلف نظر آئیں گے۔ وہاں رحمان صاحب جیسا اصول پرست انسپکٹر جنرل، کیپٹن فیاض جیسا غبی، سر سلطان جیسا محکمہ خارجہ کا سکریٹری اور علی عمران صاحب ایم ایس سی، پی ایچ۔ ڈی (آکسن) اور وہ بھی حماقت مآبی کی نقاب کے ساتھ، اُن کی اماں بی کی مامتا، ثریا جیسی بہن، گلرخ اور سلیمان کی چھیڑ چھاڑ، جوزف جیسا بلانوش،

صفدر، تنویر، جولیا نافٹز واٹر، ایکس ٹو، بلیک زیرو، رانا پیلیس، دانش منزل، سائیکو منشن اور پھر مجرمین کی فہرست میں فریدی کے ساتھ فنچ، عمران کے ساتھ سنگ ہی اور سراپا ذہانت وحسن بلاخیز کی تھریسیا کی صورت میں یکجا ہیں، یہ سب ابن صفی کے کرداروں اور اختراع کی چند صورتیں ہیں۔
دیگر ادیبوں کے ناول میں پلاٹ یا فریم کے کردار اور منظر سب کچھ بدل جاتے ہیں لیکن کردار بدلے بغیر نئی اختراع، جدت پسندی اور اس کے آخر میں عدل کی ظلم پر اور قانون کی جرم پر بالا دستی کو مسلسل ثابت کرنا ایک محال سفر ہے۔
جہاں تک ادب کی زمرہ بندی میں ابن صفی کی تخلیقات کا تعلق ہے اس کا تعین کون کرے؟ قاری یا نقاد۔ اگر یہ فیصلہ قاری پر چھوڑ دیا جائے تو یہ ایک طے شدہ بات ہے کہ ابن صفی ایک بے حد مقبول ادیب تھے انہوں نے قاری کی ذہن سازی کی ہے۔ نفسیاتی اعتبار سے انسان کو جرم سے باز رکھنے کی کوشش کی ہے اور اُن کی یہ کوشش پیہم رہی ہے۔ اُنہوں نے اپنی بھرپور ذہانت اور قلم سے کئی قیمتی جملے لکھے ہیں۔ ایک مستقبل بین کی طرح اُنہوں نے سائنسی دور کے جرائم کی جس طرح پیشنگوئیاں کی ہیں اور دُنیا پر ایک ہی طاقت کی حکومت کا خواب، خلاؤں میں پرواز کرنے والے راکٹ کا استعمال اُن کی بھرپور ذہانت اور ذکاوت کا عکسِ جمیل ہے۔ جسارت معاف، علامہ اقبال کا ایک شعر کہ ۔

عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں
کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا مہ کامل نہ بن جائے

اس شعر کے ضمن میں شارحین اقبال کا یہ خیال ہے کہ چاند پر انسان کے قدموں کی چاپ کو اقبال نے بہت پہلے محسوس کر لیا تھا اور یہ شعر اُس کا عکاس ہے اگر اس شرح کو قبول کر لیا جائے تو ابن صفی کو کس کلیہ کی روشنی میں رد کیا جائے۔ رہی بات علامہ نیاز فتح پوری یا دیگر بلند پایہ نقادوں کی تو وہ اپنے مقرر کردہ معیارات رکھتے ہیں لیکن اصل مسئلہ یہ ہے کہ کوئی پیمانہ تو ہو جس میزان سے تحریر کے خدوخال دیکھ کر اُسے کسی زمرہ میں جگہ دی جائے۔
طنز و مزاح کوئی صنف نہیں ہے۔ یہ محض ایک اسلوب ہے جو کسی بھی صنف میں پایا جا سکتا ہے۔ لیکن آج طنز و مزاح کو ادب میں جس نگاہ سے دیکھا جا رہا ہے وہ اس کے تعین کے لئے کافی ہے۔ اگر نقادانِ ادب کی نگاہ میں طنز و مزاح کی کوئی حیثیت ہی نہ ہو یا ثانوی حیثیت ہو تو پھر پطرس بخاری، شوکت تھانوی، مشفق خواجہ، مشتاق احمد یوسفی، یوسف ناظم اور مجتبیٰ حسین کی تحریروں اور اُن کے مقام کا تعین کس طرح سے کیا جائے۔ کیا ان تمام کو صرف کھلونوں کی حیثیت دے دی جائے یا پھر کسی ایسے وجود کی جو دنیا کو صرف ہنسا کر خود روتا ہے۔
شکیل عادل زادہ اور محی الدین نواب نے اتنے ضخیم ناول لکھے کہ انہیں عصر حاضر کی طلسم ہوشربا کہا جا سکتا ہے۔ میرے دورہ پاکستان کے دوران میں نے نصیر ترابی سے شکیل عادل زادہ سے ملنے کی خواہش کی ۔ ایک دن جمیل الدین عالی سے ملاقات کے بعد انہوں نے مجھ سے کہا چلو میں تمہیں اپنے ایک دوست سے

ملوادوں اور پھر ایک عمارت کی پانچویں منزل پر ایک دفتر میں داخل ہوکر بلاتکلف چیمبر میں داخل ہو گئے۔ مقابل نے نصیر ترابی کو دیکھ کر پُرتپاک استقبال کیا اور بہت دنوں بعد ملاقات کا شکوہ بھی۔ تب نصیر ترابی نے کہا کہ میں تو اپنے بھائی کو تم سے ملوانے کے لئے آیا ہوں' یہ علامہ اعجاز فرخ ہیں اور تم کو "شکیل حرامزادہ" کہتے ہیں۔ شکیل عادل زادہ نے برجستہ کہا بالکل ٹھیک کہتے ہیں' آخر کو علامہ ہیں بلاوجہ تو نہیں کہتے ہونگے۔ مجھے خفت سی ہورہی تھی' میں نے ٹوپی اُتاردی اور پھر میں نے کوئی سوا گھنٹے میں اُن کے سلسلہ وار ناول "بازیگر" جو 1981ء سے میں مسلسل پڑھ رہا تھا' اُس کے ایک ایک کردار کا تذکرہ اور تجزیہ کرتے ہوئے کہا کہ "سب رنگ" جو کہلاتا تو ماہنامہ ہے لیکن کبھی تین مہینے اور کبھی چار مہینے انتظار کرنا پڑتا ہے۔ اس اشتیاق اور شوق کے بعد اس تاخیر کے لئے میں آپ کو اور کیا کہہ سکتا تھا"۔ کچھ دیر وہ خاموش رہے' پھر زار و قطار روتے ہوئے انہوں نے کہا "جس تفصیل سے میں نے اپنی تحریر آج سنی ہے میری ساری محنت چیز کر گئی"۔ کوئی تین گھنٹے بعد چلتے چلتے میں نے اُن سے کہا کہ "اب مجھے آپ کی کہانی کا انتظار نہیں رہے گا اس لئے کہ بابر زماں خان کو کورا کبھی نہیں ملے گی۔ اور جس دن کورا مل گئی آپ مرجائیں گے"۔ اس کے بعد شکیل عادل زادہ نے 25 سال سے لکھا جانے والا سلسلہ وار ناول یکلخت بند کردیا۔ ابن صفی بھی ایسے ہی نازک فنکاروں کی صف میں ہیں۔

نقاد چاہے کچھ کہیں مشاہدہ حق کی گفتگو اپنی جگہ لیکن
چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی

کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے۔ابن صفی

محمد فیصل۔کراچی

پہلا پتھر

برصغیر پاک و ہند نے نابغہ روزگار ہستیاں پیدا کی ہیں۔تاہم ہماری سرشت میں ایک عجیب طرح کا احساس کمتری ہے جس کی بدولت ہم ان ہستیوں پر فخر کرنے کی بجائے ایک عجیب سی شرمندگی کا شکار رہتے ہیں۔ہم اپنی زمین سے محبت کی بجائے ہمیشہ بیرونی ممالک کی طرف دیکھتے ہیں یا کسی مسیحا کا انتظار کرتے ہیں۔ہماری ہمدردیاں ہمیشہ سکندر کے ساتھ ہوتی ہیں جبکہ فطری طور پر پورس (جو کہ ہمارا ہم وطن تھا) کے ساتھ ہونی چاہییں۔ہم اپنے مسائل کا حل بھی دوسروں سے چاہتے ہیں۔یہی ہمارا قومی مزاج بن چکا ہے کہ ہم اپنے ہیروز کو ان کا صحیح مقام دینے کی بجائے ان کو ان کی حیثیت سے ہی گرا دیتے ہیں۔جتنا شرمندہ ہم اپنے ہیروز کو کرتے ہیں اس کی نظیر نہیں ملتی۔پھر ایک اور مسئلہ بھی ہمارے ساتھ ازل سے چل رہا ہے اور وہ ہے دھڑے بندی۔جہاں دو افراد ملے وہیں انھوں نے ایک گروہ بنا لیا۔پھر جس دھڑے کو اوپر آنے کا موقع ملا وہ باقیوں کا خلاف ایک محاذ کھول لیتا ہے۔اس معاملے میں ارباب اقتدار بھی برابر کے شریک ہوتے ہیں اور اپنے پسندیدہ اشخاص کو اوپر لانا ہی ان کی ترجیح ہوتی ہے جس کا اولین مقصد صرف اور صرف ذاتی تشہیر ہوتی ہے۔اس پر مستزاد یہ کہ یہی گروہ ارباب اقتدار کو ان کی من پسند تصویر دکھلا کر ان کے نشے کو مزید دوآتشہ کر دیتے ہیں۔یہ گروہ مشیروں کا ہو یا وزیروں کا ادیبوں کا ہو یا صحافیوں کا سب کا ایک ہی مقصد ہے اور وہ ہے صرف اور صرف ذاتی مفادات کی تکمیل۔

اتنی لمبی تمہید باندھنے کا مقصد یہ ہے اب وقت آ گیا ہے کہ ہم اپنے مزاج کو تبدیل کریں اور ان لوگوں کو ان کا جائز مقام دیں جو کہ ان کا حق ہے۔ہماری پچھلی نسلوں نے جو سلوک ابن صفی کے ساتھ روا رکھا ہے اس کی تلافی ہمارا قومی فرض ہے۔اس سلسلے کی ابتداء راشد اشرف نے ابن صفی۔کہتی ہے تجھ کو خلق خدا غائبانہ کیا اور ابن صفی۔فن اور شخصیت کی صورت میں پہلا پتھر پھینک کر کر دی ہے۔

ابن صفی۔ایک تنقیدی جائزہ

ابن صفی کی شخصیت کا مکمل جائزہ ابن صفی۔کہتی ہے تجھ کو خلق خدا غائبانہ کیا اور ابن صفی۔فن اور شخصیت میں مکمل طور پر سامنے آ گیا ہے۔ان کی ذاتی زندگی٬ عادات و اطوار٬ خاندان٬ اولاد٬ مشاغل غرض ہر پہلو کو نہایت عمدہ طریقے سے پیش کیا ہے۔ان کے فن کا تفصیلی پہلو خرم علی شفیق نے اپنی دو کتابوں سائیکومینشن اور رانا پیلس میں پیش کیے ہیں۔تاہم جیسا کہ راشد اشرف نے اپنے مضمون میں لکھا ہے کہ

ابھی بہت کام کرنا ہے

اس جملے سے مجھ جیسے کم علم کو بھی تحریک ملی کہ ان پہلوؤں پر روشنی ڈالی جائے جن کی بدولت ابن صفی برصغیر کے مشہور ترین ادیب تھے۔ ان کی کتاب ہاتھوں ہاتھ بک جاتی تھی۔ ان کے قارئین ان سے ٹوٹ کر محبت کرتے تھے۔ ان کے لئے مسجدوں' مندروں اور کلیساؤں میں دعائیں مانگی جاتی تھیں۔ وہ کیا وجوہات تھیں جن کی بدولت آج بھی دنیا ابن صفی کی دیوانی ہے۔ ان تمام باتوں کا ایک مختصر جائزہ پیش ہے۔ تاہم اس جائزے سے پہلے دنیا میں سری ادب کا مقام اور اردو زبان میں اس کا حشر پیش خدمت ہے۔

جاسوسی ادب اور اردو زبان

جاسوسی ادب کسی بھی زبان میں ایک نہایت عمدہ مقام رکھتا ہے۔ انگریزی زبان میں جاسوسی ادب کی تاریخ سر آرتھر کانن ڈائل سے شروع کی جاسکتی ہے جنہوں نے شرلک ہومز اور ڈاکٹر واٹسن جیسے لافانی کردار تخلیق کئے۔ اس وقت سے اب تک بہت اہم نام ہمارے سامنے آئے جن میں اگاتھا کرسٹی' وکٹر گن' آئن فلیمنگ' روتھ رینڈل' ایڈورڈ ڈی ہوچ' رابرٹ بی پارکر' رابرٹ لڈلم' مائیکل کونولی' رابرٹ کریس' جان گریشم' ولبر سمیتھ' کین فولے' ہارلن کوبن' سٹیفن کونٹس' آئن رینکن اور ان جیسے بہت سے نام شامل ہیں۔ ان میں ہر مصنف Best Seller کی فہرست میں شامل ہے۔ اور ان تمام مصنفین کو بہت پذیرائی ملی اور مل رہی ہے۔ ان میں بہت سے مصنفین کی کتابوں پر فلمیں بن چکی ہیں۔

اردو زبان اس لحاظ سے بدقسمت ہے کہ ادب کے اس اہم گوشے کو مجرمانہ غفلت سے نظر انداز کیا اور جن لوگوں نے کچھ کرنا چاہا ان کو سرے سے ادیب ہی قرار نہیں دیا گیا۔ ابن صفی سے پہلے منشی تیرتھ رام فیروز پوری' ظفر عمر' اکرم الہ آبادی (یہ ابن صفی کے بعد ہی میدان میں آئے تھے لیکن کوئی تحریری ثبوت نہیں ہے) وغیرہ نے اس ضمن میں طبع آزمائی کی تاہم ان میں سے اکثر نے انگریزی ادب کو مشرف بہ اردو کیا۔ رہی سہی کسر اس طبقے نے پوری کردی جو قیام پاکستان سے ہی ہر ارباب اقتدار کا گن گاتا رہا اور جن کی کتابیں چند سو کے ہندسوں سے آگے نہ بڑھ سکیں۔ ستم ظریفی تو یہ ہے کہ اکثر مخالفین بھی انہی کی کتابیں پڑھا کرتے تھے مگر شاید یہ تسلیم کرنے سے ان کو ادبی قد کھونے کا ڈر رہا۔ اور تو اور ایسے ادیب جن کا ادبی سرمایہ ایک دو کتابوں تک محدود ہے وہ بھی ابن صفی کا تذکرہ استہزائیہ انداز میں کرتے رہے ہیں۔ آج دنیا بھر میں جاسوسی ادب ایک صنف ہے جس کی مانگ میں روز بہ روز اضافہ ہو رہا ہے۔ مگر ہمارے یہاں آج بھی ادبی ٹھیکے دار اس کی اہمیت کو شتر مرغ کی طرح ریت میں سر ڈال کر نظر انداز کر رہے ہیں۔ اس تمام عمل میں نقصان اردو ادب کا ہے جو پہلے ہی عوام کی پہنچ سے دور ہو چکا ہے۔

اب ابن صفی کے فن کا جائزہ پیش خدمت ہے

نظریات ابن صفی

ہر مصنف کسی نہ کسی جذبے یا کسی تحریک کے تحت لکھنا شروع کرتا ہے۔ ابن صفی نے لکھنا کیسے اور کیوں شروع کیا اس کی وجہ وہ خود ایک مضمون بقلم خود (۱۹۷۰ء عالمی ڈائجسٹ) مین بیان کیا ہے۔

جاسوسی ناولوں کا سلسلہ ۱۹۵۲ء میں شروع کیا تھا..اس کی تحریک ایک مباحثے سے ہوئی۔ایک بزرگ کا خیال تھا کہ اردو میں صرف جنسی کہانیاں ہی مارکیٹ بنا سکتی ہیں۔میں ان بزرگ سے اتفاق نہ کر سکا! میرا خیال تھا کہ اگر سوجھ بوجھ سے کام لیا جائے تو اور بھی راہیں نکل سکتی ہیں۔کچھ اور بھی کرنا چاہیے کا مطالبہ بالآخر پورا ہو گیا۔تھوڑے ہی دنوں میں ایک جاسوسی ماہنامے کی داغ بیل ڈالی گئی اور میں اس کے لئے ہر ماہ ایک مکمل ناول لکھنے لگا۔

یوں اس سلسلے کا آغاز ہوا جو آج بھی قارئین کی دلچسپی کا باعث ہے۔اپنے اسی مضمون میں انہوں نے کھل کر اپنے ان نظریات کا ذکر کیا ہے جس کو انہوں نے اپنے ناولوں میں پیش کیا۔انہی کی زبانی۔

مجھے اس وقت بڑی ہنسی آتی ہے جب آرٹ اور ثقافت کے علمبردار مجھ سے کہتے ہیں کہ میں ادب کی بھی کچھ خدمت کروں۔ان کی دانست میں شاید میں جھک مار رہا ہوں۔حیات وکائنات کا کون سا ایسا مسئلہ ہے جسے میں نے اپنی کسی نہ کسی کتاب میں نہ چھیڑا ہو۔لیکن میرا طریق کار ہمیشہ عام روش سے الگ تھلگ رہا ہے۔میں بہت زیادہ اونچی باتوں اور ایک ہزار کے ایڈیشن تک محدود رہ جانے کا قائل نہیں ہوں۔میرے احباب کا اعلیٰ وارفع ادب کتنے ہاتھوں تک پہنچتا ہے اور انفرادی یا اجتماعی زندگی میں کس قسم کا انقلاب لاتا ہے۔افسانوی ادب خواہ کسی پائے کا ہو محض ذہنی فرار کا ذریعہ ہوتا ہے۔کسی نہ کسی معیار کی تفریح فراہم کرنا ہی اس کا مقصد ہوتا ہے۔جس طرح فٹ بال کا کھلاڑی شطرنج سے نہیں بہل سکتا۔اسی طرح ہماری سوسائٹی کے ایک بہت بڑے حصے کیلئے اعلیٰ ترین افسانوی ادب قطعی بے معنی ہے۔تو پھر میں گنے چنے ڈرائنگ روموں کے لئے کیوں لکھوں؟ میں اسی انداز میں کیوں نہ لکھوں جسے زیادہ پسند کیا جاتا ہے۔شاید اسی بہانے عوام تک کچھ اونچی باتیں بھی پہنچ جائیں۔

ابن صفی ابھی صرف انیس برس کے ہی تھے کہ پاکستان وجود میں آیا۔اس دور میں جو کچھ ہوا اس نے بہت سے ذہنوں پر انتہائی دوررس اور گہرے نتائج مرتب کئے۔ابن صفی کا ذہن بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔یہ بھی یاد رہے کہ یہ ایک حساس طبیعت شاعر اور ادیب کا ذہن ہے جو کسی بھی واقعے کا اثر عام آدمی سے زیادہ لیتا ہے۔یہ وہی عرصہ ہے جس کے دوران دوسری عالمی جنگ کے اثرات بھی مٹائے نہ مٹتے تھے۔ایک عجیب صورت حال تھی جس سے ہر شخص بری طرح متاثر تھا۔اور پھر انہوں نے ان واقعات کا تجزیاتی نتیجہ اخذ کیا اور بجائے کسی منفی رجحان کو ذہن میں جگہ دینے کے ایک مثبت اور منفرد سوچ اپنائی۔ان کے مطابق۔

آدمی میں جب تک قانون کے احترام کا سلیقہ نہیں پیدا ہوگا یہی سب کچھ ہوتا رہے گا۔یہ میرا مشن ہے کہ آدمی قانون کا احترام سیکھے اور جاسوسی ناول کی راہ میں نے اسی لئے منتخب کی تھی۔تھکے ہارے ذہنوں کے لئے تفریح بھی مہیا کرتا ہوں اور انہیں قانون کا احترام کرنا بھی سکھاتا ہوں۔

زبان

ابن صفی کا تعلق الہ آباد سے تھا اور بنیادی طور پر وہ شاعر تھے۔ان دونوں باتوں کا اثر جہاں تہاں ان کی

ذات پر محسوس کیا جا سکتا ہے وہیں پر یہ اثرات ان کی تحاریر میں بھی نظر آتے ہیں۔ آپ نے نہایت عام فہم زبان ایک دلکش پیرائے میں پیش کی جو اس وقت یعنی ۴۰ء اور ۵۰ء کے زمانے میں جب مولانا ابوالکلام آزاد جیسے جناتی زبان استعمال کرنے والے ادیب موجود ہوں' ایک کمال تھا۔ عوام ہوں یا خواص سب آپ کی تحریر کے دیوانے اسی لئے تھے کہ یہ تحریر ان ہی کی عام زبان میں انھی کے لئے تھی۔ مجھے ذاتی طور پر یہ محسوس ہوتا ہے کہ جیسے ابن صفی کی کتاب آپ سے مکالمہ کر رہی ہو۔ اور کبھی کبھی تو آپ خود کو بھی ان کتابوں کا ایک حصہ سمجھنے لگتے ہیں۔ جب دوسرے مصنفین اپنی قابلیت کا اظہار مشکل زبان اور ادق الفاظ میں کر رہے تھے ابن صفی نے سادہ پیرائے میں اردو زبان کا سب سے نادر نمونہ پیش کیا۔ اور قاری کی توجہ فیروز اللغات کی بجائے کتاب پر ہوتی تھی۔ اگر دو لفظوں میں ابن صفی کی زبان کا مطالعہ کیا جائے تو وہ سادہ اور سلیس ہوں گے۔

کردار نگاری

ابن صفی کو باقی تمام مصنفین بلکہ غیر ملکی مصنفین پر ایک برتری حاصل تھی اور وہ تھی ان کی کردار نگاری۔ دنیا کے مشہور ادیب اور ان کے تخلیق کردہ کرداروں کا ایک جائزہ پیش خدمت ہے

Ian Flemming	Victor Gun	Victor Gun
Inspector Spencer	Robert B Parker	James Bond
Michael Connelly	Inspector Wexford	Ruth Rndell
Elvis Cole, Joe Pike	Robert Crais	Harry Bosch
Faye Kellerman	Myron Bolitar	Harlan Coben
Jason Bournce	Robert Ludlum	Rina & Peter
Edward De Hoch	Inspector Rubeus	Ian Rankin
	Nick Velvet	

ان تمام مصنفین کے تخلیق کردہ کرداروں کی تعداد ایک یا دو ہے۔ مگر ابن صفی نے ایک دو نہیں بیسیوں کردار تخلیق کئے۔ سب اپنی علیحدہ علیحدہ خصوصیات و عادات کے ساتھ۔ ابن صفی کے دونوں سلسلوں میں مرکزی کرداروں کے علاوہ ان گنت کردار قارئین کے ذہنوں میں نقش رہیں گے۔ ان کے سلسلے جاسوسی دنیا کے مرکزی کردار احمد کمال فریدی ہیں جو ایک سنجیدہ' متین' بردبار' دلیر' نڈر' قانون کا احترام کرنے اور کروانے والے کی سی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کا دست راست ساجد حمید چلبلا' شوخ' نڈر' ہمہ وقت تبدیلی کا شائق ہے جو ہر معرکے میں ان کے ساتھ ہے۔ ان کرداروں کے علاوہ انور' رشیدہ' جگدیش' امر سنگھ' شہناز' نیلم' ریکھا' قاسم' چپاتی بیگم اور نہ جانے کتنے ہی کردار ہیں جو ہمیشہ ہمارے ذہنوں پر راج کریں گے۔ ان کے دوسرے سلسلے عمران سیریز کے مشہور و معروف کردار علی عمران جو ایک نہایت شوخ و شنگ' ہر چیز کو چٹکیوں میں اڑا دینے کو ماہر اور ایک حماقت انگیز ذہانت کا مرکب ہیں۔ اس سلسلے میں بلیک زیرو' طاہر' صفدر' روشی' جولیا' تنویر' جوزف'

سلیمان، جعفری، سر سلطان، سر رحمٰن، اماں بی، ثریا، ظفر الملک، جیمسن مشہور و معروف ہیں۔

ان کے علاوہ نجانے کتنے کردار اپنی اپنی خصلتوں اور عادات کے ساتھ ان کتابوں میں زندہ ہیں۔ ان مثبت کرداروں کے علاوہ ابن صفی نے لافانی منفی کردار تخلیق کیے جن میں سنگ ہی، تھریسیا، فنچ، راہل (؟)، قلندر بیابانی، لیونارڈ، نانوتہ، کنور شمشاد، ڈاکٹر سلمان، جیرالڈ شاستری۔ یہ تمام کردار اپنے اپنے اطوار اور خصائل سمیت اسی دنیا کا حصہ ہیں جو ابن صفی نے اپنے قلم سے تعمیر کی۔ یہاں یہ بات کہنا بے جا نہ ہوگا اتنے جاندار کرداروں کی تخلیق کے بعد، جب تک اردو زبان زندہ ہے ابن صفی کا نام اور ان کے کردار ہمیشہ زندہ رہیں گے۔

ابن صفی کی منظر نگاری

ابن صفی کی منظر نگاری کے متعلق میرے نزدیک ایک یہی بات کافی ہے کہ جیسے ایک مصور کا کینوس جس میں جا بجا رنگ بکھرے ہوئے ہیں اور یہ تصویر پوری آب و تاب کے ساتھ قاری کے ذہن پر نقش ہو جاتی ہے۔ ابن صفی ہر ایک منظر پوری جزئیات کے ساتھ لکھتے ہیں۔ مجھے علم نہیں کہ فزارو، ٹپ ٹاپ، نیاگرہ، آرلکچو، مئے پول جیسے کلب اور ریستوران موجود ہیں یا نہیں مگر اپنی تمام سہولیات کے ساتھ ابن صفی کی آباد کردہ دنیا میں موجود ہیں۔ قاری خود بھی تارجام، رام گڑھ، سردار گڑھ، نصیر آباد جیسے شہروں میں خود کو رہائش پذیر محسوس کرتے ہیں۔ میں یہاں مشہور نوبل انعام یافتہ مصنف گارشیا مارکیز کے متعلق کہے گئے چند جملے لکھنا چاہوں گا۔

اگر میکسیکو اور سپین دنیا کے نقشے پر زندہ نہ ہوتے تو پھر بھی وہ مارکیز کی تحریروں میں زندہ ہوتے۔

تو یہ کہ فزارو، ٹپ ٹاپ، نیاگرہ، آرلکچو، مئے پول، تارجام، رام گڑھ، سردار گڑھ، نصیر آباد دنیا کے نقشے پر موجود ہوں یا نہ ہوں مگر ابن صفی کی تحریر اور قاری کے ذہن میں ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ میں صرف چند مثالیں پیش کروں گا کہ ابن صفی کس کمال کی منظر کشی کرتے ہیں۔

تاریکی آہستہ آہستہ غائب ہوتی جا رہی تھی۔ آسمان میں ننداسے تارے جھپکیاں سی لیتے معلوم ہو رہے تھے۔ ہر طرف ایک پراسرار روح کی گہرائیوں میں اتر جانے والا سناٹا تھا۔ دور تک پھیلے ہوئے جنگل بیکراں آسمان کی وسعتوں سے سرگوشیاں کرتے ہوئے معلوم ہو رہے تھے۔ (پو پھٹنے کا منظر کس کمال سے قاری کو دکھایا)

اس کا سر چکرا رہا تھا! آنکھوں میں دھندسی چھا رہی تھی! اس دھند میں چنگاریاں بھی تھیں جو لاتعداد جگنوؤں کی طرح ٹمٹماتی پھر رہی تھیں! پھر یہ دھند آہستہ آہستہ گہری تاریکی میں تبدیل ہوتی گئی! اور کچھ دیر بعد اس تاریکی میں رہ رہ کر روشنی کو تیز جھماکے ہونے لگے۔ (ہوش اور بے ہوشی کے درمیان کی کیفیت)

محکمہ سراغ رسانی کی عمارت کی دیواریں جو بڑے بڑے چوکور پتھروں کو جوڑ کر بنائی گئی تھی اپنے استحکام کا اعلان کر رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ موسم کی شرانگیزیوں سے بے نیاز کہر کی گہری چادر پر طنزیہ ہنسی ہنستی ہوئی کہہ رہی ہوں کہ ہمیں کیا پرواہ ہے، ہم میں تو ایک رخنہ بھی نہیں جس سے اس سردی کی ٹھنڈی لہریں ہمارے اندر پہنچ سکیں۔ ہمارے قلب میں ایسے ایسے راز دفن ہیں جن کی ہوا بھی دنیا کو نہیں لگی۔

ابن صفی اور جدیدیت

ہر نابغہ اپنے عہد میں رہ کر بھی اس عہد سے آگے کا کام کرتا ہے۔ وہ نہ صرف اپنے زمانے بلکہ آنے والے ہر زمانے کے لئے کام کرتا ہے۔ ابن صفی اس تعریف پر پورے اترتے ہیں۔ انہوں نے اپنی تحریر میں ایسے تصورات پیش کئے جن میں سے کچھ تو ان کی زندگی میں اور کچھ ان کے بعد من وعن پورے ہوئے۔ انہوں نے بغیر آواز جہاز و آبدوز' مصنوعی دھند' ٹریفک کنٹرول کرنے والے روبوٹ' مصنوعی آندھی' ایٹم بم سے بھی خطرناک شعاعی ہتھیاروں' لاسلکی آلات' بغیر تاروں کے ٹرانسمیٹرز' خلائی جہاز' لاسلکی ٹیلے وژن' کیمیاوی ہتھیاروں غرض کون سا تصور نہیں تھا جو انہوں نے اپنی کتابوں میں نہ لکھا ہو۔ ان چیزوں پر آج تو شاید ہمیں حیرت نہ ہو مگر آپ آج سے ساٹھ سال پہلے کا زمانہ سوچئے۔ اس وقت جب نہ بجلی تھی' نہ موبائل' نہ ٹیلے وژن نہ پاکستان میں سائنسی سوجھ بوجھ۔ آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ اس وقت تو یہ باتیں صرف دیوانے کی بڑ ہی لگتی تھیں۔ مگر آج اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز چیزیں ہمارے علم میں ہیں۔ تبھی تو اقبال نے کہا۔

عروج آدم خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں
کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا کہیں مہ کامل نہ بن جائے

ابن صفی کو ان کے ہم عصروں سے یہی بات ممتاز بناتی ہے کہ انہوں نے اپنے قد سے بڑھ کر نکل جانے کی کامیاب کوشش کی۔ خود کے اپنے عہد کے روایتی علم تک محدود نہیں رکھا۔ بلکہ اپنے عہد سے آگے کا سوچا۔ مستقبل کیا ہوگا۔ اس وقت کیا سائنسی ترقی ہو سکتی ہے۔ شاید یہی وہ کوشش تھی کہ آج بھی ابن صفی اپنی پوری آب و تاب سے زندہ ہیں اور ان کے ہم عصر شاید چند سرکاری لائبریریوں کی زینت بن کر رہ گئے۔

ابن صفی کی تحریر میں بیرونی ممالک کا تذکرہ

یہاں یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ ابن صفی نے اپنی پوری زندگی صرف دو ملک یعنی بھارت اور پاکستان ہی دیکھے مگر ان کی کتابیں ان کے قاری کو دنیا جہان کی سیر کروا دیتی ہیں۔ انہوں نے اپنی کتابوں میں مصر' جزائر غرب الہند' امریکہ' جنوبی امریکہ' انگلستان' سپین' اٹلی' فرانس' عرب' یونان' ایران' تاہیتی اور افغانستان کا اتنا تفصیلی ذکر کیا ہے کہ جیسے انہوں نے خود وہاں جا کر یہ جگہیں دیکھی ہوں۔ یہ ان کا مطالعہ اور مشاہدہ تھا جس کی وجہ سے یہ منظر کشی نہیں بلکہ ایک سفرنامہ بن گیا۔ انہی کی زبانی کہ۔

میری چارپائی مجھے جہانوں کی سیر کرواتی ہے۔

اثرات ابن صفی

یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ابن صفی کی تحریر اردو ادب کی ان اصناف پر پورا اترتی ہے۔

ناول (سری۔ادبی)' مزاح نگاری' سفرنامہ' انشائیہ' افسانہ' غزل' نظم

ابن صفی نے اردو ادب میں گراں قدر اضافہ کیا۔ ان کے اثرات مٹائے نہیں مٹتے۔ ہر صنف میں انہوں نے اس کمال کے شہ پارے تخلیق کئے ہیں کہ جن کی نظیر نہیں ملتی۔ اگر ہم صرف ان کے پیش رس ہی کا بہ نظر غائر جائزہ لیں تو یہ فیصلہ کرنا دشوار ہو جاتا ہے کہ انہیں اردو کی کس صنف میں شامل کیا جائے۔ ان کا ایک ناول

تزک دو پیازی اردو ادب میں مزاح نگاری ایک شائستہ نمونہ ہے۔ انشائیہ نگاری میں ان کے فن کا ادراک ہمیں ان کی کتاب ڈپلومیٹ مرغ پڑھ کر ہوتا ہے۔ میرے خیال میں متذکرہ اصناف میں ہر صنف میں ابن صفی کی مہارت پر ایک پوری کتاب لکھی جا سکتی ہے۔ اور آپ بھی راشد اشرف کی اس بات سے متفق ہوں گے کہ ابھی بہت کام کرنا ہے۔

حاصل کلام

ابن صفی جیسی ہمہ جہت شخصیت پر مجھ جیسے ناعلم کا قلم اٹھانا ان کی ادبی شخصیت کی مزید بلندی کا باعث نہیں بلکہ مجھ جیسے جاہل کے لئے ایک اعزاز ہے۔ میں اس تحریر کا محرک راشد اشرف کی دو کتابوں کو سمجھتا ہوں اور میرے خیال میں اگر ابن صفی سے مکمل تعارف حاصل کرنا ہو تو ان کتابوں کا مطالعہ ضرور کریں۔ اور جہاں تک ابن صفی کے ادبی مقام کا تعلق ہے تو مجھے یقین کامل ہے کہ بہت جلد قارئین خود اس بات کا فیصلہ کریں گے کہ ابن صفی ایک ہمہ جہت شخصیت اور ایک انتہائی اعلیٰ پائے کے ادیب تھے جن کی ادبی حیثیت طے کرنے کا کوئی پیمانہ مقرر نہیں ہو سکتا۔ اور مجھے اس بات کا اتنا یقین ہے جتنا کل سورج کے طلوع ہونے کا۔

میں اور ابنِ صفی

نذیر فتح پوری

آپ اس عنوان کو ''ابنِ صفی اور میں'' بھی پڑھ سکتے ہیں اور حقیقت بھی یہی ہے کہ پہلے ابنِ صفی کی شخصیت ہے۔ اس کے بعد کہیں بہت دور جا کر' ایک طویل فاصلے پر میں ہوں۔ اور میں بھی کیا ہوں۔ وہاں بھی ابنِ صفی کی شخصیت ان کے جاسوسی ناول اور ان کے وضع کردہ کرداروں کے ساتھ ہی ان کی لطیف ،فصیح' ادبی چاشنی میں لپٹی' گداز' طنز و مزاح سے بھرپور اردو زبان ہے۔ اس کا سحر آگیں وجود ہے۔ اس کی آسمان جیسی بلندی ہے۔ اس کی زمین جیسی کشادگی ہے۔ اس کی سمندر جیسی گہرائی ہے اور فکر و فن کی آفاقیت ہے۔ ابنِ صفی کو اردو نے کیا دیا یہ ایک داستانی ''حساب کتاب'' کا سلسلہ ہے جو اس دن شروع ہوا تھا جب الہٰ آباد کے کسی مکان کی چھت کے نیچے بیٹھ کر ایک شخص نے پہلا جاسوسی ناول لکھا تھا۔ اس شخصیت کا نام اسرار احمد تھا۔ اسرار احمد نے جاسوسی ناول کیوں لکھا۔ اگر کوئی سوال کرے تو اس کا جواب یہی ہے کہ غالب نے غزل کیوں لکھی یا اقبال نے نظم نگاری کیوں کی' آزاد نے آبِ حیات کیوں لکھی' حالی کے قلم سے تنقید کے سوتے کیوں پھوٹے' جب ان سوالوں کا ہمارے پاس کوئی جواب نہیں تو ہم یہ سوال کیسے کریں کہ اسرار احمد نے جاسوسی ناول کیوں لکھا۔ راقم کی نظر میں اس کا سادہ سا جواب یہی ہے کہ غالب' اقبال' آزاد' اور حالی کی طرح قدرت کو اردو کے لیے ایک اور نابغہ وجود میں لانا تھا اور وہ ''اسرار احمد'' تھا۔ یعنی ہمارا ابنِ صفی' اردو کا ابنِ صفی' جاسوسی دنیا کا بے تاج بادشاہ ابنِ صفی' اپنے بے شمار پرستاروں کے دل میں عزت و احترام کی جگہ پانے والا ابنِ صفی۔ ابنِ صفی نے جب اپنا قلمی نام منتخب کیا تو اس بات کا خیال رکھا کہ اس کی ابتداء الف سے ہو۔ ان کا نام اسرار احمد بھی الف سے شروع ہوتا ہے اور قلمی نام کی ابتداء بھی الف سے ہوتی ہے ۔الف میں بڑی خیر ہے۔ یہ نہایت برکتوں والا حرف ہے اس کی جھلک ابنِ صفی کی زندگی میں صاف نظر آتی ہے۔

نہیں معلوم کہ ابنِ صفی کے پہلے ناول کی تشہیر کس طرح ہوئی۔ کیسے یہ خاص و عام قارئین کے ذہنوں تک رسائی کر سکا۔ پہلے ناول کے پبلی شر نے کتنی کاپیاں شائع کی ہونگی۔ اس کی کاپیاں کس طرح کتب فروشوں تک پہنچائی ہونگی اور پبلی شر نے پہلے ناول میں کتنا منافع کمایا ہوگا۔ اور ابنِ صفی کو کس صورت میں اپنے قلم کی کمائی کا پہلا حصہ ملا ہوگا۔ آج ایسے موضوعات پر سوچنے اور اظہار خیال کرنے کے لیے ہمارے پاس وقت کہاں ہے۔ لیکن یہ بنیادی باتیں ہیں۔ ابنِ صفی کی زندگی میں اس وقت ان باتوں کی اہمیت تھی۔ ادب نے غالب اور اقبال کو مالی اعتبار سے کیا دیا ہوگا۔ اس کے حوالے مل جائیں گے۔ غالب کو شاعری کی وجہ سے دربارِ مغلیہ تک رسائی ملی۔ یا ان کی رسائی بہادر شاہ ظفر کے دربار میں ہوئی۔ ظفر نے اپنے گلے سے

قیمتی ہیروں کا ہار اتار کر غالب کے گلے میں پہنا دیا۔ اور ان کا شاہانہ استقبال کیا' دوسری طرف اقبال کو ان کی زندگی میں جو قومی سطح پر عزت و احترام کا مقام ملا وہ اپنے آپ میں ایک اہم مقام تھا لیکن ہم غور کریں تو معلوم ہو کہ ابنِ صفی کو کیا ملا۔ عوام کی محبت' اردو کا عام قاری؟ لیکن یہ عام قاری بھی خود ابنِ صفی کا ہی پیدا کردہ ہے اس کی ایک مثال پیش کرتا ہوں۔ یہاں پونہ میں چند ایسے لوگوں سے میری ملاقات ہوئی جنہوں نے ابنِ صفی کے ناول پڑھنے کے لیے باقاعدہ اردو سیکھی کیوں کہ ناگری لپی میں شائع شدہ ناولوں کو پڑھنے میں وہ لطف نہیں آیا جو اردو میں آتا ہے۔ میرا خیال ہے کسی نے بھی غالب اور اقبال کے کلام کو محض پڑھنے کے شوق میں اردو نہیں سیکھی ہوگی۔ ابنِ صفی کے قلم کا یہ کرشمہ نہیں تو کیا ہے کہ ابنِ صفی کی وجہ سے اردو کا عام قاری برسوں زندہ رہا' جوان رہا' متحرک رہا اور تجارتی طور پر اردو زبان بھی عروج پر رہی۔

میں اعتراف کرتا ہوں

میں اس بات کا برملا اعتراف کرتا ہوں کہ ابتداء میں اردو نثر لکھنے کی روشنی مجھے ابنِ صفی کے ناولوں کے مطالعے سے ملی۔ میں نے جب شعر و سخن کی دنیا میں قدم رکھا تو مجھے معلوم نہیں تھا کہ ابنِ صفی کون ہیں اور یہ جاسوسی ادب کیا ہے' اس کی ابتدا اردو میں کیسے ہوئی' اس ادب کا بنیاد گزار کون ہے' یہ

(۱) کس کے ذہن کی اختراع ہے' مجھے میرا ایک رشتہ دار غلام مصطفیٰ حسین خان جوڈ یاد ہے جس سے بعد میں میری دوستی ہوگئی تھی اور آج بھی یہ دوستی کا رشتہ قائم ہے۔ ہمارے یہاں رشتے داریوں میں دوست داریاں کم ہوتی ہیں لیکن مصطفیٰ جوڈ سے میری دوستی پونہ آنے کے بعد ہوئی اور اردو زبان کے حوالے سے ہوئی۔ پھر اس دوستی کو استحکام ملا ابنِ صفی کی وجہ سے۔ ان دنوں ہم دونوں جوان تھے' مصطفیٰ اردو کا طالبِ علم رہ چکا تھا' میں اپنے طور پر پونہ آنے کے بعد بغیر کسی استاد کے اردو لکھنا پڑھنا سیکھ رہا تھا۔ مصطفیٰ ابنِ صفی کا عاشق تھا جب اس سے میری پہلی ملاقات ہوئی تو میرے ہاتھ میں میر اور غالب کی وہ بُک لیٹ تھیں جو اسٹار پاکٹ بکس دلی والوں نے شائع کی تھیں اور مصطفیٰ کے کمرے کی شیلف میں ابنِ صفی کے ناول سجے تھے۔ اس نے مجھے ابنِ صفی کے ناول پڑھنے کی ترغیب دلائی اور ابنِ صفی کی تحریر کی خوبیوں کو سمجھایا۔ مصطفیٰ کو ان ناولوں کے کئی کردار زبانی یاد تھے' اس کی باتیں دلچسپ لگیں اور میں اس کے پاس جمع شدہ پرانے ناول حاصل کر کے دھیرے دھیرے پڑھنے لگا' واقعی میں نے ابنِ صفی کا پہلا ناول جس کا عنوان مجھے یاد نہیں مصطفیٰ سے مستعار لے کر پڑھا تھا۔ پہلا ناول میں نے کئی قسطوں میں پڑھا اس لیے کہ ان دنوں میں عمارت سازی کا کام سیکھ رہا تھا' سائیکل کی سواری تھی' کام کے لیے مجھے دور جانا پڑتا تھا' اس وقت میری ماں اور گھر کے دیگر افراد گاؤں ہی میں تھے اس لیے کھانا بھی مجھے ہی پکانا پڑتا تھا۔ کپڑے دھونے سے لے کر برتنوں کی صفائی اور اس کے بعد کمرے کی جھاڑو اور دیگر صفائی ستھرائی کی ذمہ داری بھی مجھ پر تھی۔ تمام ذمہ داریوں سے سبکدوش ہو کر رات دیر گئے میں ناول لے کر بیٹھ جاتا اور بیٹھے بیٹھے کبھی لیٹ بھی جاتا اور نیند آنے تک ناول پڑھتا رہتا۔ کبھی کبھی تو یوں بھی ہوتا کہ ناول پڑھتے پڑھتے مجھے نیند آ جاتی اور ناول میرے

سینے پر رکھا رہ جاتا یا کبھی بستر میں دائیں بائیں پڑا ملتا۔ صبح کام پر چلے جانے کے بعد اکثریوں بھی ہوتا کہ دیواروں پر اینٹ جوڑتے جوڑتے یا پلاسٹر کرتے کرتے مجھے ابن صفی کا کوئی نہ کوئی کردار یاد آ جاتا۔ کبھی عمران کی یاد آ جاتی، کبھی شوخ اور شریر حمید میاں تشریف لے آتے، کبھی شوکت بھائی اپنے پورے جثے کے ساتھ گاڑھی اردو بولتے ہوئے نمودار ہو جاتے۔ مثلاً گاف کی جگہ نین اور سین کی جگہ شین اور نہ جانے کیا کیا۔ اور پھر بھائی حرام مونچھ کو لے لیجئے وہ اپنی مضحکہ خیز مونچھوں پر بل دیتے ہوئے منہ چڑانے لگ جاتے اور اس کے بعد عزت مآب فریدی کی تشریف آوری ہوتی' بادشاہوں کا سا جاہ وجلال'

بہادروں کی سی چال' پیار' محبت' خلوص' فرض شناسی اور قانون کی محافظت کا پیکر۔ فریدی جیسا کردار جاسوسی دنیا کے حوالے سے ابنِ صفی نے کیوں وضع کیا وہ خود لکھتے ہیں

''یہ میرا مشن ہے کہ آدمی قانون کا احترام کرنا سیکھے اور جاسوسی ناول کی راہ میں نے اس لیے منتخب کی تھی۔ تھکے ہارے ذہنوں کو تفریح مہیا کرتا ہوں اور انہیں قانون کا احترام کرنا بھی سکھاتا ہوں۔ فریدی میرا آئیڈیل ہے جو خود بھی قانون کا احترام کرتا ہے اور دوسروں کو بھی قانون کا احترام کرانے کے لیے اپنی زندگی تک داؤ پر لگا دیتا ہے۔''

فریدی جیسا کردار ان دنوں میرے ذہن و دل پر بھی مسلط ہو گیا تھا' میں کبھی کبھی تصور میں اپنے آپ کو فریدی سمجھ کر ظلم کے خلاف کمر بستہ ہو جاتا' غنڈوں کی پٹائی کرتا' موالیوں کو گرفتار کرتا' مظلوموں کی مدد کرتا' رشوت خور سرکاری افسروں کو ہتھکڑیاں لگاتا اور انہیں عدالت کے کٹہرے میں لا کھڑا کرتا۔ کالے دھن والوں کے گھروں میں بے دریغ گھس جاتا اور ان کی تجوریاں توڑ کر فاقہ زدہ عوام میں لٹا دیتا اور نہ جانے کیا کیا ایسے کام کرتا جو انسان کے اور انسانیت کے لیے سودمند ہوں۔

لیکن میرے خیال میں ابن صفی نے ایک طرف فریدی کے کردار کو ایک بے مثال ہیرو کے رنگ میں پیش کر کے دوسری طرف اس پر یہ ظلم بھی کیا ہے کہ انسان کے فطری جذبات کے اظہار کا کبھی اس کو موقع نہیں دیا۔ کبھی کسی خوبصورت چہرے کو اس کے کردار کے روشن دان سے جھانکنے تک کی اجازت نہیں دی۔ کبھی کسی سیاہ اور سمندر جیسی گہری آنکھوں میں صرف ایک ڈبکی لگانے کی بھی فریدی کو مہلت نہیں ملی۔ فریدی آخر ایک انسان تھا فرشتہ تو نہیں تھا' ظاہر ہے ایک انسانی زندگی کے سارے تقاضے اور لوازمات اس کی زندگی سے جڑے ہوئے تھے۔

کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے۔

(۲)

آدمی کیا ہے فرشتوں کے بہک جائیں قدم

حالانکہ میں خود دلِ گداختہ رکھتا ہوں اور ان سارے جمالیاتی مراحل سے گذر چکا ہوں اس لیے فریدی کے لیے میرے دل میں آج بھی کسک ہے۔ مجھے معلوم نہیں بعد کے ناولوں میں ابنِ صفی نے فریدی کے

ساتھ کیا رویہ اختیار کیا؟ کیوں کہ جاسوسی دنیا کے ناول بند ہونے کے بعد میں نے ابنِ صفی کے ناول پڑھنا بند کر دیے تھے یا پھر ان ناولوں تک میری رسائی نہیں ہو سکی تھی۔

میں یہاں اپنے ابتدائی زمانے کی بات کر رہا ہوں جب میری ماں فتح پور سے پونہ آ گئی تو ہم نے گھر تبدیل کر دیا اور مجھے گھریلو کاموں سے مکمل طور پر فرصت مل گئی۔ میں نے مصطفیٰ سے ناول مستعار لینا بند کر دیا اور ابنِ صفی کے ناول ہر ماہ پابندی سے خریدنے لگا۔ پونہ کے کیمپ علاقے میں واقع اسلم بک ڈپو پر جاسوسی دنیا اور رومانی دنیا کی کاپیاں اپنے وقتِ مقررہ پر آ جاتیں اور آتے ہی گرم کیک کی طرح بک جاتیں۔ ان دنوں پونہ میں سائیکلوں کی سواری کے علاوہ کوئی سواری نہیں تھی جس بستی میں ہمارا مکان تھا وہ شہر سے آٹھ دس میل کی دوری پر تھی۔ ایروڈا نامی اس بستی سے اسلم بک ڈپو تک جانے آنے میں سائیکل سے ایک گھنٹہ صرف ہو جاتا کبھی کبھی تو یوں بھی ہوتا کہ مقررہ تاریخ پر کتابوں کا پارسل آنے میں تاخیر ہو جاتی اور مجھ ایسے ابنِ صفی کے دیوانوں کو سائیکل پر کئی چکر لگانے پڑ جاتے۔ ابنِ صفی کا کوئی ناول میں نے ایک نشست میں کبھی نہیں پڑھا' مجھے اچھی طرح یاد ہے احمد نگر روڈ پر دی نوبیلی کالج کی نئی عمارت میں کام کے لیے جاتا تو ایک ہاتھ سے سائیکل کا ہینڈل پکڑتا اور دوسرے ہاتھ میں ناول ہوتا' ان دنوں سڑکوں پر اتنی بھیڑ بھاڑ نہیں ہوتی تھی اس لیے ٹرافک کا کوئی مسئلہ نہیں تھا اور میں اپنی ہی دھن میں سائیکل چلاتے ہوئے ناول بھی پڑھتا چلا جاتا۔ چھٹی کے دن گھر میں اکثر ناول کا مطالعہ کرتا رہتا' کبھی کبھی یوں بھی ہوتا کہ کھانے کا وقت ہو جاتا تو کھانا کھاتے وقت بھی ناول کا مطالعہ جاری رہتا۔ جب تک ناول ختم نہ ہو جاتا ایک اضطرابی کیفیت طاری رہتی۔ اسی دوران جب مصطفیٰ سے ملاقات ہوتی تو نئے ناول پر گفتگو ضرور ہوتی' وہ بتاتا کہ میں نے ناول یہاں تک پڑھ لیا ہے۔ میں کہتا کہ میں یہاں تک پہنچا ہوں۔ اس میدان میں مصطفیٰ مجھ سے تیز تھا۔ کبھی کبھی تو ادھوری کہانی پڑھ کر ہی وہ بتا دیتا کہ فلاں شخص ہی مجرم ہوگا اور اکثر اس کے فیصلے درست ثابت ہوتے۔ ہماری اس دیوانگی کا کوئی کیا اندازہ لگا سکتا ہے آپ اسے مطالعیاتی خودسپردگی بھی کہہ سکتے ہیں۔ آج چالیس برسوں کے بیت جانے کے بعد بھی سارے منظر' سارے حالات اور ساری کیفیات میرے ذہن میں موسمِ بہار کے پہلے پھول کی مانند تر و تازہ ہیں اور اب بھی یہ سطریں لکھتے وقت میں اپنے آپ کو پھولوں کی خوشبو میں گھرا ہوا محسوس کر رہا ہوں۔

مجھے بہ خوبی یاد ہے میں نے اور مصطفیٰ نے مل کر ایک آزاد لائبریری بھی قائم کی تھی جس میں جاسوسی اور رومانی دنیا کے شمارے سجا رکھے تھے۔ کچھ کتابیں شاعری کی بھی ہوا کرتی تھیں، ہم نے پوری بستی میں لائبریری کی تشہیر کے لیے پمفلٹ بھی تقسیم کئے تھے اور چند لوگوں کی موجودگی میں لائبریری کا افتتاحی جلسہ بھی کیا تھا اور مٹھائی تقسیم کی تھی۔ یہ الگ بات کہ اس لائبریری میں کبھی کوئی تیسرا ممبر نہیں آیا ہم دونوں ہی اپنی اپنی فرصت کے وقت آ کر کتابوں کا مطالعہ کرتے رہتے۔

مرحوم دلدار ہاشمی اکثر میرے ساتھ آ جایا کرتے تھے لیکن ان کو جاسوسی ادب سے کوئی شغف نہیں تھا

البتہ وہ رومانی ناول پڑھ لیا کرتے تھے۔ لائبریری جب بند ہوئی تو کتابیں ہم دونوں میں تقسیم ہوگئیں۔ مصطفیٰ چونکہ امیر باپ کا بیٹا تھا اس کے پاس کتابیں رکھنے کے لیے جگہ تھی اس کے برعکس ہماری رہائش کے لیے جو مکان تھا اس کے دو چھوٹے چھوٹے کمرے تھے وہاں کتابوں کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی۔ اس لیے ایک صندوق میں ساری کتابیں بھر کر میں گاؤں لے گیا۔ جب بھی چھٹیوں میں گاؤں جاتا ابنِ صفی کی یاد تازہ ہوجاتی تو پرانے ناول لے کر پڑھنے بیٹھ جاتا' تقریباً پچیس سال تک میں نے ان ناولوں کی حفاظت کی اور ہر بار گاؤں جانے کے بعد ان کی دیکھ بھال کرتا رہا' ابھی تین سال پہلے اسلامیہ اسکول عیدگاہ کی لائبریری کے لیے وہ تمام کتابیں دے آیا۔ وہاں ان کتابوں کو قاری میسر آیا کہ نہیں یہ معلوم نہ ہوسکا' ویسے اس بات کا امکان تو کم ہی ہے کیوں کہ اب اردو کے استاد بھی اردو نہیں جانتے۔ بہت خراب حالت میں ہے اردو اسکولیں۔ خدا حافظ ہے اردو کا۔ نہ ادب کا ذوق ہے نہ کوئی شاعری کا مطالعہ کرتا ہے' ہر طرف بے حسی چھائی ہوئی ہے۔ اب ایسے میں ابنِ صفی کے جاسوسی ناول دلچسپی سے پڑھنے والے قارئین کہاں مل سکتے ہیں۔ افسوس!

(۳)

الہ آباد کا سفر

جب پریتا واجپائی کی کتاب کی اجرائی مجلس میں شرکت کے لیے میرا الہ آباد جانا ہوا تو مرحوم خواجہ جاوید اختر نے اپنی بائیک پر بٹھا کر الہ آباد کے شاعروں اور ادیبوں سے ملوایا۔ دو روز تک یہ سلسلہ جاری رہا' دانش الہ آبادی سے بھی ملاقات رہی' دانش بھائی نے بتایا کہ اسی روڈ پر جہاں ان کی مٹھائی کی دکان ہے ایک گلی میں عباس حسینی کا وہ دفتر ہے جہاں سے ابنِ صفی کے جاسوسی ناولوں کی اشاعت ہوا کرتی تھی۔ ابنِ صفی کا نام سنتے ہی پرانی باتیں یاد آنے لگیں چونکہ رات کے نو بج رہے تھے اس لیے میں جاسوسی دنیا کے دفتر میں نہیں جاسکا حالانکہ دل تو بہت چاہا کہ ابنِ صفی کی کوئی یادگار دیکھوں۔ ویسے بھی اب وہاں نشر و اشاعت کا کام بند ہی ہے۔ تاہم میں نے وہ اسکول ضرور دیکھ لیا جس کے کمروں میں ابنِ صفی نے ابتدائی تعلیم حاصل کی تھی۔ رات کا وقت تھا اس لیے اسکول تو بند تھا لیکن اسکول کے صدر دروازے کے سامنے رُک کر دل ہی دل میں چند قرآنی آیات پڑھ کر ابنِ صفی کو ایصالِ ثواب پہنچایا۔ ان کے حق میں دعا کی اور عقیدت سے انھیں یاد کیا۔ اور اب میں فخر سے کہہ سکتا ہوں کہ میں نے الہ آباد دیکھا ہے اس اسکول کے صدر دروازے کا دیدار کیا ہے جہاں ابنِ صفی نے ابتدائی تعلیم حاصل کی تھی اور جس اسکول کے صحن میں چھوٹے چھوٹے بچوں کے ساتھ ایک بچہ ابنِ صفی بھی شرارت کرتا رہتا تھا۔

میں ایک بار پھر اعتراف کرتا ہوں کہ ابنِ صفی کے جاسوسی ناولوں کے مطالعے کے بعد ہی مجھے اردو نثر لکھنے کا حوصلہ ملا ورنہ میں نے اس وقت تک ادب اور تنقید کی کوئی کتاب نہیں پڑھی تھی۔ ماہنامہ شمع نئی دہلی' ماہنامہ بیسوی صدی نئی دہلی اور ماہنامہ خاتونِ مشرق دہلی سے آگے کسی ادبی رسالے کا نام تک مجھے معلوم

نہیں تھا۔

میں ابنِ صفی کے ناولوں پر گفتگو کرنا چاہتا ہوں' ان کی کہانیوں پر لکھنا چاہتا ہوں' ان کے کرداروں کی تشریح کرنا چاہتا ہوں لیکن یہ کام کسی اور دن کے لیے اٹھا رکھتا ہوں' مجھے ابنِ صفی کا ایک ناول ''دوہرا قتل'' آج بھی یاد آتا ہے۔ چھوٹا سا ناول' چھوٹی سی کہانی' چند کردار لیکن ایک بڑا پُر اسرار ماحول خود ابنِ صفی کے نام کی طرح گہرا اور گہراتا ہوا' قاری کے دل کی دھڑکنوں کے ساتھ آگے بڑھنے والا سسپنس' چونکا دینے والے واقعات اور حیرت انگیز انکشافات۔ یہ تمام خوبیاں اردو میں ابنِ صفی کے علاوہ کہیں اور نظر نہیں آتیں۔

☆☆☆

''ادبِ عالیہ'' کیا ہے' میں نہیں جانتا لیکن ''ادبِ عوامیہ'' خوب جانتا ہوں۔ وہ ادب جو عوام کی پہلی پسند ہوا سے میں ''ادبِ عوامیہ'' قرار دیتا ہوں اور ابنِ صفی اسی ''ادبِ عوامیہ'' کے بنیاد گزار تھے اور ہم ایسے ادب کے طالبِ علموں کے لیے ان کی عوامی تحریریں آج بھی رہنمائی کا باعث ہیں۔

ابن صفی: ماورائے اسرار

خان احمد فاروق
شعبۂ اردو، حلیم مسلم پی۔ جی کالج، کانپور

مجنوں گورکھپوری بڑے سنجیدہ نقاد تھے۔ اسی سنجیدگی میں کہہ گئے کہ "ادب میں، میں اس صنف کو کوئی بڑا مرتبہ نہیں دیتا تھا جو اصطلاح میں سراغ رسانی یا جاسوسی ادب کہلاتا ہے" (۱)۔ اسی لئے وہ اِسے "سرسری طور پر پڑھ کر الگ رکھ دیتے تھے۔ اسی سرسری پڑھت نے ابن صفی کو ادب کی دنیا سے باہر رکھا۔ لیکن جب ابن صفی توجہ سے پڑھے جانے لگے تو ایک اور ہی دنیا وجود میں آنے لگی۔ خالد جاوید نے بالکل صحیح سوال اٹھایا کہ "ابھی تو ہم وثوق کے ساتھ یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ ابن صفی کے ناول مکمل طور پر جاسوسی ہی ہیں" (۲) اس کی ایک وجہ تو یہ سمجھ میں آتی ہے کہ ابن صفی کا مقصد یا ارادہ جاسوسی ناول لکھنے کا تھا ہی نہیں۔ یہ صرف اتفاق ہی کہا جا سکتا ہے کہ ابن سعید نے اُن کو جو پہلا ناول ترجمہ کرنے کے لئے دیا وہ جاسوسی تھا۔ ان کا ارادہ یا چیلنج تو یہ تھا کہ کس طرح بازار میں چھائے جنسی تحریروں کو روکا جا سکے۔ اور اس راہ کو مسدود کرنے کے لئے اُن کو اسی راہ میں سے ایک نیا راستہ پیدا کرنا تھا جو انھوں نے کیا۔ اور اب تک ہمارے سامنے مسئلہ بنا ہوا ہے۔ ایک تو یہ کہ اگر ابن صفی کی تحریریں اسی طرح کی تحریریں تھیں جو دوسرے بھی لکھ رہے تھے تو پھر ابن صفی کی مقبولیت کی وجہ کیا تھی۔ دوسری کہ اگر ان کی تحریریں ان سے الگ تھیں تو ان میں ایسی کون سی خاص بات تھی کہ ایسے جنسی اور چٹخارہ دار تحریروں کو چھوڑ کر پورا معاشرہ ابن صفی کا دیوانہ ہو گیا۔ ممکن ہے اس معاشرہ کے لاشعور میں اس کمی کا احساس ہو اور ابن صفی کی تحریروں سے اس معاشرہ کو وہ تسلی یا تشفی حاصل ہونے لگی جس کا اظہار وہ نہیں کر سکتے تھے۔ لیکن جو اس کے اظہار پر قادر تھے انھوں نے یہ تبدیلی کیوں محسوس نہیں کی۔ کہیں یہ معاملہ بھی پروفیسر کلیم الدین احمد اور نظیر اکبرآبادی جیسا تو نہیں ہے۔ کلیم الدین صاحب کے باعلم ہونے میں کس کو کلام ہو سکتا ہے۔ وہ تو لندن کے پڑھے تھے لیکن ان کی ادبی اور ذہنی تربیت جس نہج پر ہوئی تھی وہاں غزل کا گزر ہی نہیں تھا اس لیے غزل ان کے نزدیک "نیم وحشی صنف سخن" قرار پائی۔ یہ دوسری بات ہے کہ فضیل جعفری نے ہمیں بتایا کہ یہ جملہ بھی مستعار تھا۔ نظیر نے مرثیہ، مثنوی، قصیدہ کے ہوتے ہوئے جب اپنی وہ تحریریں لکھیں جو بہت بعد میں نظم کہلائیں۔ اس کو میر سے حالی تک کسی نے قابل اعتنا نہیں سمجھا۔ خدا بھلا کرے اُس نیک انسان کا جس نے نظیر اکبرآبادی کی تحریروں پر عنوان قائم کر دیئے۔ اگر یہ عنوان ذرا پہلے قائم ہو گئے ہوتے تو آزاد اور حالی کو نظم کی تحریک شروع کرنے کی ضرورت ہی نہ محسوس ہوتی۔ ہم جس تحریک کو انیسویں صدی کی اور انگریزی کی مرہون منت سمجھتے ہیں وہ تو اٹھارہویں صدی میں نظیر اکبرآبادی سے شروع ہو چکی تھی۔ "اصناف" اور تحریکیں صدیوں ذہنوں میں ہی سفر کرتی رہتی ہیں تب وہ کہیں جا کر کوئی وجود اور ہیئت پاتی ہیں۔ انتظار حسین نے کیا عمدہ بات کہی ہے۔

''شاعری کی مار وہاں تک ہوتی ہے جہاں تک زبان اُس کا ساتھ دیتی ہے' مگر کہانی اپنی پیدائشی زبان کی اس حد تک محتاج نہیں ہوتی جہاں تک زبان اس کا ساتھ دیتی ہے۔ وہاں ماشاءاللہ' سبحان اللہ۔ اس سے آگے وہ خود اپنی اندرونی طاقت کے زور پر چلتی ہے اور دور تک سفر کرتی ہے۔۔۔ وہ اپنے کہانی پن کے زور پر دور دور تک سفر کرتی ہیں۔ گھاٹ گھاٹ کا پانی پیتی ہے۔ بہت کچھ لٹا کر اور بہت کچھ سمیٹ کر واپس آتی ہے''۔(۳)

اردو ناول اور کہانی کا سفر تو ہم کو یاد ہے۔ رتن ناتھ سرشار اور ڈپٹی نذیر احمد سے لے کر اب تک ناول کتنی منزلوں پر ٹھہرا اور کیسا طویل سفر کیا۔ آج اردو افسانہ تو عالمی افسانے کی ہم سری کا دعویٰ کرتا ہے لیکن کیا ہم اب تک اردو کے پہلے افسانے کا تعین کر پائے۔ ابن صفی کی تحریروں کے صنفی تعین میں بھی ہمیں شاید برسوں لگ جائیں کہ یہ جاسوسی ناول ہیں یا کسی ''نئے مہابیانیہ کا آغاز''(۴) گفتگو شروع ہو چکی ہے تو مزید در بھی وا ہوں گے۔ Tzvetan Todorov کہتا ہے کہ:

"Detective fiction has its norms; to'develop' them is also to disappoint them: to 'improve' upon' detective fiction is to write 'literature', not detective fiction."(5)

ابن صفی کی تحریروں میں قتل' قاتل' جاسوس' تفتیش' پولیس رپورٹ' فوٹو گرافر' انگلیوں کے نشان' سگریٹ کا دھواں اور اندھیرے کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے۔ جس کو TzvetanTodorov ''improve upon'' اور انتظار حسین ''اندورونی طاقت'' کہتے ہیں۔۔۔ عمرانی اور معاشی علوم کی ماہر امریکی خاتون ایان آئسلر اپنی کتاب ''The Real Wealth of Nations'' میں لکھتی ہیں کہ جب تک (کسی بھی نظام میں) انسانی فلاح کو مرکزیت حاصل نہیں ہوگی اس وقت تک دنیا میں ظلم و جبر اور تخریب ختم نہیں ہو سکتی'' بلاشبہ ابن صفی کی تحریروں میں ''انسان'' اور ''انسانی فلاح کو مرکزیت'' حاصل ہے۔ کیا ابن صفی کی تحریروں میں improve upon جیسی کوئی بات نہیں ہے۔ اگر نہیں ہوتی تو آج ہم اس پر کوئی بات نہیں کر رہے ہوتے۔ اگر ادب کی بات ہوگی تو کیا کوئی ادب انسانی تعلقات سے ماورا بھی ہو سکتا ہے۔ اور جو ہوگا اسے کتنے لوگ تسلیم کریں گے۔ کیونکہ یہ کائنات انسانی وجود کے علاوہ کیا حسن رکھتی ہے۔ یا جو اس کا حسن ہے وہ انسان کے تسلیم کیئے بغیر کوئی وجود رکھتا ہے۔ بہت ''کٹا چھنی'' کے بعد یہ بات تو تقریباً طے پا چکی ہے کہ ہم ادب اس لئے نہیں پڑھتے کہ اس سے ہماری زندگی متاثر ہوتی ہے۔ نہ ہی زندگی کی الجھنوں کا حل ڈھونڈنے کے لئے پڑھتے ہیں لیکن یہ ضرور ہے کہ ہم ادب اس کو ہی کہتے ہیں جس سے ہماری بصیرت میں کچھ نہ کچھ اضافہ ہو۔ اب یہ ہماری فہم پر انحصار کرتا ہے کہ ہم اس سے کیسے بصیرت حاصل کرتے ہیں۔ کیا ابن صفی کی تحریروں سے ہمیں کوئی بصیرت حاصل نہیں ہوتی۔ کیا ہم کسی نئے تخیل' نئی زبان سے متعارف نہیں ہوتے۔ کیا ہمیں ان کی تحریروں میں کوئی احتجاج نظر نہیں آتا۔ چلیئے ہم تھوڑی دیر کے لئے بھول جاتے ہیں کہ اُن کا مقصد لوگوں کو قانون کا احترام کرنا سکھانا تھا۔ تو کیا ہم یہ بھی بھول سکتے ہیں کہ جب ابن صفی کی یہ تحریریں دجود

میں آئیں تو ایک زمین کے ٹکڑے کے لئے پانچ لاکھ انسان مارے جاچکے تھے۔ کیا ہمیں ان کی تحریروں میں کوئی انسانی مسائل نظر نہیں آتے۔ دیکھئے کیسے ان کی تحریروں میں "روح عصر" اور "انسانی اقدار" کی روشنی جا بہ جا پھوٹتی ہے۔ صرف ادھر ادھر سے چند مثالیں ملاحظہ کیجیے۔

"ڈاکٹر شوکت کے چلے جانے کے بعد انہوں (ستیا دیوی) نے ملازمہ سے کہا "میرے کمرے میں قندیل مت جلانا' میں آج شوکت کے کمرے میں ہی سوؤں گی۔ وہ آج رات گھر تھکے ہوئے آئیں گے۔ میں نہیں چاہتی کہ جب وہ صبح آئے تو اپنے بستر کو برف کی طرح ٹھنڈا اور یخ پائے۔ جاؤ جا کر اس کا بستر بچھا دو۔"

یہ اقتباس ان کی پہلی تحریر "دلیر مجرم" سے ہے۔ جو انگریزی کے مشہور ناول "آئرن سائڈز لون ہینڈز" سے مستعار تھا۔ ابن صفی نے ناول کا چربہ نہیں اتارا۔ اس میں اپنی روح پھونک دی۔ اب تک فسادات پر بہت سارا اچھا فکشن سامنے آچکا تھا۔ انہوں نے فساد کی ہیبت ناکی یا انسان کے مکروہ یا مظلوم چہرے کو پیش نہیں کیا بلکہ انسان کے ازلی جذبے اور اقدار کو پیش کر دیا ہے۔ اس موضوع کو بعد میں مختلف طریقہ سے پیش کیا گیا۔ اسی موضوع پر بہت بعد میں سنجے خان نے فلم "عبداللہ" بنائی۔ ابن صفی نے لکھا بھی کہ "میں نے اس میں کچھ ایسی دلچسپیوں کا اظہار کیا جو اوریجنل پلاٹ میں نہیں تھیں۔" یہ ابن صفی کا ایک خاص طرز بھی تھا۔ کہ وہ کبھی قاری اور کبھی کہانی کے مطالبہ کے پیش نظر کہانی کو کئی کئی قسطوں تک آگے بڑھا دیتے تھے۔ یہ صرف اور صرف داستان کا عنصر ہے اور ابن صفی کی ذہنی اور ادبی تربیت میں داستان کا عمل دخل تو بالکل کھلا ڈلا ہے۔ ان کے یہاں "مشرق" اور "مغرب" کی دو انداز تحریر کے اتصال کے ساتھ ساتھ وہ سب کچھ ہے جو کسی بھی ادب کی ضرورت ہوتا ہے۔ وہ قطعی اپنے آس پاس کی دنیا سے بے نیاز نہیں تھے۔ ان کی زود حسی اور دراکی نے ان کی کہانی اور زبان دونوں کو مجروح ہونے سے بچا لیا۔ انسانی مسائل اور روح عصر کو اتنی چابکدستی سے اپنے یہاں برتا کہ احساس ہی نہیں ہوتا کہ وہ کتنا گمبھیر مسئلہ سامنے لا رہے ہیں۔ "پراسرار اجنبی" کا سعید آپ کو یاد ہوگا جس کو سب کسان صاحب کہتے ہیں۔ یہ ہمارے معاشرہ کا مثالی نوجوان بھی ہے اور کہانی میں گاندھی جی کی چھوٹی چھوٹی صنعتوں اور کاشتکاری کا فروغ دینے کی بات کو بھی پیش کر دیا ہے۔

ہمارے عہد میں ہر چیز بہت تیزی سے بدل رہی ہے۔ اشیا ہی نہیں انسانوں کی شناخت کے طریقہ اور فاشسٹ قوتوں کے انداز بدل گئے ہیں۔ اور تو اور یاروں نے اس کی تعریف اور رویہ بھی بدل دیا۔ اب اقتصادی اداروں اور طاقت کا سرچشمہ "نیوکلیئر ہتھیار" جبراً قابض طاقتور اور رہنما کہلاتے ہیں۔ یہی فیصلہ کرتے ہیں کہ فاشسٹ کون ہے۔ وہ اب یہ فیصلہ کرنے میں بھی حق بجانب ہیں کہ "جوان کے ساتھ نہیں ہے وہ ان کا دشمن ہے"۔ اب وہ دنیا کے کسی ملک پر قبضہ نہیں کرتے صرف پالیسی نافذ کرتے ہیں۔ اور کسی سے بھی اس کی زمین چھین کر دوسرے کو اس پر بسا سکتے ہیں۔ وہ چاہے جہاں بم گرا سکتے ہیں۔ اور پھر وہی فیصلہ بھی کرتے ہیں کہ کس کے ہاتھوں میں دنیا کے خطرناک ترین بم محفوظ ہیں۔ اور وہی فیصلہ کرتے ہیں کہ دہشت گرد کون ہے۔ ابن صفی کتنی سادگی سے سوال کرتے ہیں۔

''جب ایک آدمی پاگل ہو جاتا ہے تو اسے پاگل خانے میں بند کر دیتے ہیں اور جب پوری قوم پاگل ہو جاتی ہے تو طاقتور کیوں کہلانے لگتی ہے''۔ (انوکھے رقاص)

جو پہاڑ اس زمین کو سنبھالتے ہیں۔ وہ جڑ سے اکھاڑے جا رہے ہیں زمین ادھر اُدھر لڑھک رہی ہے۔ اس کے اندر میلوں تک پانی سوکھ چکا ہے۔ کیوں کہ جب بم برسانے کے لئے نئے ملک نہیں ملتے تو وہ انہیں زمین کے اندر ہی پھوڑ دیتے ہیں تا کہ ان کی طاقت کے نشے کا خمار ٹوٹنے نہ پائے۔ پہاڑی علاقے گرم اور میدانی ٹھنڈے ہونے لگے ہیں۔ سطح سمندر بڑھتی جا رہی ہے دس بیس برسوں میں کچھ ملک ڈوب کر ختم ہو جائیں ان کی صحت پر کیا اثر۔ اس وقت بھی اور آج بھی ''وہ بڑی طاقتوں کے نام کو روتے جو محض ایٹمی تجربات سے ایک دوسرے کو مرعوب کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ لیکن بھگتنا انہیں پڑ رہا تھا جو طاقت یا ناطقتی کسی سے بھی سروکار نہیں رکھنا چاہتے تھے۔

ابن صفی کی تحریریں کی ایک خاص بات یہ بھی ہے کہ ان کے یہاں کسی کی کوئی تقلید کسی بھی طرح نہیں ملتی۔ نہ کہانی کی صورت، نہ زبان میں، نہ کردار میں، واقعات میں اور نہ رویوں اور نظریوں میں۔ وہ ہر مسئلے یا معاملے میں ،جس پر بھی قلم اُٹھاتے خوب ٹھونک بجا کر قلم اتھاتے۔ ان کے یہاں فیشن زدگی یا فارمولائیت بالکل نہیں ہے۔ ساٹھ کی دہائی کی ہپی تحریک ابھی بہت پرانی بات نہیں ہے۔ ان کے نام سے شرفا تو الگ عام آدمی بھی بدکتا تھا۔ وہ بڑے بے ڈھنگے لباس پہنتے تھے۔ زندگی کے تئیں لاابالی رویہ رکھتے تھے مفلسی اور جنسی بے راہ روی کو شوقیہ اختیار کرتے تھے۔ چرس اور دیگر منشیات کا بے مہابا استعمال کرتے تھے۔ کیونکہ یہ تحریک ہی نشہ آور اشیا پر پابندی لگانے کی مخالفت میں شروع ہوئی تھی جس کو وہ اپنی آزادی پر قدغن تصور کرتے تھے۔ ''تابوت کی چیخ'' کے نواب مظفر الملک اس کو بکواس کہتے ہیں اور ان کا بھتیجا ظفر الملک جو اس طرز زندگی کو اختیار کر چکا ہے ''اس بکواس کو کل کے لئے نشان راہ کہتا ہے'' اپنی تمام تر مقبولیت کے بعد بھی یہ تحریک بارہ پندرہ برسوں میں ختم ہوگئی۔ آج تقریباً پچاس برسوں بعد ''وہی بکواس'' نشان راہ ثابت ہو رہی ہے۔ مغرب کی بعض یونیورسٹیاں اسے بیسویں صدی کی اہم ثقافتی تحریک قرار دے رہی ہیں۔ اس کو فطرت سے ہم آہنگ' تمام تحفظات سے پاک یا بے نیاز طرز زندگی اور Artisatic Exprimentation تعبیر کیا جا رہا ہے۔ ''ممکن ہے اس کی وجہ یہ ہو کہ اس زمانے کے نوجوان اب بزرگ ہو گئے ہیں'' (۶) لیکن عام خیال یا رویہ سے ہٹ کر ابن صفی نے اس تحریک کے ہر پہلو کو اپنی تحریروں میں پیش کیا اور غالباً اردو میں پہلی بار پیش کیا۔

''کتے'' کو میر امن سے لے کر انتظار حسین تک اردو کی علمی اور ادبی دنیا میں متعدد معنی میں پیش کیا گیا ہے۔ ابن صفی نے بھی بیچاری/ بیچارہ، سگ پرست، ریگیم بالا کے علاوہ ''خوشبو کا حملہ'' میں کتے کو اپنے انداز میں پیش کیا۔ لیکن ''خوشبو کا حملہ'' میں پلپلی صاحب (عمران) کا کتوں کے ساتھ جو Ethical Treatmant دکھایا ہے اس کو دیکھ کر تو Peat والے بھی عش عش کریں گے۔ خوشبو کا حملہ 1976 میں لکھا گیا اور Peat کا قیام 1980 میں ہوا۔ بغیر کسی تفصیل کے چند اقتباسات ملاحظہ کیجئے۔

۱۔ یہ فرنگی بھی عجیب ہوتے ہیں۔ ان کی ایک ٹولی لوگوں پر گولیاں برساتی ہے اور دوسری ٹولی زخمیوں کی مرہم پٹی کرتی پھرتی ہے۔ ان کا نشان ایک دوسرے کو کاٹتی ہوئی دو سرخ لکیریں ہوتی ہیں۔
(خطرناک ڈھلان: عمران سریز)

۲۔ آسودہ حال لوگ نا آسودہ لوگوں کو ہمیشہ بیوقوف بناتے چلے آرہے ہیں۔ پہلے انہوں نے نا آسودہ لوگوں میں علم کی روشنی پھیلائی کہ وہ مہذب ہو جائیں اور ان کے مزید دولت مند بننے میں حارج نہ ہوسکیں۔ قناعت کا سبق پڑھاتے رہے لیکن علم ذہن کی کوئی ایک کھڑکی تو نہیں کھولتا بلکہ سارے دریچے کھول دیتا ہے علم نے نا آسودہ لوگوں کو قناعت تو سکھائی لیکن انہیں یہ بھی سمجھا دیا کہ ان کی حق تلفی ہو رہی ہے۔ بس پھر کیا تھا طرح طرح کی تحریکیں سر ابھارنے لگیں۔
(بیمبو کیسل: عمران سریز)

۳۔ خود شناسی جہنم کے دہانے کھول دیتی ہے۔ خوش وہی ہے جو صرف جبلتوں کے تحت زندگی بسر کر رہے ہیں۔
(ہمزاد کا مسکن: جاسوسی دنیا ۱۲۴)

۴۔ اگر خود غرض اور جاہ پسندی سے منہ موڑ لیا جائے۔ ایک نئے انداز کی سرمایہ داری کی بنیاد ڈالنے کی بجائے خلوص نیت سے وہی کیا جائے جو کہا جاتا رہا ہے تو عوام کی جھلاہٹ دور ہو جائے گی۔
(زہریلا سیارہ: جاسوسی دنیا)

۵۔ کچھ مجرم بڑی بڑی رشوتوں سے کام چلاتے ہیں اور کچھ دھونس دھڑلے سے..... لیکن رشوتوں کا سہارا لینے والے مجرم نہیں کہلاتے..... کبھی کبھی تو حکومت انہیں خطابات سے نوازتی ہے۔
۶۔ ان کے بلند بانگ نعرے جو انسانیت کا بول بالا کرنے والے کہلاتے ہیں کتنے زہر آلودہ ہیں اس کا اندازہ مشکل ہے۔ یہ ایسے ہی ایک ملک کی کہانی ہے جو اپنے حریف سے نپٹنے کے لئے ایشیا کی لاش پر کھڑے ہونے کی کوشش کر رہا ہے۔
(وبائی ہیجان: جاسوسی دنیا ۷۶)

۷۔ ہمارے ہاں تو کتابوں کو ترازو میں تول کر سال کی بہترین کتابیں منتخب کی جاتی ہیں اور ان پر انعامات دیئے جاتے ہیں عموماً سب سے زیادہ ضخیم کتاب کا مصنف انعام پاتا ہے۔ اگر کوئی اللہ کا بندہ اعتراض کر بیٹھے تو کہہ دیا جاتا ہے اماں اتنی موٹی کتاب لکھ دی بے چارے نے، کہیں تو کوئی قابل انعام بات قلم سے نکل ہی گئی ہوگی۔
(بلی چیختی ہے: عمران سریز)

۸۔ اگر آدمی کا دائرہ معلومات اس کی قوت عمل سے زیادہ ہو تو وہ اپاہج ہو کر رہ جاتا ہے۔
(ٹھنڈی آگ: جاسوسی دنیا ۶۹)

۹۔ جمہوریت کے ساتھ لفظ حکومت لغو ہے۔ اسے حکومت کی بجائے نظامت ہونا چاہئے...... منتظم، حکم نہیں دیتے' مشورہ دیتے ہیں۔ حکم سے آدمی کو ازلی بیر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ پہلے قوم کے خادموں کو خوشی خوشی منتخب کرتا ہے اور پھر جب وہ حاکم بن جاتے ہیں تو انہیں گالیاں دینا شروع کر دیتا ہے حکم اور حکومت کے خلاف لاشعور میں بیٹھی ہوئی نفرت اسے گالیاں دلواتی ہے جسے اس نے خود منتخب کیا تھا۔

(جنگل کی شہریت: عمران سریز)

• یہ اقتباسات ابن صفی کے انداز فکر کو ظاہر کرتے ہیں۔ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب ہمارے زمانے کی باتیں ہیں۔ ہمارے آس پاس یہی سب کچھ تو ہو رہا ہے۔ان اقتباسات سے ''انسانی ضمیر میں اٹھنے والی ٹیس کا احساس ہوتا ہے'' اور یہی احساس تو ادب کو زندہ رکھتا ہے۔ان میں عصری آ گہی اور جذبے کی جو شدت ہے وہ ہمیں ابن صفی کی تحریروں کے مطالعہ پر مجبور کرتی ہے۔ یہی مجبوری تو اس عہد یا معاشرہ کی بھی بن گئی تھی جہاں یا جب صرف ابن صفی کے لئے آنہ لائبریریاں قائم ہوئی تھیں۔ خواندہ ناخواندہ سب لمبی لمبی قطاروں میں کتابوں کی دوکانوں کے باہر کھڑے ابن صفی کے نئے آنے والے ناول کا بے چینی سے انتظار کرتے تھے۔ ناول باقاعدہ اعلان کی گئی تاریخ پر ہوتے تھے۔ ناخوندہ خوانندوں کی خوشامدیں کرتے تھے۔ لوگوں نے ابن صفی کو پڑھنے کے لیے اردو سیکھی۔ اسکول کے لڑکے اپنے اساتذہ اور بڑوں کے ڈر سے قمیص اور موزوں کے اندر ناول اڑسے رہتے تھے۔ جس کو ناول ہاتھ لگا اس نے وہیں کھڑے کھڑے پڑھنا شروع کر دیا۔ میں نے ایسا منظر صرف ہیری پاٹر سریز کی ناولوں کے بارے میں پڑھا ہے۔اس معاشرہ کو مہذب اور ترقی یافتہ کہتے ہیں۔ جس ادبی معاشرہ نے ابن صفی کو نظر انداز کیا اس اپنے اوپر سوالیہ نشان نہیں لگایا۔

خرم علی شفیق جو اقبال اور ابن صفی پر کافی کام کر رہے ہیں اور بی بی سی سے بھی وابستہ ہیں ابن صفی کو ایک مصلح قوم کے طور پر سرسید، محمد علی جوہر اور اقبال کا جانشین مانتے ہیں شاید اس بات کو ماننے میں تامل ہو لیکن کہیں بھی ادبی دنیا کی ایسی کوئی مثال ملتی ہے کہ کوئی مصنف کسی چیلنج کے ساتھ ادبی کارزار میں آیا ہو اور ابن صفی کی طرح منہتم بالشان فتوحات حاصل کی ہوں۔ میں تو ابن صفی کا نام چانکیہ کے ساتھ لینا پسند کروں گا اس سے بھی ایک قدم آگے کہ ابن صفی نے سام، دام، دنڈ، بھید سے کام نہیں لیا۔

آخر میں ایک ضروری بات بھی عرض کرتا چلوں کہ ابن صفی کی تحریروں کو ادب عالیہ میں جگہ نہیں دی گئی اور ہمیں ان کو صرف مقبول عام ادب ماننے میں تامل ہے۔کیوں نہ ہم ابن صفی کی تحریروں کو ہائی پاپولر ادب (High Popular Literature) کہیں۔

اقتباسات:

(۱) اردو میں جاسوسی افسانہ، مجنوں گورکھپوری، بحوالہ: ابن صفی: کہتی ہے تجھ کو خلق خدا غائبانہ کیا، مرتبہ راشد اشرف، ص ۱۰۳

(۲) ابن .... چند معروضات، خالد جاوید، بحوالہ ایضا۔ ص ۲۹۱

(۳) انتظار حسین، دنیا زاد ۳۴

(۴) ابن .... چند معروضات، خالد جاوید، بحوالہ ایضا ص ۲۸۷

(۵) The Typology of detective fiction, Moderan criticism and theory, edited by David Lodge With Nigel wood P156

(۶) سائکومیشن۔ خرم علی شفیق